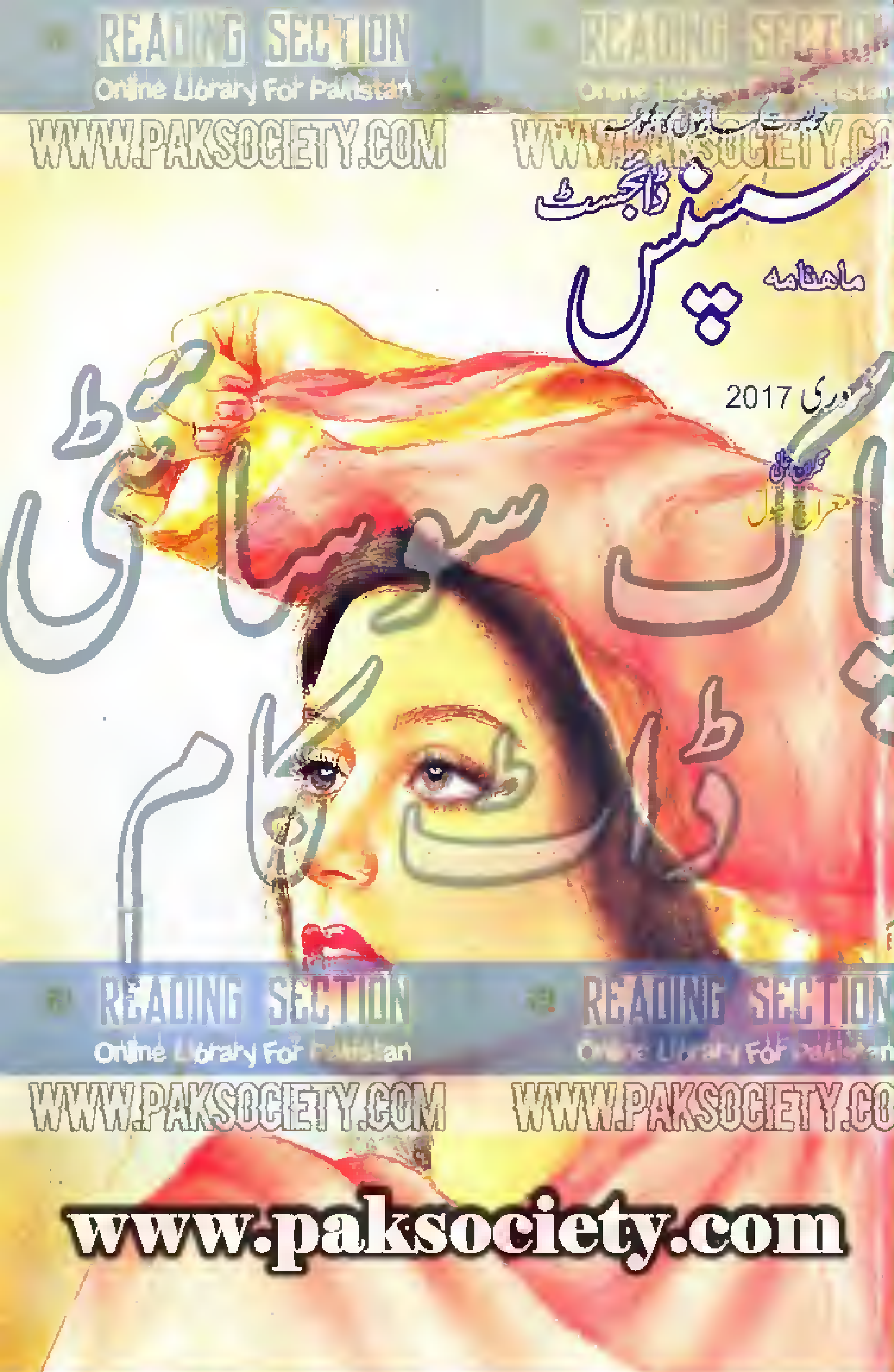

ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
فروری 2017

سسپنس ڈائجسٹ

جلد 47 • شمارہ 02 • فروری 2017 • زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون (021)35895313 فیکس (021)35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پرو پرائٹر: [illegible] رسول [illegible] اشاعت گراؤنڈ فلور C-63 [illegible] ڈیفنس [illegible] کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ [illegible] کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

بازیافت

ہم شام سے سائنس کی فیروزمندیوں کا اندازہ لگا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں، بات اس مصنوعی ستارے سے چلی تھی جو مریخ کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ ہم نے اس بیچ میں سائنس کو کتنی ہی داد اور کتنی ہی دعائیں دیں۔ یوں بھی ہم لوگ سائنس کو بس دعائیں ہی دے سکتے ہیں یا پھر بددعائیں زیادہ دی جاتی ہیں۔

بڑی بات ہے، ہم لوگ جو یہاں بیٹھے ہیں سائنس کے دعاگو ہیں۔ پر ابھی چند لمحوں پہلے میرے دماغ میں جہالت بھڑک اٹھی ہے۔ وہ کھانستا ہوا نوجوان جو ابھی یہاں آیا تھا اور ہم عیاشوں اور بدمعاشوں کی محفل کا مزہ کرکرا کر کے چلا گیا ہے، اس کے حوالے سے ہم سائنس کی آسماں نشیں دامرانیوں کو کس طرح دیکھیں گے۔ اس کے معاملوں اور مسئلوں سے فضا نورد سائنس کی بے سروکاری آخر ہمیں ذہن کی کس حالت سے دوچار کرتی ہے۔ میں تو ذہن کی ایک دماغ سوز حالت سے دوچار ہوں اور ایسے کتنے ہی نوجوان اور مان کے مسئلے انسان اور اس کے مسئلے یہ وہ مسئلے ہیں جن سے سائنس کے اس عہد کے انسان کو کب کا فارغ ہو جانا چاہیے تھا۔

سوچنے کی بات ہے کہ سائنس آخر کس لیے ہے اور کس کے لیے ہے۔ ایثار کا آخر یہ کونسا جذبہ ہے کہ انسان سائنس کو خود اپنے کام میں لانے سے جھجک رہا ہے۔ سائنس انسان کی معجز نمائی کا دوسرا نام ہے پر یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ یہ معجز نمائی خود انسان اور اس کے مسئلوں کے دائرے سے باہر ظہور میں آرہی ہے۔ جو انسان آج فضاؤں میں سربلندیاں حاصل کر رہا ہے، اسے اس زمین پر کتنا سربلند اور سرفراز ہونا چاہیے تھا۔ زمین پر اس کی شکستیں اور ندامتیں کم و بیش وہی ہیں جو آج سے صدیوں پہلے تھیں۔ اس پر بدحواسی کے وہی دورے پڑتے ہیں جو قرنوں پہلے پڑا کرتے تھے۔ کیا علم اور آگہی کی اس روشنی میں انسان کو اتنا ہی سیاہ کار اور اتنا ہی تیرہ دروں ہونا چاہیے تھا جتنا وہ ہے۔ ارجمند سائنس کے اس بدبخت خداوند نے اپنے آپ کو ذرا بھی نہیں بدلا۔

سوچا جائے کہ فطرت کے اس کماؤ پوت نے کیا پایا اور کیا کمایا۔ میرے خیال میں یہاں ان ایجادوں کی فہرست پڑھ کر سنانا ہرگز مناسب نہ ہوگا جو معجز نما سائنس کی دین ہیں۔ وہ حیران کن فہرست اپنی جگہ ہے اور انسانوں کا حرمان اور خسران اپنی جگہ بلکہ اس فہرست کے پیش نظر جب اس حرمان اور خسران کا اندازہ لگایا جاتا ہے تو احساس زیاں کی عذاب ناکی ہڈیاں پگھلا دیتی ہے۔ کیا انسان نے ایجادوں کی شکل میں جو کچھ پایا ہے وہ سب کچھ وہی کچھ ہے جس کی سائنس سے امید رکھی جاتی ہے؟ ہاں سائنس کے ذریعے انسانوں نے بہت کچھ کمایا ہے، انسانیت نے شاید کچھ بھی نہیں پایا ہے۔

سائنس کے کارنامے دل میں بڑی جولانی پیدا کرتے ہیں پر وہ جی بھی بہت جلاتے ہیں کہ ان کارناموں کے ہوتے ہوئے بھی انسان اسی قدر ہیچ، پوچ اور لچر ہے جتنا کبھی پہلے تھا۔ سیاروں کے مداروں میں دنگ کر دینے والی مہارت دکھانے والی سائنس کا آفریدگار زمین پر ایک مضحکہ اور ایک مذاق بنا ہوا ہے۔ انسانوں کے جو غول بھوک اور بیماری سے نڈھال ہیں، جو قبیلے سیاست کی بے حس شاہ اندازیوں کے پاتال ہیں، جو بے مقدور قومیں قہرمان قوتوں کی دہشت سے بے حال ہیں، ان کے لیے اس خبر میں بھلا کون سی خوش خبری ہے کہ آج خلائی سائنس کے فلاں طائفے نے فلاں سیارے کے مدار میں فلاں کرتب دکھایا اور کل فلاں طائفہ فلاں سیارے کے مدار میں فلاں کمال دکھائے گا۔

جون ایلیا! فلاں کی یہ تکرار کچھ جچی نہیں۔ نہ جچے میں کیا کروں؟ مگر میرے بھائی، بیان کا ایسا بولا دینے والا بھونڈا پن! یہاں میں بیان کے بھونڈے پن کو دیکھوں یا انسان کی اس ذہنیت کو جو اس سے بھی زیادہ بھونڈی ہے۔ اتنی بھونڈی کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی سلسلۂ خیال میں بھی یہ نتیجہ نکالے کہ جہالت کی خاکساری کا دوسرا نام علم ہے تو اس کی بات کو جھٹلانا بہت مشکل ہوگا۔ ایک طرف سائنس کے معجزے ہیں اور دوسری طرف اس حیوانیت کے مقابل انسان کی شرمناک عاجزی۔ انسانوں کے باہمی رویوں پر آج بھی انسان کے حیوان ہی کا فرمان چلتا ہے۔ انسان اپنے حیوان کا ایک فرودست ہے اور کچھ بھی نہیں۔

نرا آشوب تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے آپ سے بری طرح شکست کھائی ہے یا پھر یوں کہہ لو کہ تاریخ کا سب سے زیادہ ناخوشگوار حادثہ خود انسان ہے۔ تم نے اپنے علم، اپنے تجربے، اپنے ہنر اور اپنی مہارت کو آسمانوں میں تو سیاروں کی تسخیر کے لیے مامور کر رکھا ہے اور زمین پر انسانیت کی تخریب اور تباہ کاری کی ورزش میں لگا دیا ہے۔ کیا زمین پر یہی کام سائنس کے سپرد کیا جانا چاہیے تھا کہ وہ جنگ اور جنون کے حوصلے بڑھائے اور جب چاہے اور جہاں چاہے زندگی اور شائستگی کی بستیوں کو روندھ کر بے نشان کر ڈالے؟

سائنس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے گفتار کی یہ تلخی اور زہرناکی ہم میں سے کسی کو بھی زیب نہیں دیتی، پر یارو! یہ غصہ سائنس پر نہیں ہے، اس سیاست پر ہے جو سقراط کے ہاتھوں آگہی کو زہر دلوادے اور مسیح کے ہاتھوں نیکی کو سولی پر چڑھوا دے۔ اس سیاست نے عام طور پر زمین پر سائنس سے یہی کام لیا ہے اور ہے یوں کہ انسانی شعور کے بغیر سائنس انسانوں کو کوئی بھی مژدہ نہیں سنا سکے گی۔ سارا رونا انسان کے حیوانی رویوں کا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سائنس کے دور میں انسان کی دانست تو بڑھتی ہے پر دانش کم ہوئی ہے۔

ابتدائیہ

عزیز قارئین!

السلام علیکم!

فروری 2017...... لیجیے جناب نئے سال کا دوسرا شمارہ بھی آپ کے ہاتھوں کی زینت بن چکا ہے...... وقت کا کام ہے تیزی سے گزرتے رہنا مگر...... وقت کی رفتار کو ذرا دھیمی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی چال کو تھوڑا تیز اور چلن کا قبلہ درست کرلیا جائے تب کہیں جاکر یہ وقت کا جن کچھ قابو میں آسکتا ہے، ورنہ ہر سال ہم یہی کہتے رہ جائیں گے ''لیں جی یہ سال بھی یونہی گزر گیا اور پتا بھی نہیں چلا'' ظاہر ہے جب سارے مسائل اور حالات جوں کے توں رہیں گے تو تبدیلی کا احساس کیوں کر ہوگا۔ ارے ہاں تبدیلی سے یاد آیا کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ تبدیلی بھی رونما ہوئی ہے جیسے کہ اس سال بجلی کے نرخوں میں بالخصوص کراچی والوں کے لیے مزید اضافہ کرکے اپنایت کا بھرپور احساس دلایا گیا ہے۔ ہمیں آج تک یہ فارمولا سمجھ نہیں آیا کہ نہ صرف ہمارا ملک زرخیز ہے بلکہ ذہانت کی زرخیزی بھی بہت زیادہ ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کارکردگی دکھانے والے بھی ہیں۔ پھر ہم کیوں اتنا پریشان رہتے ہیں جبکہ ماشاء اللہ ہمارے سیاسی قائدین کے پاس بھی ذہانت کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اقتدار سے باہر رہ کر نعرے لگاتے ہیں کہ ہم اقتدار میں آکر تباہ حال ادارے بحال کردیں گے، روزگار کے مواقع پیدا کیے جائیں گے، محنت کشوں کے حقوق پر ڈاکا ڈالنے والوں کا احتساب کیا جائے گا مگر...... اقتدار میں آنے کے بعد کیسا احتساب، کیسا خواب...... ان کے سارے حساب کتاب کے گوشوارے کہیں گم ہوجاتے ہیں۔ بہرحال اب تک ''ایک جیب سو کو ہرائے'' کے فارمولے پر عمل کرکے حکومتی گاڑی کو بڑھایا جا رہا ہے۔ تعلیم کے حوالے سے ہماری گفتگو ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی، یہ ٹھیک ہے کہ تعلیمی معیار اور سرگرمیوں کی راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں حائل ہیں مگر حکومت کی ایک کاوش کی داد تو دینا پڑے گی۔ نوجوانوں کو ہنرمندی کی تربیت کے لیے ووکیشنل ادارے قائم کرکے ایک مثبت قدم تو اٹھایا ہے... مگر ابھی ان اداروں کا معیار کافی پست ہے۔ جب تک نوجوان طبقے پر ان کے نمایاں مثبت نتائج ثبت ہوتے نظر نہیں آئیں گے، اس وقت تک ان کی افادیت سے مطمئن بھی نہیں ہوا جاسکتا۔ ظاہر ہے یہاں بھی اخراجات کو بڑی وجہ بناکر پیش کیا جائے گا تو جناب یہ بڑے بڑے وزراء اور رئیسوں کو اربوں روپے کے قرضے دے کر پھر انہیں معاف کرنے کا ڈراما کرنے سے بہتر ہے کہ یہی رقوم نوجوانوں کے بہتر مستقبل، ان کی فلاح اور ترقی کے حوالے سے روزگار کے مواقع پیدا کرنے پر خرچ کر دی جائیں تو وہ دن دور نہیں جب یہی پاکستان معاشی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہوگا مگر...... افسوس! اہم باتوں پر توجہ دینا تو شاید ہم بھول ہی چکے ہیں۔ یاد رہا تو فقط غیروں کی تقلید کرکے خوشی محسوس کرنا جیسے کہ ''ہیپی نیو ایئر'' کوئی تہوار ہو یا ایجاد، کوئی خاص تاریخ ہو یا دن...... انہیں یاد رکھنے اور منانے کا اہتمام کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ یہ معاشرے کے لیے کسی طور نقصان کا سبب نہ بنیں۔ دنیا بھر میں نئے سال کا جشن منایا جاتا ہے مگر پاکستان میں جانے کیوں یہ لمحہ بہت سے دلوں پر قیامت ڈھا جاتا ہے۔ بھلا خوشی مناتے ہوئے انسانی جانوں سے کون کھیلتا ہے۔ فائرنگ کے شور میں، موٹرسائیکل سواروں کا سیلابی ریلا جس طرح طوفان بدتمیزی مچاتا، دندناتا ہوا گزرتا ہے۔ کیا کوئی قانون، کوئی حد بندی، کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوسکتی۔ اس کے بعد ویلنٹائن ڈے، ماہِ فروری کا خاص تحفہ...... اور نئی نسل اس تحفے سے ہر سال خوب خوب محظوظ ہوتی ہے۔ اللہ جانے یہ اونٹ کس کل بیٹھے!! بات وہی آجاتی ہے کہ ہم چیزوں کا استعمال چاہے مثبت کریں چاہے منفی اور پھر ویسے ہی نتائج بھگتنے کے لیے ہمیں تیار بھی رہنا پڑے گا۔ تیار تو ہم اپنی پیاری سی محفل میں جانے کے لیے ہیں جہاں بہت سارے دوست ہمارے منتظر ہیں۔

✠ فضا شاہ، لاہور سے خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں ''ٹائٹل گرل شادی کے سیزن کی مناسبت سے تیار شیار نظر آئی۔ مہندی کا ڈیزائن اگرچہ سادہ سا ہے تاہم اچھا لگا۔ کانوں میں ٹاپس پرانے اسٹائل کا تھا جسے شاید وہ اتارنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ انشائیہ ایلیا جی کے مخصوص انداز میں نئے سال کے حوالے سے تھا۔ ایک فقرہ جس نے دل کو چھولیا۔'' اور وہ حقیقت کیا ہے؟ جو نہ ہمارے ہونے سے چلتی ہے اور نہ ہمارے نہ ہونے سے رکتی ہے وہ سب سے بڑی حقیقت گزرتے رہنا اور گزر جانا

ہے۔'' اداریہ میں آپ نے کیڈٹ کالج میں استاد کے جارحانہ رویّے کا ذکر کیا۔ اس کا ایک اور پہلو جو زیادہ خطرناک ہے کہ ڈی سی او صاحب نے میڈیا پر آکر بیان دیا کہ ''تشدد کا کوئی واقعہ نہیں ہوا''۔ بعد میں تحقیق سے تشدد ثابت ہوا تو ان کا یوٹرن تھا کہ میرے بیان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ آپ کی ملک وملت کے لیے کی گئی دعاؤں پر دل سے آمین نکلتی ہے۔ رانا بشیر احمد وننگ پوائنٹ پر موجود تھے۔ رانا صاحب! سسپنس کی یہی تو خوبی ہے کہ ہر عمر اور طبقے کے افراد کے لیے اس میں دلچسپی کا سامان موجود ہے تبھی والد بزرگوار خود منگوا رہے ہیں ورنہ اکثر گھروں میں بچوں، خاص طور پر لڑکیوں کو پڑھنے سے روکا جاتا ہے کہ رسالے نہ پڑھیں، چاہے وہ کیبل اور انٹرنیٹ پر جو بھی دیکھتے پڑھتے رہیں۔ شیش محل کی سابقہ قسط اگر آپ میں سے کسی نے نہیں پڑھی تو رانا صاحب کے تبصرے میں خلاصہ پڑھ سکتے ہیں۔ حکیم رضا شاہ سیکنڈ پوزیشن پر براجمان تھے اور جولیٹ اور فاروق دادا کے ملن کے لیے سفارش کرتے پھرتے تھے۔ مرد، عورت کی چپقلش کو اچھے پیرائے میں بیان کیا حکیم صاحب نے۔ رمضان پاشا، زرین قمر سے شکستِ فاتحانہ کو حقیقی واقعے سے کہانی کے قالب میں ڈھالنے پر ناراض نظر آرہے تھے، بریکٹ میں ادارے کا جواب شاید ان کی تشفی کرواسکے۔ صفدر معاویہ بھائی! اسلامی فلاحی ریاست کے فرائض میں وہ سب شامل ہے جو آپ نے لکھا لیکن کیا کریں جو اسمبلیوں میں جاتے ہیں، ہم ہی انہیں بھیجتے ہیں۔ بس اپنے پیٹ کے لیے عوام کو ڈرامے دکھا کر خوش کیا جاتا رہا ہے۔ شمارے کے اختتامی صفحات پر کاشف زبیر کی آخری تحریر آخری لمحہ دیکھی تو سب سے پہلے پڑھنے کا ارادہ کیا۔ مرحوم کی اس سے پہلے بھی زندگی کے آخری لمحات پر مشتمل تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ گل پور کے اردگرد کے خوب صورت منظر کو جامعیت سے بیان کیا گیا۔ ظہیر اور سلمٰی کے مثبت کرداروں کے ساتھ ساتھ رفیق اور نورین کے منفی اثر رکھنے والے کردار حقیقی زندگی کے عکاس نظر آئے۔ یونیورسٹی کے ماحول کو فصاحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔ عالیہ کی جرأت مندی مومنہ اور دیا کی عزت وجان کے بچانے کا سامان بن گئی۔ عالیہ کی قبر کا سیلاب میں صحیح وسالم رہنا اللہ کی خوشنودی کا استعارہ تھا۔ شیش محل کی حالیہ قسط نہایت شاندار رہی اور تیزی کا تاثر اجاگر ہوا۔ بملا کی موت کے ساتھ ساتھ وکرم کی لاش کا منظرِ عام پر آنا رین دادا کی مشکلات میں اضافہ کرتا نظر آیا۔ فاروق کی لندن روانگی اور نواب اسد اللہ کی تلاش ایک ساتھ عمل پذیر ہوئی۔ ماروی میں بھی اس بار تغیر کی لہریں کروٹیں لیتی نظر آئیں۔ عابد علی منگی کو انتہائی عیاری سے ہلاک کروا دیا گیا۔ ش م جمیل کی میں کیا کروں، میں جارج کے فول پروف منصوبے کے باوجود بھی جارج بیوی کے قتل میں پھنس کر رہ گیا۔ مظہر کا منصوبہ جو اس نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کے لیے بنایا اس سے سو فیصد مماثلت نے جارج کو پھنسا دیا۔ ڈوبتگ ڈیا تنگ تو تنگ میں رائٹر نے جنگ لڑنے والے فوجی کی اندر کی جنگ کو بیان کیا ہے۔ جنگ کے دوران کیے گئے مظالم نے اس کی زندگی کو اس کے لیے ایک مستقل جنگ کے میدان میں بدل ڈالا ہے اور ضمیر کی عدالت اسے رہا کرنے پر تیار نہیں، سبق آموز تحریر تھی۔ ثمر عباس کی خوش خیالی ڈیرن لیسٹر کو لے ڈوبی۔ اپنی طرف سے اس نے مکمل احتیاط کی لیکن اس کے جوتے اسے پھنسا گئے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی اپ ڈیٹ زمان اور شازیہ کی محبت کی دلخراش داستان تھی۔ بزرگوں کی چپقلش نے دو پیار کرنے والوں کو ایک دوسرے سے محروم کردیا۔ یادوں کو اپ ڈیٹ کرنے جانے والے شاہ زمان کو کیا معلوم تھا کہ اس کی محبت اس کی شازی پہلے سے وہاں قبر میں مٹی اوڑھے پڑی ہوگی۔ انتہائی اداس کر دینے والی داستانِ محبت تھی۔ میری بات تو سنو میں گزشتہ چند ماہ پہلے بچوں کے اغوا اور ان سے میڈیا میں پھیلائی گئی سنسنی کو مغل صاحب نے موضوع بنایا۔ اچھے رائٹر کی یہی پہچان ہے کہ وہ حالاتِ حاضرہ کے موضوعات کو اپنے انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ آپا بیگم نے جو تصور اپنے ذہن میں بنایا ہوا تھا، اس کے مطابق ہی ری ایکٹ کیا جوان کا پچھتاوا بن گیا۔ مغل صاحب کا قلم درد بانٹتا نظر آیا۔ ماضی کی داستان آخری معرکہ بھی دلچسپ انداز میں تاریخ سے آگاہ کرتی ہوئی پائی گئی۔ شعر و سخن میں ظفر اقبال ظفر اور صغیر آفاق کے مختصر اشعار زبردست رہے۔ لطائف میں قابلِ غور کے نام سے شائع شدہ تراشے نے بہت مزہ دیا۔'' (آپ کا تبصرہ کافی دلچسپ رہا)

✱ ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے محفل کی رونق بنے ہیں'' سرورق ذوق کی تسکین کا باعث بنا۔ سرورق کے بعد انشائیے سے مستفید ہوئے۔ اداریے کے بعد خطوط کی دنیا میں داخل ہوئے اور رانا بشیر احمد ایاز سرفہرست نظر آئے، مبارکباد۔ سب ہی دوستوں کی حاضری بھرپور تھی۔ پھر حسبِ معمول الیاس سیتاپوری کی آخری معرکہ پڑھی جس میں بھرپور انداز میں تاریخ سے متعارف کراتے ہیں الیاس سیتاپوری کہ مزہ آجاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو طاہر جاوید مغل کے اندازِ تحریر میں کھو گئے۔ میری بات تو سنو نے بڑا مزہ دیا پھر سکونِ قلب کا بھی الگ ہی رنگ تھا۔ اس کے بعد اسما قادری کی شیش محل پڑھی جس کے بے چینی سے رہتے ہیں۔ کہانی دن بدن دلچسپ اور سنسنی خیز ہوتی جارہی ہے۔ قسط ختم ہوتی ہے تو تشنگی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ تنویر ریاض کی پلاٹ بھی اچھا تاثر دینے والی کہانی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی اپ ڈیٹ ایک منفرد انداز کی کہانی بھی بہت پسند آئی جو بیتے ہوئے ماضی کا المیہ سنا رہی تھی۔ ماضی میں پوشیدہ یادوں کا خزانہ ہوتا ہے۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل، گزرے وقتوں کا ہر رنگ نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو انسان اس میں کھو جاتا ہے جیسے وقت ٹھہر سا جاتا ہے۔ محفلِ شعر و سخن میں اشعاروں کی چاشنی نے

بھی بہت محظوظ کیا۔ میں کیا کروں بھی اچھی لگی۔ خوش خیالی میں ایک چور نے کافی دیدہ دلیری دکھائی اور جیکٹ چرالی مگر تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ گارڈ کے سامنے اس کی دلیلیں غیر موثر رہیں اور اس نے ثابت کر دیا کہ اس نے چوری کی ہے۔ اس کے بعد ضیا تسنیم بلگرامی نے حضرت عبدالقادر جیلانی غوث پاک غوث الاعظم جیلانیؒ کی حیات طیبہ کی روشنی سے دل کو منور کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔ ڈونگ ڈیانگ فونگ بھی دلچسپی سے پڑھی گئی۔ آخری کہانی کاشف زبیر کی آخری لمحہ تھی۔ ان کی تحریر تعریف کی محتاج نہیں ہوتی۔ بڑے اچھے انداز میں متاثر کرنے والی کہانی تھی۔ اقوالِ زریں معلومات وغیرہ پر مبنی کترنیں بھی ڈائجسٹ کی جان تھیں (بہت اچھا لگتا ہے جب آپ کسی کہانی یا سلسلے پر دلچسپ جملہ لکھتے ہیں)

⌘ طاہرہ گلزار پشاور سے تبصرہ کر رہی ہیں '' تمام دوستوں، رائٹرز صاحبان اور ادارے والوں کو نیا سال مبارک۔ میری دعا ہے کہ یہ سال میرے تمام دوستوں، گھر والوں، تمام مسلمانوں اور خاص کر کشمیر، فلسطین اور عراق کے مسلمانوں کے لیے مبارک اور خوشیوں بھرا سال ہو اور پاکستان کے لیے بھی یہ سال پُرامن، خوشیوں اور کامیابیوں والا ہو۔ آمین۔ 2016ء کا سال گزر گیا جس میں ہمارے پیارے رائٹرز نواب انکل، کاشف زبیر اور مختار آزاد ہم سے جدا ہو گئے۔ میری دعا ہے کہ اللہ ان کو جنت الفردوس عطا کرے اور JDP کا ادارہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کر کے تا قیامت ادب کے آسمان پر جگمگاتا رہے۔ آمین۔ جب جاسوسی کے اندر سسپنس کا اشتہار دیکھا اس میں بڑے عرصے بعد ایک ساتھ پھر تین لیجنڈ مغل اعظم، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اور میرے پیارے بھائی کاشف زبیر ایک ساتھ جلوہ گر ہوئے، بہت اچھا لگا۔ آج حسبِ عادت سسپنس 19 دسمبر شام 5 بجے ملا۔ خط شائع نہ ہوتا اور حد تو یہ کہ کالی کلوٹی ماسی مصیبتی نوکری نے بھی میرا خط قبول نہیں کیا، کیوں۔ (ہاہاہا..... اف اتنا غصہ۔ ارے بھئی ڈاک کا نظام ہے...... دیر سویر ہو ہی جاتی ہے) سرورق پہ تو انکل ذاکر ایک یرقان زدہ سی حسینہ کو لائے ہیں جو اپنے مہندی بھرے ہاتھ دکھا کے کہہ رہی تھی کہ یہ ناپس میرا ہے کہیں آپ بلقیس خان عرف بیلو کا نہ سمجھ لیں۔ میرے کچھ نادیدہ بھائی اس حسینہ کو بھی حسب عادت گھور رہے ہوں گے اور ٹھنڈی آہیں لیتے ہوں گے یہ اور بات کہ اس بار سردی نام کو ہی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ خیر کی بارش ہو جائے تاکہ یہ بیماریاں ختم ہو جائیں، آمین۔ اس بار جون ایلیا انشائیہ میں نیا سال لے آئے۔ واقعی ان کا ایک ایک لفظ ان کی دعا ہم سب کے گزرے اور آنے والے زمانے کی تشریح کر رہا تھا۔ اتنے برے اور مشکل حالات میں بھی ہم اچھی امید کا دامن تھامے چل رہے ہیں کہ کبھی تو ہمارے ساتھ بھی اچھا ہوگا۔ انکل نے ایک بار پھر نیا سال، تعلیم کے حوالے سے اپنے دل سوز الفاظ ہمارے ساتھ شیئرز کیے ہیں۔ یہی تو ہمارا المیہ ہے کہ ان 20 سالوں میں تعلیمی نظام پست ہو گیا ہے ہر جگہ سے اساتذہ کے مظالم سامنے آ رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب رشوت کے زور پہ کم پڑھے لکھے اساتذہ آئیں گے تو اس معاشرے کا یہی انجام ہوگا ہم خود ہی تو اس ملک کے معماروں کو کمزور اور ذہنی مریض بنا رہے ہیں۔ اپنی تاریخ، اسلامیات اور اردو کو کمزور کر کے غیروں کی تعلیم کو آگے ہی آگے لا رہے ہیں۔ آج کے بچے سے اگر آپ پوچھیں کہ قائداعظم اور علامہ اقبال کون ہیں تو مشکل سے ہی جواب دیں گے لیکن گوئٹے، شیکسپیئر ان کو فر فر یاد ہوں گے۔ ہم مسلمانوں اور خاص کر پاکستانیوں کے لیے شرم کا مقام ہے۔ انکل اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔ آمین...... چلتی ہوں دوستوں کی محفلِ خطوط کی طرف۔ پہلے نمبر پہ رانا بشیر احمد ایاز بہت شاندار اور تفصیلی تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ مبارکاں مبارکاں...... دوسرے نمبر پہ ہمارے سرگزشت کے بہت معتبر تبصرہ نگار حکیم سید محمد رضا شاہ آخر ہمارے بار بار کہنے کا بھرم رکھ کے اس بار حاضر۔ ویلکم رضا جی! اب غائب مت ہو جانا۔ حکیم صاحب اپنی عادت کے مطابق معاشرے پہ گہرا طنز فرما گئے۔ کورنگی والے بھائی محمد خواجہ اپنا بھرپور جامع اور تفصیلی تبصرہ لے کر حاضر۔ ایک ایک لفظ ان کی پسندیدگی کی سند، سسپنس کی کہانیوں کے لیے ویلڈن۔ شہباز بھائی ہمارے اس معاشرے میں کتنی نگینہ اور ثمینہ ہیں اور صفدر جیسے بے غیرت شوہروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ کوئی بھی ان کو ٹھیک کرنے کے لیے آگے نہیں بڑھتا۔ بابر عباس وہ بوڑھی حسینہ تھی نہیں آپ کی ہم عمر حسینہ تھی جو آپ کو یاد کر رہی تھی، آپ کی نظر کمزور ہے۔ ایک بار پھر ادارے کو ان کا کیا ہوا وعدہ یاد دلا دوں کہ نئے سال کا سسپنس بھی آ گیا لیکن آپ نے پیغمبروں والا سلسلہ ابھی تک شروع نہیں کیا۔ پلیز توجہ دیں۔ (ہمیں اپنا وعدہ یاد ہے۔ بس کچھ دن اور صبر کریں) شیش محل، بملا کی انتہا پسند طبیعت کی وجہ سے ایسا ہی ہونا تھا۔ فاروق وہاں سے خیریت سے نکل گیا۔ اختر ایک بار پھر اپنی کمینگی کے ساتھ حاضر۔ واقعی کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ رب آخر داد ہے، کس صفائی سے فاروق کو لندن بھیج دیا۔ عالیہ نے اختر کے ساتھ جو کیا بہت اچھا کیا، مر گیا، خس کم جہاں پاک۔ آخر جولیٹ نے فاروق کو محب اللہ کے نام سے پہچان لیا لیکن اب کہانی نے الگ روپ میں بڑھنا ہے۔ ویلڈن اسامہ جی...... ماروی بہت تیزی سے دیوتا ثانی بن رہی ہے۔ مختصر کہانی خوش خیالی ثمر عباس کی تحریر کچھ خاص نہیں لگی...... ضیا تسنیم بلگرامی نے اس بار تو دل خوش کر دیا غوث پاک لکھ کر۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ آمین۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر ڈونگ ڈیانگ فونگ امریکی فوجیوں کی بربریت اور بعد کے ذہنی دباؤ پر مبنی ایک اچھی تحریر...... اللہ تعالیٰ کاشف زبیر بھائی کو جنت کی خوبصورت ترین جگہ میں رکھے۔

آخری تحریر کیا شاندار تحریر، ایک ایک لفظ پہ آنسو گریں۔ اس معاشرے کا کیسا رنگ ہمیں دکھا کے گئے ہیں۔ انہوں نے عالیہ کے روپ میں ایک ایسا کردار اور واقعہ ہمارے لیے لکھ چھوڑا ہے کہ ہر سمجھ دار بندہ جو دنیا کو صرف دنیا کے طور پہ لے وہ اس کہانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور کون اس کے قریب ہے۔ وہی جانتا ہے کہ وہ زوہیب، دیا یا رفیق نہیں بلکہ عالیہ ہے جو مضبوط کردار کی مالک تھی۔ کاش ادارے والے ایک احسان اور کر دیتے کہ کہانی کے ساتھ کاشف زبیر کی تصویر بھی شائع کر دیتے۔ طاہر جاوید مغل کی سسپنس کے لیے ایک انوکھی تحریر میری بات تو سنو، ہمارا معاشرہ ہے ہی ایسا دوسروں کی نہیں سنتے، بس گزر کرتے ہیں۔ جیسے بغیر سوچے سمجھے بابا سرمد کے ساتھ کیا، ویلڈن مغل اعظم...... ایک اور تحریر اپنے فیورٹ رائٹر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی۔ اپ ڈیٹ سچی محبت پر لکھی ہوئی ایک زبردست تحریر جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ زمان اور شازی کی ناکام محبت۔ شوہر حضرات تو ہمیشہ اپنے 80 فیصد کارنامے بیوی سے چھپاتے ہیں۔ ویسے ڈاکٹر بھٹی کہیں یہ کہانی آپ کی اپنی تو نہیں؟ کچھ تھوڑے رد و بدل کے ساتھ۔ آخر آپ اتنے بڑے رائٹر ہیں، ہاہاہا...... اس بار نظر فریب میں امجد بیگ صاحب نے نادرہ کا کیس تحریر کر کے بہت دکھی کر دیا اور مردوں سے نفرت اور بھی شدید ہو گئی۔ آخر بلاکو خان کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ الیاس سیتا پوری کی تحریر سے یوں لگتا ہے کہ جیسے ابھی بلاکو خان نے ہمارے سامنے موت کو گلے لگایا...... سلیم انور کی مغربی تحریر سکونِ قلب اچھی تحریر، اچھا طریقہ سکھایا جان چھڑانے کا...... جتنے اقوالِ زریں اور مراسلے تھے، بہت اچھے اور معیاری تھے۔ اس بار کا سسپنس تو واقعی سنبھال کے رکھنے کے قابل ہے۔ ایک معیاری ہونے کی وجہ سے اور دوسرا کاشف زبیر کی آخری تحریر کی وجہ سے۔ آخر میں تمام پرانے تبصرہ نگاروں سے ایک بار پھر التجا، واپس آ جاؤ۔ جب پرندے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ وہ شاخِ گل تو اب بھی موجود ہے تو واپس اپنے ٹھکانے پہ آ جاتے ہیں آپ بھی واپس آ جائیں۔ ہم J.D.P. والے بھی ایک ہی خاندان ہیں۔ کوئی ایک بھی کم ہو تو دکھ ہوتا ہے۔'' (بہت شکریہ اتنا طویل اور بامعنی تبصرہ لکھنے کا۔ بہت اچھی لگیں آپ کی باتیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون کون آپ کی پکار پہ لبیک کہتا ہے)

✠ صادق معاویہ، خان پور، ضلع رحیم یار خان سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ''اکتوبر 16ء میں خود متعدد بیماریوں سے نبرد آزما رہا اور نومبر 16ء میں والد گرامی دل کا روگ لیے ہاسپٹل ایڈمٹ ہو گئے۔ دسمبر 16ء کا شمارہ ہاسپٹل میں ملا۔ کرسی صدارت پر پیارے بھائی صفدر معاویہ کو جلوہ فگن پایا۔ دلی خوشی ہوئی۔ اگلے ہی لمحے دل دکھ سے بھر گیا کہ آنجناب کے والد گرامی عالم بقا کو سدھار گئے۔ صفدر معاویہ بھائی یہ ایک اٹل حقیقت کہ جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے قبر کے پیٹ میں اترنا ضرور ہے۔ 8 دسمبر 16ء میرے والد گرامی بھی اس دکھ بھری دنیا میں ہمیں اکیلا چھوڑ کر دارِ بقا کو سدھار گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ (اللہ تعالیٰ آپ کے والد گرامی کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور آپ کو صبرِ جمیل دے) اب جنوری 17ء کا سسپنس زیبِ نگاہ ہے۔ اپنے ہی ضلع کے محترم رانا بشیر احمد ایاز پوری سج دھج کے ساتھ کرسی صدارت پر متمکن تھے۔ مبارکاں سائیں۔ پورے سسپنس کا احاطہ کیے مکمل اور جامع تبصرہ لائقِ تحسین ہے۔ حکیم محمد رضا، رمضان پاشا، عبدالجبار رومی انصاری، محمد خواجہ، قدرت اللہ نیازی کے تبصرے جاندار اور دلکش تھے۔ مرحا گل جیسی بہن تو باعثِ فخر ہے۔ بابر عباس، ماہین بابر کا جداگانہ انداز دل کو بھا گیا۔ صرف میری بات تو سنو، شیش محل اور پیارے کاشف زبیر کی آخری لمحہ پڑھ سکا ہوں۔ مغل اعظم نے میری بات تو سنو، ہمارے رویوں کی عکاس، دلچسپ اور پراثر تحریر تھی۔ کیا کہنے مغل اعظم کے۔ جناب! آخری صفحات پر بھی جلوہ نمائی فرمایئے۔ شیش محل کی یہ قسط انتہائی تیز رفتار تھی۔ اسما قادری جی ذرا دھیرج لگتا ہے اب شیش محل کی بساط لپٹنے والی ہے۔ پیارے کاشف زبیر کی آخری لمحہ برستی آنکھوں کے ساتھ پڑھی۔ نہایت جاندار، پرمغز، واقعتاً یادگار، پڑھ کر لطف آ گیا اور دیر تک کاشف زبیر کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہا۔''

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''اس بار سسپنس کا گیٹ اپ اچھا نہیں لگا۔ نئے سال کے پہلے ماہ کے شایانِ شان نہیں تھا، شاید پچھلے دنوں جو المناک سانحہ رونما ہوا اس کے پیشِ نظر ذاکر صاحب نے سرورق کو سنوارنے سجانے سے گریز کیا ہو۔ البتہ انشائیہ نئے سال کے موافق تھا۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے رانا بشیر احمد ایاز بھائی کو مبارکباد۔ بھائی صاحب کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ محمد خواجہ صاحب آپ کا شکریہ کہ میرے شعر کو خاص اشعار میں شمار کیا۔ نیازی صاحب تبصرہ جارحانہ؟ میرا تبصرہ جارحانہ ہوا تو سید حارودی کی ٹوکری میں جا گرے گا۔ کیوں مجھے محفل سے نکلوانے کی بات کرتے ہو۔ میری بات تو سنو، مغل صاحب کی چھوٹی کہانی اچھی لگی۔ اس میں کمزور انسان کی مظلومیت کا ذکر تو ہے مگر اغواکاروں کی سفاکی کا احوال بیان نہیں ہوا۔ کہانی سکونِ قلب بھی دلچسپ اور ٹھیک ٹھاک تھی۔ یادداشت کے بینک سے الفاظ نکال نکال کر جملے بناتا ہوں۔ شیش محل اور ماروی پر تبصرہ کرنے کے لیے اب مذکورہ بینک میں کچھ نہیں بچا، اب کیا کروں؟ پلاٹ میں وہ لطف نہیں آیا جو اس قسم کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ نظر فریب، بیگ صاحب کو کیا ہی خوب کیس ملا، عدالتی کارروائی میں خوب لطف آیا لیکن اختتام دردناک تھا۔ بھٹی صاحب کی کہانی اپ ڈیٹ نے بھی دل پر کافی اثر چھوڑا۔ خوش خیالی ثمر عباس نے ہمیشہ ہمیں اچھی کہانیاں پڑھنے کو دیں لیکن اس بار انہوں نے مایوس کیا۔ مقدس اور متبرک مضمون غوثِ پاک پر تبصرہ ان کے اختتام پر کروں گا۔ ڈونگ، ڈیانگ فونگ، شیر شاہ صاحب ایک بار پھر

عجیب اور منفرد عنوان کے ساتھ تشریف لائے۔ کہانی سچائی سے بھرپور تھی۔ میرے پسندیدہ اور محبوب قلم کار کاشف زبیر کی آخری کہانی کو آنکھوں سے لگایا اور سینے سے لگا کر ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی، پھر پڑھنا شروع کیا۔ مرحوم جاتے جاتے بھی ایسی کہانی چھوڑ گئے کہ مدتوں یاد رہے گی، ویسے بھی یہ کہانی وی اسٹوری آف دی منتھ ہے۔'' (بے شک...... پسندیدگی کا شکریہ)

✠ **عبدالجبار روی انصاری**، چونگ لاہور سے محفل کی زینت بنے ہیں ''دوشیزہ کا کیا خوب صورت انداز ہے نئے سال کی آمد پر اور نئے سال کے آنے پر اس کے استقبال کے لیے پہلے سے تیاری شروع ہو جاتی ہے اور دسمبر کی آخری رات تک جاری رہتی ہے اور نئے سال کے آنے میں صرف ایک لمحہ لگتا ہے اور اس ایک لمحے کے بعد نہ جانے کیا کچھ ہو جاتا ہے۔ آسمان گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھتا ہے اور آتش بازیاں اپنا سماں باندھ دیتی ہیں اور زمین پر جو گل کھلائے جاتے ہیں وہ الگ ہیں۔ لوگ کتنے پیسے خرچ کر ڈالتے ہیں اس ایک لمحے کے لیے۔ کاش یہی پیسے وہ اس خوشی میں کسی فلاح و بہبود کے کام لے آئیں تو کتنا اچھا ہو اور خدا کی راہ میں نیکی بھی ہو۔ لیکن اس کے لیے تو لحہ آگہی چاہیے نا۔ آخری لحہ میں عالیہ بہت اچھی لڑکی تھی جسے اس کا باپ اور وہ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے پھر باپ حادثے کا شکار ہو گیا مگر عالیہ کو جو آگہی بچپنے میں ملی تھی، وہ مختلف انداز سے آخر تک اس کے ساتھ رہی اور صنفِ نازک ہو کر کسی پل بھی اس کے قدم نہ ڈگمگائے۔ وہ پُراعتماد اور مضبوط ارادوں کی مالک تھی اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دیا اور جان تک دے دی لیکن جنہیں آگہی نہیں تھی، انہوں نے عالیہ کو اپنے قبرستان میں دفنانے سے انکار کیا تو جنگل سے ڈرنے والی عالیہ کو جنگل ہی نے پناہ دی اور اس کی قبر کو گلزار کر دیا۔ کاشف زبیر صاحب کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں رکھے۔ ان کی آخری کہانی بے حد عمدہ رہی۔ وہ ایک خوب صورت انداز کے خوب صورت رائٹر تھے ہمیشہ یاد آئیں گے۔ میری بات تو سنو، کون سنتا ان کی بات کیونکہ مارنے والے لوگوں کو آگہی جو نہیں تھی سو ایک بے گناہ اور ننھی فاطمہ کو تلاش کرنے والے بزرگ کی جان لے لی گئی۔ اپ ڈیٹ نے اینڈ پہ آ کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ شازی نے اپنی محبت کی لاج رکھی اور بچپن کی نشانی اسی برگد کے نیچے اپنی قبر بھی بنوالی۔ زمان اپنی یادوں کو اپ ڈیٹ کرنے آیا تو اسے شجر بجا کے ویلکم بھی کیا کہ آپ کی محبت بھی یہیں موجود ہے۔ نظر فریب میں کامران کو اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ نادرہ نے بھی اپنی محبت سے کامران پر اندھا اعتماد کیا جس سے خود ہی برباد ہو گئی۔ ایسی صورت میں اس نے کیا جینا تھا، سو جیل میں ہی مر گئی بیچاری۔ باقی عدنان کے لیے بیگ صاحب نے خوب بندوبست کیا۔ آخری معرکے نے ہلاکو خان کی ماں کی تدفین پر خوب ہنسایا۔ پادری نصیر الدین طوسی کو مروانا چاہتے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ مسلمان علم و فضل سے ان سے بڑھ کر ہے، سو ہلاکت انہی کے گلے پڑ گئی۔ ایک عام سے آدمی تردی نے بادشاہوں کے دل میں خوب جگہ بنائی۔ ان کے کردار نے بہت محظوظ کیا۔ ہلاکو خان برقائی کو زہر دینا چاہتا تھا لیکن اس کو ہی زہر مل گیا۔ الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانیوں کا اپنا ہی مزہ ہے۔ فاروق بھی محب اللہ کی صورت شہزادہ نکلا جو لندن جا رہا ہے اور اسد اللہ کو نہیں مل سکے گا۔ زین کا فاروق کو نہ چاہتے ہوئے بھیجنا ایسا لگ رہا ہے جیسے فاروق کو نہیں خود زین کے ساتھ کچھ انہونی ہونی والی ہے اور پھر ان کی آنے والی قسطیں دل تھام کے پڑھنا ہوں گی۔ شیش محل نے عجیب سا تجسس قائم کر لیا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، ان کو کون نہیں جانتا، جو مہمان بننے کے لیے انتہائی غریب گھرانے کا انتخاب کرتے ہیں۔ آپ اپنے عہد کے عظیم ولی تھے جن کے وعظ پر ہزاروں لوگ بعد شوق امڈ آتے تھے۔ خطوط کی محفل میں بھی قارئین نے خوب رنگ جمایا جن میں رانا بشیر احمد ایاز، حکیم سید محمد رضا شاہ، رمضان پاشا، محمد خواجہ، بابر عباس، ماہین بابر اور رضوانہ قریشی نے بھرپور اور عمدہ تبصرہ نگاری کی۔ شعروسخن میں طلحہ کمال، شاعظیم اور نگہت علی چھا گئیں۔''

✠ **محمد شہباز ناز**، گجر کالونی، سرگودھا سے تبصرہ کر رہے ہیں ''ٹائٹل گرل دیکھنے میں جتنی خوب صورت ہے، خاص کر اس کی ہاتھوں کی مہندی، باریک ناک اس کے حسن میں اضافہ کر رہی ہے۔ اللہ کرے نیا سال بھی ہمارے لیے اتنا ہی خوب صورت ثابت ہو۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا، ہمیشہ کی طرح دانش مندانہ باتیں کی۔ اس کے بعد مرزا امجد بیگ کی کہانی نظر فریب پڑھی، جس میں نادرہ کا شوہر دھوکے باز نکلا۔ اس کا سارا مال، کوٹھی، پیسہ سب کو بیچ ڈالا اور فرار ہو گیا جس کی وجہ سے نادرہ کا ذہنی توازن خراب ہو گیا غصے میں اپنے شوہر کو مار ڈالا۔ بیگ صاحب نے بڑی مہارت سے اس کو پھانسی لگنے سے بچالیا۔ اچھی کہانی تھی۔ اس کے بعد عبدالرب بھٹی کی کہانی اپ ٹو ڈیٹ پڑھی جس میں بھٹی صاحب نے اپنی لو اسٹوری کے بارے میں بتایا۔ یہ محبت بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے جس کو لگ جائے وہ مرتے دم تک یاد کرتا ہے۔ عمدہ تحریر تھی۔ اسما قادری صاحبہ کی کہانی شیش محل پڑھی۔ بہت ہی دلچسپ تھی! خاص کر زین دادا کا کردار۔ محب اللہ عرف فاروق لندن کے لیے روانہ ہو جائے گا یا پھر پکڑا جائے گا۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ ش م جمیل کی کہانی کیا کروں پڑھی جس میں دو دوستوں نے ایک ہی رات اپنی اپنی بیوی کو مارنے کا پروگرام بنایا اور کسی کو پتا بھی نہ چلا، اچھی تحریر تھی۔ طاہر جاوید مغل کی کہانی میری بات تو سنو بہت ہی دکھی کہانی تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی غوث پاک کی زندگی کے حوالے سے تحریر لے کر آئے۔ واقعہ پڑھ کر دل کو سکون آ گیا۔ کاشف زبیر کی کہانی بہترین تھی۔ تمام دوستوں کے تبصرے بہت اچھے تھے دعا گو ہوں اللہ پاک اس محفل کو اسی طرح آباد و شاد رکھے آمین۔''

✲ **محمد صفدر معاویہ،** خانیوال سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "جنوری 2017ء پہلا شمارہ 18 کو خانیوال میں ملا۔ سرورق کو ایک خوب صورت اور دلربا ماڈل سے سجایا گیا۔ سال پر لگا کر گیا۔ فروری کا سسپنس ملے گا تو نواب صاحب اور کاشف زبیر کو سال گزر جائے گا۔ آہ کیسی کیسی ہستیاں ہم کو چھوڑ کر اپنی حقیقی منزل کی مسافر ہوئیں جہاں ہم سب نے جانا ہے۔ جون ایلیا کے پاس پہنچے، اب ہمیں نئی امیدوں اور نئی تمناؤں کے ساتھ نئے جذبے کے ساتھ گنگنانا چاہیے تاکہ جمہوریت زندہ رہے۔ پاکستان تابندہ رہے، نئے سال پر بہت خوب صورت تجزیہ کیا۔ آپ کا اداریہ پڑھا، میں آپ کے ہر لفظ کی تائید کرتا ہوں اور آپ کی اچھی باتوں کے لیے دعاگو بھی ہوں۔ اپنوں کی محفل میں آیا تو رانا بشیر احمد ایاز کو کرسیٔ صدارت پر بہترین تبصرے کے ساتھ موجود پایا۔ مبارکاں ہوں جی۔ محمد خواجہ صاحب بھی اپنے تبصرے کے ساتھ محفل پر چھائے ہوئے تھے۔ کہانیوں میں بات ہو جائے پہلے ہماری ہر دلعزیز شخصیت محترم جناب محمد کاشف زبیر مرحوم کی۔ کیا اب ہم کو کاشف زبیر کی کوئی تحریر پڑھنے کو نہیں ملے گی؟ دل ڈوب سا گیا۔ آخری لمحہ بہت ہی خوب صورت تحریر تھی۔ عالیہ کی ثابت قدمی نے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں کر دی کہ اگر انسان خود پختہ کردار اور اعصاب کا مالک ہو تو کوئی گناہ اس کے دامن کو داغدار نہیں کر سکتا، نہ ہی اس کے قریب آ سکتا ہے اور تحریر میں لڑکیوں کی تعلیم کو بہترین طریقے سے اجاگر کیا گیا۔ اللہ کاشف زبیر کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ الیاس سیتاپوری کی آخری معرکہ پڑھی۔ ہلاکو خان کو موت کا پیالہ پینا پڑا۔ لاکھوں انسانوں کو دہشت زدہ کرنے والا خود موت کی دہشت برداشت نہ کر سکا۔ طاہر جاوید مغل کے قلم سے میری بات تو سنو حقیقت میں رونے پر مجبور کر گئی۔ واقعی میڈیا تھوڑی سی بات کو بتنگڑ بنا کر پیش کرتا ہے جس سے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ سلیم انور کی سکونِ قلب بھی اچھی رہی۔ شیش محل کی یہ قسط بہت ہی دھواں دار رہی۔ فاروق اصل محب اللہ، نواب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ نواب صاحب رحلت فرما گئے تو وہیں اختر کی موت، خس کم جہاں پاک والی بات ہے۔ ربن واوا کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تنویر ریاض کی چلاٹ میں نکول نے یاور سے اچھا بدلہ لیا، مرزا امجد بیگ کی ڈائری سے نظر فریب آئی جس میں محبت کے نام پر کھلواڑ کیا کامران نے نادرہ کے ساتھ کہ اس کی روح تک کو زخمی کر دیا۔ پر بیگ صاحب نے نادرہ کے لیے بہت خوب صورت انداز میں مقدمہ لڑا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی اپ ڈیٹ بھی بہت خوب صورت تحریر رہی۔ محفل شعر و سخن بھی اچھی رہی۔ میں کیا کروں..... جارج کو بہت صفائی سے کیا گیا قتل گلے پڑنے والا ہے کہ منگری نے اس کے ہی طریقۂ واردات سے اپنی بیوی کو ٹھکانے لگایا۔ ماروی میں آئے تو عابی کی موت کا دکھ لے بیٹھا اتنی جلدی عابی چلا گیا۔ اب وہ کردار شاید دانش ادا کرے۔ شہر عباس کی خوش خیالی بھی عمدہ رہی۔ حضرت محبوب سبحانی عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں پڑھ کر دل کو سکون حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عبادت و ریاضت کے بدلے میں مقام ہی ایسا اونچا عطا کیا تھا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ڈوونگ ڈیانگ فونگ میں امریکی فوجیوں کے کالے کرتوت عیاں کرتے نظر آئے۔ مجموعی طور پر ڈائجسٹ عمدہ رہا، کترنیں بھی اچھی رہیں۔" (آپ کی پسندیدگی کا شکریہ)

✲ **محمد انعام،** لودھراں سے تبصرہ کر رہے ہیں "کئی ماہ غیر حاضر رہا جس کی وجہ پڑھائی میں مصروفیات ہیں۔ کسی بھی دوست نے بھول کر بھی یاد نہیں کیا۔ اس لیے دوستوں کے خطوط کا بائیکاٹ کرتے ہوئے سیدھا شیش محل میں پہنچ گئے جہاں پر بہت سے انکشافات ہو رہے ہیں۔ جولیٹ کو حقیقی باپ کی محبت کے ساتھ محب اللہ بھی مل گیا اور فاروق خیریت سے لندن پہنچ جائے گا جس کا اصل مقصد لندن میں انتقام لینا ہے۔ اس کے بعد آخری معرکہ پڑھی۔ جہاں ظالم بادشاہ ہلاکو خان کا سورج ہمیشہ کے لیے ظلم کی داستان کے ساتھ غروب ہو گیا۔ تروی کے حالات زبردست تھے۔ تروی ہلاکو خان اور برقائی خان کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔ برقائی خان کا قتل ناکام ہوا۔ اس کے بعد آخری لمحہ پڑھی جس نے مرحوم کاشف زبیر کی یاد تازہ کر دی۔ بڑی مزے دار کہانی تھی۔ عالیہ نے یونیورسٹی میں اپنا مقصد صرف پڑھائی کو رکھا۔ اس لیے مسلسل پانچ سمسٹر میں ٹاپ کرنے والی پہلی طالبہ بن گئی۔ دوسروں کی عزت بچانے کی خاطر جان دے دی لیکن اس کی بے گناہی ثابت نہ ہوئی جبکہ سیلاب نے عالیہ کی بے گناہی ثابت کر دی۔ نظر فریب دلچسپ اور سبق آموز کہانی۔ کسی کا اعتبار اور محبت کا قتل کرنے سے انسان زندہ لاش بن جاتا ہے۔ کامران نادرہ کے ہاتھوں ہی انجام کو پہنچا جبکہ بیگ صاحب نے اپنی قابلیت کے بل بوتے سزا تو کم کرائی لیکن نادرہ جو کہ زندہ لاش تھی، سزا پورے ہونے سے پہلے خالقِ حقیقی سے جا ملی۔ غوث پاک حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے حالاتِ زندگی پڑھ کر ایمان کو تقویت حاصل ہوئی۔ آپؒ کی زندگی کے حالات

انتقالِ پُرملال

2017ء کی ابتدا ہوتے ہی ایک اور کہنہ مشق قلم کار ہم سے بچھڑ گیا۔ 4 اور 5 جنوری کی درمیانی شب کہانی لکھتے لکھتے سلیم فاروقی کی طبیعت اچانک بگڑی اور وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادارہ مرحوم کے پس ماندگان کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔ ہماری دعا ہے کہ باری تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا کرے۔ آمین۔

ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ میری بات تو سنو میں غلط فہمی سے ایک جان چلی گئی۔ اپ ڈیٹ دل کو غمگین کر گئی۔ دو محبتیں بچھڑنے کی وجہ خاندانی اختلافات تھے۔ اگر شازی بیرون ملک میں اپنی اولاد کی اچھی پرورش کرتی تو وہ اسے شیلٹر ہوم میں نہ ڈالتے۔ میں کیا کروں، میں جارج اگر وقت پر پولیس کو اطلاع دے دیتا تو شاید مشکل حل ہو جاتی۔ ہنگری وقت پر پولیس کو اطلاع دے کر بیوی سے چھٹکارا پانے کے ساتھ جیل کی سلاخوں سے بچ گیا۔ باقی شمارہ زبردست تھا۔''

✠ **محمد خواجہ**، کورنگی، کراچی سے شریکِ محفل ہیں ''جنوری 2017ء کا شمارہ، سرورق حسب معمول ایک دوشیزہ اپنے حنائی ہاتھ سے کان کی خوب صورت بالی کو ٹھیک کر رہی ہے یا نمائش۔ ہر نئے سال پر ہم سب کو مبارکباد دیتے ہیں اور اس کے مبارک ترین ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ ساری مبارکبادیں امراء اور سیاستدان لے جاتے ہیں اور ہم عوام یاس امید، پریشانیاں چہروں پر سجا کر یہ سال بھی خندہ پیشانی سے گزار دیتے ہیں۔ اس دفعہ تو میڈیا نئے سال کے لیے بڑی تباہ کن پیش گوئیاں سنا رہا ہے۔ یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا۔ کسی بھی خبر میں کوئی خوشگوار تاثر نہیں دیا جا رہا ہے۔ اللہ ہمارے حالوں پر رحم کرے۔ جب جب انسان بے بس ہو جاتا ہے، خدا کی قدرت جوش میں آتی ہے۔ یا اللہ ہمارے ملک کی کشتی کو ہر طوفان سے بچا کر کنارے پہنچا دے۔ آمین۔ انشائیہ میں نئے سال، زمانے اور لوگوں کے لیے انتہائی فلسفیانہ تحریر لکھی ہے۔ سب کچھ اس میں سمو دیا ہے۔ آخر میں نیک تمنائیں اور خواہشات کا اظہار بھی کیا۔ ہم سب کی دعا ہے اللہ قبول کرے۔ کرپشن اور جھوٹ اگر ختم ہو جائے تو ہم کو اپنا خواہشوں سے جگمگاتا پاکستان مل جائے گا۔ خطوط کی محفل رنگارنگ تبصروں اور خیالات کا مجموعہ۔ رانا بشیر احمد کا خط کرسیِ صدارت پر مبارک ہو۔ بڑی تفصیل اور بہت دلجوئی سے تحریر کیا ہے۔ تفصیل سے ہر ہر چیز پر عمدہ تبصرہ۔ واہ۔ رمضان پاشا بہت مختصر تحریر کرتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے وہ اشعار زیادہ شوق سے لکھتے ہیں۔ تمام دوستوں کو نیا سال اچھا سال بننے کی مبارکباد۔ آخری معرکہ، الیاس سیتاپوری کی ہر تاریخی کہانی اتنی عمدہ ہوتی ہے کہ ہم زمانۂ قدیم میں چلے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک نکتے کو سنوارتے ہیں۔ جتنی تعریف کروں کم ہے۔ کہانی میں تردی کے کردار کو بہت اہمیت ملی ہے۔ میری بات تو سنو، ایک تمناؤں کی جستجو میں کمزور انسان کی رلا دینے والی داستان۔ کاش کوئی تو اس کی بات سنتا۔ یہ وہی عوام ہے جو غصے میں بھی شرارت میں گاڑیوں پر پتھراؤ کرتے ہیں، چاہے گزرنے والے کا قصور ہو یا نہیں۔ ایسے واقعات ہم روز ہی دیکھتے ہیں۔ سکونِ قلب، یورپ کی عجیب کہانی۔ جہاں عورت کی اپنی زندگی اور مرد کی اپنی۔ ساتھ ہیں مگر ایک دوسرے سے بیزار۔ مرد نے بڑی ذہانت دکھائی۔ کیوں عورت نے ہی اس کو موقع فراہم کیا اور مرد نے فائدہ اٹھا کر عورت سے جان چھڑائی وہ یورپ کا ماحول۔ مشرق میں عورت مرد کے لیے اور مرد اپنی بیوی کے لیے زندگی قربان کر دیتے ہیں۔ اس کو عزت اور خوشیاں دینے میں زندگی بھر ہر جبر اور مشقت کو اٹھا لیتے ہیں۔ شیش محل، شمارے کی شاہکار داستانوں میں سے ایک۔ مصنفہ کی گہری معلومات اور لکھنے کا فن۔ تانے بانے کو جوڑنا، مختلف کہانیوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ مصنفہ اب ربن کو آخری انجام تک پہنچانا چاہتی ہیں۔ پلاٹ، ایک پیچیدہ اور بے مزہ کہانی۔ شاید میری ہی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ (یقیناً یہی ہوا ہوگا) نظر فریب، وکیل صاحب کی لاجواب تحریر، کارنامہ۔ یوں تو وہ ہمیشہ ہی بازی پلٹ دیتے ہیں لیکن اس دفعہ انہوں نے واقعی قتل کی مجرمہ کا کیس لڑا اور بہت معمولی سزا پر اس کی جان چھڑائی۔ واقعی اگر مرزا امجد بیگ نہ ہوتے تو وہ خاتون سیدھے تختۂ دار پر پہنچ چکی تھیں۔ اپ ڈیٹ، اس ماہ کا ایک شاہکار۔ دلدوز داستان۔ واقعی دل میں تیر کی طرح پیوست ہونے والی کہانی۔ ایک محبت کی انتہا۔ یادداشت کو تازہ کرنے کے عزم نے اس کو دکھوں سے بھر دیا۔ ایک محبت کو زندہ رکھنے والی نے زندگی نچھاور کر دی۔ اگر وہ شخص یادداشت کو تازہ کرنے نہ پہنچتا تو قیامت تک اس محبت کو محسوس نہ کرتا۔ یہ شمارے کی بہترین کہانی کہلانے کی مستحق ہے۔ میں کیا کروں، جرم کی دنیا میں قدم رکھنے والے لوگوں کی کہانی۔ ایک ہی وقت میں دو آدمیوں نے ایک ہی ڈرامہ رچایا، وہ بھی ایک رسالے کو پڑھ کر۔ ڈرامے میں اتنی مماثلت تھی کہ بازی جیت کر بھی ہار ہو گئی۔ خوش خیالی، بچے کی خواہش اور جرم کی کہانی۔ جرم کو چھپانے اور چوری کرنے والے کا کتنا خوب صورت انجام۔ ساری چالاکی دھری کی دھری رہ گئی۔ غوث پاک، بڑی ایمان افروز کہانی۔ کئی بار پہلے بھی پڑھ چکا ہوں مگر آج پھر مزہ آیا۔ ایمان زندہ ہو گیا۔ کیا اللہ تعالیٰ کی عظیم ہستیاں۔ کاش ایسی ہستی ہمارے دور میں بھی اللہ بھیج دے تو زندگی کی مشکلات پھولوں میں تبدیل ہو جائے۔ آمین۔ آخری لمحہ، کاشف زبیر مرحوم کی آخری کہانی ایک سوغات تھی۔ حالانکہ یہ کہانی بہت طویل تھی۔ زمینداروں سے شروع ہو کر اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے تمام حالات۔ بہرحال کاشف زبیر خدا حافظ، اللہ آپ کی مغفرت کرے۔ آپ نے بہت سی اچھی کہانیوں سے ہم بہت سوں کو بہت کچھ دیا۔ آمین۔ محفل شعر و سخن بہترین اشعار کا مجموعہ دیا۔'' (آپ کے تبصرے کا بہت شکریہ...... جہاں تک آخری کہانی سے متعلق آپ نے تحریر کیا۔ واضح کر دیا جائے کہ آپ کا خیال حقیقت پر مبنی نہیں ہے)

✠ **بابر عباس، فضل عباس**، ملکیانہ روڈ، کھاریاں سے بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں ''سرجی سسپنس کا نیا شمارہ جو کہ جنوری 2017ء کا پہلا شمارہ تھا اپنے غیر فطری سرورق کے ساتھ اس طرح ملا جیسے موٹو دے پولیس کو جرمانے کے لیے کوئی بے وقوف سا

سادہ سا ڈرائیور لگتا ہے۔ سرورق کی حسینہ شاید کوئی نشہ کر کے آئی تھی اس لیے کچھ حواس باختہ سی نظر آرہی ہے۔ ذاکر صاحب سے یہ امید نہ تھی۔ سرجی اس سے پہلے کہ مزید کچھ لکھوں، آپ کو بتاتا چلوں 24 دسمبر بروز ہفتہ شام 6:20 پر رب کائنات نے میری ذات پر اپنی رحمت کی بارش کرتے ہوئے اپنے خزانے سے مجھے ایک انمول ہیرا عطا کیا ہے یعنی مجھے بیٹا عطا فرمایا ہے جس کا نام میں نے فضل عباس رکھا ہے۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک کرے اور اس بچے کو صحت و سلامتی اور لمبی عمر دے۔ مٹھائی کہاں ہے جی!) فہرست کو بالکل اس طرح چیک کیا جس طرح آج کل ہمارے جج صاحبان پاناما کیس کو چیک کر رہے ہیں۔ میں یہی دیکھ رہا تھا کہ ہمارے سسپنس کے کسی رائٹر نے کرپشن تو نہیں کی مگر ماشاء اللہ ہمارے سارے رائٹر کرپشن سے پاک نکلے۔ یہ اپنے معراج رسول صاحب کی خاص مہربانی کا نتیجہ ہے۔ جون ایلیا مرحوم کے بارے میں میں بھلا کیا کہوں۔ دریا کو کوزے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ جون ایلیا صاحب ایک درویش صفت انسان تھے، اپنی تمام باتوں کا نچوڑ ہمیں دے گئے۔ نیا سال بھی گزر جائے گا پھر نیا سال آئے گا۔ سرجی نہ کیا کریں تلخ باتیں، ان باتوں کا کسی پر اثر نہیں ہوگا۔ ہمارا تعلیمی معیار کیا ہے، ہم کہاں کھڑے ہیں، یہ سب سوچنا ہمارے حکمرانوں کا کام ہے۔ وہی نہیں سوچ رہے۔ اس بار کرسی صدارت ہم پر بڑا احسان کرتے ہوئے احسان پورے اپنے چن ماہی رانا بشیر احمد ایاز صاحب نے سنبھالی، کرسی صدارت سنبھالتے ہی رانا صاحب نے کمی کمی کرنا شروع کر دی۔ واہ جی وا! اس بار تو اپنے حکیم رضا صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔ اپنے خمیرہ گاؤزبان وغیرہ بنانے کر حکیم صاحب خوش آمدید۔ محمد زبیر ساگر صاحب یہ ہماری پیاری سی محفل بڑی خوب صورت اور کھٹی میٹھی ہے۔ یہاں کوئی کسی کو یاد نہیں رکھتا۔ یہاں جو بندہ متواتر آئے اسی کی جے جے کار ہوتی ہے، باقی سسپنس والوں کو بددعائیں نہ دیں۔ سرجی! حسب معمول دی گریٹ رائٹر ویری موسٹ سینئر رائٹر لفظوں کے بے تاج بادشاہ ورلڈ ریکارڈ ہولڈر سسپنس کی شان ہماری جان نواب صاحب کی ماروی پڑھی۔ نواب صاحب کی ہر تحریر بول کے ہمیں کہتی ہے، مجھے پڑھو اور مجھ پھر بتاؤ میں کیا ہوں۔ بس ماروی کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کاش نواب صاحب زندہ ہوتے۔ آخری صفحات پر ایک زبردست اور خوب صورت رائٹر کی خوب صورت اور پیاری تحریر، آخری لمحہ کاشف بھیا کی ایک معیاری اور دلوں میں اترنے والی تحریر کہانی نے سطر سطر ہمیں یہی احساس دلایا کہ کاشف بھائی ابھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ یقین کریں سرجی بڑے دکھی دل کے ساتھ پڑھی۔ جمود طاری کرتی ہوئی شیش محل اسما قادری صاحبہ سے التجا ہے کہ اگر کہانی کو بوریت سے بچانا ہے تو منظرنامے کو ذرا چھوٹا کریں کہ میں سانس لینے کے لیے رکا اور پھر حسام بٹ صاحب کی تحریر کردہ مرزا امجد بیگ صاحب کی نظر فریب کو فریبی نظر سے دیکھا۔ وہی سب کچھ، وہی ہوا اور بیگ صاحب کیس جیت گئے، ونڈرفل بٹ صاحب۔ سرجی چونکہ باقی کی کہانیاں ابھی پڑھنی ہیں، یہی کہہ سکتا ہوں معیاری اور اچھی ہوں گی۔ سسپنس کے عین مطابق۔'' (بہت شکریہ)

✠ **عبداللہ بدلی شریف**، رحیم یار خان سے اس ماہ کا مختصر ترین تبصرہ لے کر حاضر ہیں ''سال 2017ء کا ابتدائی شمارہ اپنی رنگینیوں سمیت وسط دسمبر میں ہی مل گیا۔ اداریہ میں کی گئی تلخ باتوں کو اللہ رب العزت، خوش گوار باتوں میں تبدیل فرما دے اور آپ کی باتوں کو قبولیت کا درجہ عطا فرمائے۔ نئے سال کا شمارہ بہت ہی پُراثر تھا۔ خصوصاً آخری صفحات پر کاشف زبیر مرحوم کی تحریر نے انمٹ نقوش چھوڑے۔ گزارش ہے کہ ناہید سلطانہ اختر کی معاشرتی زندگی پر پُراثر تحریر ہر ماہ دیا کریں۔''

✠ **ذیشان خان**، بونیر سے محفل میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہے ہیں ''سسپنس کی بارونق محفل میں پہلی بار گھسنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لہٰذا مدیراعلیٰ صاحبہ اور نگران اعلیٰ صاحب سے گزارش ہے کہ مجھے محفل میں جگہ دیں۔ (اگر آپ گھسنے کے بجائے شرافت سے بھی آتے تو ہم آپ کو خوش آمدید کہتے) سسپنس اس بار 23 کو ملا۔ اگر سرورق پر تبصرہ کیا تو ذاکر صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ خیر محفل میں رانا بشیر بھائی کو کرسی صدارت پر دیکھا۔ بہت بہت مبارک ہو بھائی۔ دوسری سیٹ پر حکیم رضا...... مجھے تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ رمضان پاشا کا تبصرہ بہت خوب صورت رہا۔ عبدالجبار بھائی اور صفدر معاویہ بھائی آپ دونوں کا تبصرہ تو میں شیش محل سے بھی پہلے پڑھتا ہوں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ کہانی بے حد دلچسپ موڑ پر آ گئی ہے۔ بہت خوب اسما قادری صاحبہ۔ ماروی میں عابی کی موت۔ بہت برا ہوا، خیر دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ آخری معرکہ الیاس سیتاپوری صاحب کی بہت ہی اچھی تحریر تھی۔ میری بات تو سنو، طاہر جاوید مغل صاحب کی اس تحریر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آخری لمحہ، کاشف زبیر صاحب کی آخری تحریر۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ منظر امام صاحب سے گزارش ہے کہ کوئی اچھی سی تحریر لے کر آئیں۔'' (منظر صاحب تو ہمیشہ ہی اچھی تحریر لے کر آتے ہیں...... آپ کو کس بات پر اعتراض ہے......؟)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

: امتیاز احمد، منڈی بہاؤالدین۔ جنید احمد ملک۔ کراچی۔ اطہر حسین، کراچی۔ محمد اقبال، کورنگی، کراچی۔ جہانزیب احمد، لاہور۔ احمد خان، پشاور۔ اعجاز احمد، سیالکوٹ۔ یحییٰ رحمان، نامعلوم مقام۔ اورنگزیب، ایبٹ آباد۔

شام و سحر

الیاس سیتا پوری

زمین پر ایک فاتح کی حیثیت سے طویل عہد گزارنے والی منگول قوم... جس کے اتحاد نے نہ صرف اسے عروج بخشا بلکہ اس کا وحشیانہ انداز اس کی سرکشی میں بھی اضافے کا سبب بنتا چلا گیا... لیکن عقلمندوں کے لیے اشارہ ہے کہ رات کا ڈھلنا، صبح کا نکلنا اور... پھر سے صبح کا رات میں ڈھل جانا اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ نہ دن ہمیشہ رہتا ہے اور نہ رات... جیسے جیسے کمزوریاں اور برائیاں بڑھتی جاتی ہیں بالکل رات کے مانند سیاہی میں لپٹتے لپٹتے بالکل ختم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب منگولوں کا ظلم اور مفاد آپس میں نفاق کا باعث بنا تو تنزلی نے اپنے پر پھیلانے شروع کر دیے اور بنا آہٹ کے زوال نے ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ بالآخر آج تاریخ کے صفحات ہمیں ایک اور ہی داستان سناتے ہیں۔ داستانوں کا سننا اور پڑھنا بے شک ایک الگ لطف دیتا ہے مگر... سیکھنے والوں کے لیے بہت سا عبرت کا سامان بھی ملتا ہے... تو ہے کوئی جو ماضی سے اپنا حال درست کرنے کا گُر سیکھے اور اپنا مستقبل محفوظ کر لے!

ماضی کا آئینہ، با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات





ارغون فاتحانہ شان سے مراغہ میں داخل ہوا۔ اباقہ خان اور ولی عہد نکودار نے اس کی شاندار پذیرائی کی۔ اباقہ خان ترمہ شیریں سے ملنے کے لیے بے چین تھا لیکن وہ اپنی اس بے چینی کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اباقہ خان نے شہزادہ ارغون کو گھوڑے سے اتار لیا اور اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے اسے شاباشی دی۔ ''ارغون! میں تجھ پر فخر کرسکتا ہوں۔ تجھ میں سوبدائی بہادر جیسی دوراندیشی اور میرے باپ ہلاکو جیسی بہادری پائی جاتی ہے۔ ترمہ شیریں کہاں ہے؟''

ارغون اپنی تعریف سن کر آڑا ترچھا ہو گیا، بولا۔ ''میں نے سونجاق کو وہ سبق دیا ہے کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ رہی ترمہ شیریں، تو اب وہ آپ کے کس کام کی۔ کیونکہ میں نے سنا ہے شیر کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا۔''

اباقہ خان نے ارغون کو ایسی نظروں سے گھورا، گویا وہ ارغون کے جواب سے بہت برہم ہے، اس نے پوچھا۔ ''ارغون! آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

ارغون نے جواب دیا۔ ''ترمہ شیریں کو شہزادہ سونجاق نے جھوٹا کر دیا ہے۔ اب وہ آپ کے کسی کام کی نہیں رہی۔''

اباقہ خان نے طیش میں کہا۔ ''لیکن میں انسان ہوں، جانور نہیں۔ ہمارے جدِاعلیٰ چنگیز خان کی بیوی بورتے کو دشمن قبیلے نے اغوا کر کے دو سال تک اپنے پاس رکھا تھا، پھر جب چنگیز خان نے بورتے کو دوبارہ حاصل کر لیا تو اس کے کسی عزیز رشتے دار نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ شیر کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا، اس نے بورتے کو بھی رکھا اور اس کے ناجائز بیٹے جوجی کو بھی پیار محبت سے پالا اور جب وہ جوان ہو گیا تو روس کی حکومت اس کے حوالے کر دی۔ کیا میں اپنے جدِاعلیٰ چنگیز خان کی اتباع نہ کروں؟''

ارغون لاجواب ہو کر چپ ہو گیا۔ اباقہ خان نے پھر سختی سے پوچھا۔ ''ترمہ شیریں کہاں ہے؟''

ارغون نے پژمردگی سے جواب دیا۔ ''پدرِ محترم! آپ خاطر جمع رکھیں۔ ترمہ شیریں آپ کو مل جائے گی۔''

نکودار نے اپنا تیر چلایا۔ عرض کیا۔ ''پدرِ محترم! بھائی ارغون، ترمہ شیریں کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے ہیں۔''

اباقہ خان نے غصے میں ادھر ادھر ٹہلنا شروع کر دیا اور سپاہ کو حکم دیا۔ ''ترمہ شیریں کو برآمد کر کے میری خدمت میں پیش کیا جائے۔''

شہزادہ ارغون نے ناگواری سے منہ بنایا اور کہا۔ ''والد بزرگوار! آپ عجلت نہ کیجیے اور ترمہ شیریں کو میرے پاس ہی رہنے دیں۔''

اباقہ خان نے بحالتِ برہمی حکم دیا۔ ''ارغون! ترمہ شیریں کو میرے حوالے کر دے۔''

شہزادہ ارغون ڈر گیا، وہ تھوڑی دیر کے لیے کہیں چلا گیا اور جب وہ واپس آیا تو ترمہ شیریں اس کے ساتھ تھی۔ اس کو دھکا دے کر اباقہ خان کے سامنے گرا دیا، بولا۔ ''سنبھالیے اپنی ترمہ شیریں کو...... مگر والد بزرگوار! میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ ترمہ شیریں کو قبول کر لینا آپ کے شایانِ شان نہیں۔''

اباقہ خان نے ترمہ شیریں کو سنبھال کر اٹھایا اور پھر پھرتی سے بڑھ کر ارغون کو گدی سے پکڑ لیا۔ ''گستاخ لڑکے! ذرا سی کامیابی نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔'' اس نے ولی عہد نکودار کو حکم دیا۔ ''ارغون کو قید کر دیا جائے۔''

لیکن نکودار نے ارغون کی حمایت کی، بولا۔ ''پدرِ محترم! ارغون جذباتی نوجوان ہے، اسے ایک بار معاف کر دیا جائے۔''

اباقہ خان نے نکودار کو بھی ڈانٹ دیا۔ ''اگر تو بھی میری نافرمانی کرے گا تو میں کسی اور کو ولی عہد بنا دوں گا۔''

نکودار چھ نامور سرداروں کو لے کر ارغون کی طرف بڑھا اور ارغون کے کان میں کہا۔ ''ارغون! میں مجبور ہوں لیکن میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تیرے ساتھ زیادتی نہیں کروں گا، میں تجھے گرفتار کرتا ہوں۔''

نکودار نے ارغون کی کمر میں بندھی ہوئی پیٹی کھلوا کر اپنے قبضے میں کی اور اس کے خنجر اور پیش قبض کو ایک سردار کے حوالے کر دیا، بولا۔ ''اس کو احتیاط سے رکھنا، یہ ایک شہزادے کی امانت ہے۔''

ارغون کو محل کے ایک حجرے میں قید کر دیا گیا۔ ترمہ شیریں نے اس سارے واقعے کو دلچسپی سے دیکھا اور منہ پھیر پھیر کر مسکراتی رہی۔ جب ارغون کو قید خانے میں ڈال دیا گیا تو ترمہ شیریں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''افسوس کہ اس کی ساری محنت اکارت گئی، اب اس کا کیا ہو گا؟''

لیکن اباقہ خان ترمہ شیریں کو جواب دیے بغیر محل میں چلا گیا۔ ترمہ شیریں اس کے ساتھ تھی۔ یہاں اس کو چند نئی لڑکیاں نظر آئیں...... ترمہ شیریں نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ان جیسی اور کتنی لڑکیاں محل میں آ چکی ہیں؟''

اباقہ خان کی ذہنی کیفیت بگڑ چکی تھی۔ وہ ترمہ شیریں پر بگڑ گیا۔ ''آخر یہ تم لڑکوں کو ہو کیا گیا ہے؟ ترمہ شیریں! میں

ایل خان ہوں، تم سب کا حکمران۔ میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں پھر تو نے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا کہ ان جیسی اور کتنی لڑکیاں محل میں آچکی ہیں؟''

ترمہ شیریں بھی سہم گئی، بولی۔ ''مجھ پر رحم کردیجیے۔ میں معافی چاہتی ہوں۔''

اباقہ خان نے بدستور درشت لب ولہجے میں کہا۔ ''میں نے تجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ تو سونجاق کے ساتھ کیوں چلی گئی تھی اور میں نے تجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تو سونجاق کے علاوہ کس کس کے پاس رہی۔ میں نے تجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا اور تو مجھ سے سوال کررہی ہے، خوب!''

ترمہ شیریں کا خون خشک ہوچکا تھا۔ اباقہ خان ٹہلنے لگا، وہ ٹہلتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔ ''میں نہ تو کسی کا باپ ہوں اور نہ کسی کا عاشق۔ میں ایل خان ہوں۔ یہاں کا سب سے بڑا اور سب سے طاقتور حکمران۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔''

اسی دوران شراب اور گوشت کا انتظام کردیا گیا۔

اباقہ خان بڑبڑانا اور ٹہلنا بھول گیا اور گوشت کو بھوکے بھیڑیے کی طرح جلدی جلدی کھانے لگا۔ حسین وجمیل لڑکیاں اس کے چاروں طرف کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اباقہ خان کو شراب کے جام پیش کیے۔ وہ انہیں جلدی جلدی خالی کرنے لگا۔ ترمہ شیریں منہ پھلائے اس سے ذرا دور بیٹھی ہوئی تھی۔

جب نشہ چڑھا تو اسے اچانک ترمہ شیریں یاد آگئی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ترمہ شیریں کو قریب بلایا۔ ''تو وہاں، اتنی دور بیٹھی کیا کررہی ہے؟ میرے پاس آجا۔''

ترمہ شیریں بے دلی سے اٹھی اور اباقہ خان کے پاس بیٹھ گئی۔

اباقہ خان نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا اور شرمندگی سے کہنے لگا۔ ''ترمہ شیریں! کیا تو ناراض ہے مجھ سے؟ مگر کیوں؟ ناراض تو مجھے ہونا چاہیے تھا تجھ سے۔ تو مجھے چھوڑ کر شہزادہ سونجاق کے پاس چلی گئی تھی۔''

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ''محترم ایل خان! میں مال غنیمت ہوں، لوٹ کا مال...... حملہ آور آتے ہیں اور مجھے لوٹ کرلے جاتے ہیں۔ میں کسی کے ساتھ کیوں جانے لگی۔''

اباقہ خان نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ ''ترمہ شیریں! جب میں نے یہ سنا تھا کہ شہزادہ سونجاق تجھے لے گیا تو مجھے دکھ بھی پہنچا تھا اور غصہ بھی آیا تھا۔ ہم منگول اب فاتح اور حکمران کم اور عاشق زیادہ ہوگئے ہیں۔''

ترمہ شیریں اب بھی ناراض تھی، یوں بھی اسے شہزادہ سونجاق یاد آرہا تھا۔ جذباتی نوجوان، پرجوش شہزادہ...... وہ اباقہ خان سے بڑا عاشق تھا اور پیارا محبوب بھی۔ اباقہ خان نشے میں اسے دیر تک مناتا رہا۔ ترمہ شیریں مان گئی کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ اگر وہ نہیں بھی مانتی تب بھی ہوتا وہی ہے جو اباقہ خان چاہے گا۔

اباقہ خان اس کی خاموشی کا یہ مطلب لے رہا تھا کہ شاید وہ شہزادہ سونجاق کو یاد کررہی ہے۔ اس وہم نے اسے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔ اس نے ترمہ شیریں کا چہرہ اپنے روبرو کرلیا، پوچھا۔ ''کیا بات ہے ترمہ شیریں! تو کیا سوچ رہی ہے؟''

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ''محترم خان! میں جو کچھ سوچ رہی ہوں، اگر اس کا اظہار کردوں تو آپ اسے برداشت نہیں کرپائیں گے۔''

اباقہ خان نے ترمہ شیریں کے سر کو کئی بار جھٹکا دیا۔ ''تو بیان تو کر، میں برداشت کرلوں گا۔''

ترمہ شیریں نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''اب اس بات کو رہنے دیجیے۔ میں نہیں چاہتی کہ فاتح کے خاندان میں پھوٹ پڑجائے۔''

اباقہ خان کا نشہ ہرن ہورہا تھا۔ اس نے ترمہ شیریں کو ایک سخت جھٹکا دیا، بولا۔ ''میں تجھ سے معلوم کرکے رہوں گا کہ تو کہنا کیا چاہتی ہے۔''

ترمہ شیریں نے کہا۔ ''آپ مجھے جھٹکے نہ دیں اور جس بات کو میں چھپانا چاہتی ہوں، اس کے اظہار پر مجبور نہ کریں۔''

اباقہ خان پاگل ہوا جارہا تھا، اس نے ترمہ شیریں کے بال پکڑلیے، بولا۔ ''ترمہ شیریں! میرا امتحان نہ لے۔ اول تو تجھے ایسی بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی اور اگر کی ہے تو اس گرد آلود مطلع کو صاف کردے۔ میرا دم گھٹتا جارہا ہے۔''

ترمہ شیریں نے اباقہ خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، پوچھا۔ ''تب پھر میں بتادوں وہ بات؟''

اباقہ خان نے بے باکی سے جواب دیا۔ ''ہاں بتادے وہ بات۔''

ترمہ شیریں نے کہا۔ ''آج جب شہزادہ ارغون سے آپ نے مجھے طلب کیا تھا تو اس نے اس کا کیا جواب دیا تھا؟''

اباقہ خان نے جواب دیا۔ ''اس نے کہا تھا کہ شیر کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا۔''

ترمہ شیریں نے کہا۔ ''اس نے یہ کیوں کہا تھا، آپ نے کچھ سوچا؟ ارغون میرا تیسرا عاشق ہے۔ پہلے عاشق آپ ہیں، دوسرا عاشق شہزادہ سونجاق ہے اور تیسرا عاشق شہزادہ ارغون ہے۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ میں نے تین بڑوں

کے دل جیت لیے ہیں۔"

اباقہ خان دم بخود رہ گیا، پوچھا۔ "کیا تو یہ سچ کہہ رہی ہے؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔ جب شہزادہ ارغون مجھے لے کر آرہا تھا تو راستے میں کئی جگہ اس نے مجھ سے اظہارِ عشق کیا اور میں اس کو ٹالتی رہی۔ اس نے میرا سفر کرنا دوبھر کر دیا تھا۔"

اباقہ خان نے پوچھا۔ "کیا تو سچ کہہ رہی ہے؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں اسی لیے میں اس کو چھپا رہی تھی۔ میں جانتی تھی آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے۔"

اباقہ خان نے کہا۔ "شہزادہ ارغون اپنے کیے کی سزا پاکر رہے گا۔ میں اس کو معاف نہیں کروں گا۔"

ترمہ شیریں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ وہ ارغون کو اس لیے سزا دلوانا چاہتی تھی کہ اس نے ترمہ شیریں کو شہزادہ سونجاق سے جدا کرایا تھا۔

☆☆☆

شہزادہ ارغون قید خانے میں بند اپنی بدقسمتی پر غور کر رہا تھا۔ ترمہ شیریں کو شہزادہ سونجاق سے چھین لینے کے بعد وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ جملہ عساکر کا سپاہ سالار بنا دیا جائے گا مگر عین وقت پر قسمت نے منہ پھیر لیا اور وہ قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ قید خانے کے باہر پہریداروں کی بھاری جمعیت پہرا دے رہی تھی۔ اسی عالم میں ارغون کو مطلع کیا گیا کہ سعد اللہ یہودی اس سے ملنا چاہتا ہے۔

سعد اللہ یہودی جب اس سے ملا تو اس نے اپنا چہرہ ایک بڑے رومال سے چھپا رکھا تھا۔ ایک سپاہی ان دونوں کے قریب کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ ان دونوں کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ سعد اللہ یہودی نے پوچھا۔ "میرے آقا! یہ کیا ہو گیا؟ یہ میں آپ کو کس حال میں دیکھ رہا ہوں؟"

ارغون نے جواب دیا۔ "سعد اللہ! میری قسمت مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہے اور میرے سر پر کبھی خوش قسمتی کا سورج طلوع ہو جاتا ہے اور کبھی میری بدقسمتی کے بادل سایہ فگن ہو جاتے ہیں۔"

سعد اللہ یہودی نے دبی زبان میں کہا۔ "میرے آقا! انسان کی بیشتر مصیبتیں اس کی زبان کے بے جا استعمال کی پیداوار ہوتی ہیں۔ آپ کو ترمہ شیریں سے عشق نہیں کرنا تھا اور اگر عشق کیا ہی تھا تو اس کو اپنے سینے میں چوری کی قیمتی شے کی طرح چھپا کر رکھنا تھا لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اور اپنی بے احتیاطی اور زبان کے لگائے ہوئے زخم کی اذیتیں جھیل رہے ہیں۔"

ارغون نے پوچھا۔ "پھر اب میں کیا کروں؟"

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ "آپ اگر چاہیں تو اب بھی اپنی بدقسمتی کو خوش قسمتی میں بدل سکتے ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے بے چینی سے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

دانا یہودی نے جواب دیا۔ "آپ فی الحال ترمہ شیریں کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیں اور اباقہ خان کو یہ باور کرا دیں کہ آپ نے جو غلطی یا جرم کیا ہے، وہ بحالتِ نشہ کیا ہے اور آپ اس پر شرمندہ ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے پوچھا۔ "کیا اس طرح میرا باپ مجھے معاف کر دے گا؟"

یہودی نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے اس کو معاف کر دینا چاہیے کیونکہ آپ کا باپ بہت عقل مند اور شفیق ہے۔"

شہزادہ ارغون اپنی غلطی پر نادم تھا۔ اس نے بڑے کرب سے کہا۔ "افسوس کہ میں جملہ عساکر کا سپاہ سالار نہیں بن سکا۔"

سعد اللہ یہودی نے اسے تسلیاں دیں۔ "شہزادے! آپ مایوس نہ ہوں آپ ابھی اپنی بازی ہارے نہیں ہیں۔ وقتی تعطل آپ کو ہراساں اور مایوس کر رہا ہے، مگر آپ اب بھی سپاہ سالار رہیں۔ سپاہ سالار بننا آپ کا مقدر ہے، آپ کی قسمت اور خدا کی مشیت ہے۔"

شہزادہ ارغون کے چہرے پر امید کی چمک پیدا ہو گئی کہا۔ "خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔"

سعد اللہ یہودی نے آہستہ سے آمین کہا اور شہزادے کو سمجھانے لگا۔ "شہزادے! دنیا کے جملہ ناکام انسانوں میں ایک قدر مشترک ملے گی، ایک نقص عام، ایک مشترکہ غلطی۔ دنیا کے سارے ناکام، جذباتی، غیر محتاط اور زبان کے ہلکے ہوتے ہیں۔ آپ میں بھی یہی عیوب پائے جاتے ہیں۔ اب جب آپ کی اپنے باپ سے ملاقات ہو، آپ اس سے معافی مانگ لیجیے گا۔ اللہ نے چاہا تو حالات اور قسمت ایک بار پھر آپ پر مہربان ہو جائیں گے۔"

پہرے دار سپاہی نے سعد اللہ یہودی کو مزید رکنے اور باتیں کرنے سے روک دیا۔ سعد اللہ نے پہرے دار کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "میرے عزیز دوست! میں چند لمحوں بعد چلا جاؤں گا، بس چند لمحے اور۔"

سپاہی نے درشت آواز میں کہا۔ "بس جناب! میں اس سے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔"

شہزادہ ارغون کو غصہ آ گیا، بولا۔ "دو دو رہم کے

خدمت گار! اگر میں بادشاہ بن گیا تو تجھے دیکھ لوں گا۔ آخر تو خود کو سمجھتا کیا ہے۔"

سپاہی ایک دم اکڑ گیا، سختی سے کہا۔ "اب میں ایک لمحہ بھی نہیں دوں گا تجھے۔ مجھ سے جب یہ پوچھا جائے گا کہ آپ نے یہاں کس قسم کی باتیں کی تھیں تو میں کیا جواب دوں گا۔"

شہزادے نے جواب دیا۔ "جب تجھ سے کوئی اس قسم کا سوال کیا جائے تو صاف صاف کہہ دینا کہ ہم دونوں اپنے باپ اباقہ خان کے خلاف سازش کر رہے تھے۔"

سعداللہ یہودی ایک دم برہم ہوگیا، بولا۔ "پھر وہی زبان کا ہلکا پن اور جذباتیت۔ شہزادے! میں آئندہ آپ سے نہیں ملوں گا۔"

شہزادہ اس کو روکتا ہی رہ گیا مگر وہ نہیں رکا۔ بعد میں شہزادے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

اباقہ خان شہزادہ ارغون خان سے بہت ناراض تھا۔ کئی سمتوں سے شہزادہ ارغون کے لیے سفارشیں بھی آئیں مگر اباقہ خان نے اسے معاف نہیں کیا۔ سعداللہ یہودی شہزادہ ارغون کے لیے فوج میں کام کر رہا تھا۔ وہ فوجیوں کو ورغلا رہا تھا کہ جب ان کا سپاہ سالار ایل خان کی قید میں پڑا ہے تو فوجیوں کی طرف سے یہ خاموشی کیوں؟ اس نے فوجیوں کو بغاوت پر اکسایا اور انہیں مشورہ دیا کہ اباقہ خان کے خلاف اپنی تلواریں نیام سے نکال لیں۔

شمس الدین جوینی حالات سے باخبر تھا۔ اس نے ولی عہد تکودار کو سمجھایا۔ "اس سے پہلے کہ بغاوت ہو، آپ سفارش کر کے شہزادہ ارغون کو رہائی دلوا دیں۔"

شہزادہ تکودار نے پوچھا۔ "مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

شمس الدین جوینی نے جواب دیا۔ "اس سے دو بھائیوں کی رنجشیں کم یا بالکل ختم ہوجائیں گی اور سعداللہ یہودی اپنے ارادوں میں ناکام ہوجائے گا۔"

وزیراعظم کے مشورے پر ولی عہد تکودار نے اپنے بھائی شہزادہ ارغون کو رہائی دلوادی۔ جب وہ آزاد ہوا تو قید خانے کے دروازے پر اسے خوش آمدید کہنے والوں میں ولی عہد تکودار بھی تھا اور سعداللہ یہودی بھی۔ شہزادہ ارغون نے ان دونوں پر اچٹتی نظریں ڈالیں اور پھر ولی عہد تکودار سے پوچھا۔ "ولی عہد بہادر آپ کی تشریف آوری کا مقصد؟"

سوال کے پیچھے جو طنز چھپا ہوا تھا، ولی عہد تکودار نے بھی اچھی طرح محسوس کر لیا، بولا۔ "بھائی ارغون! میرے چھوٹے بھائی! یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟"

شہزادہ ارغون کی خدمت میں موجود سعداللہ یہودی شرارتاً مسکرایا اور شہزادے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر محل کی طرف روانہ ہوگیا۔

راستے میں سعداللہ یہودی نے شہزادہ ارغون کو سمجھایا۔ "شہزادے! خدا کے لیے اپنی جذباتیت کم کردیں۔ آپ کی آزادی کا سبب فوجی سرداروں کی یہ دھمکی ہے کہ اگر شہزادہ ارغون کو رہا نہ کیا گیا تو فوجیوں کی بہت بڑی تعداد بغاوت کردے گی۔"

شہزادہ ارغون اپنی رہائی سے بہت خوش تھا۔ سعداللہ یہودی سے پوچھا۔ "اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

یہودی نے جواب دیا۔ "اس کے بعد..... اس کے بعد پھر کسی مناسب موقع پر آپ موجودہ حکومت کے خلاف......"

وہ باتیں کرتے کرتے ایک دم اٹھا اور کمرے سے نکل گیا اور باہر کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ سعداللہ یہودی کچھ کھسیایا ہوا تھا، بولا۔ "اور جب آپ یہ محسوس کریں کہ فوج کی فضا آپ کے حق میں سازگار ہے، آپ فوراً یہاں سے کہیں اور......"

شہزادہ ارغون بڑی تشویش میں تھا، کہا۔ "فضا میرے حق میں ذرا بھی سازگار نہیں ہے شاید، کیونکہ ابھی میرا باپ اباقہ خان اور اس کی فوج کے حمایتی سردار موجود ہیں۔"

سعداللہ یہودی نے کہا۔ "پھر بھی کوشش کر دیکھنے میں حرج ہی کیا ہے؟"

شہزادہ ارغون بہت دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ چہرے پر مایوسی اور بیزاری کے آثار موجود تھے، بولا۔ "آپ کہتے ہیں تو یہ کوشش بھی کر دیکھوں گا ورنہ مجھے امید کی کوئی ننھی سی کرن تک نہیں نظر آرہی۔"

سعداللہ یہودی نے کہا۔ "شہزادے! آپ ہمت نہ ہاریں۔ آپ کی باتوں سے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "سعداللہ میرے مشفق ساتھی..... میں نے ہرات کے میدان میں چغتائیوں کو شکست دے کر اور ترمہ شیریں کو حاصل کر کے اپنے باپ سے یہ آس لگائی تھی کہ وہ مجھے اپنے جملہ عساکر کا سپاہ سالار اعلیٰ بنا دے گا مگر اس نے میرا مرتبہ بڑھانے کے بجائے گھٹا دیا اور میں قید کر دیا گیا۔"

سعداللہ یہودی نے برہمی اور مایوسی سے کہا۔ "شہزادے! میں پھر بھی کہوں گا کہ آپ اپنی جذباتیت اور عجلت پسندی سے پیچھا چھڑا لیں، پھر دیکھیے گا آپ کے

سارے کام خود بخود ہوتے چلے جائیں گے۔"

شہزادہ ارغون نے پوچھا۔ "شہزادہ تکودار میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے، میں کیا کروں؟ دوست بن جاؤں یا دور دور رہوں؟"

سعداللہ یہودی نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ "سبحان اللہ سبحان اللہ، کیسی خوش خبری سنائی ہے شہزادے آپ نے! بخدا آپ اس سے فوراً دوستی کرلیں اور میری یہ بات ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھیے گا کہ اپنے دشمن کو دشمن بن کے نہیں، دوست بن کے جیسی شکست دی جاسکتی ہے کسی اور طرح ممکن نہیں ہے۔ آپ شہزادہ تکودار سے پہلی فرصت میں دوستی کرلیں۔"

شہزادہ ارغون سوچتے سوچتے اٹھا اور سیدھا ولی عہد تکودار کے پاس پہنچا۔ اس وقت شمس الدین جوینی ولی عہد کو عقل و دانش کی باتیں بتا رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا۔ "ولی عہد بہادر! کھلے دشمن کا مقابلہ کرنا آسان ہے مگر دوست نما دشمن سے جیتنا تقریباً ناممکن ہے۔ اعتماد کرنا بڑی اچھی بات ہے مگر اعتماد نہ کرنا اس سے بھی اچھی بات ہے۔"

جب خدمت گار نے اندر داخل ہوکر ولی عہد کو یہ بتایا کہ شہزادہ ارغون باریابی کا خواستگار ہے تو شمس الدین جوینی اور ولی عہد تکودار ایک دوسرے کا سوالیہ انداز میں منہ دیکھنے لگے۔

شمس الدین جوینی نے کہا۔ "ولی عہد بہادر! ہوشیار۔ جس طرح حبشی لاکھ بار نہانے سے گورا نہیں ہوسکتا، اسی طرح بدباطن احسان کے بوجھ تلے دب کر احسان مند اور شکر گزار نہیں ہوسکتا۔"

ولی عہد نے پوچھا۔ "کیا میں شہزادہ ارغون سے ملاقات کروں یا نہ کروں؟"

وزیر نے جواب دیا۔ "آپ ملاقات ضرور کریں مگر مجھ کو یہاں سے چلا جانے دیں کیونکہ میری موجودگی میں شہزادہ اپنے دل کی باتیں نہیں کرسکے گا۔"

ولی عہد نے کہا۔ "بہتر ہے۔"

وزیر چلا گیا اور شہزادہ اندر داخل ہوا، راستے میں ان دونوں کا آمنا سامنا جو ہوا تو دونوں ہی لمحہ بھر کے لیے ایک دوسرے کے مقابل رکے، ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں اور اپنی اپنی راہ لی۔

شہزادہ ارغون کے درجۂ حرارت میں کچھ اضافہ ہوچکا تھا، اس نے طنزاً پوچھا۔ "برادر محترم! یہ مسلمان وزیر آپ سے کس قسم کی باتیں کرتا رہتا ہے؟"

ولی عہد نے جواب دیا۔ "میں نے اس کی باتیں کبھی غور سے نہیں سنیں۔ وہ بولتا رہتا ہے، میں سنتا رہتا ہوں لیکن یاد کچھ بھی نہیں رکھتا۔"

شہزادہ ارغون نے کہا۔ "مجھے جوینی کی شکل تک سے نفرت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ ہمیں یا ہمارے آدمیوں کو مسلمان کرلے گا۔"

ولی عہد نے موضوع بدلنا چاہا۔ "شہزادے! آپ کی تشریف آوری کا مقصد؟ کوئی خدمت میرے لائق؟"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "اس دن جب میں آپ کی سفارش پر آزاد ہوا تھا، میں نے آپ کے اتنے بڑے احسان کا شکریہ تک نہیں ادا کیا۔ اب میں اپنے ضمیر سے تنگ آکر معافی مانگنے حاضر ہوگیا ہوں۔"

ولی عہد نے شہزادے کی پیٹھ تھپتھپائی، کہا۔ "اس کی کیا ضرورت ہے شہزادے! تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔"

شہزادے نے جواب دیا۔ "برادر محترم! میں شرمندہ ہوں، میرا ضمیر شرمندگی کے اس بوجھ تلے دبتا چلا جارہا ہے۔"

ولی عہد نے کہا۔ "عزیز از جان بھائی! جب میں بار بار یہ کہہ رہا ہوں کہ جا میں نے تجھے معاف کیا، تب پھر یہ شرمندگی اور ضمیر کا دباؤ کیوں؟"

شہزادہ ارغون نے کہا۔ "اچھا چلیے آپ نے تو مجھے معاف کردیا، اب آپ یہ بتائیے کہ میں پدر بزرگوار سے کس طرح معافی مانگوں؟"

ولی عہد نے چونک کر پوچھا۔ "کیا وہ اب بھی ناراض ہیں تجھ سے؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "ہاں جناب! شاید وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہوگئے ہیں۔"

ولی عہد نے وعدہ کیا۔ "میں کوشش کروں گا کہ پدر بزرگوار تجھے معاف کردیں۔"

شہزادہ ارغون نے ولی عہد کے تخت پر چند کتابیں رکھی ہوئی دیکھیں، اس نے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ان میں ایک تو شیخ سعدی کی گلستان تھی اور دوسری سنسکرت کی پنچ تنتر کا عربی ترجمہ کلیلہ دمنہ۔ شہزادے نے پوچھا۔ "ان کتابوں میں کیا لکھا ہے؟"

ولی عہد نے جواب دیا۔ "ان کتابوں میں انسانی تجربوں کا نچوڑ محفوظ کردیا گیا ہے۔ چونکہ فانی انسان لمبی عمریں لے کر نہیں آتا، اس لیے یہ کتابیں جو بہتوں کے تجربات اور علم و دانش کا احاطہ کرتی ہیں، ہماری راہنمائی کرتی ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے پوچھا۔ "کیا میں انہیں پڑھ اور

سمجھ سکتا ہوں؟''

ولی عہد نے جواب دیا۔''پڑھ تو سکتے ہو مگر سمجھ نہیں سکتے۔''

شہزادے نے پوچھا۔''کیا میں انہیں سمجھنے کے لیے ہر روز آپ کے پاس آسکتا ہوں؟''

ولی عہد نے جواب دیا۔''تم میرے پاس آنے کے بجائے وزیر جوینی کی صحبت اختیار کرو کیونکہ شمس الدین جوینی علم کا سمندر ہے۔''

شہزادہ مایوس ہوگیا، بولا۔''لیکن وزیر تو اسلام کی باتیں کرنے لگتا ہے اور مجھے اسلام کی باتیں ذرا بھی پسند نہیں۔''

ولی عہد نے تلخ رویہ اختیار کیا، بولا۔''اور وہ سعد اللہ یہودی فتنہ و شرارت کی جڑ۔ کیا وہ یہودیت کی بات نہیں کرتا؟''

شہزادہ ارغون جب لاجواب ہوا تو چپ ہوگیا۔

ولی عہد دیر تک اسے سمجھاتا رہا۔ شہزادہ اس کی باتیں بہت توجہ سے سنتا رہا۔ آخر میں یہ وعدہ کرکے چلا گیا کہ اب وہ ولی عہد اور جوینی کی صحبت اختیار کرے گا اور رفتہ رفتہ سعد اللہ یہودی سے نجات حاصل کرلے گا۔

☆☆☆

ولی عہد تگودار نے اباقہ خان سے شہزادے ارغون کی سفارش کی اور باپ نے اسے معاف کردیا۔ سعد اللہ یہودی نے اسے مبارک باد پیش کی اور کہا۔''شہزادے! اگر تم اسی طرح میرے مشوروں پر عمل کرتے رہے تو ایک دن تم کامرانیوں کی معراج دیکھو گے۔''

شہزادہ، سعدی کی گلستان لیتا آیا تھا۔ سعد اللہ یہودی اس کی حکایتیں شہزادے کو سناتا اور پھر خوب ہنس ہنس کر ان حکایات اور شیخ سعدی کا مذاق اڑاتا۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے شہزادہ ارغون کو یہ یقین دلاتا کہ گلستان میں شیخ سعدی کا اپنا کچھ بھی نہیں۔ سعدی نے بھی اِدھر اُدھر سے لے کر اپنا گلستان سجالیا ہے۔ اس نے مزید کہا۔''اور اس سے زیادہ علم و دانش کی باتیں تو عہد نامہ قدیم میں کہی گئی ہیں۔''

ولی عہد نے شوق ظاہر کیا۔''شہزادے! میں عہد نامۂ قدیم پڑھنا چاہتا ہوں۔''

شہزادہ بہت خوش ہوا، بولا۔''برادر محترم! اس سلسلے میں آپ کو سعد اللہ یہودی کی صحبت اختیار کرنا پڑے گی کیونکہ وہ جدید اور قدیم مذہبی ادب کا مجموعۃ العلوم ہے۔''

ولی عہد نے کہا۔''اس شرط پر کہ وہ مجھ سے مذہبی باتیں نہیں کرے گا۔ اس کے دین کی بڑائی اور برتری سے مجھے کیا لینا دینا لیکن یہ چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں جو چند نصائح کا بھیس بدل کر کسی انسان میں داخل ہو جاتی ہیں تو اسے بالکل

کتابیں

کتابیں، اپنے آبا کی ہم نے یورپ میں بہت دیکھیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں جو اب بلیک فرائرز روڈ پر ایک نئی اور شاندار بلڈنگ میں منتقل ہوگئی ہے۔ برٹش میوزیم میں اور اسکول فار اورینٹل اسٹڈیز کے کتاب خانے میں لیکن دل ہمارا سی پارہ نہیں ہوا۔ یہ سوچ کر کہ ہمارے پاس یہ خزانے ہوتے بھی تو کبھی کے بٹ چکے ہوتے۔ کون ان کو سینت سینت کر رکھتا اور ان کی فہرست بندی کرتا اور دوسروں کو دیکھنے دیتا۔ ان لوگوں نے کم از کم ان کو سلیقے سے محفوظ تو کردیا اور ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہمارے تو خیر یہ تاجدار تھے لیکن جاپان اور چین کی کتابیں، نیپال، تبت اور کوریا کی کتابیں، افریقی زبانوں کی کتابیں، مخطوطے تصاویر، جو یورپ جائے ان کو دیکھ سکتا ہے۔ ورنہ اکثر صورتوں میں ان کی نقلیں یا عکس منگوا سکتا ہے۔ یہی حال آثار کا جانیے۔ اب تو خیر ہم بھی اپنی چیزوں کی قدر اور حفاظت کرنے لگے ہیں اور قاہرہ کا اپنا میوزیم بھی مصری آثار سے اٹا پڑا ہے۔ ورنہ ہم سے پہلے لوگوں کے لیے یہ چیزیں سنگ بیچز تھیں۔ مصر میں لوگ اہرام میں نقب لگا کر ممیوں کے کفن اور زیورات کھینچ لے گئے۔ پیرس میں کنکارڈ کے میدان میں ایک پرانا مصری نوکیلا مینار نصب ہے جو محمد علی پاشا نے پولین کو یا نہ جانے کس کو نذر کردیا تھا۔ لندن میں بھی ٹیمز کے کنارے پر کلوپیٹرا سوئی پڑی ہے جس کا بوجھ ایسا ہے کہ لانے والا جہاز ڈوب گیا تھا۔ بڑی مشکل سے نکالنے والا نکال کر لایا اور بھی کئی چیزیں دیکھیں جن پر لکھا تھا کہ محمد علی پاشا نے تحفتاً دیا...... ہمارے خیال میں یہ کہہ دیتا ہوگا کہ ''ارے میاں! لے جاؤ ہمارے کس کام کی ہیں یہ چیزیں...... کتابوں کے بارے میں بھی ہم ایسی ہی بے نیازی برتتے ہوں گے۔

ابن انشا کے سفرنامے ''دنیا گول ہے'' سے اقتباس

[illegible]

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف　　　ایڈ فری لنکس

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ　　　ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ　　　ناولز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں　http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں　http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں　https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



کی طرح پچھاڑ دیتی ہیں۔"

شہزادہ ارغون ولی عہد کی عاقلانہ باتوں سے لطف حاصل کررہا تھا۔ محل کے اندرونی حصے سے کسی کے گانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شہزادے کی توجہ گانے کی طرف منعطف ہوگئی۔ ولی عہد نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ "شہزادے! کیا گانا تمہیں بہت زیادہ پسند ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "واہ جناب! کیا گانا بھی کسی کو ناپسند ہوسکتا ہے۔ موسیقی روح کی غذا ہے، اس غذا سے محروم روح خشکی اور بے کیفی کا شکار ہوجائے گی۔"

ولی عہد شہزادہ ارغون کو اندر لے گیا جہاں ایک مصنوعی جھیل کے کنارے چند حسینائیں بیٹھی گا رہی تھیں۔ جب یہ دونوں ان کی لاعلمی میں ان کے سروں پر جا کھڑے ہوئے تب بھی انہیں کسی کی آہٹ سنائی نہیں دی۔ وہ گانے میں اس حد تک منہمک تھیں کہ انہوں نے اپنے وجود کے سوا سب کچھ بھلا دیا تھا۔

کچھ دیر بعد آخر انہیں معلوم ہوگیا اور وہ سب ادھر ادھر دبکنے لگیں لیکن ولی عہد نے انہیں حکم دیا۔ "شہزادہ ارغون اس وقت تمہاری محفل میں موجود تمہارے فن سے محظوظ ہونا چاہتا ہے۔"

دونوں گھاس کے فرش پر بیٹھ گئے۔ ان کے خدمت گار دیر تک ان کی خوشامدیں کرتے رہے کہ وہ کچھ کھا پی لیں لیکن دونوں کچھ کھائے پیے بغیر ہی وہاں بیٹھے رہے۔ اس محفل میں جس انداز میں گایا جارہا تھا، اس میں ترمہ شیریں کی جھلک پائی جاتی تھی۔ شہزادہ اتنا بے چین ہوا کہ اس نے مغنیہ کو ٹوک دیا، پوچھا۔ "تو نے یہ فن کس سے سیکھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "کسی ایک سے نہیں، میرے کئی استاد ہیں۔"

شہزادے نے پوچھا۔ "اور یہ جو ابھی ابھی تو گا رہی تھی؟"

مغنیہ نے پورا سوال بھی نہیں سنا، بولی۔ "اس گائکی میں ترمہ شیریں کا فیض شامل ہے کیونکہ اس انداز اور دھن میں ترمہ شیریں سے اچھا کوئی اور نہیں گا سکتا۔"

ولی عہد کو شہزادہ ارغون پر حیرت تھی کہ اس نے انداز اور دھن سے اس کے استاد کا پتا چلا لیا تھا۔

دوسری طرف ترمہ شیریں کے ذکر نے شہزادہ ارغون کے صبر و قرار کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ وہ دیر تک بیٹھا پہلو بدلتا رہا پھر بولا۔ "اس انداز اور اس دھن میں ترمہ شیریں کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ترمہ شیریں کو بہت زیادہ نہیں سنا، اب ارادہ ہے کہ اس کو بلا کر سنوں، شاید میری بات رد نہ کی جائے کیونکہ ان دنوں میری قسمت کا ستارہ عروج پر ہے۔"

شہزادہ ارغون نے تڑپ کر درخواست پیش کردی، بولا۔ "برادر محترم! ترمہ شیریں کو سنتے رہنے کی تو حسرت ہی رہ گئی دل میں۔ اب پتا نہیں پھر بھی سن سکوں گا یا نہیں۔"

ولی عہد نے مغنیہ کو حکم دیا۔ "تو چپ کیوں ہوگئی؟ گاتی کیوں نہیں؟"

مغنیہ پھر گانے لگی۔ شہزادے نے اسے ٹوک دیا۔ "اسی دھن میں، اسی انداز میں، ترمہ شیریں والے انداز اور دھن میں۔"

مغنیہ نے ایک بار پھر ترمہ شیریں کے انداز میں گانا شروع کردیا۔

ولی عہد کا تو حال ہی کچھ اور تھا۔ جب گانا ختم ہوگیا تو ایک مغنیہ نے اس سے پوچھا۔ "آپ کچھ اور بھی سنیں گے یا نہیں؟"

ولی عہد نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا۔

شہزادہ ارغون بہت زیادہ پی جانے کے سبب اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ گھاس کے فرش پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اوپر آسمان کے علاوہ کوئی سائبان بھی نہیں تھا۔ ولی عہد نے شہزادے کو جھنجوڑا۔ "اٹھ شہزادے اٹھ، یہ کہاں سو گیا تو؟"

شہزادے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا، بولا۔ "میں یہیں رہوں گا۔ میں کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔"

ولی عہد نے خدمت گاروں کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔ "شہزادے کو اٹھا کر بڑی کوٹھری میں ڈال دو پھر جب اسے ہوش آجائے تو مجھ کو بلوا لینا۔"

خدمت گاروں نے حکم پاتے ہی شہزادے کو دبوچ لیا۔ وہ نشے میں چور انسان اس وقت تک نشے میں رہا جب تک اسے ننگے فرش پر نہایت بے دردی سے پٹخ نہیں دیا گیا۔ خدمت گار کوٹھری کو باہر سے بند کر کے چلے گئے۔ اس بار ولی عہد خود بھی وہاں سے نکل گیا۔

فرش پر پٹخنے کی وجہ سے شہزادہ ارغون کے سر میں چوٹ آگئی تھی۔ کئی گھنٹے بعد جب اس کو ہوش آیا تو اس نے اپنے سر میں تکلیف محسوس کی۔ اس نے ہوش میں آتے ہی پہلے تو اس جگہ کا معائنہ کیا جو ہر طرف سے بند تھی، پھر اٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ دروازہ بھی نہیں کھلا۔ اس نے ولی عہد کو آواز دی۔ "ولی عہد بہادر! کہاں چلے گئے؟"

اس کی آواز قید خانے ہی میں گونجنے لگی، جیسے کوئی اور ولی عہد سے اس کے دل کو ٹٹولنا چاہتا ہو، بولا۔ "میں نے اس کا منہ چڑا رہا ہو۔ "ولی عہد بہادر! کہاں چلے گئے؟"

شہزادہ ارغون نے ذرا زور سے آواز دی۔ ''ولی عہد شہزادے! تم کہاں چلے گئے ہو...... آتے کیوں نہیں؟''

لیکن جواب پھر نہیں ملا۔ اب تو وہ گھبرا گیا۔ وہ اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے اور نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ کافی دیر کی جستجو کے بعد اس کو احساس ہوا کہ یہ بدترین قید خانہ ہے، وہ سوچ رہا تھا مگر اس کو قید کیوں کیا گیا؟

وہ ایک بار پھر بیٹھ گیا اور معلوم نہیں کیا کچھ سوچتا رہا۔ سوچتے سوچتے وحشت نے زور کیا اور وہ ایک بار پھر تڑپ کر اٹھا اور آوازیں دینے لگا۔ ''ولی عہد بہادر! کہاں چلے گئے؟ یہ مجھے قید کس نے کیا ہے؟''

اس کو اپنی کسی بات کا بھی جواب نہیں مل رہا تھا۔ یہ ایک ایسا قید خانہ تھا جس میں سلاخ نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں، ٹھوس چوحدی دیواروں کے علاوہ ایک دروازہ بھی تھا لیکن اس دروازے میں جھری یا سوراخ نہیں تھا۔

شہزادہ ارغون پیچ و تاب کھا رہا تھا، اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے قید کس نے کیا ہے لیکن یہ معلوم تھا کہ محل کے اس حصے میں ولی عہد تکودار کے علاوہ کسی کی رسائی ناممکن تھی۔ اسے اپنی موت صاف نظر آرہی تھی۔ اب اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کو نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے راہ سے ہٹایا جا رہا ہے۔

باہر شہزادہ ارغون کی گمشدگی کی خبر گشت کرنے لگی۔ سعد اللہ یہودی سب سے زیادہ فکر مند تھا۔ ولی عہد تکودار نے اضطراری حالت میں جو کر دیا تھا، اس سے خود بھی پریشان تھا۔ اباقہ خان بھی شہزادہ ارغون کی گمشدگی سے حیران تھا۔ کچھ لوگوں نے اباقہ خان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ شہزادہ ارغون سپہ سالاری نہ ملنے کی وجہ سے خود ہی کہیں روپوش ہو گیا ہے اور وہ جب بھی ظاہر ہوگا ایک باغی کے روپ میں ظاہر ہوگا۔

ولی عہد تکودار کے خاص محرم راز خدمت گار نے جب شہزادہ ارغون کو کھانا پہنچایا تو اس نے اپنا چہرہ ایک چادر میں چھپا لیا تھا۔ اس خدمت گار کے ساتھ کئی خدمت گار اور بھی تھے اور ان سبھوں نے اپنے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ یہ ساتھی خدمت گار کوٹھری کے باہر کسی ناخوشگوار ہنگامی واقعے کے انتظار میں موجود تھے۔ شہزادہ ارغون نے کھانا لانے والے کو پکڑ لیا اور پوچھا۔ ''بتا مجھ کو یہاں کس نے قید کر رکھا ہے؟''

خدمت گار نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر شہزادہ ارغون کی مضبوط گرفت نے اسے نہیں چھوڑا۔ شہزادہ اس کے چہرے پر سے چادر ہٹا دینا چاہتا تھا لیکن طاقتور خدمت گار نے سخت مزاحمت کی اور منہ سے عجیب و غریب بے معنی آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔ ان آوازوں کو سن کر دوسرے خدمت گار تیزی سے اندر داخل ہوئے اور کھانا لانے والے خدمت گار کو شہزادہ ارغون کی گرفت سے آزادی دلا کے باہر نکال کر دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ اندر شہزادہ ارغون غصے میں چیخ رہا تھا۔ ''بدمعاشو! تم یہ سب کس کے ایما اور کس کے حکم سے کر رہے ہو؟ میں باہر نکل کر ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو اس سازش کے سرغنہ کا نام بتا دو۔''

لیکن خدمت گاروں نے شہزادے کی کسی بات کا بھی جواب نہیں دیا۔

ولی عہد تکودار کو جب اس ناخوشگوار واقعے کی خبر ملی تو وہ پریشان ہو کر شمس الدین جوینی سے ملا اور اس کو پورا واقعہ بتا کے پوچھا۔ ''وزیر محترم! اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

شمس الدین جوینی نے پوچھا۔ ''پہلے آپ یہ بتائیں کہ ایسا آپ نے کیا کیوں؟''

ولی عہد نے جواب دیا۔ ''میرے بھائیوں میں شہزادہ ارغون ہی میرا سب سے بڑا دشمن ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو قتل کر کے اس کی لاش ویرانے میں پھنکوا دوں۔''

شمس الدین نے کہا۔ ''ولی عہد! آپ کی سوچ غلط ہے۔ اس طرح آپ کو کیا فائدہ پہنچے گا؟''

ولی عہد نے جواب دیا۔ ''اس کے بعد میں کسی فکر اور اندیشے کے بغیر حکومت کروں گا۔''

شمس الدین نے مشورہ دیا۔ ''ولی عہد! شہزادہ ارغون زندہ اور آپ کے آس پاس موجود ہے اور آپ اس کی سازشوں اور حرکتوں پر اپنے فکر و تدبر سے قابو پاتے رہے، یہ ہے ایک کامیاب اور لائق و فائق حکمران کی خوبی۔ اگر آپ نے شہزادہ ارغون کو ہلاک کر دیا تو ہلاکو خان کا پورا خانوادہ آپ ہی پر شبہ کرے گا اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے کہ دنیا کی ہمدردیاں مظلوم کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ہلاکت کے بعد شہزادہ ارغون مظلوم قرار پائے گا اور آپ ظالم۔ آپ کو اس وقت اس فتنے سے بچنا چاہیے۔''

ولی عہد نے پوچھا۔ ''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

وزیر نے جواب دیا۔ ''آپ قید خانے میں جائیے اور شہزادہ ارغون سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے قید خانے سے باہر لائیے۔''

ولی عہد نے بے چینی سے پوچھا۔ ''اور پھر؟ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

وزیر نے جواب دیا۔ ''میں سب کچھ بتاؤں گا ولی عہد بہادر! آپ پریشان نہ ہوں۔ قید خانے سے باہر نکلتے ہی شہزادہ آپ سے پوچھے گا کہ اس کو قید کس نے کیا تھا؟ آپ اس جرم میں چند ناکارہ آدمیوں کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیں......''

ولی عہد بات کاٹ کر بولا۔ ''کون سے ناکارہ آدمی؟ اور وہ ناکارہ آدمی اپنے ناکردہ جرم کا اقرار کریں گے ہی کیوں؟''

وزیر نے جواب دیا۔ ''ولی عہد! حکومت اور سیاست میں سب کچھ جائز ہے۔ جرم کرنے والے اپنے جرم کا اقرار کب کرتے ہیں، اقرار تو زبردستی کرایا جاتا ہے۔ آپ بھی ان سے زبردستی اقرارِ جرم کرالیں گے اور اقرار کے بعد انہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔''

ولی عہد کو شہزادہ ارغون کی رہائی پسند نہیں تھی۔ وہ اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، بولا۔ ''وزیر محترم! میرا خیال ہے قابو میں آئے ہوئے دشمن کو چھوڑ دینا بہت بڑی غلطی ہے۔''

وزیر نے سختی سے انکار کیا، بولا۔ ''ولی عہد بہادر! آپ غلطی پر ہیں۔ اس معاملے میں، میں آپ سے اتفاق نہیں کرسکتا۔''

ولی عہد مجبور ہوگیا۔ ''اچھا، میں آپ کے مشورے پر عمل کروں گا لیکن بعد میں اس کے نتائج کا مقابلہ آپ کو کرنا ہوگا۔''

وزیر نے جواب دیا۔ ''میں آپ کا ساتھ دوں گا۔''

ولی عہد تخلیہ میں چلا گیا۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ اس کے نشیب و فراز پر اچھی طرح غور کرنا چاہتا تھا۔ گھنٹوں کے غور و فکر کے بعد وہ وزیر ہی کے مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہوگیا۔ اس نے وزیر ہی کے مشورے سے چار ناکارہ آدمیوں کا انتخاب کیا۔ ان میں ایک تو شامان تھا، مستقبل کی پیش گوئیاں کرنے والا۔ ایک گویا تھا جو گویا ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھا، مسخرہ شاعر، دوسروں کی ہجو کہنے والا۔ تیسرا بزعم خود ایک ایسا عقلمند تھا جو خود تو دوسروں کے دسترخوان سے پیٹ بھرتا تھا مگر دوسروں کو نہایت قیمتی مشورے دیا کرتا تھا۔ یہ تیسرا شخص ہلاکو خان کے بیٹے طرقسائی کا بیٹا الغوخان تھا۔ چوتھا شخص ایک قسمت آزما شمشیر زن تھا۔ سائبیریا کا رہنے والا اور اباقہ خان کی ملازمت میں اس لیے آیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ جنگوں میں شریک ہوکر مال و زر حاصل کرے گا۔ اس کا نام قتلق نویان تھا۔ ولی عہد تکودار نے ان چاروں کو گرفتار کرلیا۔ الغو خان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ زمامِ حکومت اباقہ خان سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ شامان پر یہ الزام لگا کہ اس نے یہ جھوٹی پیش گوئی کی تھی کہ حکومت آخر کار الغوخان کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔

گویے پر یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے اپنے اشعار میں الغوخان کی تعریف کی تھی اور اباقہ خان اور اس کے بیٹوں کو خوب خوب برا بھلا کہا تھا۔ یہ چند اشعار بھی کسی سے کہلوا کر تیار رکھے گئے تھے۔

خود ساختہ عقلمند پر یہ الزام لگا کہ وہ اباقہ خان کے خانوادے کی بربادی کے درپے تھا۔ ان چاروں کو گرفتار کر کے انہیں ان کی فردِ جرم سنائی گئی۔ چاروں نے جرم کا اقرار نہیں کیا اور اس وقت تک اقرار نہیں کیا جب تک انہیں بدترین جسمانی اور روحانی اذیتیں پہنچا کر، انہیں ناکردہ جرائم کا اقرار کرنے پر مجبور نہیں کردیا گیا۔

ان چاروں سے باری باری پوچھا گیا۔ ''اب تم سب یہ بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

گویے نے جواب دیا۔ ''ولی عہد بہادر! ہماری پٹائی کیا ہم سب سے پوچھ کر کی گئی تھی؟''

شمشیر زن نے جواب دیا۔ ''میں نے اپنے فن اور اپنی طاقت کو اباقہ خان کے نام ہبہ کردیا ہے اور میں ہی اباقہ خان سے لڑنے کا منصوبہ بتاؤں گا، تھو تھو۔ شرم شرم۔''

الغوخان نے اپنی صفائی پیش کی۔ ''ہم نے ہلاکو خان کی زندگی ہی میں اباقہ خان سے وفاداری کا عہد کیا تھا پھر اب ہم ہی غداری کریں گے، ایسا نہیں ہوسکتا۔''

ان چاروں کو اباقہ خان کی عدالت میں پیش کردیا گیا۔ گویے کو راستے ہی میں کسی نے مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ اپنے جرم کا اقرار کرلے گا تو اس کو آزاد کردیا جائے گا لیکن اس کی شرط یہ تھی کہ وہ بقیہ تینوں کو اپنا شریکِ جرم قرار دے گا۔

گویے نے وعدہ کرلیا لیکن ساتھ ہی زور دے کر اقرار کرایا کہ وہ اقرارِ جرم کے بعد آزاد کردیا جائے گا۔

اباقہ خان نے چاروں سے فرداً فرداً ان کے جرائم کی بابت پوچھا۔ تین نے تو اپنے اوپر عائد کردہ جرائم کو ماننے سے انکار کردیا مگر گویے نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا۔ اس نے کہا۔ ''چونکہ الغوخان نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب میں زمامِ حکومت سنبھالوں گا تو تجھے مالا مال کردوں گا۔''

اباقہ خان نے تخت سے اتر کر گویے کے رخسار پر ایک

طمانچہ رسید کر دیا اور پوچھا۔ ”شہزادہ ارغون کہاں ہے؟“
گویے کی سٹی گم ہو چکی تھی، بولا۔ ”میں کیا جانوں شہزادہ ارغون کہاں ہے۔“
اس کے بعد گویے نے ولی عہد کی طرف دیکھا، ولی عہد نکودار نے جلدی جلدی عرض کیا۔ ”پدر بزرگوار! میں اس شخص کو تخلیے میں لیے جا رہا ہوں تا کہ تخلیے میں اس سے شہزادہ ارغون کا پتا معلوم کروں۔“
اباقہ خان نے مشورہ دیا۔ ”یہ بہت چالاک معلوم ہوتا ہے۔ اس سے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے بات کرنا اور دیکھنا اس پر کڑی نظریں بھی رکھنا تا کہ یہ مسخرہ بھاگ نہ سکے۔“
ولی عہد اس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے محل کی راہداری میں چلا گیا، بولا۔ ”دیکھ خبردار جو کچھ تجھ سے کہا گیا ہے اس سے پھر نہ جانا۔ میں تجھ کو شہزادے ارغون کے قید خانے میں لے جاؤں گا اور یہ ظاہر کروں گا کہ شہزادہ ارغون تیری نشاندہی اور راہنمائی میں برآمد کر لیا گیا ہے۔ جب یہ سارا کھیل اپنے اختتام کو پہنچ جائے گا تو تجھ کو چھوڑ دیا جائے گا۔“
اس کے بعد ولی عہد نے پانچ سپاہیوں کو اپنے ساتھ لیا اور گویے کی راہنمائی میں شہزادہ ارغون کو قید خانے سے آزاد کرا لیا۔
شہزادہ ارغون نے ولی عہد بھائی کو اپنے سامنے دیکھ کر پوچھا۔ ”آپ یہاں کہاں؟ مجھے یہاں کس نے قید کیا تھا؟“
ولی عہد نکودار نے شہزادے کو تسلی دی، بولا۔ ”شہزادے! تم مت گھبرانا۔ سازشی سارے کے سارے پکڑے گئے ہیں۔“
اس کے بعد اس نے پوری کہانی سنا دی اور کہا۔ ”شہزادے! تم یقین کرو تمہاری گمشدگی اور سازشیوں کا پتا لگانے میں مجھے بڑی پریشانیاں اٹھانا پڑیں۔ اگر یہ شخص۔“ گویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارا ساتھ نہ دیتا تو ہم مشکل ہی سے تم تک پہنچتے۔“
گویے نے ولی عہد کی طرف معنی خیز نظروں سے گھورا۔ ”اور میرا انعام...... مجھے یہیں چھوڑ دیا جائے۔“
ولی عہد نے جواب دیا۔ ”نہیں، تمہیں یہاں نہیں چھوڑا جا سکتا۔“
ولی عہد، شہزادہ ارغون اور گویے کو اپنے ساتھ لیے ہوئے دوبارہ اباقہ خان کے دربار میں پہنچ گیا۔ ولی عہد نے گویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب والا! میں اس گویے کی نشاندہی پر شہزادہ ارغون کو برآمد کرنے میں

دل کی دھڑکن

مریض اپنے دوست سے۔ ”کل میرے دل کی حرکت بہت تیز ہو گئی چنانچہ مجھے اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔“
دوست۔ ”پھر ڈاکٹر نے دل کی حرکت کم کرنے کے لیے کیا کیا؟“
مریض۔ ”انہوں نے ایک بوڑھی سی نرس میرے پاس بھیج دی۔“

شرم

جج چور سے۔ ”تمہیں چوری کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟“
چور۔ ”جناب! آتی ہے۔“
جج۔ ”پھر؟“
چور۔ ”پھر چلی جاتی ہے حضور!“

واقفیت

ایک صاحب لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے فٹ پاتھ پر جا رہے تھے۔ ایک لڑکی کو دیکھ کر رک گئے اور بولے۔ ”میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔“
لڑکی نے جواب دیا۔ ”ضرور دیکھا ہوگا۔ میں پاگل خانے کی نرس ہوں۔“

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

اسٹیمپ

ایک دفعہ ایک صاحب ساری رات سوچتے رہے کہ میں کراچی خط بھیجتا ہوں تو آٹھ روپے لگتے ہیں اور خود جاتا ہوں تو چار سو روپے خرچ ہو جاتے ہیں، کیوں نہ میں بھی ڈاک کے ذریعے پہنچ جاؤں۔ دوسرے دن وہ صبح سویرے نہا دھو کر ڈاک خانے گئے۔ آٹھ روپے کا ٹکٹ خرید کر ماتھے پر لگایا اور ایک بڑا سا لیٹر بکس دیکھ کر اس میں سر ڈال دیا۔ جب ڈاکیا ڈاک نکالنے پہنچا تو اس نے خیال کیا کہ کوئی چور ہے جو ڈاک چوری کر رہا ہے۔ اس نے اپنا جوتا اتار کر مرمت شروع کر دی۔ وہ صاحب جب پانچ چھ جوتے کھا چکے تو چلا کر کہنے لگے۔ ”اب بس بھی کرو، ٹکٹ تو میں نے ایک ہی لگایا ہے اور مہریں تم اتنی لگائے جا رہے ہو۔“

مرسلہ۔ محمد الیاس کرد، ضلع لسبیلا بلوچستان

کامیاب ہوگیا۔"
اباقہ خان نے طیش میں کہا۔ "تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تم مجھ کو موم سمجھتے ہو؟ میں کسی کو بھی معاف نہیں کروں گا۔ میں ہر ایک کو اس کے کیے کی عبرتناک سزا دوں گا۔"
گوتیا چیخا۔ "لیکن حضورِ والا! مجھ کو چھوڑ کر، کیونکہ ولی عہد بہادر نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں......"
وہ ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ ولی عہد کے اشارے پر اس کے آدمی گوتیے کو کھینچ کر باہر لے گئے۔
گوتیے کی عدم موجودگی میں ولی عہد نے اباقہ خان کو سمجھایا۔ "میں نے گوتیے سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ سچ سچ اس سازش کی بابت بتا دے گا تو میں اسے معاف کر دوں گا۔"
اباقہ خان نے کہا۔ "لیکن میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"
ولی عہد نے کہا۔ "اور اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں بھی معاف نہ کرتا۔"
گوتیا باہر نکل کر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "ولی عہد نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے، چھوڑ دینے کا لالچ دے کر مجھ سے جھوٹ بلوایا گیا اور اب مجھے میرے ناکردہ گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔"
اس کی اس چیخ پکار کو اس نام نہاد سازش کے سرغنہ الغوخان کے بھائی بایدو نے بھی سنا۔ بایدو نہایت ہوشیار اور سمجھ دار جوان تھا۔ ہلاکو خان کا بیٹا طرقائی خان اپنے بیٹے بایدو پر بہت ناز کرتا تھا۔ بایدو بھاگ کر گوتیے کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا۔ "گوتیے! سچ سچ بتا یہ معاملہ کیا ہے؟ کیا اس سازش میں میرا بے وقوف بھائی الغو شامل ہے؟"
گوتیے نے جواب دیا۔ "جھوٹ۔ سراسر جھوٹ ہے۔ مجھ سے ولی عہد نے جھوٹ بلوایا ہے۔"
لیکن اسی وقت ولی عہد تکودار کے ایک حمایتی نے گوتیے کو قتل کر دیا۔ بایدو نے اس شخص کو گریبان سے پکڑ لیا، بولا۔ "ظالم! یہ تو نے کیا کر دیا۔ مجھ کو تو اس سے چند راز اگلوانے تھے۔"
گوتیے کے قاتل نے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی اور جواب دیا۔ "محترم ایل خان نے اس کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔"
بایدو نے اس کو پھر بھی نہیں چھوڑا اور اس کے گریبان کو جھٹکے دیتا رہا۔ اسی دوران ولی عہد بھی وہاں پہنچ گیا اور گوتیے کو مقتول دیکھ کر پوچھا۔ "اس کو کس نے قتل کر دیا؟"
بایدو نے گوتیے کے قاتل کو نیچے گرا دیا، بولا۔ "اس نے...... تیرے اس حمایتی نے قتل کیا ہے اسے اور عین اس وقت قتل کیا ہے جب یہ تیری سازش کا بھانڈا پھوڑنے والا تھا۔"
ولی عہد نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی، بولا۔ "بایدو! اس کو چھوڑ دے ورنہ میں تجھے بھی قتل کر دوں گا۔ میرا خیال ہے اپنے بھائی الغو کی سازش میں تو بھی شریک ہے۔"
بایدو نے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے۔"
ولی عہد نے بھی چیخ کر جواب دیا۔ "یہ سچ ہے۔"
بایدو نے کہا۔ "ہم سب شہزادہ ارغون کے حمایتی ہیں اور تو شہزادہ ارغون سے حسد کرتا ہے۔ اسی حسد نے تجھے ارغون کے حمایتیوں کا دشمن بنا دیا ہے۔"
ولی عہد نے بایدو کو نرمی سے سمجھایا۔ "بایدو! پاگل نہ بنو۔ تیرے چچا اباقہ خان نے سازشیوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کرنے کا فیصلہ سنا دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تیری حمایت خود تجھے بھی موت سے قریب نہ کر دے۔"
موقع شناس بایدو نرم پڑ گیا۔ "اگر چچا اباقہ خان نے ان بے گناہ مجرموں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کرنے کا فیصلہ سنا دیا ہے تو میں خاموش ہو جاؤں گا لیکن چچا اباقہ خان کو اصل واقعات کا علم نہیں ہے شاید۔"
ولی عہد نے طنز کیا۔ "اگر پدرِ محترم کو صحیح واقعات کا علم نہیں ہے تو، تو انہیں صحیح واقعات بتا دے جا کر۔ ایک لائق حکمران، ایک مثالی فاتح تیری نظر میں غافل اور لاعلم ہے۔"
بایدو، ولی عہد کے الزامات سے خوفزدہ تھا، بولا۔ "ولی عہد بہادر! چچا اباقہ خان کو غافل اور لاعلم تم نے کہا ہے، میں نے نہیں کہا۔"
اسی وقت شامان، الغو اور قتلق تویان رسیوں میں جکڑے ہوئے سامنے سے گزرے۔ بایدو تلملا گیا، بولا۔ "اپنے وفادار ساتھیوں کو ہلاک کر دینا بہت بڑا ظلم ہے۔"
اب اس کو شہزادہ ارغون کی تلاش تھی۔ قیدیوں کے پیچھے وہ بھی نمودار ہوا۔ وہ شہزادہ ارغون کو کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا، بولا۔ "شہزادے! یہ ان تینوں کو کہاں لیے جا رہے ہیں؟"
شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "ان سب نے میرے اور حکومت کے خلاف سازش کی اور اب اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جائیں گے۔"
بایدو نے بڑے کرب سے کہا۔ "شہزادے! یہ جھوٹ ہے، یہ بے گناہ ہیں۔ انہوں نے تیرے خلاف کوئی سازش نہیں کی۔ یہ سازش کسی اور ہی کی ہے۔ انہیں بچا لے شہزادے! یہ بے گناہ ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے نفرت سے منہ بنایا، بولا۔ ''انہوں نے مجھے ایک ایسی کوٹھری میں بند کر دیا تھا جس میں ہوا کا بھی گزر نہ تھا، اب انہیں بھی قبروں میں زندہ دفن کر دیا جائے گا۔''

بایدو نے اصرار کیا۔ ''شہزادے! میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔ میں تیرے چچا کا بیٹا بھی ہوں اور تیرا دوست بھی۔ میں تیرا برا نہیں چاہتا۔ میں تجھ کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں۔''

شہزادے نے پوچھا۔ ''تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

بایدو نے گویے کی حق گوئی اور موت کا چشم دید واقعہ سنا کے بیان کیا۔ ''یہ جھوٹی سازش ہے، یہ سب بے گناہ ہیں۔ میں تیرے ساتھ چچا اباقہ خان کے پاس چلتا ہوں اور ساری باتیں خود کرلوں گا۔''

ولی عہد تکودار ان دونوں کی باتیں غور سے سنتا رہا اور جب اس نے یہ دیکھا کہ دونوں میں اتحاد ہونے ہی والا ہے تو درمیان میں مداخلت کر دی، بولا۔ ''شہزادے ارغون! تو میرا بھائی ہے اور بایدو چچا کا بیٹا ہے اور چچا کے بیٹے کا مطلب ہوتا ہے دشمن۔ یہ تیرا، میرا اور ہم سب کا دشمن ہے۔ اس کی باتوں میں نہ آ۔''

بایدو نے شہزادے ارغون کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو بھگاتا ہوا ولی عہد سے دور لے گیا اور وہاں شہزادے کو کچھ اس طرح سمجھایا کہ ساری باتیں اس کی سمجھ میں آگئیں اور قید کیے جانے سے پہلے کے وہ واقعات بھی یاد آگئے جب وہ نشے میں مدہوش سا ہوا جا رہا تھا کہ کسی آواز نے خدمت گاروں کو حکم دیا تھا کہ شہزادے کو کسی کوٹھری میں قید کر دیا جائے۔ وہ آواز شہزادہ تکودار کی آواز سے بہت ملتی جلتی تھی۔

ولی عہد بھاگا بھاگا تینوں مجرموں کے پیچھے پہنچا۔ اس کی یہ کوشش تھی کہ تینوں کو جلد از جلد قبروں میں زندہ دفن کر دیا جائے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جتنی بھی جلدی ممکن ہو، تینوں کے لیے قبریں کھود کر تیار کر لی جائیں۔

دوسری طرف شہزادہ ارغون اور بایدو، اباقہ خان کو سمجھا رہے تھے اور شہزادہ ارغون تینوں مجرموں کی سفارش بڑے جذباتی انداز اور لہجے میں کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بادا جان! اگر وہ میرے دشمن بھی ہیں تب بھی میں انہیں معاف کرتا ہوں۔ اپنے جدِ اعلیٰ چنگیز خان کے نام پر ان تینوں کو بچا لیجیے۔''

اباقہ خان نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اپنے حکم کو کس طرح منسوخ کر دوں؟''

شہزادہ ارغون نے پوچھا۔ ''کیا آپ اس میں خوش ہیں کہ میرے سارے حمایتی ہلاک کر دیے جائیں؟''

اباقہ خان خود کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا، بولا۔ ''اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ولی عہد تکودار نے آخر اتنی بڑی سازش کی کیوں؟''

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ''تکودار میرا بھائی ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ میں جملہ مغل افواج کا سپاہ سالار بنا دیا جاؤں، وہ مجھ کو اپنے اس پہلے مرحلے میں ہی میرے اچھے اور مخلص دوستوں سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔''

اباقہ خان نے اپنا سر اور ٹھوڑی، دونوں ہی اپنی ہتھیلیوں پر ٹکا دیے اور پوچھا۔ ''کیا تم دونوں سچی باتیں کر رہے ہو؟''

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں بادا جان! آپ میری باتوں پر یقین کیوں نہیں کرتے؟ کیا ہم پیدائشی جھوٹے اور اجڈ ہیں۔ عاقبت نا اندیش۔''

اباقہ خان نے تالی بجا کر خدمت گاروں کو طلب کرایا، اس نے انہیں حکم دیا۔ ''تم لوگ میرا ایک پروانہ لے کر فوراً ان تینوں مجرموں کے پاس پہنچ جاؤ ورنہ تین بے گناہ انسان خواہ مخواہ قبروں میں دفن کر دیے جائیں گے۔''

انہیں اباقہ خان نے تینوں کا فرمانِ رہائی دیا اور اسی وقت وہ اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

تینوں کی قبریں کھودی جا چکی تھیں، انہیں قبروں کے پاس کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ تینوں یہاں بھی یہی کہہ رہے تھے۔ ''لوگو! ہم بے گناہ ہیں۔ ہم پر تہمت لگائی گئی ہے۔ ہم پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔''

ولی عہد تکودار انہیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا، اس نے جواب دیا۔ ''گویا مر گیا، اس نے تم تینوں کو شریکِ جرم قرار دیا تھا......''

اسی دوران ولی عہد تکودار نے اپنے پیچھے گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں سنیں۔ اس نے پچیس تیس سواروں کو اپنی طرف آتے دیکھا اور حکم دیا۔ ''تینوں کو قبروں میں گرا دیا جائے۔''

تینوں کے ہاتھ ان کی پشتوں پر باندھ دیے گئے۔ ولی عہد تکودار کے حکم پر انہیں قبروں میں گرا دیا گیا لیکن اسی وقت شہزادہ ارغون کے آدمیوں نے قبروں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ شہزادہ ارغون چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ''دوستو! محترم ایل خان نے انہیں معاف کر دیا ہے۔''

ولی عہد نے جھنجلا کر کہا۔ ''یہ سب جھوٹ ہے۔ قبروں کو مٹی سے پاٹ دو۔''

لیکن شہزادہ ارغون کے ساتھیوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے تینوں کو قبروں کے اندر سے نکال لیا اور ان کے پشت پر بندھے ہاتھ کھول دیے۔ بایدو نے اپنے بھائی الغوخان سے پوچھا۔ ''بھائی الغو! تیرے چوٹ تو نہیں آئی؟''

الغو کی ناک زخمی ہوگئی تھی۔ قبر میں وہ اوندھے منہ گرا تھا جس سے ناک میں ایک نکیلا پتھر گھس گیا تھا۔ بایدو نے اپنے بھائی کی ناک کا خون اپنی آستین سے پونچھ کر حکم دیا۔ ''جا اس کو پانی سے دھو ڈال، ٹھیک ہو جائے گا۔''

ولی عہد تکودار سینہ تان کر شہزادہ ارغون اور بایدو کے پاس جا کھڑا ہوا، بولا۔ ''میں پدر محترم کا وہ فرمان دیکھنا چاہتا ہوں جس نے ان کے پہلے فرمان کو منسوخ کر دیا۔''

شہزادہ ارغون نے اباقہ خان کا فرمان ولی عہد کو دکھا دیا۔

ولی عہد نے شہزادہ ارغون سے پوچھا۔ ''مگر یہ تو خود اپنے مجرموں کو معافی دلانے کیوں آ گیا؟''

شہزادے ارغون نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''کیونکہ میں ابھی مجرموں سے اپنے دشمنوں کے ہٹانے کا کام لوں گا۔''

ولی عہد نے حیرت سے کہا۔ ''میں تیری باتوں کا مطلب نہیں سمجھا۔''

شہزادے ارغون نے جواب دیا۔ ''لیکن میں نے ولی عہد کی باتوں کا مطلب خوب سمجھ لیا ہے۔''

ولی عہد نے زور دے کر کہا۔ ''لیکن یہ تینوں تیرے دشمن ہیں ارغون۔''

شہزادے نے جواب دیا۔ ''صرف دشمن ہی نہیں، پیارے دشمن ہیں۔ میں نے ان کی دشمنی اور دوستی کو سمجھ لیا ہے۔''

ولی عہد کا چہرہ اتر گیا، وہ بہت اداس ہو چکا تھا، بولا۔ ''ارغون! ایک نہ ایک دن تو بہت پچھتائے گا۔''

بایدو ابھی تک اپنے بھائی الغو کی ناک ہی درست کر رہا تھا۔

ولی عہد نے کہا۔ ''میں بادا جان سے خوب خوب جھگڑوں گا۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ وہ ایک فرمان دیتے ہیں اور دوسرے فرمان سے اسے منسوخ کر دیتے ہیں۔ یہ تو خاصی مضحکہ خیز بات ہوگئی۔''

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ''اور میں بھی یہ باور کراتا ہوں کہ اب ہم بے وقوف نہیں بن سکتے۔''

بایدو نے دور سے پوچھا۔ ''کون بے وقوف بن رہا ہے؟''

شہزادہ ارغون اور بایدو خان جب اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس جا رہے تھے تو ان کی چالوں سے ایک قسم کی تازگی اور فتح مندی کا احساس ہوتا تھا اور ولی عہد تکودار اور اس کے ساتھیوں کی چالوں سے تھکاوٹ اور شکست خوردگی کا احساس ہوتا تھا۔ یہ سب اپنے باپ اباقہ خان کی خدمت میں جا رہے تھے۔

اباقہ خان انہیں راستے ہی میں مل گیا۔ اس کے ساتھ شمس الدین جوینی بھی تھا۔ اباقہ خان اپنے ابلقی گھوڑے پر سوار اپنے بیٹوں کی چپقلش کا صحیح اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اس کو یہ خوف تھا کہ کہیں اس کے فرمانِ رہائی سے پہلے ہی تینوں کو زندہ دفن نہ کر دیا جائے لیکن جب اس نے سب کو صحیح سلامت دیکھا تو بڑی خوشی ہوئی۔ اس کو ولی عہد پر غصہ تھا کہ اس نے ایسی سازش کیوں کی؟

شہزادہ ارغون اور بایدو نے اباقہ خان کو آتے دیکھا تو دونوں بڑی گرم جوشی سے آگے بڑھے اور اباقہ خان کی رکاب پکڑ لی۔ بھتیجا الغو شرمندہ تھا، اس نے اپنا سر جھکا رکھا تھا۔ ولی عہد تکودار کو اپنی ناکامی پر جھنجلاہٹ تھی۔ اس نے اباقہ خان سے شکایت کی۔ ''بادا جان! یہ تینوں سازشی تھے، آپ نے انہیں معاف کیوں کر دیا؟''

اباقہ خان نے جواب دیا۔ ''محل چل، وہاں تفصیلی بات کروں گا۔''

الغو نے خلاف توقع اپنی زبان کھولی۔ ''ولی عہد بہادر! آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے، میں نے کوئی سازش نہیں کی اور نہ ہی کسی سازش میں شریک رہا ہوں۔ میں ایک نکما انسان ہوں، سست اور کاہل انسان۔ دوسروں کے دسترخوان سے اپنا پیٹ بھرنے والا، ایک پست حوصلہ انسان۔ سازش تو وہ لوگ کرتے ہیں جن میں حوصلہ ہوتا ہے اور جو کچھ بننا چاہتے ہیں۔''

اباقہ خان نے الغو کو ملامت کی۔ ''تو میرا بھتیجا ہے اور افسوس کہ تو نکما ہے اگر تو نکما نہ ہوتا تو شاید تجھے اتنی آسانی سے کسی سازش میں ملوث نہ کیا جا سکتا۔''

شمس الدین جوینی نے سب کو مفاہمانہ مشورہ دیا۔ ''شہزادوں کو اتفاق سے رہنا چاہیے۔ اگر گھر میں پھوٹ پڑ گئی تو دشمن سے مقابلہ کس طرح ہوگا؟''

شہزادہ وزیر سے ناخوش تھا، اس کا خیال تھا کہ اس سازش کے پیچھے وزیر جوینی ہی کی ذات ہے۔ اس نے

پیشانی پر بل ڈال کر وزیر کو دیکھا اور تلخ لہجے میں کہا۔ ''وزیر محترم! آپ خاموش رہیں کیونکہ اس نفاق اور نااتفاقی میں آپ ہی کی ذات کارفرما ہے۔''

اباقہ خان نے شہزادہ ارغون کو گھور کر دیکھا۔ ''ارغون! جوینی ایک مخلص انسان ہے۔ اس پر کسی قسم کا الزام لگا کر خود کو میری نظروں سے نہ گرا۔ تم لوگ جوینی کی فراست سے کام لے کر کارآمد بن سکتے ہو نہ کہ اس کو دشمن بنا کر نقصان اٹھاؤ۔''

شمس الدین جوینی نے نہایت فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شہزادے کو میری طرف سے کسی قسم کی غلط فہمی ہوگئی ہے جو دور ہو جائے گی اور یہ میرا فرض ہے کہ میں اسے دور کرنے کی کوشش کروں۔ شہزادہ ارغون کو میری بابت کم از کم یہ تو سوچنا ہی چاہیے کہ میرا عروج، میرا اقبال، میرا مقام جو کچھ بھی ہے اس حکومت کے بقا اور استحکام سے وابستہ ہے۔''

اباقہ خان نے ان سب کو اپنے خاص ہال نما کمرے میں لے جا کر حکم دیا کہ اس کے تیسرے بیٹے کیخا تو خان کو حاضر کیا جائے۔

جب کیخا تو خان بھی آ گیا تو اباقہ خان۔ نے ان سب کو سمجھایا۔ ''دیکھو، جب چنگیز خان نے جھیل بیکال کے چاروں طرف آباد قبائل کو متحد اور متفق کر دیا تھا تو اس نے دنیا کو فتح کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد بھی جب تک ہم میں اتحاد برقرار رہا، دنیا ہم سے مرعوب اور لرزہ براندام رہی لیکن پھر ہم میں نفاق اور نااتفاقی نے گھر کر لیا اور ہم آپس ہی میں برسرِ پیکار ہو گئے تو ہمارا رعب بھی کم ہو گیا اور مصر کے مملوک ہمارے مقابلے پر آ گئے۔ یہاں تک کہ ہمارے مشہور جنرل قطبوغا کو شکست ہو گئی ہے اور حقیقی بھائی بھائی کا دشمن ہو رہا ہے، یہ ساری ادبار کی نشانیاں ہیں۔''

اباقہ خان بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گیا اور ولی عہد تکودار کا ہاتھ پکڑ کے کھڑا کر دیا، پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟ یہ تمہارا کون ہے؟''

شہزادہ ارغون اور کیخا تو خان نے جواب دیا۔ ''ہمارا بڑا بھائی اور ولی عہد سلطنت۔''

ان کے بعد الغو اور بایدو نے جواب دیا۔ ''شہزادہ، ولی عہد شہزادہ ہمارا چچازاد بھائی۔''

اباقہ خان نے کہا۔ ''تم سب کا یہ فرض ہے کہ اس کا احترام کرو۔ اس کا حکم مانو اور کوئی ایسی بات نہ کرو جس سے آپس میں نااتفاقی پیدا ہو۔'' اور ولی عہد تکودار سے کہا۔

''اور ولی عہد تکودار! تم پر واجب ہے کہ اپنے بھائیوں اور عزیزوں کا خاص خیال رکھو۔ سازش کس نے کی اور کس کے خلاف کی، اس کو بھلا دو اور نئے سرے سے اتحاد اور یگانگت کا پیمان باندھو۔''

شہزادہ ارغون کھڑا ہو گیا۔ ''بابا جان! اگر شکایت نہ سمجھی جائے تو میں اپنے دل کی خلش آپ پر ظاہر کر دوں۔''

اباقہ خان نے جواب دیا۔ ''تم سب کو جو کچھ کہنا سننا ہو، اس وقت کہہ سن لو۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، کہیں یہ نہ ہو کہ میری آنکھیں بند ہوں اور حکومت کا شیرازہ ہی بکھر جائے۔''

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ''میں نے ہزابت کی جنگ میں چغتائیوں کو شکست دی اور ترمہ شیریں کو سونجاق سے چھین لایا۔ میرا خیال تھا کہ میری ان خدمات کے صلے میں مجھے اپنی جملہ افواج کا سپاہ سالار بنا دیا جائے گا لیکن مجھے اس سے محروم رکھا گیا۔''

اباقہ خان نے اعلان کیا۔ ''میں نے تجھے آج سے اپنی جملہ افواج کا سپاہ سالار اعلیٰ مقرر کیا۔''

شہزادہ ارغون اپنے باپ اباقہ خان کی طرف بڑھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ بولا۔ ''میں بھی وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ اپنے بھائی تکودار کا وفادار رہوں گا۔''

الغو خان بھی سب سے پہلے شہزادہ ارغون کی طرف بڑھا اور اس کو مبارکباد پیش کی۔ اباقہ خان مسکرایا اور کہا۔ ''الغو! تو شاید اس طرح ارغون کے دسترخوان پر اپنی جگہ بنا رہا ہے۔''

بایدو خان نے اپنے بھائی کو ملامت کی۔ ''بھائی الغو! تم مجھے ہر جگہ شرمندہ کراتے ہو۔ تم تلوار سنبھال کر میدان میں کیوں نہیں نکلتے۔ ہمارا رزق تلوار سے وابستہ ہے، اب نکما پن چھوڑو اور ہتھیاروں سے لیس ہو جاؤ۔''

اب اباقہ خان بہادر قتلق نویان سے مخاطب ہوا، بولا۔ ''قتلق نویان! میں نے تجھ پر ہمیشہ ہی فخر کیا ہے۔ تو وعدہ کر کہ تو ہمیشہ تکودار کا وفادار رہے گا۔''

قتلق نویان نے کمر سے بندھی ہوئی پیٹی کھول کر شہزادہ تکودار کی طرف بڑھا دی، بولا۔ ''ولی عہد بہادر! آپ یہ پیٹی اپنے ہاتھ سے میری کمر سے باندھ دیجیے تاکہ میں ان ہاتھوں کا ہمیشہ وفادار رہوں۔''

ولی عہد تکودار نے پیٹی اپنے ہاتھ سے قتلق نویان کی کمر سے باندھ دی۔ قتلق نویان ولی عہد کے روبرو دوزانو بیٹھ گیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو ادب و احترام سے بوسہ دیا، بولا۔ ''ان ہاتھوں کو مضبوط کرنے کے لیے میں اپنی

جان تک داؤ پر لگا دوں گا۔"

اب اباقہ خان شامان سے مخاطب ہوا۔ "ہاں شامان! اب تو بتا کہ ولی عہد نکودار کیسا حکمران ثابت ہوگا اور اس سلطنت کے استحکام اور زوال کا کیا حال رہے گا؟"

شامان نے اپنی آنکھیں بند کر کے گردن کو جھٹکا اور ہاتھوں کو ہوا میں بے معنی حرکت دیتا رہا، پھر آنکھیں کھول کر بولا۔ "ابھی ابھی مجھے پراسرار روحوں نے جو کچھ بتایا ہے اس کو صاف صاف بتا دوں گا تو آپ اور شہزادگان اسے برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

اباقہ خان نے کہا۔ "نہیں، ہم سب توجہ اور حوصلے سے سنیں گے۔ تجھ کو جو کچھ نظر آیا ہے، اسے صاف صاف بتا دے۔"

شامان نے کہا۔ "چونکہ مجھ پر ایک الزام لگ چکا ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ سچی بات کہہ کر قتل ہو جاؤں۔"

اباقہ خان نے وعدہ کیا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیری کسی بھی بات پر تجھے کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی۔"

شامان نے نہایت احتیاط سے بولنا شروع کر دیا۔ "پراسرار روحوں نے سرگوشیوں میں مجھے بتایا ہے کہ بھائیوں کے ایک دوسرے سے دل صاف نہیں ہیں، یہ آپس میں جھگڑیں گے، دو بھائی اپنے باپ دادا کے مسلک ترک کر دیں گے لیکن حکومت کو استحکام حاصل ہوگا۔"

اباقہ خان جھنجلا کر بولا۔ "اچھا، اب بند کر اپنی بکواس، اگر میں نے جاں بخشی نہ کی ہوتی تو تجھے اس منحوس پیش گوئی پر قتل کر دیتا۔"

شمس الدین جوینی سب کی باتیں سن رہا تھا اور خاموش تھا۔ اباقہ خان نے اس سے پوچھا۔ "شمس الدین! تو کیوں خاموش ہے؟ کچھ بولتا کیوں نہیں؟"

وزیر نے جواب دیا۔ "میں شامان کی باتوں پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ غیب کا علم صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسان دنوں، مہینوں اور سالوں کا حال کس طرح بتا سکتا ہے جبکہ اسے چند ساعتوں بعد پیش آنے والے واقعات کا بھی علم حاصل نہیں۔"

اباقہ خان نے شامان کو اسی وقت نکال باہر کیا اور یہ کہہ کر محفل برخاست کر دی "آپس میں محبت کرو اور کینہ اور بغض کو اپنے دلوں سے نکال دو، ورنہ پچھتاؤ گے۔ میرا کیا ہے آج ہوں، کل نہیں ہوں۔"

جب محفل برخاست ہوئی تو بظاہر شہزادوں کے چہرے بشاش تھے اور وہ خوش خوش جا رہے تھے مگر بایدو اور الغو کے چہرے فکر و تردد کی غمازی کر رہے تھے۔ ان دونوں نے باہر نکل کر ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر شہزادہ ارغون کا انتظار کیا، ولی عہد نکودار نے انہیں کھڑے دیکھا تو آگے بڑھ گیا۔ شمس الدین جوینی نے ان دونوں کی بابت ولی عہد نکودار کو سمجھایا۔ "ولی عہد بہادر! میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں کے دلوں میں کھوٹ ہے، یہ دونوں کسی بھی وقت آپ پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔"

ولی عہد نکودار نے جواب دیا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے لیکن میں ان سے ہوشیار رہوں گا۔"

نکودار کے سب سے چھوٹے بھائی کجتا تو خان نے کہا۔ "میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ چچا طرقائی کے بیٹوں کے دلوں میں حکومت کا سودا سمایا ہوا ہے بس وہ وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔"

شمس الدین جوینی نے اس کی تائید تو نہیں کی لیکن دل سے اس کا قائل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد شہزادہ ارغون بھی ادھر سے گزرا۔ اس کے ساتھ شامان بھی تھا۔ بایدو نے ارغون کو روک لیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ "شہزادے! ہم دونوں بھائی آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ "اور میں بھی لیکن اس وقت نہیں کسی اور وقت۔"

اتنا کہہ کر شہزادہ ارغون چلا گیا، اس کے بعد بایدو اور الغو بھی چلے گئے۔ شہزادہ ارغون سیدھا اپنے استاد اور مشیر سعد اللہ یہودی کے پاس پہنچا اور اس کو جملہ عساکر کا سپاہ سالار اعلیٰ بننے کی خوشخبری سنائی۔

سعد اللہ یہودی کی باچھیں کھل گئیں۔ "سچ؟ مگر یہ اچانک کس طرح ہو گیا؟"

ارغون نے پوری تفصیل بتا دی اور کہا۔ "پدر بزرگوار نے ہم بھائیوں میں اتکا تو کرا دیا ہے لیکن میرا خیال ہے ولی عہد نکودار اس سے خوش نہیں۔"

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ "جناب والا! خوش ہونے کی کوئی بات ہوتی تو وہ خوش بھی ہوتا۔ آپ کا سپاہ سالار ہو جانا اس کے لیے بڑی خطرناک بات ہے۔"

ارغون نے کہا۔ "ہم بھائیوں نے پدر بزرگوار سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم سب متحد اور متفق رہیں گے۔"

سعد اللہ یہودی نے کہا۔ "نہ نہ۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ نکودار... وزیر شمس الدین جوینی کے زیر اثر تقریباً مسلمان ہو چکا ہے اور حکومت پر قبضہ جمانے کے بعد وہ آپ سب کے خلاف کوئی

قدم اٹھائیے گا۔"

ارغون نے جوش میں جواب دیا۔ "اگر وہ ایسا کرے گا تو سخت غلطی کرے گا کیونکہ جملہ افواج تو میرے قبضے میں ہیں۔"

سعد اللہ یہودی بہت بے چین اور اضطراری حالت میں تھا، بولا۔ "مگر ایک بات کا بطور خاص خیال رکھیے گا۔ آپ کو جو کچھ بھی کرنا ہو انتہائی صبر اور تحمل سے کیجیے گا۔ دشمنی کسی سے بھی نہیں، دوستی سبھی سے، بظاہر آپ کا یہی نصب العین ہونا چاہیے مگر اندر سے دوست کسی کے بھی نہیں، دشمن سب کے، پرکار بند رہنا ہوگا۔ آپ کی زبان کچھ کہے گی اور دل کچھ اور کر گزرے گا۔ آپ بظاہر سب پر اعتماد کریں گے لیکن بہ باطن کسی پر اعتماد نہیں کریں گے۔"

شہزادہ ارغون سعد اللہ یہودی کی عقل و فراست کا بے حد قائل تھا۔ اس نے کہا۔ "میں تیرے مشوروں پر عمل کرتا رہوں گا اور جب میں برسر اقتدار آ جاؤں گا تو تجھ کو اپنا وزیر بنا لوں گا۔"

☆☆☆

ولی عہد نکودار شیخ سعدی کی خدمت میں کئی گھنٹے بیٹھا رہا۔ اس فقیر منش شخص کی ذات بڑی پُرکشش تھی۔ یہاں دور دور سے لوگ آتے تھے اور علم و دانش کی مزے دار نصیحتیں اور حکایتیں گرہ میں باندھ کر لے جاتے تھے۔ شیخ سعدی نے نکودار کو سمجھایا کہ تیرا باپ کب تک اسلام سے بچتا رہے گا۔ مہذب دنیا پر غیر مہذب لوگ کب تک حکومت کریں گے؟

ولی عہد نکودار نے عرض کیا۔ "شیخ! میں اپنے باپ سے یہ بات نہیں کہہ سکتا۔"

شیخ نے پوچھا۔ "اور خود تو نے کیا طے کیا ہے؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "جب تک میرا باپ زندہ ہے میں اس کا تابع ہوں۔ جب وہ نہیں ہوگا تب میں خود کوئی فیصلہ کرلوں گا۔"

شیخ اس کو دیر تک نصیحتیں کرتے رہے، انہوں نے کہا۔ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہاں جو بویا جائے گا آخرت میں وہی کاٹا جائے گا۔"

نکودار خوفزدہ ہو گیا، بولا۔ "شیخ! میں اپنے آبائی دین سے مطمئن نہیں ہوں لیکن باپ کی موجودگی میں اپنا آبائی دین بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں برائی کو برائی ہی سمجھتا ہوں اور اگر برائی کو اپنی زبان سے برا کہہ نہیں سکتا تو دل میں اس کو برا ضرور سمجھتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ اسلام میں اس کا بھی ثواب ہے۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "بے شک اس کا بھی ثواب ہے اور میری دعا ہے کہ خدا تجھ کو برائی کو برائی سمجھنے کی حد سے نکال کر برا کہنے اور برائی کو روکنے کی حدود میں داخل فرما دے۔"

نکودار شیخ کے پاس سے اٹھا تو بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ جیسے تیسے محل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس نے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی۔ شاہی محلات کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ انہی محلات میں بایدو اور الغو کے محل بھی تھے۔ بایدو کا خاندان محرابی دروازوں والے محل میں رہتا تھا۔ محرابی شکل کا پھاٹک ہر وقت بند رہتا تھا۔ اس پھاٹک میں ایک چھوٹا سا دروازہ بھی تھا۔ بایدو اور اس کے خاندان والے آمد و رفت کے لیے اسی چھوٹے دروازے کو استعمال کرتے تھے۔ پھاٹک کے دائیں بائیں چھوٹے بڑے درختوں کا ایک گھنا سلسلہ تھا۔ اس حصے میں بایدو خان کے خاندان کے بچے ہر وقت کھیل کود میں مشغول رہتے اور اسی حصے میں وہ تلوار بازی کی مشقیں بھی کیا کرتے تھے۔ یہاں پھولوں کی روشیں بھی تھیں، کئی قسموں کے گلاب اور جوہی، چنبیلی کے پودوں کی بہتات تھی۔

جب ولی عہد نکودار اس کے سامنے سے گزرا تو اچانک الغواس کے سامنے آ گیا اور بولا۔ "ولی عہد بہادر، کیا آپ ہمیں تھوڑا سا وقت دیں گے؟"

نکودار نے پوچھا۔ "کیوں؟ کوئی خاص بات؟"

الغو نے جواب دیا۔ "ہم دونوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، میں انہیں دور کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

نکودار نے کہا۔ "لیکن میرے دل میں تو کوئی غلط فہمی نہیں۔"

الغو نے عاجزی سے عرض کیا۔ "نکودار ولی عہد بہادر! آپ ٹھہرے ایل خان کے بیٹے، میں ایک معمولی آدمی ہوں لیکن خدا نے مجھے عقل بہت زیادہ دے دی ہے، آپ چاہیں تو میں آپ کو مفت مشورے دے سکتا ہوں۔ ان پر عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہوگا۔"

ولی عہد نکودار کو اس کی باتوں میں بڑا مزہ آیا، بولا۔ "اچھا چلو میں کچھ دیر تو تمہارے پاس بیٹھ ہی سکتا ہوں۔"

الغو، نکودار کو گلابوں کی روشوں میں لے گیا اور وہاں سبزے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔

الغو نے کہا۔ "ولی عہد بہادر! میں اپنے نکمے پن سے عاجز آ چکا ہوں، میں کسی حکمران کا مشیر بننا چاہتا ہوں، آپ چاہیں تو مجھے اپنا مشیر بنا لیں۔ میں بہت کارآمد انسان ہوں لیکن دوسروں کے لیے، اپنے لیے نہیں۔"

نکودار نے پوچھا۔ "اس وقت تجھے کون سی بات کرنا ہے؟"

الغو نے جواب دیا۔ "میں آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا

ہوں کہ بایدو خان اور میں، یعنی ہم دونوں بھائی آپ کے دوست ہیں۔"

نکودار نے چڑ کر کہا۔ "میں کب یہ کہتا ہوں کہ تم دونوں میرے دشمن ہو۔"

النغو نے کہا۔ "مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نکما ہوں، کوئی کام نہیں کرتا۔ میں ان طعنوں سے تنگ آچکا ہوں اور اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کوئی کام کروں، میں بنیادی طور پر سپاہی نہیں ہوں، مشیر یا تاجر ہوں۔ عنقریب میں ہندوستان جانے والا ہوں۔ وہاں سے میں کاریگر اور مزدور لاؤں گا پھر ان کاریگروں اور مزدوروں سے اس طرح کام لوں گا کہ جو کچھ وہ کمائیں گے، اس کا نصف مجھے دے دیا کریں گے۔"

نکودار نے جواب دیا۔ "النغو! شاید تمہیں یہ نہیں معلوم کہ ہندوستانی اپنی سرزمین نہیں چھوڑتے۔ ان کا یہاں تک لانا یا تو کسی فاتح کا کام ہے یا پھر کسی شاطر کا کام اور اتفاق کی بات کہ تم ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں ہو۔"

النغو نے مایوسی سے کہا۔ "میرا یہ منصوبہ ناقص ہے، چلو اس کو بھی چھوڑو۔ میں گھوڑوں کی تجارت شروع کردوں؟"

نکودار نے پوچھا۔ "گھوڑوں کی تجارت کے لیے آپ کے پاس دولت کتنی ہے؟"

النغو نے جواب دیا۔ "اس میں دولت کا کیا کام؟ حکومتوں سے پیشگی رقوم لے کر یہ کام کروں گا۔"

نکودار ہنسنے لگا۔ "حکومتیں تم پر اعتبار ہی کیوں کریں گی؟"

النغو نے اکڑ کر جواب دیا۔ "اگر وہ مجھ پر اعتبار نہیں کرسکتیں، تو میں ان پر اعتبار کیوں کروں، چلو یہ کام بھی چھوڑا۔ اب میں طبابت کروں گا۔"

نکودار نے ہنس کر کہا۔ "یہ کام بھی بہت مشکل ہے۔ یہ علم پڑھے لکھے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور تم ذرا بھی پڑھے لکھے نہیں۔"

النغو نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ پھر میں کیا کرسکتا ہوں؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "تمہارے لیے ایک کام ہے میرے ذہن میں، بشرطیکہ تم اسے کر بھی سکو۔"

النغو نے پوچھا۔ "کون سا کام؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "میدانِ جنگ کے مقتولوں کے لباس اور ہتھیار اتار اتار کر ان کا ذخیرہ کرو اور پھر اسے بیچ ڈالو۔ اس میں دولت کی بھی ضرورت نہیں اور کام بھی نہایت آسان ہے۔"

النغو کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں، بولا۔ "بہت خوب، بہت خوب۔" لیکن پھر فوراً ہی سرد پڑ گیا، بولا۔ "لیکن ولی عہد بہادر! یہ کام تو بہت خطرناک ہے۔ عین حالتِ جنگ میں مرنے والوں کے جسم سے کپڑے اور ہتھیار اتارنا کیا خطرناک بات نہیں؟ کوئی مجھے قتل بھی کرسکتا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ کوئی نیم مردہ سپاہی میرے ہی پیٹ میں اپنا خنجر اتار دے۔"

نکودار کو ہنسی آرہی تھی مگر وہ ضبط کیے ہوئے تھا، بولا۔ "ہے تو یہ بھی خطرناک کام۔ چلو کوئی اور کام سوچیں گے۔"

درختوں کے جھنڈ میں سے بایدو خان اچانک نمودار ہوا، اس نے نکودار کو النغو سے باتیں کرتے دیکھا تو تیکھے تیوروں سے پوچھا۔ "ولی عہد بہادر! آپ یہاں کیسے؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "میں اپنے محل جارہا تھا کہ بھائی النغو نے مجھے بلالیا اور کاروباری باتیں کرنے لگے۔"

بایدو نے خشک لہجے میں کہا۔ "ویسے میں خود بھی آپ سے ملنا چاہتا تھا، چلو اچھا ہوا جو یہاں ملاقات ہوگئی۔"

نکودار نے ازراہِ مذاق پوچھا۔ "کیا تمہیں بھی اسی قسم کی باتیں کرنا ہیں جیسی بھائی النغو نے کیں۔"

بایدو نے تنک کر جواب دیا۔ "ولی عہد بہادر! میں کوئی بے سروپا انسان نہیں ہوں۔ النغو کا میں بھائی ضرور ہوں لیکن النغو جیسا ہرگز نہیں۔ میں بہت دنوں سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے وہ سازش کی کیوں تھی؟"

نکودار نے کہا۔ "سازش کس نے کس کے خلاف کی تھی، میں خود بھی یہ جاننا چاہتا ہوں اور اس کا صحیح جواب مقتول گوتیے نے دیا بھی تھا لیکن افسوس کہ باوا جان نے درگزر کیا حالانکہ میں خود درگزر کا قائل نہیں ہوں۔"

بایدو نے سختی سے کہا۔ "وہ سازش آپ کی تیار کردہ تھی اور آپ نے گوتیے کو لالچ اور دھمکی دے کر اقراری گواہ بنالیا تھا پھر اس کو قتل بھی کرایا۔ اگر وہ گوتیا زندہ رہتا تو اصل سازشیوں کے چہروں سے نقابیں اتر چکی ہوتیں۔"

نکودار مشتعل ہوگیا۔ "بایدو! زیادہ باتیں نہ کرو، ہمیں تمہارے ارادوں کا علم ہوچکا ہے۔ دراصل تم لوگ حکومت کے خواب دیکھ رہے ہو۔"

بایدو اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کررہا تھا۔ "یہ بھی آپ کا الزام ہے ولی عہد بہادر! ایسی باتیں نہ کیجیے جس سے قبائلی اور خاندانی اتحاد پارہ پارہ ہوجائے۔"

نکودار زور زور سے پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

نکودار بھاگا بھاگا وزیر شمس الدین جوینی کے پاس پہنچا اور ساری باتیں اس کے علم میں لا کر مشورہ طلب کیا۔
''وزیر محترم! ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''
وزیر نے جواب دیا۔ ''ولی عہد بہادر! آپ کو یہ ساری باتیں بایدو سے نہیں کرنی تھیں۔ تحمل سے کام لیجیے ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''
نکودار نے مشورتاً پوچھا۔ ''کیا میں اس واقعے کو پدر بزرگوار کے علم میں لے آؤں؟''
وزیر نے جواب دیا۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''
نکودار کو سخت غصہ تھا کہ اس کی کوئی بات مانی ہی نہیں، پھر بھی خاموش تھا۔

☆☆☆

سعد اللہ یہودی نے شہزادہ ارغون کو ہر بار یہی نصیحت کی کہ وہ تحمل سے کام لیتا رہے۔ اس طرح ہر کام آسان ہو جائے گا اور شہزادہ ارغون بھی حالاتِ حاضرہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ دوسری طرف ولی عہد نکودار، شہزادہ ارغون سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ شمس الدین جوینی کے مشوروں کی روشنی میں اپنا ہر قدم اٹھا رہا تھا۔ نکودار کو بار بار یہ خبر مل رہی تھی کہ بایدو اور الغو شہزادہ ارغون سے مسلسل ملاقاتیں کر رہے ہیں اور سعد اللہ یہودی کی پراسرار حرکات بھی علم میں آ رہی تھیں۔ یہ یہودی اپنا زیادہ تر وقت شہزادہ ارغون کے پاس گزار رہا تھا۔ کبھی کبھی یہ بایدو کے پاس بھی دیکھا گیا تھا۔

اباقہ خان اپنے بیٹوں کی کشمکش کو بڑی گہری نظروں سے دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس اندرونی اور محلاتی خلفشار کے علاوہ برقائی خاندان اور چغتائی خاندان سے بھی برسرِ پیکار تھا۔ وہ جنگ سے بچنا چاہتا تھا لیکن جنگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اسی دوران وہ بیمار پڑ گیا۔ قابل ترین اطبا کی ایک جماعت اس کے علاج معالجے پر مامور ہو گئی۔ اباقہ خان اپنی بیماری کی خبر چھپاتا رہا۔ وزیر شمس الدین جوینی، شہزادگان اور بایدو اور الغو کے علاوہ بیماری کا کسی کو علم نہیں تھا۔

سعد اللہ یہودی شہزادہ ارغون کو تاکید کر رہا تھا کہ وہ اپنے باپ اباقہ خان کے ساتھ اپنا بیشتر وقت گزارے۔
شمس الدین جوینی، ولی عہد نکودار کو سمجھا رہا تھا کہ انسان کی زندگی کا کیا بھروسا، اباقہ خان کی زندگی کا بھی کوئی بھروسا نہیں، معلوم نہیں یہ چراغ کب بجھ جائے۔ اس لیے انسان کو مستعد اور چوکس رہنا چاہیے۔ شہزادگان باپ کی بیماری کو مرگ کا آزار سمجھ رہے تھے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کے خلاف شکایتوں کا طومار باندھے ہوئے تھے۔
اباقہ خان ان سے تنگ آ چکا تھا۔ اس نے سبھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''حالانکہ تم سب اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تم سب کو متحد اور متفق دیکھنا چاہتا ہوں مگر تم سب نفاق اور نااتفاقی کے شکار ہو، آخر ایسا کیوں ہے؟''
شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ''پدر بزرگوار! اتحاد اور اتفاق کے لیے خیالات اور آراء کا اتفاق بھی ضروری ہے جبکہ میں شہزادگان میں سے بعض کو اسلام کی طرف مائل دیکھ رہا ہوں۔ کیا منگول عساکر کسی مسلمان حکمران کا اقتدار گوارا کریں گے؟''
اباقہ خان نے پوچھا۔ ''تیرا اشارہ کس کی طرف ہے؟''
شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ''آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔''
ولی عہد نکودار کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وزیر نے اس کے پاؤں کا انگوٹھا دبا کے روک دیا۔
اباقہ خان نے سختی سے پوچھا۔ ''میں اس کا نام تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''
شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ''اگر میں یہاں اس کا نام لے لوں گا تو نفاق اور اختلاف کی خلیج میں کچھ اور اضافہ ہو جائے گا۔''
اباقہ خان نے اصرار کیا۔ ''اس کا نام تو تجھے بتانا ہی پڑے گا۔''
ارغون نے جواب دیا۔ ''تب پھر میں اس کا نام تخلیہ میں بتا دوں گا۔''
اباقہ خان نے اس موضوع کو یہیں پر ختم کر دیا اور شہزادہ ارغون کو حکم دیا کہ وہ رات کو سوتے سے پہلے اس سے ملاقات کرے۔
جب سب لوگ چلے گئے تو اباقہ خان نے ولی عہد نکودار کو مخاطب کیا اور ترچھی نظروں سے گھورتے ہوئے بے رخی سے کہا۔ ''نکودار! تجھ کو کچھ معلوم ہے کہ ارغون کا اشارہ کس طرف تھا؟''
نکودار نے جواب دیا۔ ''پتا نہیں۔ میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔''
اباقہ خان نے کہا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ ارغون نے جو کچھ کہا درست ہے۔''
نکودار نے بے توجہی سے جواب دیا۔ ''ہو سکتا ہے، درست ہو۔''

اباقہ خان نے جھنجلا کر کہا۔ ''ارغون کا اشارہ تیری طرف تھا۔ دراصل وہ تیری شکایت کر رہا تھا۔''

نکودار نے مشتعل ہوئے بغیر جواب دیا۔ ''ارغون کو معلوم نہیں کیوں غلط فہمی سی ہو گئی ہے۔''

اباقہ خان نے پوچھا۔ ''کیا تو اسلام کی طرف مائل نہیں ہے؟''

نکودار نے الٹا سوال کر دیا۔ ''اسلام کی طرف مائل ہونا کیا معنی؟ آپ نے شمس الدین جوینی کو اپنا وزیر بنالیا اور آپ سے پہلے دادا ہلاکو خان نے شمس الدین جوینی پر بے حد اعتماد کیا اور دادا کی ہدایت اور وصیت کے مطابق ہی آپ نے جوینی کو اپنا وزیر بنالیا۔ کیا اپنے اس عمل سے آپ دونوں مسلمان تصور کیے جائیں گے؟''

اباقہ خان نے گھبرا کر جواب دیا۔ ''نہیں تو، اس طرح ہم مسلمان کیوں تصور ہوں گے؟''

نکودار نے کہا۔ ''میں شمس الدین جوینی کا احترام کرتا ہوں اور اپنے مشکل معاملات میں اس سے مشورے لیتا ہوں۔ بس اسی سے میری بابت یہ رائے قائم کر لی گئی کہ میں اسلام کی طرف مائل ہوں۔''

اباقہ خان لاجواب ہو گیا۔ رات کو تخلیہ میں جب شہزادہ ارغون نے ولی عہد نکودار کا نام لے کر یہ شبہ ظاہر کیا کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہے تو اباقہ خان نے اس الزام کو مسترد کر دیا اور شہزادہ ارغون اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اس موقع پر اباقہ خان نے کہا۔ ''او ارغون! نکودار تجھ پر الزام لگا رہا تھا کہ تو یہودیت کی طرف مائل ہے کیونکہ تو سعد اللہ یہودی پر بہت اعتماد کرتا ہے لیکن میں نے نکودار کے اس الزام کو اسی طرح مسترد کر دیا جس طرح تیرا الزام نکودار پر......''

اباقہ خان کے جوڑوں میں بڑی تکلیف تھی۔ اس نے باتیں کرتے کرتے اپنا داہنا ہاتھ اوپر جو اٹھایا تو درد کی ٹیس سے اس کی آہ نکل گئی۔ اس نے کراہتے ہوئے شہزادہ ارغون کو سمجھایا۔ ''بیٹے ارغون! جس طرح بہت سارے ریشے آپس میں پیوست و ہم رشتہ ہو کر مضبوط رسّی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اسی طرح خاندانی اور نسلی اتفاق انسان کو چنگیز خان، خاقان اور ہلاکو خان بنا دیتا ہے۔ ارغون! اپنے بھائیوں سے بدظن نہ ہو، ان پر اعتبار کر اور طاقت کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جا۔''

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں، ترمہ شیریں اچانک آ گئی۔ کافوری شمعوں کی تیز روشنی میں شہزادہ ارغون اور ترمہ شیریں کی نظریں متصادم ہوئیں۔ اباقہ خان نے شہزادے کو حکم دیا۔ ''اب تو جا سکتا ہے۔''

لیکن شہزادہ رکا رہا۔ اس نے ترمہ شیریں کے چہرے پر بلا کی تازگی اور کشش محسوس کی، جیسے ترمہ شیریں پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی تھی۔

اباقہ خان نے سختی سے کہا۔ ''ارغون! اب تو جا سکتا ہے۔''

لیکن شہزادہ ارغون پھر بھی بیٹھا رہا، اس نے کہا۔ ''میں آپ کی صحت کی طرف سے بہت زیادہ فکرمند ہوں بابا جان..... آپ فرمائیں تو اصفہان اور بغداد سے مزید طبیب بلا لیے جائیں۔''

ترمہ شیریں کو بھی شہزادہ ارغون کی حکم عدولی گراں گزر رہی تھی، اس نے شہزادے کا نام لیے بغیر کہا۔ ''ایل خان کا حکم واجب التعمیل ہے۔ اس کو نہ ماننا گستاخی ہے بلکہ جرم بھی۔ اگر ایل خان کا حکم نہ مانا گیا تو میں خود یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

اباقہ خان کو غصہ آ گیا۔ وہ مشتعل ہو کر اٹھا تو اس کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا، پھر بھی اس نے شہزادے کو ڈانٹا۔ ''ارغون! تو نے میرا حکم نہیں سنا! اب تو چلا جا یہاں سے۔''

شہزادہ ارغون چلے جانے پر مجبور ہو گیا تو اس نے چلتے چلتے کہا۔ ''بابا جان! میں جاتا ہوں لیکن یہ خاتون ہم دونوں میں اختلاف کا سبب خوامخواہ بن رہی ہیں۔ افسوس کہ انہوں نے میری اماں کا حق غصب کر لیا۔ میں انہیں بھول نہیں سکتا، ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

شہزادہ چلا گیا۔ ترمہ شیریں نے اس کی شکایت کی۔ ''ایل خان! آپ کا یہ بیٹا مہذب نہیں ہے۔ اس کی باتوں میں سرکشی پائی جاتی ہے اور یہ ہم میں سے کسی کا وفادار نہیں ہے۔''

اباقہ خان درد اور غصے سے کراہ رہا تھا، بولا۔ ''ترمہ شیریں! میں خود کو بدقسمت سمجھتا ہوں، میں چاہتا ہوں میری اولاد متحد رہے اور مل جل کر حکومت کرے لیکن اس کا مزاج نفاق اور انتشار پر مائل ہے۔''

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ''ولی عہد نکودار آپ کی جانشینی کا سچا مستحق ہے، بقیہ میری سمجھ میں نہیں آئے۔''

اباقہ خان بہت افسردہ تھا، بولا۔ ''نکودار بھی زیادہ سمجھ دار نہیں ہے۔ اس کی اپنی رائے نہیں ہوتی، وہ کسی عقلمند پر تکیہ کرنا چاہتا ہے جبکہ میرے آبا و اجداد سنتے سب کی تھے مگر کرتے وہ تھے جس پر ان کا دل گواہی دیتا تھا۔ میرا ولی عہد ایک ایسا شخص بن سکتا ہے جو اپنی عقل سے فیصلے کر سکتا ہو، جس کی اپنی رائے ہو اور جو مصلحت اندیشی کا شکار نہ ہو جاتا ہو۔''

ترمہ شیریں باتیں کرتے کرتے اداس ہوگئی۔ اس نے بات چیت کا سلسلہ ہی بند کر دیا۔

اباقہ خان نے پوچھا۔ ”تو کیا سوچنے لگی ترمہ شیریں! تو خاموش کیوں ہوگئی؟“

ترمہ شیریں نے پژمردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”محترم ایل خان! میرا عروج اور اقبال آپ کی زندگی اور ذات سے وابستہ ہے۔ آپ بیمار ہیں تو میں پریشان ہوں۔ اگر خدانخواستہ آپ کے دشمنوں کو کچھ ہوگیا، تو میں کہاں جاؤں گی..... میرا کیا حشر ہوگا؟“

اباقہ خان نے اسے تسلی دی۔ ”ترمہ شیریں! تو بلاوجہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہے، اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ میرے بعد منگول قانون کے مطابق تو میرے کسی بیٹے کے حوالے کر دی جائے گی تو تیرا خیال غلط ہوگا۔ ولی عہد تگودار ذہنی طور پر اسلام کی طرف مائل ہے اس لیے وہ تیرا احترام کرے گا اور تجھ کو اپنی ماں کی طرح سمجھے گا۔ تگودار کی موجودگی میں اس کا کوئی دوسرا بھائی تجھ پر اپنا حق نہیں جتا سکے گا۔“

ترمہ شیریں نے کہا۔ ”محترم ایل خان! آپ کے بعد میں یہاں نہیں رہوں گی، کہیں اور چلی جاؤں گی۔“

اباقہ خان اٹھ کر بیٹھ گیا، بولا۔ ”تو نے کیا کہا؟ میرے بعد تو یہاں نہیں رہے گی، کہیں اور چلی جائے گی اور کہاں چلی جائے گی؟ کس کے پاس چلی جائے گی؟ کیا چغتائی شہزادے سونجاق کے پاس چلی جائے گی؟ کیا وہ ابھی تک تیرے دل میں موجود ہے؟“

ترمہ شیریں نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”نہیں محترم ایل خان! ایسا نہیں ہوگا، میں شہزادہ سونجاق کے پاس کیوں جاؤں گی۔“

اباقہ خان نے کہا۔ ”ترمہ شیریں! مرنے سے پہلے میں تیری بابت یہ فیصلہ کر کے جاؤں گا کہ تو میرے بعد بھی اسی محل میں رہے گی۔ تو اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکے گی۔“

ترمہ شیریں نے کہا۔ ”تب پھر ایل خان! آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اگر آپ کے بعد بھی اسی محل میں رہی تو پھر مجھے شہزادہ ارغون سے کوئی بھی نہیں بچا سکے گا۔ اس کا دل ابھی تک میری طرف سے صاف نہیں ہے۔“

اباقہ خان درد کی شدت سے پھر لیٹ گیا۔ وہ تڑپنے لگا، اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ”اگر شہزادہ ارغون نے تجھ کو اپنی بیوی بھی بنا لیا تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر میرے باپ ہلاکو خان کی بیوی بھی تو پہلے اس کی ماں تھی۔ میری ماں

عقل مندی

ایک بس جا رہی تھی جس کی چھت کے اوپر بیٹھے آدمی نے نیچے بیٹھے ہوئے آدمی کو آواز دی۔

”شمشاد!“ ایک نیچے بیٹھے ہوئے شخص نے سر نکالا تو اوپر والے نے اس کے سر پر جوتا دے مارا چنانچہ اس نے پھر سر اندر کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد اوپر والے نے پھر آواز لگائی۔ ”شمشاد!“

نیچے والے نے پھر سر نکالا تو اوپر والے نے پھر جوتا سر پر دے مارا۔ چنانچہ اس نے اپنا سر اندر کر لیا۔

یہ منظر دیکھ کر برابر بیٹھے ہوئے آدمی نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تمہارا نام شمشاد ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں اس کو بے وقوف بنا رہا ہوں۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

دوقوز پہلے میرے دادا تولوئی کی بیوی تھی، پھر جب میرا دادا مر گیا تو میرے باپ ہلاکو خان نے اسے اپنی بیوی بنا لیا۔ منگول قانون جب ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔“

ترمہ شیریں حیرت سے اباقہ خان کی صورت دیکھے جا رہی تھی۔ ”لیکن میں..... مجھے اس رشتے سے گھن آتی ہے۔“

اباقہ خان نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”اچھا اب تو چپ ہو جا۔“

اباقہ خان خود بھی چند لمحوں کے لیے چپ ہوگیا۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھا اور رک رک کر تین بار تالی بجائی۔ جواب میں کئی خدمت گار خواتین اندر داخل ہوئیں اور حکم کا انتظار کرنے لگیں۔

اباقہ خان نے انہیں حکم دیا کہ اس کے پورے جسم پر تیل کی مالش کی جائے۔ یہ تیل حکیموں نے نہایت قیمتی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا تھا اور اس کی مالش سے اسے کسی قدر افاقہ حاصل ہو جاتا تھا۔

خدمت گار خواتین نے نہایت توجہ اور محنت سے تیل کی مالش شروع کر دی، اباقہ خان درد سے کراہ رہا تھا۔ وہ کبھی چت ہو جاتا، کبھی اوندھے منہ لیٹ جاتا، کبھی داہنی

کروٹ پڑ جاتا اور کبھی بائیں کروٹ۔

☆☆☆

دو ماہ دس دن تک وہ بسترِ مرگ پر پڑا موت سے لڑتا رہا۔ پھر دواؤں نے اپنا اثر دکھایا اور وہ ٹھیک ہونے لگا۔

شہزادہ ارغون اپنے یہودی مشیر سعد اللہ سے مشورے کر کے نہایت اہم منصوبے بنا چکا تھا مگر جب اباقہ خان صحت یاب ہو گیا تو اس کو بڑی مایوسی ہوئی۔

شمس الدین جوینی بہت خوش تھا کیونکہ اباقہ خان کی علالت کے دوران حالات جو رخ اختیار کر رہے تھے، اس سے وہ فکر مند ہو گیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا، اباقہ خان کے طفیل اور مرضی سے تھا۔ ولی عہد تکودار بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کا باپ اس بیماری سے جانبر نہیں ہو سکے گا مگر جب وہ ٹھیک ہو گیا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔

اباقہ خان کو غسل کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اطبائے خصوصی نے غسل کے لیے بہت ساری دواؤں پر مشتمل ایک نسخہ تیار کیا۔ ان ادویات کو پانی سے بھری ہوئی دیگوں میں ڈال دیا گیا اور پھر چولہوں میں آگ جلا دی گئی۔ یہ دوائیں کافی دیر تک پانی میں ابلتی اور جوش کھاتی رہیں۔ اسی دوران اباقہ خان کو غسل کے لیے تیار رکھا گیا۔ کئی حسین وجمیل عورتوں نے اباقہ خان کو اپنے ہاتھوں سے نہلایا' کمزوری کی وجہ سے ہوا اسے تکلیف پہنچا رہی تھی۔

دوسری طرف وزیر شمس الدین جوینی نے صحت یابی کی خوشی میں ایک جشن کا اہتمام کیا تھا۔ شاہی عمارتوں کو خوب سجا دیا گیا تھا اور ان کی دیواروں کو ہندوؤں کی دیوالی کی طرح چراغاں سے جگمگا دیا گیا تھا۔ محل کے باہر میدان میں زریں خیمہ نصب کرا دیا گیا تھا۔

اس خیمے میں کئی ہزار آدمی دعوت کے مزے لوٹ سکتے تھے۔ اس خیمے میں خشک میوے، پھل، گوشت کی بڑی بڑی قابیں، شراب اور گھوڑی کا دودھ وافر مقدار میں رکھ دیا گیا تھا۔ جب امراء اور سرداروں کو جشنِ صحت یابی سے لطف اندوز ہونے کی اجازت مل گئی تو وہ کھانے پینے پر ٹوٹ پڑے۔

محل کے اندر شہزادگان اور شاہی خاندان کے دوسرے لوگوں کے لیے علیحدہ انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں خواتین اور مرد یکجا تھے۔ ان میں ولی عہد تکودار، شہزادہ ارغون اور شہزادہ کیخاتو خان بھی تھے اور بایدو اور الغو بھی۔ ہر شخص خوش نظر آ رہا تھا۔ خود اباقہ خان ایک چھوٹے مگر اونچے تخت پر بیٹھا خوش وخرم مرد اور خواتین کا نظارہ کر رہا تھا۔ انہی میں ترمہ شیریں بھی شامل تھی۔ شہزادہ ارغون کی نظریں ترمہ شیریں کا پیچھا کر رہی تھیں۔

ترمہ شیریں شہزادہ ارغون سے دور چلی گئی۔ ایک جھاڑی میں جہاں مہندی اور لیمو کے درختوں کی کثرت تھی، ترمہ شیریں دو خواتین کے ساتھ اس جھاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ بھی بہت خوش تھی۔ شہزادہ ارغون ترمہ شیریں کو جھاڑی میں چھپتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ ادھر ادھر تلاش کرتا ہوا جھاڑی تک جا پہنچا۔ یہاں ترمہ شیریں اپنی سہیلی کی کسی بات پر زور زور سے ہنس رہی تھی۔ وہ اس ہنسی پر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر مہندی اور لیمو کے درختوں کو تکتا رہا پھر دونوں ہاتھوں سے درختوں کی شاخیں ہٹاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

ترمہ شیریں اور اس کی سہیلیاں گھبرا گئیں لیکن اپنے سامنے شہزادے کو دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ ترمہ شیریں نے منہ بنایا۔

شہزادہ ارغون نے انہیں مخاطب کیا۔ ''ترمہ شیریں کے سوا ہر عورت جا سکتی ہے۔ دراصل میں ترمہ شیریں کی وجہ سے یہاں آ گیا ہوں۔''

دل نہ چاہنے کے باوجود عورتیں وہاں سے جانے لگیں۔ ان کے ساتھ ترمہ شیریں بھی چلی مگر شہزادے نے اس کا راستہ روک لیا، بولا۔ ''ترمہ شیریں! تم کہاں چلیں؟''

ترمہ شیریں نے ٹھنک کر کہا۔ ''ارغون! میرا راستہ چھوڑ دو، میری راہ سے ہٹ جاؤ۔''

شہزادے نے کہا۔ ''مگر کیوں؟ میں تم سے ملنے آیا ہوں، میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔''

شہزادے نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں، تم مجھ سے بات نہ کرو، میری باتیں سن تو سکتی ہو۔ بس میرے لیے یہی کافی ہے۔''

ترمہ شیریں نے دھمکی دی۔ ''اپنی ان جسارتوں کا انجام بھی معلوم ہے تمہیں؟''

شہزادے نے جواب دیا۔ ''کیسی جسارتیں: اور کیسا انجام، میں سردست اس رشتے کا احترام کروں گا جو ہمارے درمیان حائل ہے کیونکہ میرا باپ ابھی زندہ ہے۔''

عورتیں جا چکی تھیں، شہزادے نے ترمہ شیریں کے شانوں کو زور سے دبایا۔ ''بیٹھ جاؤ ترمہ شیریں...... کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاؤ، میری خاطر، میری خوشی کے لیے۔''

ترمہ شیریں نے اسے دھکا دے کر اپنی راہ سے گرا دینا چاہا مگر طاقتور شہزادہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ شہزادے کو ہنسی آ گئی بولا۔ ''خوب! ایک بار اور سہی، میں

ان باتوں کا برا نہیں مانتا۔"

ترمہ شیریں عاجز آ کر بیٹھ گئی۔ "بولو تم مجھ سے کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟"

شہزادہ ارغون نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ترمہ شیریں! میں برا آدمی نہیں ہوں۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "میں نے یہ کب اور کس سے کہا کہ تم برے آدمی ہو۔"

شہزادہ اس کی آنکھوں میں جھانکے جا رہا تھا۔ "تم نے کہا تو کسی سے بھی نہیں لیکن تمہارا طرزِ عمل تو یہی بتاتا ہے۔"

ترمہ شیریں نے منہ پھیر لیا۔ "یہ تم میری آنکھوں میں کیا دیکھ رہے ہو؟ میں تمہارے باپ کی بیوی ہوں۔"

شہزادے نے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں ترمہ شیریں۔ یہ سوچ سوچ کر میں خوش ہوتا رہتا ہوں کہ میں یا میرا باپ مسلمان نہیں ہیں۔ اگر ہم مسلمان ہوتے تو بڑی اذیت اور پریشانی کی بات ہوتی۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "یہ یہاں اسلام کا ذکر کیسے آ گیا۔ اگر تم دونوں مسلمان ہوتے تو انسان ہوتے۔"

شہزادے نے کہا۔ "ایسی بات نہ کہو ترمہ شیریں! اگر میں مسلمان ہوتا تو میں کسی طرح بھی تمہیں حاصل نہیں کر سکتا لیکن یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم منگول ہیں اور منگول قانون ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے کہ ہم اپنے باپ کی بیویوں کو اس کے بعد اپنی بیوی بنا لیں۔"

ترمہ شیریں دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ "چھی چھی۔ بڑا جاہلانہ قانون ہے۔ مجھے تو سوچ سوچ کر گھن آتی ہے۔"

شہزادے نے اپنا ہاتھ ترمہ شیریں کے بالوں پر رکھ دیا۔ "ترمہ! میں حد سے تجاوز نہیں کروں گا، بس میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں جب تب دیکھ لیا کروں، تم سے باتیں کر لیا کروں، اس کے سوا کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "شہزادے! میرے بالوں پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لو اور یہاں سے نکل کر کسی کھلی جگہ بیٹھ کر باتیں کرو۔ تمہارا باپ اباقہ خان ایک مغضوب الغضب انسان ہے، وہ ناراض ہو سکتا ہے۔"

شہزادے نے کہا۔ "میں خود بھی یہی چاہتا ہوں لیکن وہاں ہم دونوں بہتوں کی نظر میں آ جائیں گے اور اس بات کا بھی ڈر ہے کہ نیم مسلمان نکودار ہم سے جھگڑ پڑے جبکہ باوا جان نے شہزادگان کو اتحاد اور اتفاق کا درس دیا ہے۔"

ترمہ شیریں تیزی سے اٹھی اور جھاڑی سے باہر نکل گئی، بولی۔ "لیکن میں یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔"

شہزادہ اس اچانک اقدام سے ہکا بکا رہ گیا۔ وہ بھی جھاڑی سے نکلا۔ جھاڑی سے باہر کا منظر ہی عجیب تھا۔ وہاں بایدو، الغو اور نکودار اور چند خواتین چپ چاپ کھڑے ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ شہزادے نے ان سب کو دیکھا اور کوئی پروا کیے بغیر جانے لگا۔ ترمہ شیریں کہیں غائب ہو چکی تھی۔ ولی عہد نکودار نے نفرت سے منہ بنایا اور شہزادے کو سمجھایا۔ "ارغون! ترمہ شیریں تیری ماں ہے۔"

شہزادے نے بیزاری سے جواب دیا۔ "اگر ماں ہے تو میں کیا کروں؟"

نکودار نے کہا۔ "وہ تیری ماں ہے، تو اس کا احترام کرو۔"

شہزادے نے جواب دیا۔ "میں اس کا احترام کر رہا ہوں اور اس وقت تک احترام کرتا رہوں گا جب تک وہ میری ماں ہے۔"

بایدو نے شہزادے کی حمایت کی۔ "بیشک یہ احترام اسی وقت تک واجب بھی ہے۔"

نکودار نے کہا۔ "اب ہم لوگ قراقرم میں نہیں رہتے، اب ہم جن اقوام اور مذاہب کے درمیان رہتے ہیں، ان کے ہاں یہ رشتہ جائز نہیں ہے۔"

بایدو نے پوچھا۔ "ولی عہد بہادر! کیا ہم اپنے قانون چھوڑ دیں گے؟ کیا ہم اپنے آبائی قوانین کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے قوانین پر قربان کر دیں گے؟ کیا مسلمانوں اور عیسائیوں نے ہمارے قوانین اختیار کر لیے ہیں؟ جب انہوں نے ہمارے قوانین نہیں اختیار کیے تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ ان کے قوانین اختیار کریں۔"

نکودار نے بایدو کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "بایدو! تم ہم دونوں بھائیوں کے معاملات میں نہ بولو تو بڑی اچھی بات ہے۔"

بایدو برہم ہو گیا۔ "یہ کیسی بات ہے کہ میں کسی گے معاملے میں بول ہی نہیں سکتا۔"

نکودار نے جواب دیا۔ "بایدو شہزادے! تم میرے معاملات میں دخل نہ دو۔ یہ آخری موقع دے رہا ہوں تجھ کو۔"

بایدو نے کہا۔ "ولی عہد بہادر! آپ بھی منگول قوانین میں بے جا دخل اندازی نہ کریں۔"

الغو ان کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا، بولا۔ "بھائیو! آپس میں جھگڑو نہیں، اگر پسند کرو تو میں تمہیں گراں قدر مشورے دے سکتا ہوں۔ میرے پاس منصوبوں اور تجویزوں کی کوئی کمی نہیں۔"

نکودار نے الغو کو ڈانٹ دیا۔ "چپ رہ نکّے تو جوان!

آئندہ میں تیری دخل اندازی برداشت نہیں کروں گا۔"
الغو نے جواب دیا۔ "میں دخل کب دے رہا ہوں؟ میں تو مشورہ دے رہا ہوں۔ میرا مشورہ آپ دونوں کو یہ ہے کہ جو اسلام سے متاثر ہے، وہ اسلامی قوانین پر چلے اور جو منگول قوانین کا احترام کرتا ہے، وہ منگول قوانین کا احترام کرے۔"

شہزادہ ارغون ہنسنے لگا، اس نے تالی بجائی۔ "زندہ باد الغو میرے بھائی زندہ باد...... کیا اچھا مشورہ دیا ہے تو نے۔"

الغو خوشی سے پھولا نہ سمایا، بولا۔ "پھر بھی لوگ مجھے نکما اور کاہل کہتے ہیں۔ میرے مشوروں سے دوسرے تو فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن میں خود نہیں اٹھا سکتا۔"

ولی عہد نے شہزادہ ارغون سے کہا۔ "تم تو یہیں رکو، بقیہ لوگ جا سکتے ہیں۔"

شہزادہ ارغون قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ "جب سب لوگ جا سکتے ہیں تو میں بھی جا سکتا ہوں۔"

یہ کہتا ہوا وہ بایدو اور الغو کے ساتھ چلا گیا۔ ولی عہد نکودار انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ اس کے بعد وہ ترمہ شیریں کو تلاش کر کے ملا، بولا۔

"مادر محترم! آپ نے ارغون کو مایوس کر دیا، بہت اچھا کیا۔ بہرحال کوئی آپ کا ساتھ دے یا نہ دے لیکن میں ضرور دوں گا۔"

ترمہ شیریں نے سرگوشی میں کہا۔ "نکودار! تم چاہو تو میری ایک مدد کر سکتے ہو۔"

نکودار نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "جب میں اس محل میں تنہا رہ جاؤں تو تم مجھے کسی طرح یہاں سے نکلوا دینا۔"

نکودار نے کہا۔ "وقت آنے دو، جو مناسب ہوگا، اس پر عمل کروں گا۔"

اباقہ خان کو ترمہ شیریں کی تلاش تھی، کئی خدمت گار خواتین اسے تلاش کرتی ہوئی نکودار کے پاس پہنچ گئیں اور اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔

اباقہ خان نے ترش لہجے میں کہا۔ "تم کہاں چلی گئی تھیں، میں تمہیں بڑی دیر سے تلاش کرا رہا ہوں۔"

ترمہ شیریں نے بھی تلخ لہجہ اختیار کیا، بولی۔ "ایل خان! آپ کے شہزادے ارغون نے مجھے آج پھر پکڑ لیا تھا۔ میں کہتی ہوں اس کا کوئی حل نکالیے ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔ میں خود کو اس رشتے پر مائل نہیں کر سکتی۔"

اباقہ خان نے تردد سے پوچھا۔ "وہ کیا کہتا تھا؟"

ترمہ شیریں نے جواب دیا۔ "وہ کہتا تھا میں خوش قسمت انسان ہوں کہ مسلمان نہیں ہوں اور منگول قوانین مجھے یہ حق دیتے ہیں کہ اپنے باپ کے بعد اس کی بیوی کو اپنی محبوبہ بنا لیں۔"

اباقہ خان نے سرد آہ بھری۔ "ترمہ شیریں! ارغون صحیح کہتا ہے۔ اس کو یہ حق منگول قانون نے دیا ہے، اسے چھینا نہیں جا سکتا۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "لیکن میں خود کو اس پر آمادہ کس طرح کروں، مجھے تو سوچ کر ہی گھن آتی ہے۔"

اباقہ خان بہت اداس تھا، وہ معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ "ترمہ شیریں! میری صحت یابی کا جشن منایا جا رہا ہے۔ آج ہر کوئی خوش ہے لیکن یہ بات میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ میں صحت یاب نہیں ہوا۔ میں اس وقت بھی بیمار ہوں، میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔"

ترمہ شیریں گھبرا گئی، بولی۔ "کیا طبیبوں کو بلوایا جائے؟"

اباقہ خان ٹہلنے لگا۔ وہ بہت پریشان اور گھبرایا نظر آ رہا تھا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی، وہ کہہ رہا تھا۔ "ترمہ شیریں! میں اپنی سلطنت کو انتشار سے بچانا چاہتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ اگر میری موت آنا ہی چاہتی ہے تو چند دن ٹھہر کر آ جائے۔ اس غسلِ صحت کے جشن میں لوگوں کو جیسے ہی معلوم ہوگا کہ میں صحت مند نہیں ہوں، بدستور بیمار ہوں تو وہ سازشیں شروع کر دیں گے۔"

ترمہ شیریں نے کہا۔ "لیکن طبیبوں کو بلائے بغیر طبیعت کی خرابی دور بھی تو نہیں ہوگی۔"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "میں اسی لیے ٹہل رہا ہوں کہ شاید طبیعت سنبھل جائے۔ اگر نہیں سنبھلے گی تو مجبوراً طبیبوں کو بلوا لوں گا۔"

وہ ٹہلتے ٹہلتے بستر پر گر گیا اور ترمہ شیریں کو حکم دیا۔ "میری خدمت کے لیے صرف دو خدمت گار خواتین میرے پاس موجود رہیں اور نکودار اور شمس الدین جوینی کو حاضر کیا جائے۔"

ترمہ شیریں نے گھبراہٹ میں ان احکامات پر عمل کرنا چاہا تو اباقہ خان نے اسے روک دیا۔ "جو حکم دینا ہے میں خود دوں گا تو میرے بستر پر ہی بیٹھ جا۔" اس کے بعد تالی بجا کے خدمت گار خواتین کو اندر بلایا اور ایک خدمت گار خاتون کو حکم دیا۔ "وزیر شمس الدین جوینی اور ولی عہد نکودار کو حاضر کیا جائے۔" دو خدمت گار خواتین کو حکم دیا۔ "تم دونوں یہیں میرے پاس موجود رہو۔"

جب خدمت گار خاتون شمس الدین جوینی اور ولی عہد

نکودار کو بلانے کے لیے جانے ہی والی تھی تو اباقہ خان نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ ''میں تجھ کو کیسا نظر آرہا ہوں؟''

خدمت گار خاتون نے جواب دیا۔ ''نصیبِ دشمناں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

اباقہ خان گرجا۔ ''میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔ خبردار جو باہر میری بابت یہ کہا گیا کہ میں بیمار ہو گیا ہوں۔''

خدمت گار خاتون نے گردن جھکالی، کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک ہیں خانِ محترم! آپ کو بیمار کون کہے گا؟''

اباقہ خان نے اسے باہر جانے کی اجازت دے دی اور دونوں خدمت گار خواتین کو پاس بلا کر حکم دیا۔ ''میرے جسم پر ادویات کا روغن ملا جائے۔''

دونوں خواتین تیل کی مالش کرنے لگیں۔

ترمہ شیریں محسوس کر رہی تھی کہ اباقہ خان کی طبیعت بگڑتی جارہی ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جارہی تھیں لیکن اباقہ خان انہیں جبراً کھولے ہوئے تھا۔

ولی عہد نکودار اور شمس الدین جوینی کو اباقہ خان کے پاس پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ وزیر اس کے سینے پر جھک گیا۔ ''یہ آپ کو کیا ہو گیا خانِ محترم؟''

نکودار دوسری طرف کھڑا تھا۔ وہ بھی اپنے باپ کے چہرے کے پاس منہ لے جا کر بولا۔ ''آج تو آپ بالکل صحت مند تھے۔ پھر یہ آپ کو کیا ہو گیا؟''

اباقہ خان نے رک رک کر جواب دیا۔ ''میری طبیعت بگڑتی جارہی ہے۔ جشنِ صحت یابی جس طرح برپا ہے اس کو اسی طرح برقرار رکھا جائے۔ جو لوگ میری بابت پوچھیں انہیں بتایا جائے کہ اطبا کے مشورے پر میں آرام کر رہا ہوں۔''

وزیر شمس الدین نے پوچھا۔ ''کیا طبیبوں کو بلوا لیا جائے؟''

اباقہ خان نے جواب دیا۔ ''طبیبوں کی بھیڑ بھاڑ کو نہیں، صرف دو طبیبوں کو بلوا لیا جائے۔''

وزیر شمس الدین طبیبوں کو بلانے خود چلا گیا۔ اباقہ خان نے زندگی میں شاید پہلی بار حکم دینے کے بجائے استدعا کی۔ ''جوینی! تم کوشش کرو کہ جلد از جلد میرے پاس آجاؤ خدا کے لیے۔ کیونکہ وقت بہت کم ہے اور مجھے باتیں بہت زیادہ کرنا ہیں۔''

ولی عہد نکودار نے پوچھا۔ ''کسی اور کو بھی بلوانا پسند فرمائیں گے یا نہیں؟''

اباقہ خان نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''کسی کو بھی نہیں۔'' پھر اس نے ترمہ شیریں کی طرف دیکھا اور نکودار سے کہا۔ ''نکودار! ترمہ شیریں کا خاص خیال رکھنا۔ یہ ارغون سے بہت خوفزدہ ہے۔''

ترمہ شیریں رونے لگی، بولی۔ ''اس وقت آپ میری فکر نہ کیجیے۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو صحت یاب کرے۔''

اباقہ خان کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''خدا مجھے صحت یاب کرے ترمہ شیریں! افسوس کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں کوئی دوسرا وہ نہیں دیکھ سکتا۔ خان اعظم اور اس کی اولادیں آسمانی دریچوں سے نکل کر میری طرف آرہی ہیں، وہ سب مجھے بلا رہی ہیں۔''

نکودار نے باپ کے سینے پر سر رکھ دیا۔ ''آپ ٹھیک ہو جائیں گے بابا جان!''

اباقہ خان نے اسے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش تھا۔ نکودار کو اس کی خاموشی نے چونکا دیا۔۔۔ اس نے اپنے باپ کی آنکھیں جو دیکھیں تو وہ تقریباً بند تھیں اور اس کی سانس بہت سست چل رہی تھی۔ اباقہ خان بے ہوش ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد دو طبیب اور وزیر شمس الدین جوینی بھی آگئے۔ اباقہ خان اس وقت بے ہوش تھا، دونوں طبیب اس کو نہایت توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں اباقہ خان کی نبضیں نہیں مل رہی تھیں۔ ایک طبیب نے نکودار سے پوچھا۔ ''ولی عہد کون ہے؟ آپ یا کوئی اور؟''

نکودار نے گھبرائے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کی اس بات کا مطلب؟''

طبیب نے جواب دیا۔ ''میری بات کا مطلب یہ ہے کہ ولی عہد کو بیمار خان کے قریب رہنا چاہیے کیونکہ پتا نہیں کس وقت وصیتوں اور ہدایتوں کی ضرورت پیش آجائے۔''

شمس الدین جوینی نے طبیب سے پوچھا۔ ''کیا مرض نے مہلک شکل اختیار کر لی ہے؟''

طبیب نے جواب دیا۔ ''ایسا لگتا ہے جگر نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔''

دونوں طبیبوں نے چند دوائیں دیں، پلانے کی اور مالش کی۔ جب دونوں طبیب واپس جانے لگے تو ولی عہد نکودار نے پہلی بار ایل خان کا لب و لہجہ اختیار کیا اور دونوں طبیبوں سے کہا۔ ''تم دونوں ابھی نہیں جاؤ گے۔ تمہیں اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک بیمار خان ہوش میں نہیں آجاتا اور یا پھر اس وقت تمہیں چھوڑا جائے گا جب بے ہوش خان قیدِ ہستی سے نجات حاصل کر لے گا۔''

طبیبوں نے گڑگڑا کر عرض کیا۔ ''ولی عہد بہادر! ہم

قسم کھانے کو تیار ہیں، خان کی بیماری یا موت راز میں رکھی جائے گی۔"

نکودار نے جواب دیا۔ "میں تم دونوں کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا، میرا فیصلہ اٹل ہے اسے بدلا نہیں جاسکتا۔"

شمس الدین جوینی خاموش کھڑا بے ہوش اباقہ خان کی حالت کا جائزہ لے رہا تھا۔ اباقہ خان نے اچانک اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وزیر بے ساختہ بول اٹھا۔ "محترم خان کو ہوش آگیا۔"

دونوں طبیب فوراً خان کے پاس آگئے۔ نکودار نے ہوش میں آئے ہوئے اباقہ خان کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، ہونٹ ہلے مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

دونوں طبیب اباقہ خان پر جھک گئے اور نکودار کی شکایت کی۔ "محترم ایل خان! آپ ہوش میں آگئے؟ براہِ کرم ولی عہد بہادر کو حکم دیجیے کہ وہ ہمیں جانے دے، انہوں نے ہمیں بلاوجہ روک رکھا ہے۔"

شمس الدین جوینی نے دونوں کو منع کیا۔ "طبیب صاحبان! کیا آپ دونوں کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتے؟"

اباقہ خان نے نکودار کو اشارے سے قریب بلایا، جب وہ اپنے باپ کے داہنی طرف جا کھڑا ہوا تو اباقہ خان نے ہاتھ کے اشارے سے نکودار کو اپنے منہ کے قریب بلالیا۔ وہ نکودار کے کان میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔

نکودار نے اپنا ایک کان اباقہ خان کے منہ سے ملادیا، بولا۔ "آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

اباقہ خان میں اچانک طاقت عود کر آئی۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ "نکودار! اگر میں اچھا ہوگیا تو دونوں طبیبوں اور خدمت گار خواتین کا فیصلہ میں خود کروں گا لیکن اگر میں مرجاؤں تو تم دونوں طبیبوں اور خدمت گار خواتین کو قتل کردینا تاکہ یہ لوگ میری موت کی خبر باہر عام نہ کرسکیں۔"

دونوں طبیب خوشامدیں کرنے لگے۔ "خانِ محترم! ہم سے آپ قسم لے لیں، ہم محل کی خبریں باہر نہیں پہنچائیں گے۔"

اباقہ خان نکودار سے مخاطب تھا۔ "نکودار! میں نے جو کہہ دیا، کہہ دیا۔" پھر وہ غمزدہ ترمہ شیریں کو دیکھنے لگا اور نکودار کو ہدایت کی۔ "ترمہ شیریں کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ میرے بعد اس پر کسی بھی قسم کا جبر نہ کیا جائے۔"

نکودار رونے لگا۔ "اب آپ کا کیا حال ہے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "یہ میرا آخری وقت ہے۔ سعد اللہ یہودی سے ہوشیار رہنا اور تمام بھائی آپس میں متحد رہیں۔"

نکودار نے جواب دیا۔ "میں زندگی بھر آپ کے حکم کا پابند رہوں گا۔"

شمس الدین جوینی نے پوچھا۔ "خانِ محترم! میرے لیے کیا حکم ہے؟"

اباقہ خان نے جواب دیا۔ "جوینی! تم بدستور وزیر رہوگے۔ میرے بعد نکودار کے وزیر بنو گے۔ ویسے نکودار خودمختار ہوگا جس کو چاہے وزیر بنادے۔"

نکودار نے وزیر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، بولا۔ "میں پدر بزرگوار کی خواہشات کا زندگی بھر احترام کروں گا۔"

اباقہ خان نے آہستہ سے کہا۔ "شہزادہ ارغون کو بلاؤ۔"

نکودار باپ کی بات ٹال گیا، کہہ دیا۔ "میں نے آدمی بھیج دیا ہے جیسے ہی آئے گا آپ کی خدمت میں پیش کردیا جائے گا۔"

ترمہ شیریں نے اباقہ خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اباقہ ترمہ شیریں کو دیکھنے کی کوشش کررہا تھا مگر اس کی نظر دھندلا چکی تھی، اس نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔ "میرے بعد مصر کے مملوک حکمران کو سزا ضرور دینا قطبوغا کے قاتل کو....."

وہ بات پوری نہیں کرسکا، اس کا سر ڈھلک گیا۔ اباقہ خان مرگیا۔ ہلاکو خان کا جانشین اچانک مرچکا تھا۔

نکودار نے اس ہال کو جہاں اباقہ خان کی لاش رکھی تھی، لوبان اور عنبر کی خوشبو سے مہکادیا۔

شمس الدین جوینی نے نکودار سے پوچھا۔ "شہزادے! اب ان دونوں خدمت گار خواتین اور طبیبوں کا کیا بنے گا؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "میں اپنے باپ کی وصیتوں پر عمل کرکے رہوں گا۔" پھر اچانک ترمہ شیریں سے رجوع ہوگیا، بولا۔ "مادرِ محترم! میرا بھائی ارغون منگول عساکر کا سپہ سالار ہے اور آپ کا عاشق بھی۔ ابھی میرے باپ اباقہ خان کی موت کا کسی کو بھی علم نہیں، کچھ دیر بعد یہ خبر محل سرا میں عام ہوجائے گی اور ارغون اس خبر کے بعد جو پہلا قدم اٹھائے گا، وہ آپ کو اپنے قبضے واختیار میں لانے سے متعلق ہوگا۔ میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ اب آپ جہاں بھی جانا چاہیں، چلی جائیں۔"

ترمہ شیریں بہت پریشان تھی، بولی۔ "میں کہاں جاؤں؟ میں کتنی ہی تیز بھاگوں گی پھر بھی خان کی حدود

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



سلطنت سے باہر نہیں جاسکوں گی۔ ولی عہد بہادر آپ میری مدد کریں۔''

نکودار نے شمس الدین جوینی کو ایک فرماں روا کی طرح حکم دیا۔ ''ترمہ شیریں کو آپ اپنے ساتھ لے جائیں۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد میں انہیں کہیں بھجواؤں گا۔''

شمس الدین جوینی ہراساں ہو رہا تھا، بولا۔ ''خانِ محترم! اگر ارغون نے میرے گھر کی تلاشی لی اور وہاں سے ترمہ شیریں کو برآمد کرلیا تو میں کیا جواب دوں گا؟''

نکودار نے جواب دیا۔ ''آپ اس کی پروانہ کریں۔ شہزادہ ارغون آپ کے گھر کی تلاشی نہیں لے سکتا۔''

شمس الدین جوینی نکودار کا حکم ماننے پر مجبور تھا۔ وہ چادر میں لپٹی منہ چھپائے ترمہ شیریں کو نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے اپنے گھر لے گیا اور اس کو ایک تہ خانے میں چھپا دیا۔ چھپاتے وقت ترمہ شیریں سے کہا۔ ''محترم خاتون! یہ چند روزہ تکلیف تو آپ کو جھیلنا ہی ہوگی، پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

☆☆☆

اباقہ خان کی موت کی خبر محل سرا میں پھیل گئی۔ ہر طرف سے رونے دھونے کی آوازیں آنے لگیں۔ شہزادہ ارغون بھاگا بھاگا آیا اور نکودار سے شکایت کی کہ اگر تم چاہتے تو باپ کی نازک حالت کی اطلاع مجھے دے دیتے لیکن تم نے اسے مصلحتاً چھپائے رکھا۔

نکودار نے جواب دیا۔ ''نہیں ارغون! ایسی بات نہیں تھی۔ میں نے طبیبوں کی مدد سے بڑی کوشش کی کہ باوا جان کو بچالوں لیکن پھر بے بس ہوگیا۔''

شہزادہ ارغون محل میں داخل ہوگیا اور ادھر اُدھر گھوم پھر کر ترمہ شیریں کو تلاش کرتا رہا۔ جب وہ نہیں ملی تو اس نے نکودار سے پوچھا۔ ''یہ ترمہ شیریں کہاں چلی گئی؟ کہیں نظر نہیں آتی۔''

نکودار نے جواب دیا۔ ''ارغون! میں خود بہت پریشان ہوں اور مجھے کچھ پتا نہیں کہ کون کہاں ہے۔''

شہزادہ ارغون نکودار کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔

قرب وجوار کے امراء اور سرداروں کو اباقہ خان کی موت کی خبریں خفیہ طور پر روانہ کردی گئیں اور ان کی آمد کا انتظار کیا جانے لگا۔ عام طور پر یہ خبر مشہور کردی گئی تھی کہ اباقہ خان صحت مند ہو چکا ہے اور وہ سیر سپاٹے کی غرض سے کچھ دنوں کے لیے چپ چاپ بغداد چلا گیا ہے۔

اباقہ خان کی لاش کو برف کی سلوں میں رکھ لیا گیا۔ یہ برف قریب کے پہاڑوں سے منگوائی گئی تھی۔

نکودار نے دونوں طبیبوں اور خدمت گار خواتین کو قتل کرادیا۔ گو کہ اس کا جی نہیں چاہتا تھا مگر مرتے ہوئے باپ کی خواہش ہی یہی تھی، وہ مجبور تھا۔

شہزادہ ارغون نے اباقہ خان کی قبر تیار کرائی۔ قبر کے لیے ایک بہت بڑا تہ خانہ تیار کرایا گیا اور اباقہ خان کی خدمت کے لیے خوب صورت لڑکیوں کو فراہم کیا گیا۔ ان لڑکیوں کو زیورات سے آراستہ کردیا گیا۔

قریب ودور سے آنے والے محل میں اتر رہے تھے۔ انہی میں...... شہزادہ سونجاق بھی شامل تھا۔ اس کو اباقہ خان کی بیماری اور موت کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے ایما اور حکم پر اباقہ خان کی خیریت معلوم کرنے چلا آیا تھا لیکن محل میں داخل ہوتے ہی جیسے ہی اس کو اباقہ خان کی موت کی خبر ملی، وہ ہکا بکا رہ گیا۔

شہزادہ ارغون کو سونجاق کی آمد گراں گزری لیکن نکودار نے اس کو خوش اخلاقی سے خوش آمدید کہا۔

وزیر شمس الدین جوینی آنے والوں کے قیام وطعام کے بندوبست میں لگا ہوا تھا۔ اس نے شہزادہ سونجاق کو سمجھایا۔ ''شہزادے! آپ کو یہاں نہیں آنا تھا۔''

شہزادہ سونجاق نے پوچھا۔ ''کیوں؟ میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہ گیا۔''

شمس الدین جوینی نے جواب دیا۔ ''شہزادے سونجاق! اگر آپ نے اپنی سابقہ غلطی کو غلطی ہی نہیں جانا تو آپ سے کچھ کہنا سننا فضول ہے، ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا تھا، وہ درست نہیں تھا۔ اگر اس وقت اباقہ خان ہم میں موجود ہوتا اور آپ آئے ہوئے ہوتے تو اباقہ خان آپ کو کبھی معاف نہ کرتا کیونکہ وہ آپ سے بے حد ناراض تھا۔''

شہزادہ سونجاق نے ہنس کر کہا۔ ''رشتے داریوں میں ایسی غلطیاں ہوتی ہی رہتی ہیں مگر میں نے سب کچھ بھلا دیا۔ اس خاندان کو چاہیے کہ یہ بھی سب کچھ بھلا دے۔''

شمس الدین جوینی سونجاق کی جرأت وہمت کی دل ہی دل میں داد دے رہا تھا، بولا۔ ''شہزادہ سونجاق! یہ بتائیے اگر یہاں آپ کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آجائے تو؟''

سونجاق نے جواب دیا۔ ''ایسا نہیں ہوگا وزیر محترم!''

اباقہ خان کی لاش کو نہایت اہتمام اور شان سے اس کی تہ خانے نما قبر کے پاس لے جایا گیا۔ قبر کے پاس اس کی

میت رکھ دی گئی اور بملہ شریکِ جنازہ اور حاضرین کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے خان کا آخری دیدار کر سکتے ہیں۔

آخری دیدار کے لیے ہجوم ٹوٹ پڑا۔ عورتیں اور لڑکیاں اپنے حکمران کی شکل دیکھتے اور بین کرتے یا روتے ہوئے آگے بڑھ جاتیں۔

اباقہ خان کی لاش کو قبر میں اتار دیا گیا۔ اب ان آراستہ و پیراستہ لڑکیوں کو طلب کیا گیا جنہیں مُردہ خان کے ساتھ رہنا تھا۔ یہ لڑکیاں زور و شور سے رو رہی تھیں مگر انہیں ڈانٹ ڈانٹ کر چپ کرایا جا رہا تھا۔

تکودار کو ان پر رحم آ گیا۔ اس نے وزیر شمس الدین جوینی کو علیحدہ لے جا کر پوچھا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ان لڑکیوں کو مُردہ خان کے ساتھ دفن نہ کیا جائے۔''

لیکن شمس الدین جوینی نے اس سے اختلاف کیا، کہا۔ اسی غلطی نہ کیجیے گا، پورا خاندان آپ کا دشمن ہو جائے گا۔''

تکودار نے کہا۔ ''یہ جہالت ہے، اب ہم لوگ متمدن دنیا میں رہتے ہیں۔ جہالت کی رسمیں ترک کر دینی چاہئیں۔''

وزیر نے جواب دیا۔ ''یہ تو ٹھیک ہے مگر آپ کا خاندان اس تبدیلی کو قبول نہیں کرے گا اور اس کا سب سے زیادہ فائدہ ارغون اٹھا جائے گا۔''

عورتوں اور لڑکیوں کی چیخنے چلّانے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔ تکودار نے بے بسی سے کہا۔ ''مجھ سے ان کی چیخ و پکار نہیں سنی جاتی۔''

وزیر نے جواب دیا۔ ''آپ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیجیے یا پھر یہاں سے ٹل جائیے۔''

تکودار نے کہا۔ ''لیکن میرے لیے یہ دونوں ہی باتیں ناممکن ہیں۔ میں ولی عہد ہوں اور یہ ساری رسوم میری موجودگی ہی میں انجام دی جائیں گی۔''

وزیر اپنی رائے پر قائم رہا۔ ''تب پھر آپ ان رسوم کو ادا ہونے دیجیے۔''

لیکن تکودار کو کسی پہلو قرار نہیں آ رہا تھا، اس نے شہزادہ ارغون کو مُردہ خان کی قبر کے سرہانے کھڑے دیکھا۔ یہ بھاگ کر وہاں گیا اور شہزادہ ارغون کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا، بولا۔ ''ارغون! کیا تجھے یاد ہے کہ ہم دونوں نے پدر بزرگوار کی زندگی میں باہمی اتحاد و اتفاق کا وعدہ کیا تھا؟''

ارغون نے جواب دیا۔ ''ہاں مجھے یاد ہے اور میں کوشش کروں گا کہ اس وعدے کو نبھاؤں۔''

تکودار نے کہا۔ ''اب میں پدر بزرگوار کا جانشین ہوں۔ میں اگر چاہوں تو اپنی قوم کو کوئی بھی حکم دے سکتا ہوں اور قوم اس کی اطاعت اور تعمیل کی پابند ہوگی۔''

ارغون تکودار کی شکل دیکھ رہا تھا، پوچھا۔ ''اس طرح آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

تکودار نے جواب دیا۔ ''یہ خوب صورت لڑکیاں جنہیں لباس اور زیورات سے آراستہ کر کے پدر بزرگوار کی قبر میں اتار دیا جائے گا، میرے خیال میں یہ ہماری ہمدردیوں اور ہمارے رحم کی مستحق ہیں۔ انہیں زندہ رہنا چاہیے۔ انہیں قبر میں دفن نہ کیا جائے۔''

ارغون نے سر سے پاؤں تک اپنے ولی عہد بھائی کو دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

تکودار نے پوچھا۔ ''میں نے جو کچھ کہا ہے، بالکل صاف صاف اور واضح ہے۔ کیا تم میری بات سن نہیں سکے؟''

ارغون نے کہا۔ ''آپ کیا چاہتے ہیں، ان ساری لڑکیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ جو قبر میں پدر بزرگوار کی خدمت کے لیے دفن کی جا رہی ہیں۔''

تکودار ارغون کی کوتاہ عقلی سے پریشان ہو رہا تھا۔ ''میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں ارغون..... کیا تم بھی اس پر یقین رکھتے ہو کہ یہ لڑکیاں دوسری دنیا میں والد کی خدمت کریں گی؟''

ارغون نے جواب دیا۔ ''اس میں یقین یا شک و شبے کی کیا بات ہے۔ میں اپنی قوم کی طرح اس پر پورا یقین رکھتا ہوں۔''

تکودار کو ارغون کی باتیں اور زیادہ حیرت زدہ کر رہی تھیں۔ پھر پوچھا۔ ''یعنی تم اس پر یقین رکھتے ہو؟''

ارغون نے جواب دیا۔ ''یہ ہماری آبائی رسمیں ہیں۔ ہم انہیں کیونکر چھوڑ سکتے ہیں۔ آپ کو منفی انداز میں نہیں سوچنا چاہیے۔''

تکودار نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ''دیکھو ارغون! اب ہم تمدن اختیار کر چکے ہیں۔ متمدن دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ متمدن لوگ ہماری ان رسموں پر ہنستے ہیں ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہمیں ان رسموں کو ترک کر دینا چاہیے۔''

ارغون نے جواب دیا۔ ''ناممکن، ہم ان رسموں کو ترک نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری آبائی رسمیں ہیں اور ہمارے جدِ اعلیٰ چنگیز خان کے عہد سے چلی آ رہی ہیں، ہم انہیں کیونکر ترک کر سکتے ہیں۔''

تکودار نے کہا۔ ''ارغون! تم میرا ساتھ دو، میں اس رسم کو آج ہی سے اڑا دینا چاہتا ہوں۔''

ارغون نے انکار کر دیا۔ ''میں اس میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔''

نکودار نے اصرار کیا۔ ”میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر اچھی طرح سوچو، غور کرو، اس کے بعد انکار یا اقرار کرو۔“

ارغون نے جواب دیا۔ ”میں اس پر غور کرنا ہی نہیں چاہتا۔“

نکودار نے افسوس کیا۔ ”میری خواہش تو یہی تھی کہ اس بڑے اور غیر معمولی کام میں تمہیں بھی شریک کرلوں مگر افسوس کہ تم اس میں شامل نہیں ہونا چاہتے۔ بہر حال میں نے تو یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اس رسم کو آج ہی سے اڑا دوں۔“

ارغون نے جواب دیا۔ ”اور میں اس کی مخالفت کروں گا، آپ ایسا نہ کریں۔“

نکودار نے کہا۔ ”میں ایسا کر کے رہوں گا۔ میں دیکھتا ہوں مجھے ایسا کرنے سے کون روکتا ہے۔“

ارغون نے نہایت تحمل سے کہا۔ ”بھائی نکودار! آپ یہ نہ کریں، قوم آپ کی یہ بات نہیں مانے گی۔“

نکودار نے جواب دیا۔ ”قوم یہ بات ضرور مانے گی اور میں اس سے منوا کر رہوں گا۔“

ارغون یہ کہہ کر الگ ہوگیا۔ ”آپ کی مرضی..... آپ جو چاہیں کریں، میں کیا کرسکتا ہوں۔“

نکودار ابھی کوئی اعلان کر نہیں سکا تھا کہ وزیر شمس الدین جوینی نے اس سے پوچھا۔ ”یہ شہزادہ ارغون سے آپ کی کیا باتیں ہو رہی تھیں؟“

نکودار نے جواب دیا۔ ”میں نے اس سے یہ مشورہ لیا کہ کیوں نہ میں ان جاہلانہ رسوم کو ختم کردوں، ارغون نے اس کی مخالفت کی، شدید مخالفت لیکن میں آج ہی اس وحشیانہ رسم کے خاتمے کا اعلان کیے دیتا ہوں۔“

شمس الدین جوینی نے مایوسی سے کہا۔ ”ارغون نے آپ کو صحیح مشورہ دیا ہے۔ آپ اپنے سارے کام جلد بازی کی نذر کردیتے ہیں۔“

لیکن نکودار نے جوینی کی بات نہیں مانی۔ ”جوینی! اب میں ایل خان ہوں اور میں یہ سب پر واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میں خود ہی فیصلے کرسکتا ہوں۔ سب کو چونکا دینے والے فیصلے۔“

شمس الدین جوینی نے مایوسی سے کہا۔ ”میں آپ کو مشورہ تو دے سکتا ہوں مگر ان پر عمل کرنے کے لیے مجبور نہیں کرسکتا۔ اعتدال میں خیر ہے آپ جو بھی فیصلہ کریں خوب سوچ سمجھ کر اور اس کے مابعد اثرات پر غور کر کے۔“

شہزادہ ارغون نکودار کو تلاش کرتا ہوا ان دونوں کے پاس پہنچ گیا، بولا۔ ”ولی عہد بہادر! آپ تشریف لے چلیں تاکہ آخری رسوم اپنے انجام کو پہنچیں۔“

نکودار، شہزادہ ارغون اور شمس الدین جوینی اباقہ خان کی قبر کے پاس پہنچے تو وہاں قبر میں اتاری جانے والی لڑکیوں نے کہرام برپا کر رکھا تھا۔

سعد اللہ یہودی مسکراتا ہوا نکودار کی طرف بڑھا اور مبارکباد پیش کی۔ ”ولی عہد بہادر! آپ ایل خان ہوجائیں گے آپ کو میری طرف سے یہ بلند مقام مبارک ہو خدا آپ کو اس مقام کا اہل ثابت کرے۔“

نکودار نے سعد اللہ یہودی کا شکریہ بھی نہیں ادا کیا۔ اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے خاندان، امرا اور سرداروں کو مخاطب کیا۔ ”اہل خاندان اور معزز سردارو! ہم سب بھی قراقرم کے خاقان کے تابع ہوا کرتے تھے۔ جب کوئی خاقان مرتا تھا تو ہم دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوتے، نئے خاقان کے انتخاب کے لیے منعقد ہونے والی قوریلتائی میں شرکت کرنے قراقرم پہنچ جاتے لیکن ادھر دو پشتوں سے ایسا نہیں ہو رہا۔ میرا دادا ہلاکو خان فوت ہوا تو اس کی جگہ میرے باپ اباقہ خان نے سنبھال لی۔ اب میرے باپ کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ میں سنبھال رہا ہوں۔ قراقرم کی رسمیں ختم ہو رہی ہیں جو باقی ہیں، وہ بھی جلد یا بہ دیر ختم ہوجائیں گی۔ پہلے ہمیں شہری تمدن کا کوئی علم نہ تھا۔ اب ہم متمدن ہوتے جا رہے ہیں۔ تہذیب یافتہ قومیں ہماری جاہلانہ رسوم پر ہنستی ہیں، ہمارا مذاق اڑاتی ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنی بعض جاہلانہ رسمیں اڑا دوں۔ چنانچہ آج تو میرے باپ اباقہ خان کی قبر میں منگول رسم ورواج کے مطابق کنواری لڑکیوں کو زندہ دفن کردیا جائے گا مگر آئندہ یہ رسم اڑا دی جائے گی اور میں اپنے لیے اس رسم کو منسوخ کرتا ہوں۔ آئندہ کسی بھی حکمران کی قبر میں کنواری جوان لڑکیاں نہیں دفن کی جائیں گی۔“

کچھ دیر اس اعلان کے بعد سناٹا طاری رہا مگر پھر... چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔

سعد اللہ یہودی نے شہزادہ ارغون سے سرگوشی میں کہا۔ ”شہزادے! نکودار سے غلطی ہوگئی، اب آپ اپنی قوم کو اعتماد میں لے سکتے ہیں۔“

ان دونوں سے ذرا دور ایک سردار نے دوسرے سے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اب ہماری شناخت ہی ختم ہوجائے گی۔“

دوسرے نے جواب دیا۔ ”شاید اب ہم منگول نہیں رہے، آہستہ آہستہ ہم اپنی جملہ روایات سے محروم کردیے جا رہے ہیں۔“

کسی تیسرے نے اپنی رائے پیش کی۔ ''یہی وجہ ہے کہ اب ہم بزدل ہوتے جارہے ہیں اور ہم نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے، اس سے محروم ہوجائیں گے۔''

ایک سردار نے دخل دیا اور بہ آوازِ بلند کہا۔ ''ولی عہد بہادر! یہ موقع اس اعلان کا نہیں تھا۔''

شہزادہ ارغون چپ چاپ آگے بڑھا اور حکم دیا۔ ''لڑکیوں کو قبر میں اتار کر آخری رسم ادا کردی جائے۔''

منگولوں کا ایک دستہ آگے بڑھا اور اس نے نوجوان لڑکیوں کو زبردستی قبر میں اتار دیا اور قبر کا منہ بڑی تیزی سے بند کردیا گیا۔ لڑکیوں کی چیخ پکار کی آوازیں قبر کا منہ بند ہونے تک آتی رہیں جو آخر میں بند ہوگئیں۔

آخر میں اباقہ خان کے گھوڑے کو ذبح کردیا گیا اور اس کے خون سے اباقہ خان کی قبر پر چھڑکاؤ کیا گیا۔

اس ہجوم میں شہزادہ ارغون نے سونجاق کو ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور سونجاق کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ ''تجھے یہاں نہیں آنا تھا۔''

سونجاق نے جواب دیا۔ ''ارغون! اس وقت میں تیرا مہمان ہوں اور تیرے باپ کی آخری رسوم میں شرکت کرنے چلا آیا ہوں۔''

شہزادہ ارغون سونجاق کو ذلیل کرنا چاہتا تھا مگر وہ اپنے مہمان کو کس طرح ذلیل کرسکتا تھا، کہا۔ ''مگر اب تیرا کام ختم ہوگیا اور تجھ کو یہاں سے فوراً چلے جانا چاہیے۔''

سونجاق نے کہا۔ ''اگر نکودار بھی مجھے یہی حکم دے گا تو میں فوراً چلا جاؤں گا۔''

شہزادہ ارغون بہت جزبز ہورہا تھا، اس کے ساتھ سعداللہ یہودی بھی تھا، اس نے شہزادے کو سمجھایا۔ ''شہزادے! آپ عجلت میں ویسی ہی غلطی کررہے ہیں جیسی ولی عہد بہادر کرچکے ہیں۔''

شہزادہ ارغون جیسے ہوش میں آگیا، بولا۔ ''بیشک تو میرا مہمان ہے، جب تک تو رہنا چاہے، رہ مگر خبردار جو یہاں ترمہ شیریں کا ذکر کیا۔''

سونجاق نے برا سا منہ بنایا اور کہا۔ ''میرے پاس تیری ان فضول اور بے سروپا باتوں کا کوئی جواب نہیں، اب میں چلتا ہوں۔''

وہ شہزادہ ارغون کو حیران کرکے چلا گیا۔

سعداللہ یہودی نے شہزادے کو سمجھایا۔ ''شہزادے! جذباتی نہ بنیے کیونکہ مشتعل ہوجانے والا ایک جذباتی انسان ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔''

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ''میں نے ترمہ شیریں کی خاطر سونجاق سے جنگ کی ہے چنانچہ جب بھی میں اس کی شکل دیکھوں گا، آپے سے باہر ہوجاؤں گا۔ میں کیا کروں، مجبور ہوں۔''

سعداللہ یہودی نے کہا۔ ''اشتعال کی حدت صحیح غوروفکر اور قوتِ فیصلہ کو جلادیتی ہے۔ دنیا کے بیشتر بڑے لوگ اپنی اسی خامی کی وجہ سے ناکام رہے ہیں۔''

اب شہزادہ ارغون کو ترمہ شیریں کی یاد ستا رہی تھی، وہ اسے جلد از جلد اپنے قبضے میں لانا چاہتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں سعداللہ یہودی سے مشورہ کیا۔ ''آپ مجھے مشورہ دیں کہ ترمہ شیریں کو میں کس طرح اپنے قبضے میں لاؤں؟''

سعداللہ یہودی نے جواب دیا۔ ''ترمہ شیریں پر پہلا حق نکودار کا ہے، اگر وہ اس سے دستبردار ہوجائے تو پھر آپ کا حق ہوجاتا ہے۔''

شہزادہ ارغون کو سونجاق کی طرف سے فکر تھی، کہا۔ ''سعداللہ! یہ سونجاق کی آمد خالی از علت نہیں ہے۔ کہیں اس کی آمد کسی سازش کا نتیجہ نہ ہو۔''

سعداللہ یہودی نے جواب دیا۔ ''شہزادے! آپ کے سامنے ایک بڑا مقصد ہے، آپ اپنے اس مقصد کو ترمہ شیریں پر قربان نہ کردیجیے۔''

شہزادہ خاموش ہوگیا مگر ترمہ شیریں کے لیے اس کا دل تڑپ رہا تھا۔

☆☆☆

ولی عہد نکودار اباقہ خان کی جگہ برسرِ اقتدار آگیا۔ شمس الدین جوینی کو وزارت کے منصب پر برقرار رکھا گیا۔ شہزادہ ارغون کی جملہ عساکر کی سپہ سالاری بحال رہی۔

ارغون شاہی محل میں گھوم پھر کر ترمہ شیریں کو تلاش کرتا رہا مگر اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ خدمت گار خواتین نے بس اتنی نشاندہی کردی کہ انہوں نے ترمہ شیریں کو آخری بار اباقہ خان کی میت کے قریب دیکھا تھا۔

بالکل مایوس ہونے کے بعد اس نے نکودار سے ترمہ شیریں کی بابت معلوم کیا، نکودار نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ''میں ترمہ شیریں کو تلاش کرلوں گا۔ وہ کہیں نہیں جاسکتی مگر اس سے پہلے میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

نکودار نے کہا۔ ''کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

ارغون نے کہا۔ ''جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ باپ کی موت کے بعد منگول قانون بیٹوں کو یہ حق دیتا ہے کہ

اس کی بیویوں کو اپنی بیوی بنالیں۔"
تکودار نے ناگواری سے کہا۔ "ہاں منگول قانون ہمیں یہ حق دیتا ہے۔"
ارغون نے پوچھا۔ "پھر آپ نے اپنے لیے کس کس کو پسند کرلیا ہے؟"
تکودار نے جواب دیا۔ "کسی کو بھی نہیں۔"
ارغون نے کہا۔ "پھر اگر میں ترمہ شیریں کو اپنی بیوی بنالوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"
تکودار کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ "ارغون! جیسا کہ میں نے اپنے باپ کی آخری رسوم کی ادائیگی کے وقت یہ اعلان کر دیا تھا کہ اب میں بہت ساری جاہلانہ رسوم کو منسوخ کرنے والا ہوں، ان میں مرنے والوں کی بیواؤں کی رسم سرفہرست ہے۔"
ارغون نے اختلاف کیا۔ وہ پُرزور لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ ایسا نہیں کریں گے۔ ہماری قوم اس تبدیلی کو قبول نہیں کرے گی۔"
تکودار اپنی بات پر اڑا رہا۔ "مگر میں وہی کروں گا جو میری قوم کے لیے مفید ہوگا۔"
ارغون نے باغیانہ روش اختیار کی۔ "میں خود آپ کی اس تبدیلی کو نہیں مانوں گا۔"
تکودار نے صاف صاف اعلان کر دیا۔ "اور ایک بات اور سن لو۔ مسلمانوں کا طاقتور تمدن اور مذہب ہمیں مسخر کرتا جا رہا ہے، ہماری قوم کے لوگ ان کے لباس اور کھانے، کھانے لگے ہیں، ان کی زبان بولنے لگے ہیں۔ اسلام کا ایک ضابطۂ اخلاق ہے، ایک نظامِ زندگی ہے۔ منگولوں سے ارفع و اعلیٰ۔ ہم جلد یا بہ دیر اسلام کے ہاتھوں مسخر ہو جائیں گے چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ جو کل ہونے والا ہے، اسے آج ہی ہو جانا چاہیے۔ اگر ہمیں یہاں حکومت کرنا ہے تو ہمیں ان جیسا بن جانا چاہیے۔" پھر نہایت مضبوط اور اٹل لہجے میں کہا۔ "پہل میں خود کر رہا ہوں اور کل میں یہ اعلان کر دوں گا کہ میں نے اسلام قبول کرلیا ہے، اب میں مسلمان ہوں اور میرا اسلامی نام احمد خان ہے، تکودار احمد خان۔"
ارغون اس اعلان سے تڑپ گیا، بولا۔ "یہ آپ نے دوسری غلطی کردی۔ قوم آپ کے اس فیصلے کو نہیں مانے گی۔"
تکودار احمد خان نے جواب دیا۔ "نہ مانے مگر میں خود مطمئن ہوں کہ میں نے ایک صحیح فیصلہ کیا ہے۔"
ارغون نے پوچھا۔ "آپ اپنے اس فیصلے سے قوم کو

لاجواب

خلیفہ ہارون الرشید بہت ذہین اور حاضر جواب تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے پوچھا۔
"کیا آپ کبھی کسی بات پر لاجواب بھی ہوئے ہیں؟"
تو انہوں نے فرمایا کہ "ہاں تین مرتبہ ایسا ہوا کہ میں لاجواب ہوگیا۔"
(1) ایک عورت کا جوان بیٹا مرگیا اور وہ رو رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ آپ مجھے اپنا بیٹا سمجھیں اور غم نہ کریں۔ اس عورت نے کہا کہ میں اس بیٹے کی موت پر کیوں نہ آنسو بہاؤں جس کے بدلے خلیفہ ہارون الرشید میرا بیٹا بن گیا۔
(2) مصر میں کسی شخص نے حضرت موسیٰ ہونے کا دعویٰ کیا۔ میں نے اسے بلوا کر کہا کہ حضرت موسیٰ کے پاس تو اللہ پاک کے عطا کردہ معجزات تھے۔ اگر تم موسیٰ ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ۔ وہ شخص بولا کہ موسیٰ نے معجزہ اس وقت دکھایا تھا جب فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ تو خدائی کا دعویٰ کر، میں معجزہ دکھا دوں گا۔
(3) لوگ ایک گورنر کی غفلت اور کاہلی کی شکایت لے کر آئے تو میں نے کہا کہ وہ شخص تو بہت نیک، شریف اور ایماندار آدمی ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ پھر آپ اپنی جگہ اسے خلیفہ بنادیں تاکہ سب خلقِ خدا کو اس کا فائدہ ہو۔
(بحوالہ۔ کتاب الاذکیا ابن جوزی)
مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

غلطی

"وہ بدصورت عورت کون ہے جو ٹی وی کے پاس کھڑی ہے؟"
"وہ میری بیوی ہے۔"
"اوہ، معاف کیجیے گا۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔"
"نہیں جناب! غلطی تو مجھ سے ہوئی ہے۔"
مرسلہ۔ وزیر محمد خان، ہنگل ہزارہ

کب مطلع کریں گے؟''

تکودار احمد خان نے جواب دیا۔ ''کل، کل صبح اور اس وقت میں اپنی قوم کے سامنے اسلام پیش کروں گا۔ میرا خیال ہے میری قوم اس فیصلے سے اتفاق کرے گی اور بہت زیادہ لوگ مسلمان ہوجائیں گے۔''

ارغون نے اچانک نرم روش اختیار کی، بولا۔ ''اگر میری قوم نے آپ کے فیصلے سے اتفاق کیا تو میں بھی مسلمان ہوجاؤں گا۔''

تکودار نے ارغون کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ارغون میرے بھائی! پہل ہم ہی کو کرنا ہوگی۔ میرے ساتھ تم بھی مسلمان ہوجاؤ تاکہ ہماری قوم ہماری تقلید میں مسلمان ہوجائے۔''

ارغون نے انکار کردیا۔ ''نہیں، میں اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔''

تکودار بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر تھے، بولا۔ ''بہرحال کل ہی سہی، میں تمہارے فیصلے کا انتظار کرلوں گا۔''

ارغون بڑے بھائی کے پاس سے بہت فکرمند اور اداس نکلا۔ اس نے محل کی خدمت گار خواتین سے ایک بار پھر ترمہ شیریں کی بابت کئی سوال کیے مگر ان کے جوابوں سے ترمہ شیریں کا کوئی سراغ نہ لگ سکا۔ آج تکودار نے جو انکشاف کیا تھا اس نے ارغون کے دل و دماغ میں ایک انقلاب، ایک ہیجان سا برپا کر رکھا تھا۔ وہ محل سے نکل کر سیدھا سعداللہ یہودی کے پاس پہنچا اور ساری باتیں اس کے علم میں لے آیا، اس نے پوچھا۔ ''اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

سعداللہ یہودی بہت خوش تھا، بولا۔ ''شہزادے! اب منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ تکودار نے ایک اور غلطی کردی۔''

ارغون اور سعداللہ یہودی آپس میں دیر تک صلاح مشورے کرتے رہے۔ ان دونوں کے چہروں پر تازگی پیدا ہوچکی تھی۔

دوسری طرف تکودار تشویش اور تذبذب لیے شمس الدین جوینی کے پاس پہنچا اور کہا۔ ''وزیرِ محترم! میں نے اپنے اسلام کے لیے کل کا دن طے کیا ہے۔ میں اب زیادہ وقت کا انتظار نہیں کروں گا۔''

شمس الدین جوینی نے کہا۔ ''شہزادے! آپ نے اس اعلان میں بھی عجلت سے کام لیا ہے، خدا ہم پر رحم فرمائے۔''

تکودار نے ادھر اُدھر دیکھ کر اعلان کیا۔ ''میں مسلمان ہوچکا ہوں وزیرِ محترم!''

شمس الدین جوینی معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا، اس کو تکودار کے قبولِ اسلام سے خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ فکرمند ہوگیا تھا۔

تکودار نے پوچھا۔ ''آپ کیا سوچنے لگے وزیرِ محترم!''

شمس الدین جوینی نے جواب دیا۔ ''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اسلام آپ کو راس آئے گا یا نہیں۔''

تکودار نے جواب دیا۔ ''آپ اس طرح نہ سوچیں وزیرِ محترم۔ اسلام نہ صرف مجھے بلکہ میری پوری قوم کو راس آئے گا، میں جانتا ہوں۔''

شمس الدین جوینی نے کہا۔ ''اب میں بہت زیادہ بوڑھا ہوچکا ہوں اس لیے اگر آپ مجھ کو سبکدوش کردیں تو میں بہت زیادہ شکرگزار رہوں گا۔''

تکودار اپنے فیصلے پر سختی سے قائم تھا۔ ''کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے مگر میں اسلام کو ترک نہیں کروں گا۔''

شمس الدین جوینی نے بہ آوازِ بلند آمین کہہ کر تکودار کو کسی حد تک خوش کردیا۔ تکودار کو معلوم تھا کہ اس نے جو خبر شہزادہ ارغون کو دی ہے اس کو بہت جلد ایک ایک فرد کی زبان پر ہونا چاہیے۔ وہ رات کو اپنے محل میں ہر شخص سے ملنے کے لیے چل پڑا۔ سب سے پہلے اس کی ملاقات اباقہ خان کی اس بیوی سے ہوئی جو اباقہ خان سے بڑی مگر حسین تھی۔ اس نے تکودار کو روک لیا اور سختی سے پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے تو مسلمان ہوگیا ہے؟''

تکودار نے جواب دیا۔ ''ہاں اب میں تکودار احمد خان ہوں۔''

عورت نے ہنس کر کہا۔ ''اور تو نے ہی اباقہ خان کی قبر میں لڑکیوں کو بھیجنے سے منع کیا تھا؟''

تکودار نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے ہی اس جاہلانہ رسم کی منسوخی کا اعلان کیا تھا۔''

عورت نے کہا۔ ''سیدھی سادی حکومت کر، یہ تو کن چکروں میں پڑ گیا ہے۔ اپنے باپ دادا کی رسموں کو ختم کرنے والا ایک دن خود بھی ختم ہوسکتا ہے۔''

تکودار نے سختی سے کہا۔ ''مجھے اس کی پروا نہیں، میں اصلاح کرکے رہوں گا۔''

وہ آگے بڑھ گیا، آگے ایک منگول بڑی بوڑھی نے روک لیا۔ پوچھا۔ ''اب تو خان بن گیا ہے، تیرا تو یہ فرض تھا کہ اپنے آبا و اجداد کے نقشِ قدم پر چلتا مگر تو نے غیروں کی

راہ اختیار کی، جاودانی نیلا آسمان تجھ پر رحم کرے۔''

نکودار نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گیا۔ خدمت گار اور پہرے دار اس کو دیکھ دیکھ کر سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ یہیں ایک جگہ شہزادہ سونجاق مل گیا اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''محترم ایل خان! اچھا ہوا جو آپ خود یہاں تشریف لے آئے، ورنہ صبح میں خود حاضری دیتا۔''

نکودار نے پوچھا۔ ''کیوں، کوئی خاص بات؟''

سونجاق نے جواب دیا۔ ''پورے محل میں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ آپ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔''

نکودار نے کہا۔ ''یہ افواہ نہیں حقیقت ہے، میں نے واقعی اسلام قبول کر لیا ہے۔''

سونجاق نے نکودار کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا۔ ''کیا سچ؟''

نکودار نے جواب دیا۔ ''ہاں سچ۔ میں متمدن قوموں کے سامنے خود کو کمتر سمجھنے لگا تھا۔''

سونجاق نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں سکا، بولا۔ ''بہر حال ان تبدیلیوں کو یہاں بڑی اہمیت دی جا رہی ہے اور یہاں کوئی شخص ایسا ضرور ہے جو انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔''

نکودار نے کہا۔ ''میں اس شخص کو پہچانتا ہوں، اب کوئی اور بات کرو۔''

سونجاق نے جواب دیا۔ ''میں تو آپ لوگوں کا مہمان ہوں، آج ہوں، کل چلا جاؤں گا مگر یہاں کے حالات اچھے نہیں ہیں.... کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے، آپ کو ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔''

نکودار نے موضوع ہی بدل دیا۔ ''اور شہزادے! تم نے ترمہ شیریں کی بابت کچھ نہیں پوچھا۔''

سونجاق نے جواب دیا۔ ''ترمہ شیریں کی بابت میں کیا پوچھوں وہ یہاں ہے ہی نہیں، وہ چلی کہاں گئی؟''

نکودار نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے مگر میں بتاؤں گا نہیں۔''

سونجاق نے پوچھا۔ ''کیا اس کو بیوی بنانے کا ارادہ ہے؟''

نکودار ناراض ہو گیا۔ ''جب میں مسلمان ہو چکا ہوں تو پھر میں اپنی ماں سے شادی کس طرح کروں گا؟''

سونجاق نے خوش ہو کر نکودار کو گلے لگا لیا۔ ''تو بہت عظیم ہے، نکودار! تو شاندار انسان ہے۔''

نکودار نے سونجاق کو الگ کیا اور آہستہ سے کہا۔ ''جب تم واپس جانا تو ترمہ شیریں کو اپنے ساتھ لیتے جانا۔''

سونجاق ایک دم اتنی بڑی خبر سن کر اپنے آپ میں نہیں رہا۔ زور سے بے اختیار پوچھا۔ ''ترمہ شیریں ہے کہاں؟''

نکودار نے کہا۔ ''آہستہ آہستہ۔ ذرا نیچی آواز میں بولو وہ جہاں کہیں بھی ہے تمہیں مل جائے گی۔''

سونجاق نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن شہزادہ ارغون ایسا ہونے کب دے گا؟''

نکودار نے سختی سے کہا۔ ''مگر میں یہ بھی نہیں ہونے دوں گا کہ میری ماں میرے بھائی کی بیوی بنے۔''

سونجاق نے نکودار کے کان کے قریب اپنا منہ لے جا کر کہا۔ ''بھائی نکودار! آپ خطرے میں ہیں۔ اگر میں کبھی بھی آپ کے کام آ سکا تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ میں جلد از جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔ اب میں آپ کا پابند ہو گیا ہوں جب کہیں گے، چلا جاؤں گا۔''

نکودار نے آہستہ سے کہا۔ ''قدرے صبر کرو صبر۔ پہلے میں محل اور اس کے باسیوں کا جائزہ تو لے لوں۔''

نکودار آگے بڑھ گیا۔ وہ محل میں کئی گھنٹے رہا اور ہر جگہ رک کر ہر شخص نے اس سے ایک ہی سوال کیا۔ ''کیا وہ مسلمان ہو گیا ہے؟ کیا وہ اپنی قوم کو مسلمان ہونے کی دعوت دے گا؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے اپنے آبا و اجداد کو کیوں چھوڑ دیا اور اس طرح وہ چاہتا کیا ہے؟''

ان سارے سوالات کے جواب اس کے پاس تھے لیکن وہ خان تھا اور اب اس کو یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ کسی کی بات کا جواب دے یا نہ دے چنانچہ اس نے زیادہ تر سوالات کے جواب دیے ہی نہیں۔

محل کا سب سے آخری شخص ایک بوڑھا چوکیدار تھا۔ جب اس نے نکودار کو دیکھا تو تلملا گیا۔ کئی بار اس کا منہ کھلا اور بند ہو گیا۔ اس سے سیدھی طرح بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ نکودار نے اس کی اضطراری حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ بوڑھا چوکیدار اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے چنانچہ اس نے خود ہی پوچھ لیا۔ ''کیوں بڑے صاحب! آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟''

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی زبان کھولوں۔''

نکودار نے اس کو بہ آسانی اجازت دے دی۔

بڑے میاں نے کہا۔ ''میں نے آپ کی بابت ایک خبر سنی ہے اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا ہوں کہ خدا کرے وہ خبر غلط ہو۔''

نکودار نے بات کو الجھانا پسند نہیں کیا، صاف صاف کہہ دیا۔ ''حضرت! میں بحمد اللہ مسلمان ہو چکا ہوں۔''

بڑے میاں نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''مگر ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔ میں آپ کے لیے دعا گو ہوں کہ خدا آپ کو جملہ آفاتِ ارضی وسماوی سے محفوظ رکھے۔''

نکودار نے ایک بار پھر زور سے کہا۔ ''آمین۔''

نکودار احمد خان نے محل کی فضا سے یہ اندازہ تو لگا لیا تھا کہ اس کے خلاف ورغلانے اور بے سروپا باتیں پھیلانے کی مہم شروع ہو چکی ہے۔ یہ کام کون کر رہا ہے، وہ خوب جانتا تھا۔ اس نے محل میں رکنا فضول جانا اور وہ اباقہ خان کے خاص محل میں چلا گیا۔ اب یہ محل نکودار کے تصرف میں تھا۔ یہاں سے آدمی بھیج کر اس نے وزیر شمس الدین جوینی کو طلب کیا کیونکہ اب نازک لمحات میں جوینی سے مشورہ ضروری ہو گیا تھا۔

شمس الدین جوینی جہاں رہتا تھا، وہ جگہ محل سے دور تھی اور محل اور جوینی کی رہائش گاہ کے درمیان چھاؤنی حائل تھی۔ شمس الدین جوینی اپنے گھوڑے پر سوار محل جا رہا تھا۔ جب وہ چھاؤنی کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اس نے چھاؤنی میں شہزادہ ارغون اور سعد اللہ یہودی کو ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں بھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ شمس الدین جوینی کے گھوڑے کی آہٹ نے ان دونوں کو جوینی کی طرف متوجہ کر دیا۔ شہزادہ ارغون نے جوینی کو دیکھا اور سعد اللہ یہودی سے کچھ کہا پھر دونوں نے اپنے اپنے گھوڑوں کا رخ جوینی کی طرف کر دیا۔ جوینی نے ان دونوں کو اپنی طرف آتے جو دیکھا تو گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

وہ دونوں وزیر کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔

شہزادہ ارغون نے کھسیائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وزیر محترم! غالباً آپ خان نکودار خان کے پاس جا رہے ہوں گے۔''

شمس الدین جوینی نے جواب دیا۔ ''ہاں مجھے محل میں ابھی وقت طلب فرمایا گیا ہے۔''

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ''اچھا ہوا جو آپ یہاں مل گئے ورنہ ہم دونوں آپ کو مبارکباد دینے کے لیے آنے والے تھے۔''

جوینی نے پوچھا۔ ''کس بات کی مبارکباد؟''

شہزادے نے جواب دیا۔ ''نکودار نے اسلام قبول کر لیا ہے اور اب وہ نکودار احمد خان بن چکا ہے۔''

جوینی نے کہا۔ ''اگر یہ درست ہے تو نکودار کی یہ دوسری بڑی غلطی ہے۔ ایک صحیح کام غلط وقت پر کیا گیا۔''

سعد اللہ یہودی اور شہزادہ ارغون ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

شہزادے نے کہا۔ ''اس وقت آپ نکودار کے پاس جا رہے ہیں شاید۔''

جوینی جھوٹ نہیں بول سکا۔ ''میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں محل جا رہا ہوں۔''

شہزادے نے کہا۔ ''آپ نکودار احمد خان سے کہہ دیجیے گا کہ اس کا یہ فیصلہ غلط ہے۔ قوم اس کی اس غلطی کو نظر انداز نہیں کرے گی۔''

جوینی نے شہزادے کو یاد دلایا۔ ''شہزادے! جس کو تم نکودار احمد خان کہہ رہے ہو، اب وہ ہم سب کا خان ہے، اباقہ خان کا جانشین، ایل خان۔ آپ اس کی عزت کریں تاکہ دوسرے بھی عزت کریں۔''

شہزادہ ہنسنے لگا۔ ''عزت تو انسان خود کراتا ہے، میں صرف نکودار کی عزت تو کر سکتا ہوں مگر احمد خان کی نہیں۔''

جوینی نے اپنے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی مگر شہزادہ اپنے گھوڑے کو آگے بڑھا کر اس کے سامنے آ گیا، بولا۔ ''ہاں، مجھے ایک اور بات بھی یاد آ گئی۔ احمد خان سے کہہ دینا کہ ترمہ شیریں کا کہیں پتا نہیں چل رہا، ہمیں اس کا پتا معلوم ہونا چاہیے۔ ترمہ شیریں جب مل جائے تو یا تو خود نکودار اسے اپنی بیوی بنا لے ورنہ اسے میرے حوالے کر دے کیونکہ میں اپنے آباؤ اجداد کی رسمیں نہیں بدل سکتا۔''

جوینی نے شہزادے کی اس آخری بات کا جواب نہیں دیا، گھوڑے کو آڑا ترچھا کاٹ کر نکال لے گیا۔

نکودار اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

جوینی نے دیکھا نکودار بڑی بے چینی سے کمرے کے اندر ٹہل رہا ہے۔ جوینی کی آہٹ نے اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا، وہ مسکرانے لگا، بولا۔ ''وزیر محترم! میں آپ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔''

جوینی نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کے بلاوے کے ساتھ ہی روانگی اختیار کر لی تھی۔''

نکودار نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''وزیر محترم! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا میں نے کوئی غلط کام کیا ہے؟''

جوینی نے جواب دیا۔ ''کام تو آپ نے صحیح کیا ہے مگر غلط وقت پر کیا ہے، صحیح کام غلط وقت پر۔''

نکودار نے برہمی اختیار کی۔ ''آپ مسلمان ہو کر

میرے اسلام پر ملامت کر رہے ہیں، کیا میں دوبارہ اپنے آبا کی دین میں واپس چلا جاؤں؟ کیا اسلام کو چھوڑ دوں؟"

جوینی نے جواب دیا۔ "نہیں، میری یہ منشا ہرگز نہیں، آپ کی قوم آہستہ آہستہ تو زیر ہو سکتی ہے مگر ایک دم ایک ہی مرتبہ میں اچانک اس کو نہیں بدلا جا سکتا۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کی قوم آپ سے ناراض ہوتی جا رہی ہے۔"

نکودار جوانی کے نشے میں تھا، ترنگ میں بولا۔ "میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔ میں ایک ایک کو صحیح کر دوں گا اور اگر ارغون یہ سمجھتا ہے کہ وہ منگول عساکر کا سپاہ سالار اعلیٰ ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ اس کے سارے منصوبے پلک جھپکتے میں خاک میں مل جائیں گے۔"

جوینی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، انہیں آہستہ آہستہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "نکودار! جذباتی نہ بنیے، اب بھی کچھ نہیں گیا، سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے لیکن خدا کے لیے اپنی جذباتیت کو قابو میں رکھیے۔"

نکودار نے اپنے جذبات کو دبانے کی کوشش کی، بولا۔ "وہ مجھ سے براہ راست یا بالواسطہ یہی پوچھتا رہتا ہے کہ ترمہ شیریں کہاں چلی گئی۔ اس کو تلاش کرایا جائے کیونکہ شہزادہ ارغون اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

جوینی نے جواب دیا۔ "شہزادہ ارغون سعد اللہ یہودی کے ہاتھوں میں تماشا بنا ہوا ہے۔"

نکودار نے کہا۔ "مگر میں بھی کوئی معمولی یا عام آدمی نہیں ہوں، میں ان سب کو ٹھیک کر سکتا ہوں۔"

جوینی نے جواب دیا۔ "شہزادے! اب آپ حکمران ہیں...... لیکن جملہ عساکر شہزادہ ارغون کے قبضے میں ہیں اور خالی حکمران کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

نکودار نے کہا۔ "اور میں ارغون کو اس کے منصب سے ہٹا کر کیتا تو خان کو سپاہ سالار اعلیٰ بنا سکتا ہوں۔"

"اس وقت آپ کچھ نہ کریں، اگر آپ نے عجلت میں ایسا کیا تو تیسری خطرناک ترین غلطی کریں گے۔"

نکودار نے جوینی کو قالین پر بٹھا دیا، بولا۔ "وزیر محترم! میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ ترمہ شیریں کو چھپا کر رکھیں، میں اس کو سونجاق کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ اس کا سونجاق سے بہتر امیدوار نہیں مل سکتا۔"

جوینی سوچنے لگا، اس تجویز کے مفید اور مضر پہلوؤں پر غور کرتا رہا پھر بولا۔ "بہتر ہے لیکن یہ کام اتنا آسان بھی نہیں، جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ جب سونجاق جائے گا تو شہزادہ ارغون کے آدمی اس کی تلاشی لیں گے اور اس کے پاس ترمہ شیریں کو تلاش کریں گے۔"

نکودار نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "یہ لوگ مجھے پاگل کر دیں گے، آخر میں کروں کیا؟ اس سے کس طرح نمٹوں؟"

جوینی نے کسی شکست خوردہ کی طرح بولنا شروع کیا۔ "افسوس کہ میں بازی جیت کر بھی ہارتا جا رہا ہوں، تجویز یا منصوبہ بنانا اتنا مشکل نہیں جتنا اس پر عمل پیرا ہونا۔ سعد اللہ یہودی کامیاب ہے اور میں ناکام۔ میرا خیال ہے اب مجھ کو وزارت عظمیٰ کا منصب چھوڑ دینا چاہیے۔"

نکودار کے ہوش و حواس اڑ گئے، تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ "خدا کے لیے ایسا نہ کیجیے گا، میں تنہا رہ جاؤں گا۔"

جوینی نے جواب دیا۔ "میں بالکل مجبور اور بے دست و پا ہوتا جا رہا ہوں۔"

وہ دونوں دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے اور دونوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس کا حل کیا نکالا جائے۔ آخر جوینی ہی نے شہزادے نکودار کو مشورہ دیا۔ "شہزادے! اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو دوں، اگر آپ اس میں کامیاب ہو جائیں گے تو پھر کوئی آپ کو آپ کی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکے گا۔"

نکودار نے اصرار کیا۔ "تب پھر وہ ترکیب جلد از جلد بتا دیجیے۔"

جوینی نے مشورہ دیا۔ "شہزادے! آپ بالکل غیر جذباتی ہو جائیں اور تحمل سے اور اپنے لواحقین میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دیں، اس تبلیغ کا ایک نہ ایک دن اثر ظاہر ہو کر رہے گا اور جب آپ کی قوم کے لوگ مسلمان ہو جائیں گے تو گویا آپ طاقتور ہو جائیں گے۔"

نکودار نے جواب دیا۔ "یہ ترکیب میرے ذہن میں بھی تھی لیکن یہ کام میرے لیے بہت مشکل ہے۔ بہرحال میں کوشش ضرور کروں گا۔"

جوینی کافی دیر نکودار کے پاس خلوت میں رہ کر باہر نکلا تو منگولوں نے اسے مشتبہ انداز میں دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ "اس مسلمان نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے۔ اگر یہ درمیان میں نہ ہوتا تو ہمارے مزے ہی مزے تھے۔"

یہاں بایدو خان اور الغو خان بھی موجود تھے۔ الغو خان نے وزیر کے چہرے پر پریشانیوں کے سائے جو دیکھے تو فکر میں پڑ گیا۔

جوینی اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا مگر بایدو خان نے اس کو آواز دی اور دوڑ کر اس کے پاس پہنچا اور پوچھا۔

''وزیر محترم! آج کئی دن سے نئے ایل خان سے ملاقات نہیں ہورہی ہے۔بفضیب دشمناں وہ بیمار تو نہیں؟''
جوینی نے جواب دیا۔ ''وہ بالکل ٹھیک ہیں اور عنقریب وہ عوامی رابطہ قائم کریں گے۔اس وقت شاید آپ سے بھی ملاقات ہوجائے۔''
اس بار الغوخان نے زبان سنبھالی اور جوینی سے کہا۔ ''مشکل تو یہ ہے کہ جب خاندان والوں پر وقت پڑا ہے تو اس کا اپنی زبان سے اقرار بھی کرلیں لیکن وہ سب تو راشی اور بے غیرت ہیں۔''
جوینی نے ہنس کر جواب دیا۔ ''افسوس کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی آپ جیسی عقل نہیں ہے، ورنہ سارے مسائل چشم زدن میں حل ہوجاتے۔''
بایدو نے اپنے بھائی کو ڈانٹا۔ ''میں اسی لیے تجھ کو اپنے ساتھ نہیں لارہا تھا۔'' پھر جوینی سے کہا۔ ''وزیر محترم! آپ اس کی باتوں کا برا نہ مانیے گا۔ ورنہ میں اس وقت نئے ایل خان کے پاس چند پیشکشیں لے کر آیا ہوں۔''
جوینی نے پوچھا۔ ''کس قسم کی پیشکشیں؟''
بایدو خان نے جواب دیا۔ ''ان دنوں ایک جاہ پرست اور مطلبی انسان نے تکودار بھائی کے خلاف ایک مہم چلا رکھی ہے۔ میں اپنی قوم اور اپنے خاندان سے اچھی طرح واقف ہوں اور ان سے میں بہ آسانی نمٹ سکتا ہوں۔''
جوینی نے کہا۔ ''شہزادے بایدو خان! میں بہت سی باتوں سے واقف نہیں اور ادھر معلوم نہیں کیوں تکودار بھی مجھ پر اعتبار نہیں کررہا۔ آپ اگر چاہیں تو مل جل کر اپنا کام نکال سکتے ہیں۔''
بایدو خان نے کہا۔ ''میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں شہزادہ ارغون کے خلاف۔ اگر مجھ پر اعتبار کیا جائے تو۔''
جوینی اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس سے بات کرنے پر مجبور ہوگیا۔ ''بایدو خان! آپ اگر چاہیں تو واقعی تکودار کی مدد کرسکتے ہیں، میں آپ سے بات کرنے پر مجبور ہوں۔''
بایدو نے کہا۔ ''میں تکودار کے پاس جارہا ہوں اور اس کو پیشکش کروں گا، اگر وہ راضی ہوگیا تو میں اس کے لیے کام شروع کردوں گا۔''
جوینی اپنی راہ چلا گیا اور بایدو تکودار کے پاس۔
بایدو خان تکودار کے پاس چند بری خبریں لایا تھا لیکن تکودار کو بایدو پر اعتبار نہیں تھا اس لیے اس نے ملاقات سے انکار کردیا اور اپنے بھائی کیتا تو خان کو طلب کرلیا۔ اس موقع پر شہزادہ سونجاق بھی ان دونوں کے پاس تھا۔ سونجاق نے تکودار کو مشورہ دیا کہ اس معاملے میں جوینی کو نظر انداز نہ کریں اور اپنے ہر قسم کے مشوروں میں اس کو شریک رکھیں۔
لیکن تکودار کو اس رائے کی اصابت سے انکار تھا، جواب دیا۔ ''میں کچھ دنوں سے یہ محسوس کررہا ہوں کہ شمس الدین جوینی میرے ہر اقدام کی مخالفت کرنے لگا ہے، میں نے خان کی قبر میں زندہ دفن کی جانے والی لڑکیوں والی رسم ختم کرنا چاہی تو جوینی نے کہا یہ میری بدترین غلطی ہے پھر جب میں نے اسلام قبول کیا تو اس نے کہا کہ یہ میری دوسری بدترین غلطی ہے۔ اس نے مزید کہا کہ یہ صحیح کام کا غلط وقت تھا، پھر تم ہی بتاؤ میں اس سے کیا مشورہ کروں اور اس کا مشورہ کہاں تک صائب ہوسکتا ہے؟''
کیتا تو خان نے جوینی کی تائید کی۔ ''بھائی تکودار! اس نے آپ کے اقدام کو غلط نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ صحیح کام جو غلط وقت پر کیا گیا۔ آپ جوینی کو چھوڑ کر تنہا رہ جائیں گے۔''
سونجاق نے بھی کیتا تو خان کی تائید کی۔ ''آپ نے شہزادہ ارغون کو سپاہ سالار اعلیٰ بنا کے سخت غلطی کی ہے۔ آپ پہلے اس غلطی کا ازالہ فرمائیں اس کے بعد کچھ اور کریں۔''
کیتا تو خان نے کہا۔ ''اور آپ جو کچھ بھی کریں جوینی سے مشورہ کرکے کریں، اس کو الگ نہ رکھیں۔''
تکودار نے جواب دیا۔ ''تب پھر میں اس کو بلواتا ہوں، آپ چاہیں تو کچھ دیر آرام کرلیں۔''
سونجاق نے کہا۔ ''اب تو کام جاری رہنا چاہیے، یہ آرام کا وقت نہیں ہے۔''
کیتا تو خان نے ایک خدمت گار خاتون کو حکم دیا کہ وہ جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو وزیر جوینی کو حاضر کیا جائے۔ خدمت گار خاتون اسی وقت چلی گئی۔
جوینی کی آمد سے پہلے بایدو خان کا بھی ذکر چھڑا، تکودار نے کہا۔ ''بایدو بھی آیا تھا غالباً اس کے ساتھ اس کا بھائی الغو بھی تھا۔ مگر چونکہ میں اسے شک و شبے کی نظر سے دیکھتا رہا ہوں، اس لیے اس سے ملاقات نہیں کی اور یوں ہی چلتا کردیا۔''
سونجاق نے کہا۔ ''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اس سے اس کے شوق کی آگ اور بھڑکے گی اور پھر یہی شوق آتشِ انتقام میں بدل جائے گا۔''
تکودار نے پوچھا۔ ''شوق کیسا؟ کس قسم کا شوق؟''
سونجاق نے جواب دیا۔ ''نئے ایل خان سے ملنے کا شوق۔''
تکودار خاموش ہوگیا، اس پر الجھنوں اور پریشانیوں کی

یلغار تھی، کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''پھر کیا بایدو کو بلوا لینا چاہیے؟''

سونجاق نے جواب دیا۔ ''ضرور بلوایئے، اس کی باتوں سے یہ تو اندازہ ہو ہی جائے گا کہ وہ آپ کے لیے مخلص ہے یا دھوکے باز۔ باتیں سب کچھ بتا دیتی ہیں۔''

نکودار نے بایدو خان کو بھی طلب کر لیا۔

کافی دیر بعد بایدو اور الغو تو پہلے آگئے مگر جوینی کو آنے میں دیر لگی لیکن جوینی نے آتے ہی حیرت سے پوچھا۔ ''شہزادے! ابھی تو میں گیا تھا یہاں سے پھر یہ دوبارہ طلبی کیوں؟''

نکودار نے اپنے بھائی کیخاتو خان اور سونجاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں چند اہم قدم اٹھانا چاہتا ہوں لیکن آپ کے مشورے اور تائید کے بعد۔ اسی لیے میں نے آپ کو دوبارہ طلب کیا ہے۔''

جوینی نے نکودار کی بات سنی ان سنی کر دی، بولا۔ ''بایدو خان نے کچھ بتایا؟ پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔''

نکودار نے جواب دیا۔ ''بایدو خان تو ابھی آئے ہیں، ابھی ان سے بات نہیں ہوئی۔''

جوینی نے بایدو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''لیکن جناب، آپ تو کافی دیر کے آئے ہوئے ہیں، جب میں یہاں سے جا رہا تھا تو آپ یہاں داخل ہو رہے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

بایدو نے جواب دیا۔ ''لیکن اس وقت مجھے شرفِ باریابی حاصل نہیں ہوا تھا اور میں واپس چلا گیا تھا۔''

جوینی نے کہا۔ ''بہت خوب! اس وقت آپ نے مجھے یہ بتایا تھا کہ آپ چند بڑی اور اہم خبریں.....''

لیکن بایدو نے بات کاٹ دی، بولا۔ ''اس سے زیادہ بری خبر اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہماری قوم نکودار کی اصلاح قبول نہیں کر رہی اور وہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ کیا نکودار احمد خان اب اعلیٰ اور کلیدی عہدے مسلمانوں کو عطا فرمائیں گے؟''

نکودار نے جلدی جلدی جواب دیا۔ ''ہاں، میں اعلیٰ اور کلیدی عہدے مسلمانوں کو تفویض کر دوں گا لیکن ان مسلمانوں کو جو منگول ہیں اور مسلمان ہو جائیں گے۔''

جوینی دل برداشتہ ہو رہا تھا، اس نے نکودار سے پوچھا۔ ''آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

نکودار نے جواب دیا۔ ''مشورے کرنے کے لیے۔''

جوینی نے کہا۔ ''پھر آپ فیصلے نہ سنائیں پہلے مشورہ کریں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں۔''

نکودار نے کہا۔ ''لیکن میں نے ابھی تک تو کوئی اپنا فیصلہ سنایا نہیں۔''

جوینی نے جواب دیا۔ ''ابھی ابھی آپ نے بایدو خان کے سوال کے جواب میں یہ فرمایا تھا کہ آپ اعلیٰ اور کلیدی عہدے مسلمانوں کو دیں گے، ان مسلمانوں کو جو منگول ہیں اور مسلمان ہو جائیں گے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ آپ ایسا نہیں کریں گے اور اگر ایسا کریں گے تو یہ آپ کی تیسری بڑی غلطی ہوگی۔''

نکودار نے کیخاتو خان اور سونجاق کی طرف دیکھا۔ ''میں کیا کہتا تھا، جوینی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ میری غلطیاں پکڑنے لگا ہے۔''

جوینی نے جواب دیا۔ ''اگر آپ ایسا سمجھنے لگے ہیں تو یہ میری بدقسمتی ہے ورنہ میں ہمیشہ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہتا رہا ہوں۔''

نکودار نے پوچھا۔ ''اگر میں اعلیٰ مناصب مسلمانوں کو دوں گا تو کیا غلط کام کروں گا؟''

جوینی کو جوش آگیا۔ ''شہزادے! عہدے اور مناصب اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر ملتے ہیں یا تعصب کی بنیاد پر، اگر اس کی بنیاد تعصب پر ہوتی تو آپ کے دادا اور والد مجھے وزارت کا منصب نہ دیتے کیونکہ میں مسلمان ہوں اور آپ کے دادا اور والد مسلمان نہیں تھے۔ جب آپ کے اس تعصب سے مستحقین کی حق تلفی ہوگی تو اس سے بے چینی بڑھے گی اور جب بے چینی بڑھے گی تو حکومت کمزور ہونے لگے گی۔''

بایدو خان، جوینی کی باتوں سے سب سے زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا۔ اس نے جوینی سے کہا۔ ''وزیرِ محترم! آپ بیشک بلا کے ذہین انسان ہیں، خوب۔''

شہزادہ سونجاق نے کہا۔ ''جوینی! اگر آپ پسند کریں تو چغتائی خاندان آپ کو وزارت کا منصب پیش کر سکتا ہے۔''

کیخاتو خان نے کہا۔ ''نہیں شہزادہ سونجاق! یہ ہماری آبرو ہیں، ہم انہیں کس طرح جدا کریں گے۔''

جوینی نے بایدو سے پوچھا۔ ''ہاں تو بایدو خان! آپ شہزادہ نکودار کی کس طرح مدد کریں گے؟''

بایدو نے کہا۔ ''آپ جس طرح چاہیں گے میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔''

نکودار نے پوچھا۔ ''بایدو خان! آخر تو نے کچھ تو سوچا ہی ہوگا۔''

بایدو اپنے دل کی بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا، بولا۔ ''میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں پھر کسی وقت کہہ دوں گا لیکن اس وقت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ خود کو برسرِ اقتدار رکھنا

چاہتے ہیں تو عساکر کا سپاہ سالار اعلیٰ کسی اور کو بنانا ہوگا، کسی ایسے شخص کو جو آپ کا وفادار ہو، جس کی وفاداری اٹل ہو۔"

نکودار اس تجویز پر اچھل پڑا، بولا۔ "یہی تجویز تو میں نے سوچی تھی۔ خوب خوب۔"

لیکن جوینی نے اس کی بھی مخالفت کی، بولا۔ "شہزادے نکودار! میں کہتا ہوں آپ ایسا سوچیں بھی نہیں، آپ یہ غلطی نہیں کریں گے۔ خود اباقہ خان نے شہزادہ ارغون کو سپاہ سالار بنایا تھا۔ ہم ارغون کو کس طرح اس کے منصب سے ہٹا سکتے ہیں۔"

کیخاتو خان نے پوچھا۔ "پھر ہم اس آگ کو کس طرح بجھائیں جو اندر ہی اندر کہیں سلگ رہی ہے۔ اور کچھ پتا نہیں چلتا کہ اوپر نمودار ہونے والا دھواں کہاں سے نکل رہا ہے۔"

جوینی نے جواب دیا۔ "آپ سب یکجا ہو جائیں جب تک دور دور رہیں گے، اختلافات بڑھتے رہیں گے۔ آپ دونوں شہزادہ ارغون سے اس کے محل میں جا کر ملاقات کریں اور اس سے پوچھیں کہ وہ آپ سے برگشتہ کیوں ہے؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "اگر اس طرح یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو میں شہزادہ ارغون سے مل لوں گا۔"

لیکن بایدو نے سرد مہری سے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ اس طرح معاملہ نہیں بنے گا اور شہزادہ ارغون اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے گا کہ شاید شہزادہ نکودار کمزور پڑ رہے ہیں۔"

جوینی نے کہا۔ "اگر شہزادہ ارغون یہ سمجھے گا تو دیکھا جائے گا۔ لیکن یہ اس سے بہتر ہے کہ الٹے سیدھے اقدام سے اختلافات کی خلیج کو اور زیادہ بڑھا دیا جائے۔"

بایدو خان نے پوچھا۔ "وہ ترمہ شیریں کا کیا چکر ہے؟"

نکودار نے جواب دیا۔ "ترمہ شیریں کا کوئی چکر نہیں۔ والد کی موت کے بعد سے وہ غائب ہے جب وہ مل جائے گی تو اس کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کر دیا جائے گا۔"

بایدو نے کہا۔ "لیکن مشہور تو یہ ہے کہ اس کو آپ ہی لوگوں نے کہیں چھپا دیا ہے۔"

کیخاتو خان نے کہا۔ "اس کو ہم کیوں چھپائیں گے؟ یہ ہم پر الزام ہے۔"

بایدو نے کہا۔ "یہ الزام نہیں حقیقت معلوم ہوتی ہے چونکہ نکودار نے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ منگولوں کی جاہلانہ رسوم کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔"

جوینی نے کہا۔ "اس وقت ترمہ شیریں کا ذکر کیوں آ گیا بیچ میں؟"

شہزادہ سونجاق نے بایدو پر طنز کیا۔ "شہزادہ بایدو خان کو ترمہ شیریں سے دلچسپی ہو گئی ہے اس لیے اس کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔"

بایدو خان سونجاق کی طرف مڑ گیا۔ "شہزادہ سونجاق! کم از کم آپ تو ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ نے تو ترمہ شیریں کو اغوا کر لیا تھا اور شاید اب بھی آپ اسی کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔"

جوینی نے ان سب کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "صاحبان! آپ سب ایک ہی خانوادے کے چراغ ہیں میرا خیال ہے، اب یہ فضول باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ گھر کی باتیں گھر ہی میں رہنا چاہئیں، انہیں باہر نہیں نکلنا چاہیے۔"

لیکن بایدو بہت غصے میں تھا، بولا۔ "جناب والا! جب تک شہزادہ سونجاق ہم میں موجود ہے شہزادہ ارغون سے مفاہمت نہیں ہو سکتی کیونکہ ارغون شہزادہ سونجاق کو اپنا رقیب سمجھتا ہے۔ میں اس سلسلے میں شہزادہ ارغون سے کافی باتیں کر چکا ہوں۔"

شہزادہ سونجاق نے چڑ کر جواب دیا۔ "بایدو خان! تم دوغلے ہو، تم شہزادہ ارغون سے بھی ملتے ہو اور شہزادہ نکودار سے بھی۔ غالباً تم دونوں ہی جگہ اپنی خدمات پیش کرتے رہے ہو اور جب شہزادہ ارغون نے گھاس نہیں ڈالی تو تم یہاں آ گئے۔"

بایدو خان غصے میں کھڑا ہو گیا۔ "اب میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہروں گا، یہاں میری بے عزتی کی گئی ہے۔"

جوینی نے ان سب کو لعنت ملامت کی۔ "ہم سب یہاں اس لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ اپنے اختلافات دور کر کے بھائی بھائی بن جائیں مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ نفرتوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔"

بایدو خان نے کہا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

جوینی نے کہا۔ "لیکن بایدو خان! آپ دوبارہ پھر ملیں گے۔ نکودار آپ کا انتظار کرے گا۔"

لیکن بایدو خان نے کوئی جواب نہیں دیا، چلا گیا۔ جوینی نے شہزادہ سونجاق سے کہا۔ "شہزادے! آپ ہمارے مہمان ہیں، آپ کو ہمارے گھریلو معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔"

شہزادہ سونجاق نے کہا۔ "میں بھی اس گھرانے کا ایک فرد ہوں۔"

جوینی نے کہا۔ "یہ غلط ہے، تم چغتائی ہو اور یہ سب

تو لوبی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ خاموش رہیں۔''

شہزادہ نکودار نے سونجاق کو آنکھ دکھائی اور اشاروں ہی اشاروں میں معلوم نہیں کیا کہا کہ وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلا گیا۔

اب یہاں نکودار اور کیخاتو خان کے سوا کوئی نہیں تھا۔

جوینی نے کہا۔ ''اب جبکہ آپ دونوں کے سوا یہاں کوئی بھی نہیں، میں چند کام کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

نکودار اور کیخاتو خان جوینی کی باتیں بڑے انہماک سے سننے لگے۔ جوینی نے ان دونوں کو سمجھانا شروع کیا۔

''میں آپ دونوں میں مثالی اتحاد دیکھ رہا ہوں اس لیے میری نمک خواری کا یہ فرض ہے کہ آپ دونوں کو جو مشورے بھی دوں، وہ مخلصانہ اور میری نیک نیتی پر مبنی ہوں۔''

کیخاتو خان نے کہا۔ ''جناب والا! میں بھائی نکودار کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتا۔''

نکودار نے کہا۔ ''اور اسی لیے تو میں کیخاتو خان کو اپنے جملہ عساکر کا سپاہ سالار اعلیٰ بنانا چاہتا ہوں۔''

جوینی نے کہا۔ ''شہزادے! آپ جو چاہیں کریں لیکن قدم اٹھانے سے پہلے اس کا جانچ جانچ کریں۔ آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے یہ کہا تھا کہ اب آپ حکومت کے خاص خاص کلیدی عہدے مسلمان منگولوں کو دیں گے، آپ نے جو کچھ کہا درست کہا تھا۔ آپ کو یہی کرنا بھی ہے مگر جس جگہ، جن افراد کے سامنے اور جس وقت کہا، یہ سب غلط تھا۔''

نکودار نے بڑی بے چارگی سے کہا۔ ''تو گویا میں غلطیوں پر غلطیاں کیے جا رہا ہوں!''

جوینی نے جواب دیا۔ ''اس میں کیا شک ہے، کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ جب بایدو کو اس کے شایانِ شان اعزاز نہیں ملا تو وہ آپ کے خلاف باتیں کرنے لگا۔ آپ بایدو خان کے دل کی باتیں جاننے کے لیے اس سے تخلیے میں ایک بار اور ملیں گے۔''

نکودار نے پوچھا۔ ''وزیر محترم! اب میں آپ کے مشوروں کے بغیر کوئی قدم بھی نہ اٹھاؤں گا۔''

جوینی نے دونوں کو سمجھایا۔ ''اب کوئی نیا ہنگامہ نہیں ہوگا۔ شہزادہ نکودار اور کیخاتو خان اپنے بھائی ارغون کے پاس جائیں گے اور اس سے صلح صفائی کر لیں گے۔ آپ ارغون سے کہیں گے کہ وہ تمام رسوم جو آبائی چلی آ رہی ہیں، برقرار رہیں گی اور آپ نے اسلام ذاتی طور پر قبول کیا ہے اور حکومت کے جملہ عہدے اور مناصب اہلیتوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر دیے جائیں گے۔''

نکودار نے کہا۔ ''میں آج رات ہی ارغون سے ملوں گا۔''

جوینی نے مزید سمجھایا۔ ''اور جب آپ یہ دیکھیں کہ شہزادہ ارغون مطمئن ہو گیا ہے تو آپ اس کو اپنی راہ سے نہایت ہوشیاری سے ہٹا دیں گے، اس کو گرفتار کر کے کیخاتو خان کو سپاہ سالار اعلیٰ بنا دیجیے۔''

جوینی کی عاقلانہ باتیں دونوں کو سمجھ میں بخوبی آ رہی تھیں۔

کیخاتو خان فرطِ عقیدت سے بولا۔ ''میرے باپ دادا کتنے عقلمند اور مردم شناس تھے کہ انہوں نے آپ کو وزارتِ عظمیٰ کا منصب عطا فرمایا۔''

نکودار نے کہا۔ ''جب تک جوینی جیسا عاقل و فرزانہ ہمیں میسر ہے کوئی ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

☆☆☆

رات بہت اندھیری تھی، شہزادہ ارغون کا محل ذرا فاصلے پر تھا۔ منگولوں کے محلاتِ شاہی نصف دائرے میں بنے ہوئے تھے، نکودار کا محل تقریباً بیچ میں تھا اور شہزادہ ارغون کا محل بائیں طرف کے کنارے، بالکل آخری محل۔

شہزادہ نکودار نے ارغون کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ رات کا کھانا اس کے ساتھ کھانا چاہتے ہیں۔ شہزادہ ارغون نے جواب میں کہلا دیا تھا۔ ''یہ میری خوش قسمتی ہے اور میں اس پر فخر کروں گا۔''

جوینی نے شام کو نکودار اور کیخاتو خان سے ملاقات کی اور انہیں خوب اچھی طرح سمجھایا۔ ''دیکھیے، وہاں مشتعل نہ ہو جائیے گا۔ اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھیے گا اور بات بہت ہوشیاری سے کیجیے گا۔''

نکودار نے جواب دیا۔ ''وزیر محترم! اللہ نے چاہا تو میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

جوینی نے کہا۔ ''میں بات چیت کی تفصیلات جاننے کے لیے یہیں موجود رہوں یا اپنے گھر چلا جاؤں؟''

نکودار نے پوچھا۔ ''آپ کی اپنی کیا رائے ہے اس بارے میں؟''

جوینی نے جواب دیا۔ ''میں گھر چلا جاؤں گا کیونکہ سعد اللہ یہودی بہت چالاک ہے ممکن ہے، میری محل میں موجودگی کا علم شہزادہ ارغون کو بھی ہو جائے۔''

جوینی اپنے گھر چلا گیا اور شہزادہ نکودار اور کیخاتو خان شہزادہ ارغون کے پاس چلے گئے۔ رات کی تاریکی میں مشعل بردار دونوں شہزادوں کے آگے پیچھے مشعلیں لیے چل رہے تھے۔ درمیان میں گھنے درختوں کا باغ تھا۔ دونوں اس باغ کو عبور کر کے ارغون کے محل کے سامنے پہنچے تو انہیں دور ہی سے محل کی کھڑکیوں سے اندر کی روشنیاں

دکھائی دینے لگیں۔ شہزادہ ارغون ان دونوں کا دیر سے انتظار کر رہا تھا۔

جب بھائیوں کا آمنا سامنا ہوا تو وہ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ تکودار نے ارغون کی پیٹھ تھپتھپائی اس کا سر ارغون کے کاندھے پر ٹکا ہوا تھا۔

تکودار نے کہا۔ ''بھائیوں کو دور دور نہیں رہنا چاہیے، ورنہ حاسد سازشیں شروع کر دیتے ہیں۔''

کیختاتو خان نے کہا۔ ''میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ میرا ایک بھائی ایل خان ہے اور دوسرا سپاہ سالار اعلیٰ۔''

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ''میں بھی اپنے بھائی ایل خان پر ناز کرتا ہوں۔''

تکودار کی نظر اچانک بایدو خان پر پڑ گئی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''بایدو خان تم یہاں کہاں۔''

بایدو خان ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی میں شرارت پائی جاتی تھی۔ بولا۔ ''آخر میں بھی تو آپ سب کا بھائی ہوں تایا زاد یا چچا زاد ہی سہی، بھائی تو بھائی ہوتا ہے۔''

کیختاتو خان بھی بایدو کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ شہزادہ ارغون تکودار کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھا۔ ''آیئے ہم سب اندر چلیں، وہاں اطمینان سے باتیں کریں گے۔''

وہ محل کے اندر چلے گئے۔ یہاں نئے ایل خان اور اس کے چھوٹے بھائی کی آمد کی خوشی میں ضیافت کا شاندار انتظام کیا گیا تھا۔

شہزادہ ارغون نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ پہلے تو ہم سب ضروری باتیں کر لیں اس کے بعد کھانا کھائیں۔''

تکودار نے جواب دیا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

بایدو کسی اور سے معروفِ گفتگو تھا۔ تکودار نے شہزادے سے پوچھا۔ ''یہ بایدو یہاں کیا لینے آ گیا؟ اس کو کس نے بلا لیا ہے؟''

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ''اپنی مرضی سے چلا آیا۔ یہ مجھے اپنی خدمات پیش کر رہا تھا، میں نے اسے منع کر دیا۔''

تکودار نے گھبرا کر پوچھا۔ ''اور بھی کچھ کہہ رہا تھا یا بس اتنا ہی؟''

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ''اور یہ کیا کہے گا؟ میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔''

تکودار نے کہا۔ ''مجھے بایدو ذرا بھی پسند نہیں، کیا ہماری گفتگو اس کے سامنے ہوگی؟''

شہزادے ارغون نے جواب دیا۔ ''یہ ضروری تو نہیں..... اگر آپ اس کی موجودگی کو ناپسند فرماتے ہیں تو اسے کسی بہانے چلتا کر دیتا ہوں۔''

تکودار نے کہا۔ ''میں یہی چاہتا ہوں۔''

دوسری طرف بایدو کیختاتو خان سے کہہ رہا تھا۔ ''میں نے اپنی اور آپ لوگوں کی ملاقات کا ذکر نہیں کیا۔ براہ کرم آپ لوگ بھی چپ رہیے گا۔''

کیختاتو خان نے جواب دیا۔ ''میں یا بھائی تکودار کیوں ذکر کرنے لگے؟''

بایدو خان نے تکودار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بھائی تکودار اگر چاہتے تو اس کی نوبت ہی نہ آتی اور میں وہ چال چل کرتا کہ بس مزہ ہی آ جاتا لیکن وہ میری بات سننے پر آمادہ ہی نہ ہوئے۔''

کیختاتو خان نے کہا۔ ''تم دوبارہ مل لینا بھائی تکودار سے اور ان کے سامنے اپنی تجویز رکھ دینا۔ اگر وہ مفید اور کارآمد نکلی تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تم سے فائدہ نہ اٹھائیں۔''

بایدو خان باتیں تو کیختاتو خان سے کر رہا تھا لیکن اس کے کان تکودار اور شہزادہ ارغون کی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ کیختاتو خان خطرے کی بو سونگھ کر فوراً ان دونوں کے پاس پہنچ گیا، بولا۔ ''یعنی کمال ہے آپ دونوں مجھے دور بٹھا کے اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔''

تکودار نے خاصا نرم رویہ اختیار کر رکھا تھا، بولا۔ ''کیختاتو خان! میں ارغون سے کہہ رہا تھا کہ میں نے نادانی اور ناتجربہ کاری میں جن اصلاحات کا اعلان کر دیا تھا، اب اس پر شرمندہ ہو رہا ہوں۔ میں نے اسلام قبول کر لیا، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ شاہی مناصب اور عہدے مذہب و ملت کی تفریق اور امتیاز کے بغیر صرف اہلیت اور صلاحیت رکھنے والے لوگوں کو دیے جائیں گے۔''

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ''یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا، ورنہ یہاں کی صورتِ حال بگڑتی جا رہی تھی۔ میری قوم کے لوگ ان اصلاحات اور تبدیلیوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔''

تکودار نے کن انکھیوں سے بایدو خان کی طرف دیکھا اور شہزادہ ارغون سے کہا۔ ''شہزادہ بایدو خان کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے؟''

شہزادہ ارغون نے اس اشارے کا مطلب سمجھ لیا، بولا۔ ''وہ تو بجا فرمایا آپ نے لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وزیر شمس الدین جوینی کو بھی یہاں بلوا لیا جائے۔''

تکودار نے اپنے دل و دماغ میں ہنگامہ سا محسوس کیا،

بولا۔ ''لیکن میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہے، یہاں وزیر جوینی کا کیا کام؟''

لیکن شہزادہ ارغون نہیں مانا اور اس نے بایدو خان کو جوینی کے پاس بھیج دیا۔

تکودار نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''بھائی ارغون! ہم دونوں کا باپ اور ماں ایک ہیں.....''

کیخاتو خان بیچ میں بول پڑا۔ ''اور میں۔ مجھے کیوں الگ کر دیا؟''

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ''تو بھی ہم دونوں کا حقیقی بھائی ہے۔ ہم تینوں کی ماں بھی ایک ہے اور باپ بھی ایک۔''

تکودار نے کہا۔ ''یہ فضول باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، اس وقت تو وہ باتیں ہونی چاہئیں جن کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔''

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔''

کیخاتو خان نے تکودار کی طرف سے بولنا شروع کر دیا۔ ''بھائی تکودار کو معلوم نہیں کیوں غلط فہمی ہو گئی ہے کہ ہم بھائیوں میں ایکا نہیں رہا اور ہم تینوں حاسدوں کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔''

شہزادہ ارغون نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔

کیخاتو خان کہتا رہا۔ ''مجھے یاد ہے میرے باپ نے جھاڑو کی مثال دے کر اتحاد اور اتفاق کی افادیت پر روشنی ڈالی تھی.....''

تکودار نے بات کاٹ دی، بولا۔ ''بات مختصر ہونی چاہیے، اس وقت میں تمہیں یہ یقین دلانے آیا ہوں کہ اب میں کوئی بھی قدم تمہارے مشورے اور اجازت کے بغیر نہیں اٹھاؤں گا اور تم بھی مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ تم کوئی ایسا ویسا کام نہیں کرو گے اور حاسدوں کی باتیں سن کر انہیں میرے علم میں لاؤ گے کیونکہ اسی طرح ہم دونوں اپنے اتحاد اور حکومت کو برقرار رکھ سکیں گے۔''

شہزادہ ارغون اپنے بھائیوں کی باتیں، بہت غور سے سنتا رہا اس کے بعد پوچھا۔ ''میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنی باتوں میں جن حاسدوں اور سازشیوں کا ذکر کیا ہے، آخر وہ ہیں کون؟ میرے آس پاس تو ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہے۔ آپ دونوں کے پاس موجود ہو تو بات الگ ہے اور پھر ہمارا اتحاد و اتفاق ختم ہی کب ہوا ہے؟ وہ باقی ہے، موجود ہے اور یہ میرا وعدہ ہے کہ میں جو قدم اٹھاؤں گا آپ کی رضا اور اجازت سے اٹھاؤں گا۔ آپ بڑے ہیں اور خدا نے آپ کو ایل خان بنا دیا ہے، میں اس کا ہمیشہ احترام کروں گا۔''

دونوں بھائی شہزادہ ارغون کی باتیں سن کر حیران رہ گئے۔ تکودار نے پوچھا۔ ''تو یہ سچ ہے کہ تمہیں کسی نے بھی ہمارے خلاف نہیں بھڑکایا؟''

شہزادہ ارغون نے جواب دیا۔ ''میں اس کی قسم کھا سکتا ہوں۔''

تکودار حیرت سے کیخاتو خان کی شکل دیکھنے لگا۔ پھر شہزادہ ارغون سے کہا۔ ''تب پھر اب بات ہی کون سی رہ گئی؟ بس یہی بات کرنا تھی۔''

کیخاتو خان بالکل خاموش تھا، وہ ان دونوں سے لاتعلق سا ہو گیا تھا۔

کافی دیر بعد جب بایدو خان شمس الدین جوینی کو لے کر آ گیا تو شہزادہ تکودار نے جوینی سے کہا۔ ''جوینی، محترم وزیر! میں حیران ہوں کہ آخر میں اتنے دنوں سے غلط فہمیوں میں کیوں مبتلا ہوں، یہاں تو کوئی بات ہی نہیں۔''

کیخاتو خان نے بایدو خان سے کہا۔ ''ہم نے آپ دونوں کی وجہ سے کھانا نہیں شروع کیا۔''

جوینی کو تکودار کی بات سے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے، اس نے بات بنائی۔ ''میں نے تو ہمیشہ یہی کہا کہ آپ تینوں بھائی ہیں، کسی اور کو آپ کے معاملات میں نہیں پڑنا چاہیے۔''

اس کے بعد کھانے کا دور چلا اور سب کھانے پر پل پڑے۔

☆☆☆

بایدو خان، تکودار سے ایک بار پھر ملا اور بالکل تخلیے میں ملا۔ اس نے بایدو خان سے پوچھا۔ ''ہاں اب بتا تو مجھے کون سا مشورہ دینے والا تھا؟''

بایدو خان نے کہا۔ ''تکودار! آپ ہم سب کے لیے محترم اور قابل تعظیم ہیں، آپ شہزادہ ارغون کی باتوں میں نہ آئیں اور اس کو معزول کر کے کسی اور کو سپاہ سالار اعلیٰ بنا دیں۔''

تکودار نے پوچھا۔ ''کسی اور کو، کون؟ کوئی نام ہے تیرے ذہن میں؟''

بایدو خان نے جواب دیا۔ ''وہ میں خود ہوں، اگر آپ مجھے سپاہ سالار اعلیٰ بنا دیں گے تو میں ہمیشہ آپ کا وفادار رہوں گا اور آپ پر کسی سمت سے بھی آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

تکودار نے چونک کر بایدو خان کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ''لیکن ارغون سے میرا جھگڑا ہی کیا ہے۔ اس سے کوئی اختلاف بھی نہیں پھر میں اس کو معزول کیوں کروں؟''

لیکن بایدو خان اپنی رائے پر ڈٹا ہوا تھا، بولا۔

''شہزادہ نکودار آپ تاریکی میں ہیں۔ شہزادہ ارغون پر آپ کا اعتماد آپ کی زندگی کی بدترین غلطی ہوگی۔''

نکودار نے جواب دیا۔ ''میں اس بدترین غلطی کو قبول کرتا ہوں لیکن میں اس کو معزول نہیں کروں گا۔''

اس کے بعد اس نے تالی بجا کے خدمت گاروں کو طلب کیا اور بایدو خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کو قید کر دیا جائے کیونکہ اس کی سازش حکومت اور شاہی خاندان کے لیے سخت خطرہ بن گئی ہے۔''

بایدو خان اس غیر متوقع حکم سے گھبرا گیا، بولا۔ ''نکودار! تم مجھے قید کرسکتے ہو لیکن میری باتوں کی سچائی کو بدل نہیں سکتے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، سچ کہا ہے تم ارغون پر اعتبار نہیں کرسکتے۔''

نکودار نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نہ تو تجھ پر اعتبار کرتا ہوں، نہ اپنے بھائی ارغون پر..... میں نے اس کا بھی انتظام کرلیا ہے۔'' اس کے بعد نکودار نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''اب آپ لوگ بھی باہر آجائیں۔''

بایدو خان نے دیکھا، اس حکم کے بعد پردے کے پیچھے سے شمس الدین جوینی، شہزادہ کیخاتو خان اور سونجاق مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے۔ نکودار نے ان تینوں سے کہا۔ ''آپ لوگوں کا خیال درست تھا۔ یہ ساری سازشیں اسی ایک شخص کی تھیں۔''

جوینی نے یہاں بھی حکمتِ عملی سے کام لیا، نکودار کو مشورہ دیا کہ...... حالات پر قابو پاتے ہی بایدو خان کو پہلی فرصت میں قتل کر دیجیے گا کیونکہ میں نے اس سے زیادہ ناقابلِ اعتبار آدمی نہیں دیکھا۔

نکودار نے سونجاق سے کہا۔ ''اور سونجاق! تم کل ہی یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہیں ترمہ شیریں آگے مل جائے گی۔''

سونجاق نے پوچھا۔ ''لیکن وہ کہاں ملے گی مجھے؟''

نکودار نے جواب دیا۔ ''مراغہ کے باہر، تمہیں تلاش نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ لوگ تمہیں تلاش کر کے ترمہ شیریں کو پہنچا دیں گے۔''

شمس الدین نے اجازت چاہی۔ ''اچھا شہزادے، میں تو چلا اب۔ جب آپ مجھے طلب فرمائیں گے، حاضر ہوجاؤں گا۔''

شمس الدین جوینی اسی وقت وہاں سے چلا گیا۔ اب وہاں صرف دو بھائی رہ گئے تھے۔ شہزادہ نکودار اور کیخاتو خان۔ نکودار نے کہا۔ ''ارغون ہمیں بے وقوف سمجھتا ہے، اس نے خاسدوں اور سازشیوں کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ لیکن میں بھی کوئی بے وقوف نہیں ہوں۔ کل رات کو ارغون میرا مہمان ہوگا۔ میں اس کی دعوت کر رہا ہوں، اس کے ساتھ بدبخت سعد اللہ یہودی بھی آئے گا۔ میں اسی وقت انہیں گرفتار کر کے تجھے اپنی جملہ افواج کا سپاہ سالار اعلیٰ مقرر کردوں گا۔ تو اس منصب کے لیے تیار رہ۔''

دوسرے دن ترمہ شیریں کو مراغہ کے باہر شہزادہ سونجاق کے حوالے کر دیا گیا، وہ اسے لے کر تیزی سے خراسان کی طرف روانہ ہوگیا۔

نکودار نے اپنے سپاہ سالار اعلیٰ کی ضیافت کا شاندار اہتمام کیا تھا۔ محل کے پیچھے میدان میں دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور ان کے چولہوں سے دھواں سہ پہر ہی سے اٹھنے لگا تھا۔ نکودار نے محل کی چھت سے اس اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھا تو پھولے نہ سمایا، اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو اس دھوئیں کی طرح رات شہزادہ ارغون تو بھی فضا میں تحلیل ہوجائے گا۔''

شام ہوگئی۔ کیخاتو خان ابھی تک نکودار کے پاس نہیں پہنچا تھا۔ نکودار کو اس پر غصہ آرہا تھا۔ اس نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ وہ اسی وقت شہزادہ کیخاتو خان کو اس کے سامنے پیش کرے۔

مغرب سے ذرا پہلے نکودار نماز کے لیے وضو کر رہا تھا۔ اس حال میں ایک خدمت گار نے نکودار کو مطلع کیا۔ ''خان محترم! خبر ملی ہے کہ شہزادہ ارغون تشریف لا رہے ہیں۔''

نکودار مسکرایا، بولا۔ ''میں مغرب کی نماز ادا کرلوں..... تو ارغون کو میرے کمرے میں بٹھا دے۔''

خدمت گار نے کہا۔ ''ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔''

نکودار نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ ان سب کو ہال نما کمرے میں بٹھایا جائے۔''

نکودار وضو کر کے مغرب کی نماز پڑھنے لگا، اسی دوران میں خدمت گار چلایا۔ ''حضورِ والا! شہزادہ ارغون کے ساتھ دو چار نہیں کئی ہزار آدمی ہیں اور ان کی نیت اچھی نہیں لگتی۔''

لیکن اب نکودار کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا، وہ رکوع سے سجدے میں چلا گیا۔

خدمت گار برابر اعلان کر رہا تھا۔ ''حضورِ والا! وہ بغیر اجازت کے محل میں داخل ہوچکے ہیں اور اسی طرف چلے آرہے ہیں۔''

نکودار خاموش تھا، نماز پڑھنے میں مشغول۔ خدمت گار بہت زیادہ فکرمند تھا کہ آخر یہ نکودار خاموش کیوں ہے؟ اس کے بعد خدمت گار کی آواز سنائی نہیں دی، ایسا لگا جیسے

کسی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔

تین رکعت فرض ادا کرنے کے بعد جب اس نے مڑ کر دیکھا تو شہزادہ ارغون اور سعد اللہ یہودی اس کے پیچھے کھڑے اس کو گھور رہے تھے۔

تکودار نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ''کوئی بات نہیں، ہم آپ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ جس طرح آسمان پر ایک سورج ہے، اسی طرح اس محل میں ایک ہی حکمران رہے گا۔''

تکودار نے کچھ کچھ یہودی کا مطلب سمجھ لیا تھا، پھر بھی تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔ ''میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔''

سعد اللہ یہودی نے جواب دیا۔ ''میرا مطلب صاف ہے۔ ہم تجھے معزول اور شہزادے ارغون کو اپنا خان بناتے ہیں۔''

تکودار نے کہا۔ ''لیکن تجھ کو یہ حق کس نے دیا ہے؟''

جواب میں شہزادہ ارغون نے میان سے تلوار نکال کر تکودار کی گردن پر وار کیا۔ ''یہ حق اس نے، اس تلوار نے ہمیں دیا ہے۔''

تلوار نہتے تکودار کا سر اڑاتی دوسری طرف نکل گئی۔ تکودار کا سر الگ جا گرا اور جسم فرش پر تڑپنے لگا۔ تکودار کا خون بہہ بہہ کر سعد اللہ یہودی کے جوتے تر کرنے لگا۔

تکودار کے قتل کے بعد شہزادہ ارغون کے آدمی محل کے اندر اور باہر یہ اعلان کرتے پھر رہے تھے۔ ''وہ خان جس نے اپنا مذہب ترک کر دیا تھا اور جو ہمارے آبا و اجداد کی رسوم مٹا دینا چاہتا تھا، قتل کر دیا گیا ہے اور قوم ایک بہت بڑے فتنے سے نجات پا گئی۔ اب شہزادہ ارغون ہمارا خان ہے، ایل خان اور دیکھو خبردار جو کسی نے شہزادہ ارغون کے خلاف کچھ کہا یا زبان کھولی۔ نیلا جاودانی آسمان ہمارے موجودہ ایل خان کو صدیوں قائم اور برقرار رکھے۔''

شہزادہ ارغون نے محل کے چپے چپے میں ترمہ شیریں کو تلاش کیا مگر وہ نہیں ملی۔ اس کے بعد اس نے شہزادہ سونجاق کو ڈھونڈا مگر وہ بھی نہیں ملا۔ دونوں طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے ان دونوں کی تلاش کا سلسلہ ختم کر دیا۔

اس نے کیتا تو خان سے کچھ نہیں کہا کیونکہ کیتا تو خان اپنے آبائی دین پر قائم تھا۔ اس نے کیتا تو خان سے کہا۔ ''شہزادے! تکودار میرا بھی بھائی تھا مگر گمراہ بھائی۔ میں نے اس کو قتل کر کے ہزاروں لاکھوں منگولوں کی خواہش پوری کر دی اور ان ہزاروں لاکھوں میں تو خود بھی شامل ہے۔''

بایدو خان کو آزاد کر دیا گیا۔ اس نے بایدو خان سے معذرت کی۔ ''بایدو خان! تیرے ساتھ جو کچھ ہوا، میں اس پر نادم اور شرمسار ہوں۔ بہرحال اب ایسا نہیں ہوگا۔''

شمس الدین جوینی کو اس انقلاب کی خبر مل چکی تھی اور یہ جو کچھ ہوا تھا، وہ جوینی کے لیے خلافِ توقع نہیں تھا لیکن وہ مایوس بھی نہیں ہوا تھا۔ جوینی کو معلوم تھا کہ اسلام منگول شہزادوں کے دل و دماغ میں جگہ بنا چکا ہے، ایک تکودار کی موت اسلام کے اس اثر و نفوذ کو نہیں روک سکے گی جو کئی شہزادوں کے دلوں میں رچ بس چکا تھا۔

شہزادہ ارغون نے جوینی کو طلب کیا۔ اس وقت بایدو خان بھی ارغون کے پاس موجود تھا۔ شہزادہ ارغون نے کہا۔ ''جوینی! میں تیری عزت کرتا ہوں کیونکہ تیرا کردار بے داغ رہا ہے۔ تو نے مسلمان ہونے کے باوجود تکودار کے ہر اس اقدام کی مذمت کی جو اسلام کی تائید میں تھا۔ میرے دادا اور باپ بھی تیری بڑی عزت کرتے تھے۔ اگر تو چاہے تو دربار میں آتا جاتا رہ، ورنہ گوشہ نشینی کی صورت میں تیرا مشاہرہ تجھے پہنچتا رہے گا۔''

بایدو خان نے بھی جوینی کی بڑی تعریف کی۔ جوینی نے شہزادہ ارغون سے درخواست کی کہ اب وہ آرام کرنا چاہتا ہے، اس لیے کوئی خدمت قبول کرنے کو تیار نہیں۔ شہزادہ ارغون نے اسے سبکدوش کر دیا۔

اب شہزادہ ارغون کے سامنے ایک عظیم الشان منصوبہ تھا۔ اپنے باپ اباقہ خان کی سرحدوں کو وسعت دینے کا منصوبہ۔ مصر کے مملوک خاندان کی گوشمالی کرنا۔ برقائی اور چغتائی خانوادوں کو مزہ چکھانا اور منگولوں میں پھیلتے ہوئے اسلامی اثرات کو سختی سے روک دینا۔ شام کے بعد رات اور رات کے بعد طلوع ہونے والی صبح پر پہرے بٹھا دینا۔ ارتقا کی طرف بڑھتے ہوئے وقت کے دھارے کا رخ موڑ کر اپنے آبا و اجداد کے رسم و رواج کی طرف لے جانا، یہ وہ عظیم مقاصد تھے جنہیں شہزادہ ارغون حاصل کرنا چاہتا تھا مگر...

من در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

ماخذات

تاریخ تمدنِ اسلام۔ جرجی زیدان۔ الفہرست۔ ابنِ ندیم۔ طبقاتِ ناصری۔ منہاج سراج۔ الفخری۔ ابن طباطبا۔ تاریخِ اسلام۔ شاہ معین الدین ندوی۔ تاریخ الخلفا۔ مولانا جلال الدین سیوطی





باتدبیر

طاہر جاوید مغل

ازل سے ہوتا چلا آیا ہے کسی ایک کا تجربہ، کسی دوسرے کے لیے عبرت کا سبب بن جاتا ہے مگر افسوس... ایسا صرف چند لمحات کے لیے اور احساس کی حد تک ہوتا ہے اور پھر ہم دنیا کے جھمیلوں میں گم ہوجاتے مگر... یہ وقت کہیں گم نہیں ہوتا ہمیشہ روپ بدل کر پھر سے پرانے تجربات دہرانے آجاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا... دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے جب خود منہ کے بل گرتے ہیں تو دوسروں کے لیے ایسے ہی عبرت کا سبب بن جاتے ہیں جیسے ان کے لیے ان سے پہلے کے تجربات لیکن... صرف چند لمحات کے لیے۔

چاندنی راتوں میں ایک غیر متوقع انجام اور......

عبرت کی روداد

''چاندنی رات کا اپنا ایک سحر ہوتا ہے، اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس کو رومانس کی طرف لاؤ۔'' ذیشان نے شہلا کو تقریباً جھاڑتے ہوئے کہا تھا۔

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ وہ بالکل مٹی کا بُت بن گیا ہے۔'' شہلا نے موٹی شال اپنے گرد لپیٹے ہوئے جواب دیا۔

''اور مٹی کا بُت چونکہ اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے، چلتا پھرتا ہے نہ کوئی مشکل کام کرتا ہے اس لیے اس کے ٹوٹنے کا

امکان ہی باقی نہیں رہتا۔''

یہ مکالمہ دو پرانے پریمیوں ذیشان اور شہلا کے درمیان ہو رہا تھا۔ یہ وہی عالی شان کوٹھی تھی جہاں ڈیڑھ برس پہلے بائیس سالہ شہلا اٹھتر سالہ میاں انوار کی دلہن بن کر آئی تھی۔ یہ وہی پرانا کھیل تھا جو ان گنت مرتبہ دہرایا جا چکا ہے اور دہرایا جاتا رہے گا...... قریب المرگ دولت مند بوڑھے سے جوان خوب صورت لڑکی کی شادی۔ بوڑھے کی موت اور جوان لڑکی کے کروڑپتی ہو جانے کے نہایت قوی امکانات۔ اس کھیل میں شہلا کے ساتھ اس کا محبوب ڈاکٹر ذیشان بھی شریک تھا۔ ڈاکٹر ذیشان ایک عام ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا اور آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ آج کل اس نے میاں انوار کی کوٹھی کے پچھواڑے ہی ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ میں فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ یوں وہ شہلا سے دور ہو کر بھی اس کے قریب تھا اور اس کے ایک پرانے کلاس فیلو کی حیثیت سے میاں انوار کے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔

ڈیڑھ سال پہلے جب شہلا اور میاں انوار کی شادی ہوئی تو میاں انوار کے دو عدد بائی پاس ہو چکے تھے۔ دل کی حالت اچھی نہیں تھی۔ غالب امید یہی تھی کہ تیسرے بائی پاس کی نوبت نہیں آئے گی اور جناب چار چھ مہینے کے اندر ہی لڑھک جائیں گے لیکن پھر تیسرا بائی پاس بھی ہو گیا تھا۔ اس بائی پاس کے بعد میاں انوار ایک دم بے حد محتاط ہو گئے تھے۔ ہر قسم کی بدپرہیزی یکسر ختم کر ڈالی تھی اور اس بدپرہیزی میں غالباً ''شہلا'' بھی شامل تھی۔ وہ اس کی طرف شاذ و نادر ہی توجہ دیتے تھے۔

شہلا اور ذیشان کی دلی خواہش تو یہی تھی کہ بڑے میاں اب جلد از جلد اپنا بستر بوریا گول کریں لیکن وہ دونوں اس حوالے سے کوئی بھی غیر قانونی کام کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

تیسرے بائی پاس کے بعد میاں انوار کی صحت جیسے سنبھل سی گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے بے اعتدالیوں سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ ذیشان کو یاد تھا...... شہلا اور میاں انوار کی شادی کو آٹھ ماہ گزرے تھے جب شہلا اور ذیشان کے درمیان پہلا سنجیدہ مکالمہ اسی کوٹھی میں اور اسی لان میں ہوا تھا۔ ذیشان نے کہا تھا۔ ''بڈھے کے لیے مشکلیں آسان کرو۔ تم خود تو سبزی خور ہو لیکن وہ تو نہیں۔ جناب بہت مرغن سے مرغن کھانے کھاتے رہے ہیں۔ میں ان کی ساری ہسٹری بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ انہیں چنگا چوکھا کھلاؤ تاکہ بہتری کی صورت نکلے۔''

شہلا نے کہا تھا۔ ''توبہ کرو ذیشان! اب تو وہ چکنائی اور نمک وغیرہ کے پاس سے بھی نہیں گزرتا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے اور پھونک پھونک کر کھاتا پیتا ہے۔''

پھر ایک موقع پر ذیشان نے مشورہ دیا تھا۔ ''ہر وقت اس کے سامنے بھیگی بلی بنی نہ رہا کرو۔ کچھ کلاسیکل قسم کی ''ٹینشن'' دو اس کو۔ تم عورتوں کے پاس روٹھنا اور آنسو بہانا بہت بڑے ہتھیار ہیں۔ گھر میں کوئی جنگ شنگ شروع کرو۔ ایسے اٹکے ہوئے مریضوں کے لیے ذہنی تناؤ بڑا مشکل کشا ثابت ہوتا ہے۔''

''لیکن وہ تو اس طرف آتا ہی نہیں۔ کئی دفعہ غصے میں پھٹ بھی پڑتی ہوں مگر چپ سادھے رہتا ہے۔ فس کر ٹال دیتا ہے۔ لگتا ہے جو کچھ ہمیں پتا ہے، اسے بھی پتا ہے۔''

کوئی چھ ماہ پہلے عید کے موقعے پر شہلا نے ذیشان کے مشورے سے اپنے بڈھے کو ٹینشن دینے کی زبردست کوشش کی تھی۔ میاں انوار کا ایک دیرینہ ملازم تھا، نام تو اس کا کچھ اور تھا مگر پتا نہیں کیسے ''بنگالی'' پڑ گیا تھا۔ دبلا پتلا سا شریف النفس نوجوان تھا۔ ڈرائیوری کر لیتا تھا اور کچن سنبھالنے والی صفیہ کا ہاتھ بھی بٹا لیتا تھا۔ میاں انوار اس پر بے حد بھروسا کرتے تھے۔ اسے وہ ساری دوائیں ازبر تھیں جو دن میں کئی بار میاں انوار نے لینا ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ ان کی بیشتر ضروریات کا دھیان رکھتا تھا۔ وہ گاؤں کا رہنے والا تھا۔ عید کے موقع پر شہلا نے اسے کسی کام سے لاہور سے گاؤں بھجوا دیا اور اس سے کہا کہ وہ مالک کو خود ہی آگاہ کر دے گی۔ گاؤں میں بنگالی کو چار پانچ روز تو لگ ہی جانا تھے۔ شہلا نے میاں انوار کو آگاہ تو کیا لیکن اس طرح کہ ان کی تسلی ہونے کے بجائے ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ ان دنوں موبائل فون وغیرہ کا رواج نہیں تھا۔ میاں انوار کے لیے ممکن نہیں تھا کہ کسی طرح بنگالی سے رابطہ کر پاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے عید اور عید کے بعد دو تین روز تڑپ کر گزارے۔ ایک دن اسپتال بھی جانا پڑا۔ امید پیدا ہو گئی کہ شاید دیگیں وغیرہ پک جائیں گی۔ ان کے دو ناخلف بیٹے اپنے بال بچوں سمیت ''اسٹیٹس'' میں رہتے تھے۔ انہیں بھی فون کھڑکا دیے گئے لیکن بابا جی تھے ڈھیٹ ہڈی کے۔ لوٹ پوٹ کر چند گھنٹے میں پھر سنبھل گئے۔

اور اب...... شادی کو قریباً ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ میاں انوار، اندر اپنے کمرے میں آرام فرما رہے تھے۔ شہلا اور ذیشان وسیع لان میں بیٹھے مکالمہ کر رہے تھے۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

بات ہو رہی تھی، چاندنی رات کی اور اس کے سحر کی۔

ذیشان نے شہلا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں پھر کہتا ہوں کہ راتوں کا اپنا ایک سحر ہوتا ہے۔ جیسے تہوار سے پہلے کی رات...... بارش کی رات...... چاندنی رات اور جہاں تک مجھے پتا ہے تمہارا بڈھا تو چاندنی راتوں کا بہت رسیا ہے۔ ان کی شیخوپورہ والی فیکٹری کا منیجر فیاض میرا دوست ہے۔ وہ مجھے بڈھے کی عیاشیوں کی داستانیں سنایا کرتا ہے۔ دس پندرہ سال پہلے شیخوپورہ والے ریسٹ ہاؤس میں ان لوگوں کی جو محفلیں جمتی تھیں وہ عموماً چاندنی راتوں میں ہوتی تھیں۔ بڈھا چاندنی میں بیٹھ کر پیتا تھا اور پورا چکور بن جاتا تھا۔ وہاں جو میوزک چلے ہوا کرتا تھا اس میں اس طرح کے گانے بجتے تھے، اب کی بار پونم میں...... تو جو آئے گی ملنے...... ہم نے یہ سوچ رکھا ہے...... وغیرہ وغیرہ۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو ذیشان؟'' شہلا نے ذرا الجھ کر اور اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں چلا کر پوچھا۔

''آج چاند کی تیرھویں ہے، کل چودھویں ہوگی اور پرسوں پندرھویں۔ ان راتوں سے فائدہ اٹھاؤ جانِ من۔ بڈھے کو راہِ راست پر لاؤ۔''

''وہ کیسے؟''

''جی چاہتا ہے ایک پیارا سا جھانپڑ دوں تمہارے منہ پر۔ لیکن سامنے صفیہ اور بنگالی کچن میں کھڑے دیکھ رہے ہوں گے۔ میرے جگر کے ٹوٹے! پہلے اپنے اس حلیے کو ٹھیک کرو۔ لگتا ہے کہ جوان لڑکی نہیں ہے، اسی بڈھے کی ہم عمر یا اس سے تھوڑی چھوٹی اس کی شریکِ حیات ہے۔ بالوں کا بیڑا غرق فرمایا ہوا ہے تم نے۔ عمر رسیدہ خواتین کی طرح شال لپیٹی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ مہینوں سے بیوٹی پارلر کی شکل نہیں دیکھی تم نے...... اور لباس...... بس سبحان اللہ...... اس حلیے میں تو تم اٹھارہ سال کے لڑکے کو متوجہ نہیں کر سکتی ہو، اسی سال کے بوڑھے کو کیا کرو گی۔''

''تو کیا کروں؟''

''دیکھو، ابھی صبح کے گیارہ بجے ہیں۔ رات ہونے میں کوئی بارہ گھنٹے باقی ہیں۔ سب سے پہلے پارلر کا چکر لگاؤ۔ میں ذرا کلینک سے ہو آؤں۔ پھر آکر تمہیں بتاؤں گا۔''

ذیشان کے اصرار پر شہلا پارلر جانے کو تیار ہوگئی۔

تین بجے کے لگ بھگ ان کی ملاقات دوبارہ ہوگئی۔

میاں انوار دوپہر کے پرہیزی کھانے کے بعد پھر لمبا قیلولہ فرما رہے تھے۔ ذیشان، شہلا کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یقیناً وہ بھی خود کو آئینے میں دیکھ کر حیران ہوئی ہوگی۔ اس کی Look کم از کم ستر فیصد بہتر ہوئی تھی۔ ذیشان کا اپنا دل دھڑکنا شروع ہوگیا۔

وہ اپنے ساتھ ایک میڈیکل میگزین لایا تھا۔ اس کے ایک آرٹیکل میں دل کے مریضوں پر ذہنی وجذباتی تناؤ کے اثرات بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے تھے۔ ذیشان نے آرٹیکل جگہ جگہ سے پڑھا۔ ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھو سویٹی! یہ وہی بات لکھی ہے جو میں تم سے اکثر کہتا ہوں۔ دل کے مریضوں میں...... خاص طور پر زیادہ بڑی عمر کے مریضوں میں مرد وزن کی قربت اور جذباتی فشار اکثر سنگین نتائج کا سبب بنتے ہیں۔''

اس سے آگے آرٹیکل میں بہت سی مثالیں تھیں اور کچھ سچے واقعات بھی درج تھے جن میں ذمے داروں کو فوری موت یا بدترین اسٹروک کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

شہلا، ذیشان کا رخِ نظر سمجھ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آج پوری سنجیدگی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اپنے طویل لیکچر کے اختتام پر ذیشان نے اس سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں، ان دو تین راتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاؤ، اس طرح سی ساوتری بن کر پھرتی رہو گی تو کچھ نہیں بنے گا۔ گھر میں بولڈ لباس پہنو...... اور رات کو تو تمہارا لباس ایسا ہونا چاہیے کہ بڈھا نظر ہی نہ ہٹا سکے...... یہ دیکھو، اس طرح کی ڈریسنگ ہونی چاہیے گھر میں۔''

اس نے میگزین کے چار پانچ صفحات پلٹے۔ اسکن لوشن کے ایک اشتہار میں ایک پری پیکر تقریباً آدھ میٹر کپڑا زیبِ تن کیے کھڑی تھی۔

ذیشان بولا۔ ''جہاں تک مجھے پتا ہے تمہارے وارڈروب...... میں اس سے ملتے جلتے تین چار ڈریس تو ضرور ہوں گے۔''

''اس سے بھی چھوٹے ہیں۔'' وہ ذرا شوخی سے مسکرائی۔

''تو کرو نا استعمال۔''

''اس کی رحلت کے بعد استعمال میں آئیں گے۔''

وہ معنی خیز انداز میں ذیشان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

''لیکن رحلت کا ہی تو مسئلہ ہے۔'' وہ بولا۔

وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ اس کا دل چاہا اسے ٹچ کرے، لیکن وہ کھلے سبزہ زار میں بیٹھے تھے اور دونوں ملازمین بھی آس پاس ہی کہیں تھے۔ اتنے میں

چھریرے جسم والا بنگالی بیچ بیچ دکھائی دے گیا۔ ان دونوں کے پاس آ کر اس نے سلام کیا اور بولا۔ ''میڈم! رات کے کھانے میں کیا ہوگا؟''

''شلجم، بھنڈے یا حلوا کدو وغیرہ پکا لو۔'' ذیشان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''کیوں اپنی میڈم اور سب گھر والوں کے معدوں پر ظلم ڈھا رہے ہو۔ کچھ اچھا پکاؤ، خود کھاؤ اور اپنے صاحب کو بھی کھلانے کی کوشش کرو۔ کچھ بروسٹڈ، کچھ باربی کیو وغیرہ وغیرہ۔''

بنگالی آج کچن کے حوالے سے میڈم کے بجائے ذیشان سے ہدایات لے کر واپس چلا گیا۔ جب وہ لان سے نکل کر کچن میں اوجھل ہو گیا تو ذیشان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''رومان انگیزی میں میوزک کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ تمہارے بڈھے کو عشقیہ غزلیں اور انگلش کے تھرلنگ سونگ، جوانی سے بہت پسند رہے ہیں۔ شیخوپورہ والے ریسٹ ہاؤس میں جو محفلیں جما کرتی تھیں وہاں بھی موسیقی کا بہت عمل دخل ہوتا تھا۔''

وہ دیر تک شہلا کو مختلف ہدایات دیتا رہا۔ عشوہ طرازیوں پر بات کرتا رہا۔ بڑے میاں کے پاس آ کر دور جانا اور دور جا کر پھر پاس آنا، اسے جذباتی تلاطم کا شکار کرنا۔ وہ شہلا کو قائل کرتا رہا کہ وہ اگلے ایک دو دن میں گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دے ہی ڈالے۔

☆☆☆

شام سے پہلے ہی ذیشان اپنے فلیٹ پر واپس آ گیا۔ بلڈنگ کی ایک بالکونی سے اسے میاں انوار احمد کی وسیع و عریض کوٹھی دکھائی دیتی تھی اور وسیع لان کا تھوڑا سا حصہ بھی نظر آتا تھا۔ یہ اوائل ستمبر کے خوشگوار دن تھے۔ شام کو ذیشان نے دیکھا کہ میاں انوار قیلولے سے جاگ گیا تھا اور شہلا کے ساتھ لان میں موجود تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ شہلا اس کی ہدایات پر واقعی عمل کر رہی ہے۔ اسے لان میں شہلا کی جھلک نظر آئی۔ وہ نہایت چست شارٹ اور باریک سی ٹی شرٹ پہنے پھولوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس کے لمبے ریشمی بال ہوا میں لہرا رہے تھے پھر وہ اوجھل ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور سین نظر آیا۔ وہ بوڑھے انوار کے ساتھ چہلیں کر رہی تھی۔ اس نے میاں انوار پر پانی کے پائپ سے پھوار پھینکی تھی۔ وہ ہانپتا ہوا لگ رہا تھا اور اپنے ''تھل تھلے'' جسم کے ساتھ شہلا کے ہاتھ سے پائپ چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دائیں بائیں ہو رہی تھی اور کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ پھر وہ دونوں ذیشان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''ویل ڈن...... ویل ڈن...... گڈ گرل۔'' ذیشان نے زیر لب کہا۔

پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ آج رات کافی سنسنی خیز رہے گی۔ آسمان صاف تھا۔ پوری راتوں کا چاند طلوع ہو گیا۔ مدھر ہوا، چاندنی اور ایک دلکش رات۔ آخری بار قریباً بارہ بجے ذیشان نے فون پر شہلا سے رابطہ کیا۔ اس نے دبے الفاظ میں بتایا کہ آج وہ عرصے بعد شوہر کو تھوڑی سی ''خراب'' بنانے میں کامیاب ہوئی ہے...... اب وہ ایک رومانٹک انگلش فلم دیکھنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

''بہت اچھی جا رہی ہو، میں تو کہتا ہوں، آج کچھ کر دکھاؤ۔''

''پتا نہیں۔'' وہ جیسے ٹھٹک کر غیر یقینی انداز میں بولی۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ'' چاندنی'' بڈھے پر ہمیشہ سے خاص اثر کرتی ہے۔ کھڑکیوں کے پردے ہٹا دو...... اچھا میوزک لگاؤ...... ماحول بناؤ۔''

''اچھا، وہ شاید ادھر ہی آ رہا ہے۔'' شہلا نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ تقریباً ساری رات ہی ذیشان نے سوتے جاگتے میں گزار دی۔ پوری رات کا چاند اپنے جلوے دکھاتا رہا۔ پتا نہیں کیوں، اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ کوئی اچھی خبر ملے گی۔ اس کی سماعت ہر گھڑی فون کی گھنٹی پر لگی ہوئی تھی۔

بہر حال وہ رات گزر گئی، کوئی اہم واقعہ رونما نہیں ہوا۔ صبح نو بجے کے قریب ذیشان نے شہلا کو فون کیا۔ شہلا نے بتایا کہ رات فلم دیکھنے کے دوران ''اولڈ مین'' کی طبیعت ذرا بگڑ گئی تھی۔ بنگالی نے ڈاکٹر کو فون کیا اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق رات والی میڈیسن کی ڈوز میں تھوڑا سا اضافہ کیا۔ شاید اسی اضافے کی وجہ سے اولڈ مین جلدی سو گیا۔ دوا دینے کی ذمے داری میاں انوار نے مکمل طور پر ملازم بنگالی کو ہی سونپ رکھی تھی۔

☆☆☆

اگلی رات چودھویں کی تھی۔ آسمان آج بھی شفاف تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ رات آٹھ بجے کے قریب شہلا نے فون پر ذیشان کو خوشخبری سنائی۔ ''اولڈ مین کا موڈ آج اچھا ہے۔ شام ہی سے میوزک سن رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، آج اپنے حسن کی ساری بجلیاں گرا دو اس کے سر پر۔ جانے نہ پائے۔''

ناسور

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس لیے اپاہج راستوں پر گامزن تھا۔

سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسرپیکار رہنے میں بیتنے لگا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

فروری 2017ء سے

ماہنامہ **سرگزشت** کے صفحات پر ملاحظہ کریں

وہ دلکش انداز میں ہنسی ''کوشش تو کر رہی ہوں۔''
''کیا پہن رکھا ہے؟''

شہلا نے تفصیل بتائی۔ ذیشان مطمئن ہوا۔ ذیشان نے اسے ایک مشروب کا برانڈ بتایا جو میاں انوار کچھ عرصہ پہلے تک بڑے شوق سے پیا کرتا تھا۔ ''میرے خیال سے سویٹی! یہ مشروب بھی بڈھے کے پرانے بار روم میں موجود ہوگا...... ڈھونڈ لو، نہ ملے تو پھر کسی سے بھی کام چلانے کی کوشش کرنا لیکن پہلے ڈھونڈ لو۔''

''اچھا میں بنگالی سے کہتی ہوں۔''

پونم کی رات تھی۔ چاند جوبن پر تھا۔ موسم کی جادوگری اس سے سوا تھی۔ ذیشان اپنے فلیٹ کی بالکونی میں ٹہل رہا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا، کوئی اچھی خبر آئے گی...... کوئی بڑی خبر آئے گی۔ بارہ بجے...... ایک بجا اور پھر دو۔ وہ کمر سیدھی کرنے کے لیے اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔ اسے لیٹے پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایمبولینس کے سائرن کی ''دلکش'' آواز سنائی دی۔

اس کے دل نے پکار کر کہا۔ یہ آواز میاں انوار کی کوٹھی سے آرہی ہے۔ وہ ننگے پاؤں لپک کر بالکونی میں پہنچا۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں اس نے دیکھا، ایمبولینس میاں انوار کی کوٹھی میں ہی تھی...... وہ تیزی سے ریورس ہوئی اور پھر مین گیٹ کی طرف دوڑی۔

بڈھے کو اٹیک آگیا تھا...... شاید آخری اٹیک......

اس نے شہلا کو فون کیا لیکن وہ اٹینڈ نہیں کرسکی۔ ذیشان نے تیزی سے لباس تبدیل کیا اور سیڑھیاں اتر کر میاں انوار کی رہائش گاہ کی طرف لپکا۔ دو تین چوکیدار اور پڑوس کے لوگ مین گیٹ پر ہی موجود تھے۔

ذیشان نے میاں انوار کے پڑوسی سیٹھ فضل سے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے جی؟''

''اسپتال لے کر گئے ہیں، بے ہوشی کی حالت میں۔'' سیٹھ فضل نے جواب دیا۔

''زیادہ سیریس تو نہیں؟''

''حالت تو نازک ہے۔'' دوسرے پڑوسی نے جواب دیا۔

''لیکن ایکدم سے؟...... یقین نہیں آرہا۔'' ذیشان منمنایا۔

سیٹھ فضل نے کہا۔ ''لگتا تو یہی ہے کہ سر پر زیادہ چوٹ آئی ہے۔''

اس وقت ذیشان نے دیکھا کہ میاں انوار کوٹھی کے برآمدے میں سلیپنگ گاؤن پہنے کھڑے تھے۔ بے حد پریشان نظر آرہے تھے۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

اس نے مڑ کر پڑوسی سیٹھ فضل کی طرف دیکھا...... وہ کہہ رہے تھے۔ ''اللہ کرم کرے۔ کافی زیادہ سیڑھیوں سے گری ہیں بے چاری۔''

''گری ہیں؟ کون گری ہیں؟'' ذیشان حیرت کے شدید ریلے میں تھا۔

''مسز انوار گری ہیں بھائی! تم کیا سمجھ رہے تھے؟'' سیٹھ فضل نے حیران ہو کر کہا...... سب لوگ برآمدے کی طرف گئے۔ سیٹھ فضل نے میاں انوار سے پوچھا۔ ''کچھ پتا چلا بھائی جی؟''

''نہیں...... میں نے پولیس کو فون کر دیا ہے۔ وہ پہنچ رہے ہیں۔'' میاں انوار نے کہا اور دھم سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

چند سیکنڈ کے اندر ذیشان پر ایک حیرت ناک اور لرزہ خیز انکشاف ہوا۔ بنگالی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس نے اپنی نوجوان مالکن پر مجرمانہ حملے کی سنگین کوشش کی تھی۔ ہاتھاپائی کے دوران میں شہلا سیڑھیوں سے گری تھی اور سر پر شدید چوٹیں لگنے سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ اسے نازک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔

قریباً دو گھنٹے بعد شہلا اسپتال میں دم توڑ گئی۔ بنگالی کی تلاش میں پولیس نے جگہ جگہ چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ سب ششدر تھے۔ پانچ چھ سال میاں انوار کے پاس کام کرنے والا نہایت قابل اعتماد ملازم یہ کیا کر گزرا؟ وہ تو کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا۔ ہر وقت نگاہیں جھکائے رکھتا تھا۔ شرافت اس کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔

وہ سب حیران تھے...... وہ جانتے نہیں تھے کہ شہلا نے اپنے بوڑھے شوہر کو شکار کرنے کے لیے جو کچھ کیا تھا، اس نے کسی اور کو بھی تہ و بالا کر دیا تھا۔

ہاں...... حسن کی شوخیاں اور حشر سامانیاں سب مردوں کو ایک ہی طرح سے متاثر کرتی ہیں۔ چاندنی راتیں بھی سب کے جذبات ایک ہی طرح سے بھڑکاتی ہیں۔ موسیقی، شراب اور کباب بھی ہر ایک کے لیے ایک جیسی دیوانگی لاتے ہیں...... ریشمی راتوں کے سناٹے میں جب حسن اکساتا ہے تو کسی بھی جھکی جھکی نظروالے بنگالی کے دل میں بھی طوفان برپا ہوسکتا ہے۔ ہاں...... کوئی بھی گہرائی کے گڑھے میں گر سکتا ہے۔



ممنوع عادت

راحیل انجم

انسان کی بعض عادتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہزاروں میں بھی اس کی شناخت کرادیتی ہیں، جیسے کہ یہاں... اس کی کچھ ایسی ہی انفرادی عادتوں کی وجہ سے قانون کو بھی آسانی ہوگئی کہ مجرم لاکھ ہوشیاری دکھائے، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کر بیٹھتا ہے... سو وہ بھی کر بیٹھی۔

ایک انتہائی پیچیدہ کیس کی الجھنوں کا دلچسپ اور مختصر قصہ

کرٹ بلٹزر نے پولیس افسر بگر اور اس کے ساتھی ہینس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''یہ میری بیوی کی لاش نہیں ہے۔''

بگر نے محسوس کیا کہ کرٹ کتنا پریشان ہے اور کچھ کہہ نہیں پا رہا ہے۔ وہ فوراً اس کی مدد کو بڑھا اور بولا۔ ''تو پھر یہ آپ کی دوست اور محبوبہ کی لاش ہوگی۔''

کرٹ نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ ''آپ کا خیال درست ہے۔''

پولیس افسر نے اپنا سر جھکالیا اور کہا۔ ''خوب جناب! یہ عورت آپ کے گھر کے سامنے اور آپ کی کار میں قتل کی گئی

ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ قتل کا کیس ہے؟''
قتل کا نام سنتے ہی کرٹ کے چہرے کا رنگ سفید ہوگیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ بولا۔ ''آپ کو کیسے معلوم کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ یہ تو محض ایک اتفاقی حادثہ تھا۔''
بنگر نے تیز لہجے میں اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں جناب! یہ ایک عام حادثہ نہیں ہے۔ گو کار اور لاش دونوں جل چکے ہیں لیکن شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دانستہ کیا گیا ہے۔ کوئی آتش گیر مادہ کار میں رکھا گیا تھا جس کا سلسلہ بیٹری سے جوڑ دیا گیا تھا۔ جونہی کار اسٹارٹ کی گئی، وہ پھٹ گیا اور کار میں آگ بھڑک اٹھی۔ اب آپ یہ بتائیے کہ رات کو آپ نے کار گیراج میں کھڑی کی تھی؟''
''نہیں! کار تمام رات اسی جگہ کھڑی رہی ہے جہاں حادثہ پیش آیا ہے۔''
کرٹ بلٹزر، یہ کہہ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا اور جھانک کر باہر دیکھنے لگا جہاں جلی ہوئی کار کا سیاہ ڈھانچا اب بھی موجود تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف منہ کیے ہوئے کہہ رہا تھا۔
''جس کسی نے بھی آتش گیر مادہ میری کار میں رکھا ہوگا، اس کا مقصد مجھے ہلاک کرنا ہوگا۔ اسے تو امید بھی نہ ہوگی کہ مجھ سے پہلے برجیٹ کار اسٹارٹ کرے گی۔''
''تو مقتولہ کا نام برجیٹ تھا؟''
''جی ہاں!'' کرٹ نے آہستہ سے جواب دیا۔
''برجیٹ ہنگل۔ عمر 28 سال تھی۔ وہ ویانا کی رہنے والی تھی اور ایک ادارے میں مترجم کا کام کرتی تھی۔ وہ تین ہفتے قبل ہی یہاں آئی تھی۔ اس لیے یہاں اس کا کوئی عزیز وغیرہ بھی نہیں ہے۔''
پولیس افسر نے کرٹ کو اوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''خوب! تو کیا آپ اس سے شادی کرنا چاہتے تھے؟''
کرٹ نے بڑی تیزی سے جواب دیا۔ ''نہیں جناب! میں اپنی بیوی سے طلاق نہیں لینا چاہتا۔ میری بیوی بہت دولت مند ہے اور اس کی دولت کی بدولت میں نے اپنی زندگی بنائی ہے۔ کئی بار مالی پریشانیوں سے اسی نے نجات دلائی ہے۔'' وہ خاموش ہوگیا اور چند لمحے سکوت کے بعد بولا۔
''اور اب تو ہم نے اپنی زندگی کو نئے انداز سے بسر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم نے اپنی تمام املاک فروخت کرنا شروع کر دی تھی۔ یہاں تک کہ یہ مکان بھی جس میں... آپ اس وقت موجود ہیں۔ مع اثاثہ فروخت کر کے ہم دونوں دنیا کی سیاحت کرنے نکل کھڑے ہوں گے۔ پھر اس سیاحت کے دوران ہمیں جو شہر سب سے اچھا لگے گا، وہیں ہمیشہ کے لیے اقامت اختیار کرلیں گے۔''
بنگر یہ سن کر حیران رہ گیا۔ ''ہمیشہ کے لیے؟ کیا مطلب؟ کیا آپ لوگوں کا ارادہ گوشہ نشینی اختیار کرنے کا ہے؟''
کرٹ کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے۔ ہم کام کر کر کے تھک گئے ہیں۔ اتنا کما لیا ہے کہ اب زندگی بھر کے لیے کافی ہے جبکہ ہماری اولاد بھی نہیں ہے تو کیوں نہ آرام سے وقت گزارا جائے۔''
''تو اس وقت آپ کی بیوی کہاں ہیں؟''
''وہ کل رات ہوائی جہاز سے پیرس چلی گئی۔ وہ وہاں سے جنوبی فرانس جائے گی اور اپنی ایک سہیلی سے ملے گی۔ آٹھ روز بعد میں اس سے پیرس کے ہوائی اڈے اورلی پر جاملوں گا اور پھر ہم سیاحت کا پروگرام بنائیں گے۔'' کرٹ نے ایک نگاہ بنگر کو دیکھا اور بولا۔ ''یہ آٹھ روز میں برجیٹ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ آج ہمارا پروگرام شہر سے باہر جانے کا تھا۔''
اس بار ہینس نے دخل اندازی کی تھی۔ ''تو برجیٹ نے رات یہاں بسر کی تھی؟''
کرٹ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا۔ ''ہاں، وہ یہیں تھی۔ جب میری بیوی روانہ ہوگئی تو میں نے برجیٹ کو ساتھ لیا اور گھر آگیا۔''
''تو آج صبح وہ کہاں جارہی تھی اور آپ نے اپنی گاڑی اسے کیوں دی تھی؟''
کرٹ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا اندازہ تو آپ خود بھی لگا سکتے ہیں کہ ایک عورت کسی مرد کے ساتھ کہیں جانے سے پہلے کیا کرتی ہے۔ وہ بال بنوانے ہیئر ڈریسر کے ہاں جارہی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کرلیں اور دھیرے دھیرے بولا۔ ''میں یہیں کھڑکی میں کھڑا تھا، تب ہی وہ ناگوار واقعہ پیش آیا۔ برجیٹ واقعی بے پناہ حسین لڑکی تھی۔'' اس نے آنکھیں کھول کر جیب سے اپنا پرس نکالا اور اس میں سے ایک تصویر نکال کر پولیس افسر کو دکھائی۔
پولیس افسر نے تصویر کو بغور دیکھا۔ پھر پرس کرٹ کو واپس کردیا اور پوچھنے لگا۔ ''آپ کو برجیٹ کا پتا تو معلوم ہوگا؟''
کرٹ نے اس کا پتا بتا دیا۔ تب بنگر نے اس سے کہا۔ ''اچھا جناب! برائے مہربانی شہر کی حدود میں رہیے گا تاکہ اگر آپ کی ضرورت پڑے تو ہم آپ سے مل سکیں۔''
وہ دونوں باہر نکل کر جلی ہوئی کار کے پاس رک گئے۔
لاش کی باقیات کو لے جایا جاچکا تھا۔ جو کار جل چکی

تھی، وہ بیوک کا نیا ماڈل تھی۔ ہینس بے ساختہ بول پڑا۔
''وہ کتنی خوب صورت اور قیمتی کار تھی۔'' بنگر خاموش رہا، ہینس نے پھر کہا۔ ''لیکن کرٹ نے بھی بڑی ہمت کا ثبوت دیا ہے کہ اتنی قیمتی کار قربان کردی۔''
''کیا مطلب؟'' بنگر نے پوچھا۔
''میرے خیال میں کیس بہت سیدھا سادہ ہے۔ کرٹ اب دنیا کی سیاحت اور باقی ماندہ زندگی آرام و آسائش سے بسر کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اب بریجیٹ کا وجود اسے بار...... نظر آتا ہوگا۔ ادھر وہ بیوی کی دولت کا محتاج بھی ہے لہٰذا اس نے بیچاری محبوبہ کو قربان کر دیا اور اس سے نجات حاصل کرلی۔''
بنگر نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ ''ہینس! تم ایسا کرو کہ کرٹ کے بتائے ہوئے پتے پر جا کر بریجیٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ میں یہاں پڑوس میں معلوم کرتا ہوں۔''
دوپہر کو جب دونوں یکجا ہوئے تو بنگر نے کہا۔ ''کرٹ کی بیوی گیبریل واقعی کل رات پیرس گئی ہے مگر کرٹ نے تو کہا تھا کہ وہ واپسی میں بریجیٹ کو لیتا آیا تھا اور پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ رات کو جب وہ کار سے اترا تو اکیلا تھا۔''
ہینس کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''ممکن ہے وہ گھر آنے کے بعد دوبارہ سگریٹ وغیرہ لینے نکلا ہو اور اس وقت اسے پڑوسیوں نے دیکھا ہو، بہرحال میں نے جو تحقیق کی ہے' اس سے پتا چلا ہے کہ بریجیٹ کی ایک دوست گرڈا کورنر اس کے پاس ایک ہفتے کے لیے آکر ٹھہری تھی۔ اب وہ ویَن میں ہے۔ میں اس کا پتا لے آیا ہوں۔''
اگلے روز بنگر ویَن سے لوٹا تو ہینس کو دیکھتے ہی بولا۔
''ہر عورت کی ایک نہ ایک سہیلی ضرور ہونا چاہیے کیونکہ عورتیں، عورتوں سے کوئی بات نہیں چھپاتیں اور انہیں سب معلوم بھی رہتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ بریجیٹ کو یقین تھا کہ کرٹ جلد ہی اس سے شادی کرلے گا۔ بریجیٹ نے اپنا بیمہ بھی کرا رکھا تھا۔ اس کی موت کے نتیجے میں کرٹ کو ایک لاکھ مارک ملنا تھے۔''
پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔
''آج رات میں اسپانیا جا رہا ہوں۔ وہاں ساحل پر کرٹ کا ایک عالی شان مکان ہے۔''
بنگر ہوائی جہاز سے مالاگا گیا جو اسپانیا میں واقع ہے اور وہاں سے ٹرین کے ذریعے کستاول کے ساحلی مقام پر پہنچا۔ کرٹ ولا واقعی بے حد شاندار بنا ہوا تھا۔ بنگر نے گھنٹی بجائی تو ایک لاغر اندام اور سرخ بالوں والی عورت باہر نکلی اور حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔
پولیس افسر نے ہیٹ اتار کر اسے تعظیم دی اور بولا۔
''معاف کیجیے گا۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی۔ آپ ہی مسز گیبریل کرٹ ہیں؟''
سرخ بالوں والی عورت نے تصدیق کے طور پر سر ہلایا اور بولی۔ ''جی ہاں! فرمایئے کیا کام ہے؟''
بنگر نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ ''میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں مگر چونکہ آپ اس وقت گھر میں تنہا ہیں اس لیے میں اندر نہیں آؤں گا۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ کسی ہوٹل میں چلیں تاکہ آرام سے بات ہوسکے۔''
یہ کہہ کر بنگر نے گیراج کی طرف نگاہ ڈالی جہاں ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔
سرخ بالوں والی عورت اس کی نظروں کا مطلب سمجھ گئی اور بولی۔
''میرا خیال ہے، آپ گاڑی نہیں لائے ہیں۔ آپ یہیں ٹھہریے، میں اپنی گاڑی لے کر آتی ہوں۔''
چند لمحے بعد وہ گیراج سے گاڑی نکال لائی اور بولی۔
''اب آپ ازراہِ کرم سوالات شروع کردیں۔ مجھے بے چینی ہو رہی ہے۔''
بنگر دروازہ کھول کر عورت کے برابر میں بیٹھ گیا اور بولا۔ ''آپ گاڑی باہر نکالیں، میں ابھی بتاتا ہوں۔''
عورت نے چابی گھمائی۔ پیر سینڈل سے نکال کر ایکسلریٹر پر رکھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔
بنگر مسکرا کر بولا۔ ''محترمہ! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ برہنہ پیر گاڑی چلانا ممنوع ہے کیونکہ اس میں حادثے کا خطرہ ہوتا ہے۔''
''پتا نہیں۔'' عورت نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''میں تو سالہا سال سے کار اسی طرح چلاتی آرہی ہوں۔ آج تک کبھی کوئی حادثہ نہیں ہوا۔''
''جی ہاں' مجھے آپ کی دوست گرڈا کورنر نے بھی بتایا تھا کہ آپ گاڑی چلاتے وقت جوتا اتار دیتی ہیں۔ اسی سے میں نے پہچانا کہ آپ گیبریل نہیں بلکہ بریجیٹ ہیں۔ جو عورت گاڑی میں جل کر مرگئی تھی، وہ گیبریل تھی کیونکہ گاڑی اسٹارٹ کرتے وقت اس کے پیر میں جو سینڈل تھے، وہ جل کر اس کے پیر سے چپک گئے تھے۔''



شیش محل

قسط 18:

اسماء قادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہولہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

ناہر جابر و جیجر کے مہروں میں ملفوف سازشیں رنگ بدلتی وارداتوں کی ہنگامہ خیز دلچسپ داستان



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیامِ پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شاہی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں ولدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ ولدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے ولدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ ولدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالتِ بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شاہی اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکتِ قلب بند ہونے سے مر گئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق ربن داوا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ ولدار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دورانِ ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھابیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ ربن داوا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھابیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھابیہ کی بیٹی بملا سے ہوتی ہے جو بیوہ تھی۔ بملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ ادھر طوائف زادی چاند بانو جو فاروق سے محبت کرتی ہے اور فاروق کے دل میں چاند بانو کی محبت نہ سہی مگر وہ چاند بانو کا دل سے احترام کرتا تھا۔ بملا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ بملا ایک غنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسیڈنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمرد بائی جان سے جاتی ہے۔ ادھر ربن فاروق کا حساب چکتا کرنے کے لیے ولیم کو اٹھا لیتا ہے اور اسے شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس ربن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ فاروق بمبئی لوٹ آتا ہے۔ ربن اور فاروق ولیم والے معاملے کو نمٹانے کے لیے وکیل اشوک بچن کی خدمات لیتے ہیں۔ ادھر جولیٹ اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لیتی ہے اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدرآباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ فاروق جولیٹ کی غیر موجودگی سے پریشان ہو کر اس کی تلاش میں اسٹیشن پر معلومات حاصل کرتا ہے۔ وہیں وہ چاند بانو کے ایکسیڈنٹ کے ذمے دار گنیش کو دیکھ لیتا ہے۔ دونوں کے درمیان دھینگا مشتی میں گنیش جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ فاروق بملا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرتا ہے تاہم اپنی اچھی خصلت کے باعث اسے چھوڑ دیتا ہے۔ فاروق کو کچھ لوگ اغوا کر لیتے ہیں۔ حویلی میں آپا بیگم کا بیٹا اختر جولیٹ کو پامال کرنا چاہتا ہے تاہم جولیٹ کے شور مچانے پر وہ پکڑا جاتا ہے۔ اسی وقت جولیٹ انکشاف کرتی ہے کہ وہ جوزفین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اسد اللہ اسے بیٹی قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور آگے کا فیصلہ نواب سلیم اللہ کی حویلی آمد تک موقوف ہو جاتا ہے۔ تاہم نواب صاحب ہندو بلوائیوں کے حملے میں شدید زخمی ہو جاتے ہیں اور حویلی میں تاحال صورتِ حال تبدیل ہو جاتی ہے۔ ادھر ربن فاروق کی تلاش کرتے کرتے اصل حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے اغوا میں بھابیہ سیٹھ کی بیٹی بملا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بملا فاروق کو خود کو اپنانے پر زور دیتی ہے۔ انکار پر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے۔ ربن فاروق کو روپوش کر دیتا ہے۔ وہ فاروق کی خواہش پر انو پم اگروال کی فیملی کے ہمراہ اس کے لندن جانے کے انتظامات کرتا ہے۔ ادھر اختر جولیٹ کی عزت کے درپے ہو کر دوبارہ اس پر حملہ کرتا ہے۔ تاہم عالیہ کی مداخلت اور اس کے حملے میں وہ اپنی جان سے جاتا ہے۔ ربن فاروق کو بندرگاہ دیکھنے جاتا ہے۔ واپسی میں اس کے تانگے کو دشمن گھیر لیتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

فاروق نے اپنی مرضی سے لندن جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ وہاں جا کر ولدار آغا کو اس کے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا لیکن بحری جہاز میں قدم رکھتے ہی اس کے دل کی عجیب سی کیفیت ہوگئی اور وہ یوں بے چین ہونے لگا جیسے کوئی اس کے دل کو مٹھی میں جکڑ کر بری طرح بھینچ رہا ہو۔ اپنی یہ کیفیت خود اس کے لیے بھی ناقابلِ فہم تھی۔ وہ تو ہر حال میں آغا کو اس کے انجام تک پہنچا کر جولیٹ کا بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن کچھ تھا جو اس کے قدموں میں زنجیر ڈال رہا تھا، کوئی آواز تھی جو اسے پکار کر پلٹ جانے پر اصرار کر رہی تھی۔ اپنی اس کیفیت پر حیران و پریشان وہ سب کے درمیان ایسے چل رہا تھا جیسے اسے زبردستی اپنے قدموں کو گھسیٹنا پڑ رہا ہو اور دم تھا کہ سینے میں گھٹتا جاتا تھا۔ اس کیفیت سے تو وہ تب بھی نہیں گزرا تھا جب اس نے اپنے خون کے رشتوں کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر حویلی سے قدم باہر نکالے تھے۔ اپنی اندرونی گھٹن سے گھبرا کر اس نے اکبر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور بولا۔

”تم ان لوگوں کے ساتھ کیبن میں جاؤ۔ میں ذرا عرشے پر جارہا ہوں۔“

”خیریت تو ہے فاروق بھائی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اکبر نے اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا اور چونک کر پوچھنے لگا۔ اڈے پر اتنے عرصے کے قیام کے باعث اسے فاروق کے ساتھ ہونے والے حادثے کا علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ صحت یاب ہو جانے کے باوجود فاروق کو ابھی توجہ کی ضرورت ہے۔ سر کی نازک چوٹ کا معاملہ ایسا تھا کہ ڈاکٹروں نے معمولی سی طبیعت کی خرابی کو بھی نظرانداز نہ کرنے کی ہدایت دے رکھی تھی۔

”طبیعت ٹھیک ہے، بس ذرا کھلی ہوا میں سانس لینے کو دل چاہ رہا ہے۔“ فاروق نے زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟“ اکبر نے دریافت کیا۔

”نہیں یار! تم سیٹھ صاحب کی فیملی کے ساتھ جاؤ۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔“ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے پیچھے رہ گئے تھے۔ شکنتلا اور اس کے والدین نے اس بات کو محسوس کیا تو رک گئے اور پیچھے مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔ فاروق نے اکبر کی توجہ ان کی طرف مبذول کرواتے ہوئے اسے ان کے ساتھ جانے کو کہا تو وہ مجبوراً آگے بڑھ گیا۔ خود فاروق نے عرشے کا رخ کیا۔ وہاں اور بھی کئی افراد موجود تھے لیکن اسے لوگوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ سب کو نظرانداز کر کے ایک تنہا گوشے کی طرف بڑھ گیا اور ریلنگ سے کہنیاں ٹکا کر اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ آنکھوں کے سامنے جھاگ اڑاتا سمندر کا پانی تھا اور سر پر بےکراں وسعتوں کا مالک نیلا آسمان۔ نیلے آسمان کے پس منظر میں صبح دم رزق کی تلاش میں نکلنے والے پرندے پرواز کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اسے بمبئی کی اس صبح کو الوداع کہہ کر اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا لیکن جانے کیوں اچانک دل جانے سے انکاری ہوگیا تھا۔ دل کی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر وہ خود پر جبر کیے سفر شروع ہونے کا منتظر تھا۔ ابھی جہاز کی روانگی میں وقت تھا اور مسافروں کے اپنے سامان سمیت سوار ہونے کا سلسلہ جاری تھا۔

”لائٹر یا ماچس ہوگی آپ کے پاس؟ جلدی میں میرا لائٹر جانے کہاں رہ گیا ہے اور مجھے اس سے سگریٹ کی بڑی طلب ہو رہی ہے۔“ وہ اپنی ذات کی تنہائی میں گم تھا کہ قریب سے ابھرنے والی اس آواز پر چونک کر بولنے والے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ چالیس سے اوپر کا آدمی تھا جس نے صبح کے وقت بھی پورا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔

”مجھے رندھاوا کہتے ہیں۔ میں ڈیلی انڈیا کا ایڈیٹر ہوں۔“ فاروق متوجہ ہوا تو وہ آدمی خود ہی اس سے اپنا تعارف کروانے لگا۔ فاروق کو اس وقت کسی کے تعارف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی سے بات چیت کا خواہش مند تھا لیکن ڈیلی انڈیا کے حوالے نے اسے چونکا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ جولیٹ اسی اخبار میں ملازمت کرتی تھی۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی رندھاوا صاحب! آپ کا نیوز پیپر تو میں بہت پابندی سے پڑھتا ہوں۔ اس نیوز پیپر میں آپ نے کچھ بہت ہی اچھے سلسلے شروع کر رکھے ہیں۔ خاص طور پر وہ جو سیاستدانوں کے فیملی انٹرویوز کا سلسلہ تھا وہ تو مجھے بہت ہی پسند تھا لیکن پھر آپ نے اس سلسلے کو بند کر دیا۔“ وہ جانتا تھا کہ اخبارات کے مدیر ان بڑے باخبر اور بارسوخ لوگ ہوتے ہیں اس لیے اس نے خاص ڈھب پر گفتگو کا آغاز کیا۔

”اس سلسلے کو بہت سے لوگوں نے پسند کیا تھا لیکن آج کل ہندوستان کے حالات آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ کتنی افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ سیاستدانوں کے پاس انٹرویو دینے کی فرصت ہی نہیں ہے اور فیملی انٹرویو کے لیے ٹائم لینا تو بہت ہی مشکل ہوگیا ہے۔ بہت سے سیاستدانوں نے تو اپنی فیملیز کو ہندوستان سے باہر بھیج دیا ہے کہ کہیں وہ نشانے پر نہ آجائیں، اسی لیے ہم اپنے ریڈرز کی پسندیدگی کے

باوجود اس سلسلے کو جاری نہیں رکھ سکے۔'' زندھا وا کے ہاتھ میں اب بھی وہ سگریٹ تھا جسے سلگانے کے لیے وہ فاروق سے لائٹر یا ماچس کا طلب گار ہوا تھا لیکن اپنے اخبار کی تعریف پر اس کا ذہن سگریٹ کی طرف سے ہٹ گیا تھا اور وہ پوری دلچسپی سے اس سے گفتگو کر رہا تھا۔

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ حالات کی وجہ سے بہت کچھ متاثر ہو رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم جیسے ریڈرز ایک اچھے سلسلے سے محروم ہو گئے۔ اس سلسلے میں ایک انٹرویو دلدار آغا اور ان کی بیگم کا بھی شائع ہوا تھا۔ وہ تو مجھے بہت ہی اچھا لگا تھا۔ آغا صاحب مسلمان ہوتے ہوئے جس طرح ہندوستان کی تقسیم کے خلاف کام کر رہے ہیں اور مسلسل کانگریس کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں، یہ بات مجھے بہت اچھی لگی۔'' اس نے بہت سلیقے سے دلدار آغا کا ذکر چھیڑا۔

''جانے دیجیے صاحب! ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، اور دکھانے کے اور۔ دلدار آغا سے اچھے تو وہ مسلم لیگی سیاست دان... ہیں جو کھل کر ہندوستان کے بٹوارے کی بات کرتے آ رہے ہیں۔ آغا صاحب کہنے کو سارا ٹائم کانگریس کے ساتھی بنے رہے لیکن جب انہیں دکھائی دینے لگا کہ بٹوارا ہونے کو ہے تو پہلے انگلینڈ سدھار گئے اور اب سنا ہے وہاں سے کراچی روانہ ہو گئے ہیں۔ کہا جا رہا ہے بننے والے ملک میں کراچی انویسٹرز کے لیے بہترین شہر ہوگا۔'' زندھا وا نے جو انکشاف کیا وہ فاروق کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ تو یہ سن کر ہی سٹپٹا گیا تھا کہ وہ جس شخص کی جستجو میں اتنے طویل سفر پر نکل رہا ہے وہ تو اب لندن میں موجود ہی نہیں ہے۔

''تو کیا پاکستان سچ مچ بن جائے گا؟'' اپنی بوکھلاہٹ میں اسے اور کچھ سجھائی نہ دیا تو زندھا وا سے یہی پوچھ بیٹھا۔

''نیوز پیپر پڑھنے والے آدمی ہو کر آپ یہ سوال کر رہے ہیں۔ اب تو یہ سامنے ہی کی بات ہے کہ مسلمان اپنی سازش میں سپھل (کامیاب) ہو گئے ہیں۔ آپ اس شپ پر دیکھ نہیں رہے کہ کتنے انگریز سوار ہیں۔ مدت تک ہندوستان پر راج کرنے کے بعد اب یہ سب اپنے دیش واپس لوٹ رہے ہیں۔'' زندھا وا نے اسے جواب دیا لیکن وہ تو شاید اس کے جواب کو توجہ سے سن بھی نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ صرف اتنا سوچ رہا تھا کہ جب دلدار آغا لندن میں نہیں ہے تو وہ اس جہاز پر کیوں سوار ہے۔ اس کے تو سفر کی وجہ ہی باقی نہیں رہی تھی۔

''آپ کس وچار میں پڑ گئے؟'' زندھا وا نے اس کی غائب دماغی کو محسوس کر کے پوچھا لیکن وہ ان سنی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جہاز پر اپنی موجودگی کا جواز ختم ہو جانے پر اسے ایک پل بھی یہاں اپنی موجودگی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا دل جو پہلے ہی عجیب سی کیفیت کا شکار تھا، اب بالکل ہی وحشت زدہ ہو گیا تھا اور وہ بے چین تھا کہ کسی طرح یہاں سے نجات ملے۔

''فاروق بھیا۔'' یہ صدا شاید پہلے بھی اس نے سنی تھی لیکن متوجہ تب ہوا جب کسی نے اس کے بازو کو جھنجوڑ کر اسے پکارا۔ پکارنے والی شگفتہ تھی جس کی سانس ذرا سی پھولی ہوئی تھی۔

''کہاں گم ہیں آپ۔ اکبر نے بتایا کہ آپ عرشے پر ہیں اس لیے میں بھی یہاں چلی آئی لیکن لگتا ہے آپ نیچے جا رہے ہیں۔''

''ہاں میں جا رہا ہوں۔ تم ابھی کسی کو کچھ مت بتانا۔'' فاروق نے اس سے کہا تو وہ ہونق سی اس کی صورت دیکھنے لگی۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے فاروق کی بات سمجھ نہیں آئی ہے۔

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟'' اس نے سراسیمہ سے لہجے میں پوچھا۔ اس بار فاروق نے خود پر قابو پایا اور بولا۔

''میری بات غور سے سنو شگفتہ! میں جس وجہ سے انگلینڈ جا رہا تھا وہ وجہ باقی نہیں رہی ہے اس لیے اب میں بھی تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا رہا لیکن تم یہ بات ابھی کسی کو نہیں بتانا، خاص طور پر اکبر کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں وہ تم لوگوں کے ساتھ انگلینڈ چلا جائے اور وہاں سیٹل ہو جائے۔ یہاں اس کا کوئی نہیں ہے اور اڈے کی زندگی کو میں اس کے لیے مناسب نہیں سمجھتا۔ وہ پڑھ لکھ کر کوئی اچھی نوکری کرے اور اپنا گھر بسائے، اس کے لیے یہی ٹھیک رہے گا۔ تم اور تمہاری فیملی اس سلسلے میں اس کی ہیلپ کر سکتے ہیں۔ وہ بہت وفادار اور جانثار لڑکا ہے۔ اسے اپنے ساتھ رکھنا تمہارے لیے بوجھ نہیں بنے گا۔''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں فاروق بھیا! آپ نے کہہ دیا کہ اکبر کو اپنے ساتھ رکھنا ہے تو بس ہم رکھیں گے چاہے وہ جیسا بھی ہو لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ آپ کیوں واپس جا رہے ہیں؟ بمبئی آپ کے لیے بہت خطرناک ہو چکا ہے۔ چاچاجی نے کہا تھا کہ بمبئی میں آپ کی جان کو خطرہ ہے اس لیے وہ آپ کو لندن بھیجنا چاہتے ہیں۔'' شگفتہ اس کا فیصلہ سن کر روہانسی ہو گئی تھی اور اپنے طور پر اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ بحث کا وقت نہیں ہے شکنتلا! تم بس میری بات پر عمل کرو۔ آدمی کی زندگی باقی ہو تو وہ خطروں میں گھر کر بھی جیتا رہتا ہے۔ ویسے بھی میں بمبئی میں زیادہ رکنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے اب کہیں اور جانا ہے۔'' فاروق نے جلدی جلدی شکنتلا کو سمجھایا اور اس کی نم ہوتی آنکھوں سے نظر چرا کر چل پڑا۔ جہاز چھوڑ کر اس کے قدموں نے دوبارہ زمین کو چھوا تو یہ سوال سامنے تھا کہ اب کہاں جائے۔ شکنتلا کی کوٹھی پر تالا پڑ چکا تھا اور راڈے جانا یوں مناسب نہ ہوتا کہ ربن نے سختی سے اسے وہاں آنے سے منع کر رکھا تھا۔ اس کے لیے اب یہی مناسب ہوتا کہ وہ کہیں اور اپنا ٹھکانا کرتا اور ربن کو خاموشی سے اپنی بمبئی میں موجودگی کی اطلاع بھجوا دیتا۔ بمبئی سے کراچی جانا عام حالات میں اتنا مشکل نہیں تھا لیکن آج کل کے حالات میں شاید دشواری پیش آتی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ آج کل مسلمان تیزی سے ان علاقوں کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں جن کے پاکستان میں شامل ہونے کا قوی امکان ہے۔ وہ کچھ ایسی جلد بازی میں جہاز سے اترا تھا کہ اپنا سامان تک ساتھ نہیں لے سکا تھا۔ اس کی کل متاع بس اس کی جیب میں پڑا چاقو اور چرمی بٹوا تھا جس میں ربن کی مہربانی سے ٹھیک ٹھاک رقم موجود تھی۔ رقم جیب میں ہو تو آدمی کے بہت سے مسائل آپ ہی آپ حل ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی کسی ہوٹل میں کمرا کرائے پر لے کر گزارہ کر سکتا تھا بس تھوڑا سا پولیس کی طرف سے دھڑکا تھا کہ پولیس والے ہوٹلوں اور مسافر خانوں پر خاص نظر رکھتے ہیں لیکن اس مسئلے کا بھی اس نے حل نکال لیا۔ بندرگاہ پر گھومتے لوڈرز میں سے ایک کم عمر لوڈر کا انتخاب کر کے اس سے بات کی تو اس چلتا پرزہ لڑکے نے فوراً اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے ایک قریبی ہوٹل کے بیرے کی مدد سے اس کے لیے اس طرح کمرے کا انتظام کیا کہ وہ ہوٹل کے پچھلے دروازے سے ایک کمرے میں مقیم ہو گیا اور کاؤنٹر کلرک سے ملاقات تک نہیں کرنی پڑی۔ بیرے نے خود ہی ہوٹل کے رجسٹر میں اس کے فرضی کوائف درج کروا کر ضابطے کی کارروائی مکمل کروا دی۔ ظاہر ہے اس خدمت کے لیے اسے اضافی رقم خرچ کرنی پڑی تھی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے بیرے کی ناشتا لانے کی پیشکش کو رد کر دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر سوچ بچار کرنے لگا کہ ربن تک کس ذریعے سے پیغام پہنچائے۔ پہلا نام چاند بانو کے ملازم کا ذہن میں آیا لیکن فوراً ہی رد بھی ہو گیا۔ چاند بانو کا ٹھکانا پولیس اور دشمنوں، دونوں کی نظر میں تھا۔ وہ وہاں جاتا تو آسانی سے دھر لیا جاتا۔ وکیل اشوک بچن کے بارے میں بھی سب جانتے تھے کہ وہ ربن کے لیے کام کرتا ہے اس لیے امکان تھا کہ اس کی بھی نگرانی کی جا رہی ہو۔ یہی حال نانا کے باڑے کا تھا۔ نانا اور ربن کی دوستی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی اس لیے پولیس کی یقیناً اس پر بھی نظر ہو گی۔ ماضی کے مقابلے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت اس لیے تھی کہ معاملہ بھاٹیہ سیٹھ کی بیٹی کی ہلاکت کا تھا۔ بھاٹیہ جیسے طاقتور آدمی کے لیے پولیس والوں کی کارکردگی اپنے عروج پر ہونے کا پورا امکان تھا۔ ربن نے اسے اپنے ٹھکانوں تک سے دور رکھا تھا تو یہ سب یونہی تو نہیں تھا۔ وہ کوئی غلطی کر کے ربن کی اب تک کی احتیاط کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس لیے بہت سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ پیغام رسانی کے لیے مختلف راہوں کو سوچتے ہوئے اچانک ہی اس کے ذہن میں کیتھرائن کا نام آیا۔ کیتھی کسی کی نظر میں نہیں تھی اور وہ اس پر پورا اعتماد بھی کر سکتا تھا۔

اس کا خیال آتے ہی اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف سات بجے تھے۔ اسے علم تھا کہ اسپتال میں نرسوں کی ڈیوٹی آٹھ بجے تبدیل ہوتی ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کیتھرائن کی آج کل کون سی ڈیوٹی چل رہی ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے اس نے آٹھ بجے سے کچھ پہلے اس کی رہائش گاہ پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ اسپتال سے منسلک اس قیام گاہ تک وہ ایک ٹیکسی کی مدد سے آٹھ بجنے سے پندرہ منٹ پہلے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر وارڈن سے دریافت کرنے پر اسے علم ہوا کہ کیتھی کی نائٹ ڈیوٹی تھی یعنی اسے ملاقات کے لیے اس کی واپسی کا انتظار کرنا پڑتا۔ وہ ایک اخبار کے مطالعے میں مصروف انتظار گاہ میں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ سوا آٹھ بجے نائٹ ڈیوٹی آف کر کے واپس آنے والی نرسوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تھکی ماندی نرسیں ایک دوسرے سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے جلدی جلدی اپنے رہائشی کمروں کی طرف جا رہی تھیں تاکہ لباس تبدیل کر کے آرام کر سکیں۔ فاروق کی توجہ اب اخبار کے بجائے آنے والی نرسوں کی طرف تھی۔ ان نرسوں میں اسے ابھی تک کیتھی نظر نہیں آئی تھی۔ آہستہ آہستہ نرسوں کی آمد کا سلسلہ رک گیا لیکن کیتھی وہاں نہیں آئی۔ مضطرب سے فاروق کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا اور اس نے ایک بار پھر وارڈن سے رجوع کیا۔

''وہ تو ہمیشہ ٹائم پر آتی جاتی ہے، تم رکو! میں اس کی کسی کولیگ سے پتا کرتی ہوں۔ شاید اس کی ڈبل ڈیوٹی لگ

گئی ہو۔" وارڈن نے اس سے کہا اور بیل بجا کر وہاں کام کرنے والی ایک آیا کو بلایا۔ آیا اس کے حکم پر تھوڑی دیر میں ایک نازک سی لڑکی کو بلا کر لے آئی۔ لڑکی کی آنکھوں میں شب بیداری کی سرخی تھی اور چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ عالم مجبوری میں اس بلاوے پر وہاں آئی ہے۔

"سوزی! تم کو کیتھرائن کا کچھ پتا ہے۔ اس کا گیسٹ آیا بیٹھا ہے اور اسے پوچھتا ہے۔ آج اس کا ڈبل ڈیوٹی تو نہیں لگ گیا؟" وارڈن نے لڑکی سے دریافت کیا۔

"نو میڈم! ڈیوٹی تو نہیں لگا لیکن کیتھی خود ہاسپٹل میں رک گئی ہے۔ وہاں اس کا کوئی جاننے والا پیشنٹ بہت زخمی حالت میں لایا گیا ہے اور وہ اس کی وجہ سے رک گئی ہے۔ بے چاری اس پیشنٹ کے لیے بہت رو رہی تھی۔" سوزی نامی نرس نے جو اطلاع دی وہ فاروق کے لیے چونکا دینے والی تھی۔ کیتھی نے اسے اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور وہ جانتا تھا کہ کیتھی کا کوئی ایسا قریبی عزیز یا رشتے دار نہیں ہے جس سے اس کی جذباتی وابستگی ہو البتہ اڈے والوں سے وہ مختصر عرصے میں بہت قریب ہو گئی تھی اور ان کو اپنا سمجھنے لگی تھی۔ مریض کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ شدید زخمی حالت میں لایا گیا ہے، اس سے بھی یہی گمان ہوتا تھا کہ وہ اڈے ہی کا کوئی آدمی ہوگا۔ اڈے کے آدمیوں میں سے بھی کیتھی کا خود اس کے علاوہ گولو اور ر.بن سے ایسا واسطہ رہا تھا کہ وہ ان کے لیے آنسو بہاتی۔ گولو لڑنے جھگڑنے والا بندہ نہیں تھا کہ زخمی ہوتا تو کیا پھر ر.بن ......سوچ کی تان یہاں آ کر ٹوٹی تو سینے میں اس کا دل بری طرح دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ یہ دل پہلے ہی بڑا بے چین اور مضطرب تھا۔

"کیا آپ اس پیشنٹ کا نام جانتی ہیں؟" اپنی کیفیت کے زیر اثر اس نے ذرا تیز لہجے میں نرس سوزی سے دریافت کیا۔

"نام تو نہیں معلوم......" سوزی کا انداز کچھ سوچنے والا ہو گیا۔ "ہاں...... یاد آیا۔ کیتھی اسے دادا، دادا بول کر پکارتی تھی۔" اب فاروق کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے قدموں کو روک پاتا۔ ہر خوف اور احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ تیزی سے باہر کی طرف دوڑ گیا۔

☆☆☆

جولیٹ جلے پیر کی بلی کی طرح ساری حویلی میں چکراتی پھر رہی تھی۔ وہ جب یہاں آئی تھی تو اس کے دل میں اس حویلی اور حویلی والوں کے لیے معاندانہ جذبات تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں اس کی ماں کے ارمانوں کا قتل ہوا تھا، جہاں وہ محبت کے نام پر لوٹی گئی تھی اور جہاں سے عزت کے ٹھیکے داروں نے اسے دو کوڑی کا کر کے نکال دیا تھا لیکن اب اس کے لیے اس حویلی کی حیثیت تبدیل ہو گئی تھی۔ حویلی والوں کا سازشی رویہ اپنی جگہ لیکن اسد اللہ کے خلوص پر یقین آنے کے بعد اس کے جذبات میں خاطر خواہ تبدیلی آئی تھی۔ اب اس کے لیے یہ حویلی وہ خاص جگہ تھی جہاں کے چپے چپے پر اسے اپنے ماں باپ کی محبت کے گل مہکتے نظر آتے تھے۔ وہ تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتی تھی کہ دو چاہنے والے اس حویلی کی اونچی دیواروں کے درمیان کس طرح اپنی محبت کے پودے کو پروان چڑھاتے رہے تھے۔ ان دو چاہنے والوں کی بے قراری، بے تابی اور بے بسی کی گواہ تھی یہ حویلی۔ خود اس نے اس حویلی میں کچھ ناخوشگوار واقعات کا سامنا کیا تھا لیکن بحیثیت باپ اسد اللہ نے اسے جو محبت، عزت اور اہمیت دی تھی وہ ہر برے رویے کا مداوا بن گئی تھی۔

جوزفین اور جوزف کے بعد وہ بالکل تہی دامن رہ گئی تھی، اسد اللہ نے اپنی محبت اور شفقت سے اس کے دامن کو ایک بار پھر پھولوں سے بھر دیا لیکن اس کے لیے زندگی کو پھولوں کی سیج بننا قبول ہی کہاں تھا جب ہی تو یہ انہونی ہو گئی کہ فاروق اس حویلی کے گم شدہ بیٹے محب اللہ کی صورت اس کے سامنے آ گیا۔ ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے اسد اللہ کو فاروق کی حقیقت سے آگاہ کر دیا اور اس سچ کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ اسد اللہ بچھڑے ہوئے بھتیجے کو واپس حویلی لانے کے لیے بمبئی کی طرف عازم سفر ہو چکے تھے۔ بمبئی میں جن دنوں وہ تباہی سے دوچار ہوئی، فاروق اپنی بیماری کے باعث اڈے پر نہیں تھا لیکن یہ تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ اس کی بربادی کی داستان اس تک پہنچ گئی ہوگی۔ وہ اسد اللہ کے ساتھ محب اللہ کی حیثیت سے حویلی واپس آتا تو اپنے ساتھ اس کی بربادی کی داستان بھی لے کر آتا۔ وہ اس داستان کا اس حویلی میں دہرایا جانا برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے اسد اللہ کی واپسی سے قبل ہی یہاں سے روانہ ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا اس حویلی سے جانا طے تھا پھر بھی اس فیصلے پر اس کی روح سسک اٹھی تھی اور وہ ادھر سے ادھر چکراتی ہوئی یوں حویلی کے ایک ایک گوشے کو اپنی نگاہوں میں بسا رہی تھی کہ اسے یقین تھا، اب کبھی اسے ان در و دیوار کو دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ ادھر ادھر ٹہلتی ہوئی وہ پائیں باغ میں پہنچی تو وہاں آصف خان کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"زہے نصیب۔ آج آپ کا دیدار ہو گیا، اس اتفاق کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں یا آپ کی نظرِ کرم۔" اسے سامنے پا کر وہ شوخ ہوا۔

"اس اتفاق کو آپ محض اتفاق ہی سمجھیں تو اچھا ہے۔" جولیٹ نے اس کی پُرشوق نگاہوں سے بے نیازی برتتے ہوئے سنجیدگی سے اسے جواب دیا۔

"آپ کا حکم ہے تو ایسا ہی سمجھ لیتے ہیں لیکن اس اتفاق سے فائدہ اٹھا کر آپ سے سوال کرنے کا حق تو ہے مجھے۔" آصف خان اس کی سنجیدگی کو زیادہ خاطر میں نہیں لایا۔

"کیسا سوال؟" جولیٹ نے ایک بار پھر بے نیازی برتی۔

"کیا آپ میرے سوال سے ناواقف ہیں؟" آصف خان ذرا سا خفا ہوا۔

"جس سوال سے میں واقف ہوں، وہ آپ نے بزرگوں کے سامنے رکھا تھا اور وہی آپ کو اس کا جواب دیں گے۔"

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ میرے سوال کا جواب آپ کی مرضی سے مشروط ہے۔" اس نے جولیٹ کو اپنی باخبری سے آگاہ کیا۔

"میری مرضی کی خبر بھی میرے بزرگ ہی آپ کو دیں گے۔" جولیٹ ایک بار پھر اسے طرح دے گئی۔

"یعنی میرے نصیب میں ابھی مزید انتظار لکھا ہے۔" آصف خان نے سرد آہ بھری۔

"بس تھوڑا انتظار اور باقی ہے۔ جلد آپ کو جواب مل جائے گا۔" جولیٹ کی سنجیدگی برقرار رہی اور وہ یہ کہہ کر تیزی سے وہاں سے پلٹ گئی۔ آصف خان کے خلوص پر اسے یقین تھا لیکن کیا کرتی کہ اس کے نصیب میں اس پُرخلوص آدمی کا ساتھ لکھا ہی نہیں تھا۔

"شریف گھرانوں کی لڑکیاں شادی سے قبل اپنے ہونے والے خاوند سے خفیہ ملاقاتیں نہیں کیا کرتیں۔ پر آپ کو اس بات کی کیا خبر۔ آپ کی ایسے ماحول میں تربیت ہی نہیں ہوئی۔" وہ آصف خان میں الجھی ہر طرف سے۔۔۔ بے خبر حویلی کے زنان خانے میں داخل ہوئی تھی کہ کاٹ دار لہجے میں کیے گئے اس طنز نے اس کے قدموں کو ٹھٹکا دیا۔ اس نے چونک کر بولنے والی ہستی کو دیکھا۔ وہ عشرت جہاں تھیں جو حسبِ معمول اس کے لیے اپنی آنکھوں میں نفرت وحقارت کے جذبات لیے کھڑی تھیں۔ اس نے بڑی بے پروائی سے ان کی طرف دیکھا اور لہجے میں بے نیازی سمو کر بولی۔

"معاف کیجیے۔ میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"آصف خان سے آپ کا رشتہ طے پا چکا ہے، یہ بات سب ہی جانتے ہیں۔ اسد اللہ نے تو اپنی ماضی کی محبت نباہنے کے لیے ایسی سرگرمی دکھائی کہ انہیں حویلی میں ہونے والی دو دو اموات کا بھی خیال نہیں آیا۔ اپنی محبوبہ کی اولاد کے لیے خوشیوں کا انتظام کرتے ہوئے انہیں یہ احساس تک نہیں ہوا کہ ان کے اردگرد بسنے والے لوگوں کے دل دکھوں سے چُور چُور ہیں اور ایسے میں خوشی کے شادیانے بجا کر وہ ہمارے زخموں پر نمک پاشی کا انتظام کر رہے ہیں۔" عشرت جہاں کے لہجے میں دکھ اور حسد کی آمیزش تھی۔ اسد اللہ کو نہ پاسکنے کا دکھ کبھی ان کے دل سے نہیں نکلا تھا اور زبان موقع بے موقع اس کا اظہار کسی نہ کسی صورت کر جاتی تھی۔ اب بھی وہ بھائی کی موت کے بہانے اپنے ہی دکھوں پر نوحہ کناں محسوس ہوئیں۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابھی صرف میرے سامنے آصف خان کی خواہش رکھی گئی ہے جس کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا اس لیے رشتہ طے پا جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" آج پہلی بار جولیٹ کو عشرت جہاں پر غصہ آنے کے بجائے ترس محسوس ہوا۔ اسد اللہ تھے ہی اتنے شاندار کہ عشرت جہاں کا ان کے عشق میں مبتلا ہو جانا انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ ساری زندگی نارسائی کی آگ میں جلتی اتنی تلخ ہو گئی تھیں کہ اب ان کی زبان سے کوئی میٹھی بات نکلتی ہی نہیں تھی اور جولیٹ تو جوزفین کی بیٹی تھی جس سے ان کا رقابت کا رشتہ تھا۔ اس رشتے کو پوری نفرت سے نبھاتے ہوئے انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ خود جوزفین کے حصے میں بھی تو جدائی ہی آئی تھی۔

"اب تم جیسی کل کی لڑکی ہمیں بتائے گی۔ تمہاری مرضی تو سب ہی کو نظر آ رہی ہے۔ آصف خان سے ملاقاتوں کا سلسلہ ایسے ہی تو جاری نہیں ہے اور پھر وہ اسد اللہ کے عزیز دوست کا بیٹا ہے۔ اسد اللہ کسی صورت اسے انکار نہیں کر سکتے۔" ان پر جولیٹ کی بات کا مطلق اثر نہیں ہوا اور وہ اپنی بات پر ڈٹی رہیں۔

"میرے انکار کی صورت میں اس رشتے سے انکار ہو سکتا ہے۔" اس نے انہیں جتایا۔

"بالکل نہیں۔ اس حویلی میں لڑکیوں کو ایسے فیصلے کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔"

"جب اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے تو حویلی والے اپنی مرضی کے اصول کیسے بنا سکتے ہیں؟" جولیٹ کو ان سے بحث کرنے میں لطف آ رہا تھا۔

''تم کیا جانو اسلام کے بارے میں؟'' عشرت جہاں کی حیرت دیدنی تھی۔

''بندہ کوشش کرے تو بہت کچھ جان ہی جاتا ہے۔ میں نے ان چند دنوں میں اسلام کا اتنا مطالعہ کیا ہے کہ بہت سے پیدائشی مسلمان بھی اتنا کچھ نہیں جانتے ہوں گے۔'' اس نے انہیں جواب دیا اور انہیں حیرت میں مبتلا چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئی۔ حویلی سے جانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اس لیے وہ ایک ایک کر کے حویلی کے مکینوں سے غیر محسوس طور پر الوداعی ملاقاتیں کر رہی تھی۔ زیادہ تر سے تو اس کا تعلق سرسری سا تھا، ہاں حبیب اللہ کی بیوی اور بیٹی سے اس نے کچھ طویل ملاقات کی۔ سب سے آخر میں وہ عالیہ کے کمرے میں آئی۔

''کہاں تھیں آپ۔ آج اپنی صورت ہی نہیں دکھائی۔'' انہوں نے اسے دیکھتے ہی محبت سے شکوہ کیا۔

''بس ایسے ہی حویلی میں ادھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ آپ کو کوئی کام تھا تو پیغام بھیج کر بلوا لیتیں۔'' اس نے محبت سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''کام تو کچھ نہیں تھا بس آپ نظر نہیں آئیں تو دل بے چین سا ہو گیا تھا۔'' عالیہ نے سادگی سے کہا تو وہ ان کی صورت تکنے لگی اور خود بخود ہی اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

''یہ کیا بھئی؟'' عالیہ نے حیرت سے اس کی پلکوں پر جمے شفاف قطروں کو اپنی انگلی کی پور پر چنتے ہوئے کہا۔

''آپ بہت اچھی ہیں۔ سب سے زیادہ اس حویلی میں مجھے آپ نے ہی سپورٹ کیا اور اس رات کا احسان تو میں بھول ہی نہیں سکتی جب آپ نے اپنے سہاگ کی قربانی دے کر میری عزت کی حفاظت کی۔'' جولیٹ نے محبت پاش نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''ہم نے آپ پر کیا احسان کیا؟ ہم تو خود اپنی جان پر چڑھے قرضے اتارتے پھر رہے ہیں اور سوچتے ہیں کہ شاید آپ کے ساتھ کی گئی نیکی ہی روز حشر ہمیں جوزفین کے سامنے سرخرو کر جائے۔ ہم نے بڑا ظلم کیا تھا ان پر۔ اپنے اس جرم کو ہم زندگی میں کبھی بھی نہیں بھول پائے۔'' عالیہ آج بھی احساس جرم میں مبتلا تھیں کہ ان کی نیک فطرت نے انہیں کبھی اپنی وہ غلطی بھلانے ہی نہیں دی تھی۔

''جو کچھ ہوا، اب وہ ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ اپنی ماں کے ساتھ زیادتی کرنے والے ہر فرد کو چاہے اسے اپنی غلطی اور زیادتی کا احساس ہو یا نہیں، میں نے معاف کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ماما نے بھی معاف کر دیا ہوگا۔'' اس نے عالیہ کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد وہ بہت دیر تک ان سے گفتگو کرتی رہی۔ کافی دیر بعد وہ اپنے کمرے میں واپس آئی تو سروری کو بلاوا بھیج کر بلا لیا۔

''حکم کیجیے۔'' سروری اگرچہ حویلی میں آغا بیگم کی جگہ سنبھال چکی تھی اور اس کا وہاں خاصا رعب و دبدبہ تھا لیکن جولیٹ کے روبرو وہ ہمیشہ نگاہ جھکا کر ہی کھڑی ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ احساس جرم آج تک زندہ تھا جو جوزفین کے خلاف ہونے والی سازش میں حصے دار بننے پر اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

''کیا تم میرے ہر حکم کی تعمیل کر سکتی ہو؟'' جولیٹ نے اسے چھیدنے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہمیں حکم کی تعمیل کے سوا کچھ سکھایا ہی نہیں گیا۔'' سروری کا جواب واضح تھا۔ شاید وہ بتا رہی تھی کہ وہ جس جرم کی شریک رہی اس میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا اور وہ محض حکم کی بجا آوری پر مجبور تھی۔

''اچھی بات ہے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ میں آج رات اس طرح حویلی سے باہر جانا چاہتی ہوں کہ کسی کو کانوں کان میرے یہاں سے جانے کی خبر نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ انتظام کر سکتی ہو۔'' اسے معلوم تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح آزادانہ اس حویلی سے کہیں نہیں جا سکتی۔ اب وہ قدم باہر رکھے گی تو اسے اپنے باہر جانے کا مقصد اور منزل دونوں کے بارے میں بتانا ہوگا اور وہ یہ دونوں باتیں نہیں بتا سکتی تھی اس لیے یہ راہ سوچی تھی۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟'' سروری بوکھلا سی گئی۔

''میرے خیال میں تم سمجھ تو اچھی طرح گئی ہو لیکن عمل کرنے سے گھبرا رہی ہو۔'' جولیٹ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''مجھ پر رحم کریں بی بی! مالک مجھے کتوں کے آگے ڈلوا دیں گے۔'' سروری رونے والی ہو گئی اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''تم کہہ سکتی ہو کہ تم نے صرف حکم کی تعمیل کی تھی جیسے اس سے پہلے بھی کرتی رہی ہو۔ بے فکر رہو کہ جس شخص نے تمہیں اپنا دل اجاڑنے میں حصہ دار بننے پر سزا نہیں دی وہ اب بھی تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ میں ان کے نام ایک خط لکھ کر جاؤں گی جو تمہاری مجبوری کا ثبوت بن جائے گا۔'' جولیٹ نے اسے تسلی دی اور پھر کچھ اس طرح سے سروری کو مجبور کیا کہ وہ خاموشی سے اسے حویلی سے نکالنے پر راضی

ہوگئی۔ زنان خانے میں رات کو جلدی سونے کا رواج تھا چنانچہ رات کے ابتدائی حصے میں ہی جب تقریباً بیگمات محو خواب تھیں، جولیٹ نے سروری کی مدد سے حویلی کی دہلیز پار کرلی اور ایک تانگے میں سوار ہو کر قصے میں لپٹی ان محبتوں سے فرار ہوگئی جن سے جدائی پر خود اس کا اپنا دل کٹ کر آنسوؤں کے ساتھ بہتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

ربن کے دیکھتے ہی دیکھتے تانگے کے آگے رکی گاڑی اور دونوں ٹیکسیوں کے دروازے کھلے اور اس میں سے لوگ اترنا شروع ہوئے۔ اترنے والوں میں سے کئی چہرے اس کے لیے شناسا تھے۔ جگو دادا، فیکا، ڈی ایس پی راٹھور، جگو کے اڈے سے غائب ہوجانے والے اس کے دو تین گرگوں کے علاوہ کچھ اجنبی صورتیں بھی اس کے سامنے تھیں۔ سوائے جگو کے ان سب کے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی ہتھیار موجود تھا۔ جگو سے ہونے والے مقابلے میں اس کے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کاٹ کر خود ربن نے ہی اسے ہمیشہ کے لیے ہتھیار اٹھانے سے معذور کردیا تھا لیکن اس کے خالی ہاتھ ہونے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اس کے سارے چیلے اور ہمدرد تو ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ڈی ایس پی راٹھور کے ہاتھ میں ریوالور تھا، فیکے نے کم لمبائی والی تلوار اٹھا رکھی تھی، باقیوں کے ہاتھوں میں چاقو اور ڈنڈے نظر آرہے تھے۔

''تو تانگے سے اتر کر بھاگ جا۔ یہ اپن کا لفڑا ہے، سالے تجھ کو نہیں روکیں گے۔'' اس نے آہستہ آواز میں تانگے والے کو ہدایت دی اور خود بے خوفی سے نیچے اترنے کے بعد یوں سینہ تان کر کھڑا ہوا کہ اس کا رخ جگو دادا کی طرف تھا۔

''نکل آیا رے تو اپنے بل سے؟'' جگو کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے حقارت سے پوچھا۔

''تیرے کو اپنے واسطے بے قرار دیکھا تو سوچا تجھے اپنے درشن کروا ہی دوں۔'' جگو نے دوبدو اسے جواب دیا۔ وہ پوری نفری کے ساتھ تنہا ربن کو گھیرے کھڑا تھا۔ اس کے حوصلے کو تو بلند ہونا ہی تھا۔

''سانپ بل میں چھپ کر بیٹھا رہے تب ہی اس کی خیر رہتی ہے۔ بل سے نکلے تو مارا جاتا ہے۔'' ربن نے حقارت سے اسے دیکھا۔

''اس سانپ کا زہر تیرے جسم میں اترے گا تو جانو گے آج کس کے مارے جانے کا دن ہے۔'' جگو بھی اونچی اڑان اڑ رہا تھا۔

''او باسٹرڈ! یہ ڈائیلاگ بازی بند کرو اور اصل کام کرو۔ زیادہ سمے نہیں ہے۔ اپن نے بھائیہ سیٹھ سے پرامس کیا ہے کہ اس کی بیٹی کے خونیوں کا انت جلدی ہوگا۔ اس کو اس کے انت تک پہنچا کر تم اپنا بدلہ لو اور مجھے میرا پرامس پورا کرنے دو۔''

ڈی ایس پی راٹھور نے بیزاری سے جگو کو ٹوکا اور اس کا یہ ٹوکنا جیسے جگو کے ساتھیوں کے لیے اشارہ ثابت ہوا۔ وہ سب ایک ساتھ ربن پر ٹوٹ پڑے۔

''تو اپنی بات مانتا تو اب بھی بمبئی پر راج کر سکتا تھا۔ اپنی ماننے سے انکار کر کے تو نے خود موت کو آواز دی ہے۔''

ڈی ایس پی راٹھور نے اس منظر کو دیکھا اور بڑبڑایا۔ وہ انا پرست آدمی تھا جو ربن کو اپنے دام میں لانے میں ناکام ہونے کے بعد اس کے خلاف ہوگیا تھا اور اب ربن کو اس کے انکار کی سزا دینے کے انتقام کے ساتھ آیا تھا۔ قانونی کارروائی کی صورت ربن اپنا بچاؤ کرنے میں کتنی مہارت رکھتا ہے، یہ اس کے علم میں تھا اس لیے اس نے ربن پر یہ اوچھا وار کیا تھا۔ یقیناً وہ لوگ مسلسل اس تاک میں رہے تھے کہ اڈے سے دور ربن تنہا مل جائے تو اسے چھاپ لیں اور اب انہیں یہ موقع مل گیا تھا۔ وہ درجن بھر سے زیادہ افراد ایک ساتھ ربن پر حملہ آور ہوئے تھے، ایسے میں ربن کا چاقو بھلا کیسے جیب میں پڑا رہتا۔ چاقو باہر آیا اور اپنے کمالات دکھانے لگا۔ پہلا چرکا فیکے کے بازو پر لگا۔ وہ جو اپنی چھوٹی سی تلوار سے شاید ربن کا سر قلم کردینے کا ارادہ رکھتا تھا، ایک دھاڑ کے ساتھ پیچھے ہٹا۔ ربن کو اس کا انجام دیکھنے کی فرصت نہیں تھی کہ اس پر حملہ آور ہونے والے کوئی ایک دو افراد نہیں تھے۔ ان درجن بھر حملہ آوروں سے نمٹنے کے لیے وہ پھرکی کی طرح گول گھومتا چلا گیا۔ گول گھومتے ہوئے اس نے اپنے چاقو والے ہاتھ کو قوس کی شکل میں پھیلا رکھا تھا۔ حملہ آوروں میں سے کئی اس کے کھلے چاقو کا نشانہ بنے لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ان میں سے کسی کا داؤ نہ چلتا۔ ان میں سے کسی کے چاقو نے کام دکھایا اور بائیں شانے سے نیچے پیٹھ پر گھاؤ ڈال دیا۔ زخم گہرا تھا، فوراً ہی خون پھوٹ پڑا اور تیزی سے ربن کی قمیص کو بھگونے لگا۔ اسے اپنے زخم کو دیکھنے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ پے درپے حملہ آور ہوتے دشمنوں پر جوابی وار کرنے لگا۔ اس کے چاقو کا پھل چمک چمک کر حملہ آوروں کے مزاج پوچھتا رہا لیکن وہ بھی آج پیچھے ہٹنے کا ارادہ لے کر نہیں آئے تھے۔ گھائل ہوکر بھی اس پر حملے کرتے رہے۔ ان حملوں کے نتیجے میں ربن کے بدن پر لگنے

والے زخموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔
''تو نے بیچ چوراہے پر مجھے جوتے لگوائے تھے۔ آج میں بیچ چوراہے پر تیرا قیمہ بناؤں گا۔'' حملہ آوروں میں فیکا سب سے زیادہ پُرجوش تھا اور زک اٹھانے کے باوجود بڑھ چڑھ کر اس پر حملے کر رہا تھا۔
''تجھ جیسوں کو اپن چٹکی میں مسل کر رکھ دیتا ہے۔ ان ورجن بھر بھاڑے کے ٹٹوؤں کے بغیر آتا تو اپن تیری جی داری کو مانتے۔'' ربن نے اس کے تلوار والے ہاتھ کو کلائی سے تھام کر موڑا اور نہایت پھرتی سے خنجر کی نوک سے اس کی گردن پر چرکا لگایا۔ اس کا یہ وار فیکے کے لیے جان لیوا بھی ہوسکتا تھا لیکن کسی نے یکدم اسے جھٹکے سے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ بہت مضبوط تھا لیکن تھا تو بہر حال گوشت پوست کا انسان ہی، جس کی کوئی نہ کوئی انتہا ہوتی ہے۔ زخموں سے چور خون میں لت پت اتنے بہت سے لوگوں سے لڑتا وہ نڈھال ہونے لگا تھا۔ اپنی اس کمزوری نے اس کے اندر طیش کی شدید لہر دوڑائی اور اس نے حملہ آوروں میں سے ایک کے ہاتھ سے مضبوط لکڑی کا پتلا سا لمبا ڈنڈا جھپٹ لیا۔ ڈنڈا ہاتھ میں آتے ہی اس نے اسے اس کمال اور مہارت سے گھمانا شروع کیا کہ اسے گھیر لینے والے چوٹ کھا کر پٹ پٹ مکھیوں کی طرح گرنے لگے۔ گرنے والوں کی چیخوں اور مغلظات کی آوازیں بہت بلند تھیں پھر وہ پچھاڑ کھانے والا دھما کا سب پر سبقت لے گیا۔ دھماکے کے فوراً بعد ہی ربن کے جسم نے ایک زوردار جھٹکا کھایا اور اس نے اپنی چھاتی پر بننے والے سوراخ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد دوسری نظر ڈی ایس پی راٹھور پر ڈالی۔ اس کے ریوالور کی نال سے اٹھتا دھواں وہ اپنی دھندلاتی نظر کے باوجود دیکھ سکتا تھا۔ راٹھور اور مجو دادا دور کھڑے یہ لڑائی دیکھ رہے تھے اور شاید راٹھور نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس ہمالیہ سے شخص کو تسخیر کرنا اتنا آسان نہیں ہے، اس لیے اس نے اوچھا پن دکھاتے ہوئے اس تنہا آدمی کے سینے میں گولی داغ دی تھی جو بڑی بے جگری سے اتنے لوگوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ گولی کا زخم ایسا نہیں ہوتا کہ اسے سہہ کر آدمی اپنے قدموں پر کھڑا رہ سکے اور ربن کے بدن سے تو پہلے ہی کافی مقدار میں خون بہہ چکا تھا۔ راٹھور کی اوچھی حرکت پر اس نے حقارت سے زمین پر تھوکا اور پھر کسی شہتیر کی طرح گرتا چلا گیا۔ گرے ہوئے شیر کو دیکھ کر سارے گیدڑوں کے حوصلے دوبارہ بلند ہو گئے۔ سب سے پہلے فیکا اس کے قریب پہنچا اور اس کے ہاتھ کو اپنے جوتے کے نیچے اس زور سے دبایا کہ ہڈیاں

کڑکڑا گئیں۔

"ایک انگلی مت چھوڑنا فیکے اس کے ہاتھوں میں۔ اپنے کو اپنے دونوں انگوٹھوں کے بدلے میں اس کی پوری دس کی دس انگلیاں چاہیے ہیں۔" بجو نے اپنے چیلے کو جوش دلایا تو اس نے ایک وحشیانہ نعرہ لگا کر اپنی تلوار بلند کی اور پوری قوت سے ربن کے ہاتھ پر وار کیا۔ ایک ہی وار میں پانچوں انگلیاں کٹ کر گر گئیں۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں کٹنے سے قبل ہی ربن کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے اور ہمیشہ بیدار رہنے والا دماغ تیزی سے اندھیرے میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

بمبئی میں اس صبح نمودار ہونے والے سورج نے یہ خونی منظر دیکھا تو غضب ناک ہو کر قہر برسانے لگا۔ کامیابی کے نشے میں چور وحشیوں نے ربن کو مردہ جان کر قہقہے بلند کیے اور پرجوش نعرے لگاتے ہوئے اپنی سواریوں پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کمزور سا تانگے والا جو ربن کی ہدایت پر تانگے سے اتر کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا، ایک آڑ میں کھڑا یہ دہشت بھرا کھیل دیکھ رہا تھا۔ ایک تو فطری تجسس تھا جس نے اسے یہاں سے دور نہیں جانے دیا تھا، دوسرے اسے اپنے تانگے کی فکر بھی جس کی آمدنی سے اس کے کنبے کی روٹی روزی وابستہ تھی۔ وہ تھر تھر کانپتا سب کچھ دیکھتا رہا۔ ربن کی بے جگری اور مقابل ٹولے کی بے ضمیری دونوں ہی اس کے حواس پر اثر انداز ہوئیں اور سب کے جانے کے بعد وہ ڈرتا جھجکتا ربن کے قریب پہنچا۔ اسے چھونے پر پہلے لمحے تو اسے بھی یہی لگا کہ یہ شخص اپنی جان سے گزر چکا ہے لیکن پھر اسے خون آلود کپڑوں کے نیچے دھڑکنوں کا سراغ مل گیا۔ یہ پرائے پھڈوں میں پڑنے کا دور نہیں تھا پھر بھی جانے اسے کیا ہوا کہ اس نے ربن کے نیم مردہ وجود کو بڑے جتنوں سے تانگے میں ڈالا اور اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسپتال میں پوری داستان سنانے کے بجائے اس نے صرف یہ بتایا کہ اسے یہ شخص راستے میں اس حال میں پڑا نظر آیا تھا اور وہ انسانی ہمدردی کے ناتے اسے اسپتال لے آیا ہے۔ ڈاکٹروں نے بھی انسانی ہمدردی میں ہی اس شخص کو طبی امداد دینے کی کوشش شروع کر دی جس کے جسم میں سوائے جان کے شاید کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

"بس اب تم جاؤ۔" تانگے نے جولیٹ کو اسٹیشن پر پہنچایا تو اس نے نیچے اترتے ہوئے کوچوان سے کہا۔

"نکو بی بی! میں ایسے کیسے جا سکتا ہوں۔ سرور ی آپا بولے تھے آپ کو اکیلے نہیں چھوڑنا ہے اور جب تک آپ ریل گاڑی میں سوار نہیں ہو جاتے، آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ حالات بہت خراب ہیں بی بی! آپ اکیلے ریلوے اسٹیشن پر رہے تو یہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہوئیں گا۔" کوچوان چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر جھاڑی۔ اس کی بات جولیٹ کے دل کو لگی۔ واقعی موجودہ حالات میں کسی عورت کا تنہا گھر سے نکلنا مناسب نہیں تھا اور رات کے وقت تو یہ عام دنوں میں بھی معیوب ہی سمجھا جاتا۔

"ٹھیک ہے بابا! تم آجاؤ میرے ساتھ لیکن ہو سکتا ہے بہت دیر تک انتظار کرنا پڑے۔ مجھے ابھی ٹکٹ بھی لینا ہے۔ معلوم نہیں میری منزل پر جانے والی ٹرین کا کیا وقت ہے۔"

"کوئی بات نہیں بی بی! ساری رات بھی رکنا پڑا تو میرے کو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کو حفاظت سے گاڑی میں بٹھا کر اچ واپس گھر لوٹوں گا۔" ادھیڑ عمر تانگے والے نے اسے جواب دیا۔ جولیٹ اس بار خاموش رہی اور وہ دونوں آگے پیچھے چل پڑے۔

جولیٹ نے مسلمان عورتوں کی طرح برقع پہن رکھا تھا اور چہرے پر نقاب بھی ڈالا ہوا تھا تا کہ کسی شناسا سے اتفاقاً سامنا ہونے کی صورت میں پہچانی نہ جا سکے۔ وہ بہت دکھی دل کے ساتھ مجبوراً یہاں سے جا رہی تھی۔ دکھ اونچا خاندان اور اونچی حویلی چھوڑ کر جانے کا نہیں تھا۔ دکھ اسد اللہ کی محبتوں کو چھوڑ کر جانے کا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر اس بات کا تھا کہ اسد اللہ بمبئی سے واپس پلٹنے پر اسے نہ پا کر کتنے دکھی ہوں گے۔ وہ تو حویلی کے لیے خوشیاں لانے بمبئی گئے تھے، واپسی میں خود ان کا دامن خالی ہو چکا ہو گا یہ انہیں کہاں پتا تھا۔ حویلی میں واحد جولیٹ تھی جسے ان کے بمبئی جانے کی اصل وجہ معلوم تھی۔ وہ احتیاطاً کسی کو کچھ بتا کر نہیں گئے تھے کہ اگر خدانخواستہ اپنے مقصد میں ناکام لوٹے تو بندھنے والی امیدیں ٹوٹ جائیں گی۔ دوسروں کی امیدوں اور امنگوں کا اتنا خیال رکھنے والے اسد اللہ کو یہ امید کہاں ہو سکتی تھی کہ ان کی بیٹی ان کے ساتھ ایسا کر گزرے گی لیکن بیٹی بھی مجبور تھی۔ وہ باپ کو اپنا داغ دار دامن نہیں دکھا سکتی تھی اور اسے داغ لگانے والے سے بھی بدلہ لینا تھا۔ اسی لیے اس نے حویلی سے نکل کر واپس بمبئی جانے کے بجائے سید حاجتاب کے اس علاقے میں جانے کا فیصلہ کیا تھا جہاں دلدار آغا کی رہائش تھی۔

اس نے حویلی سے روانگی سے قبل ایک معذرتی خط لکھ

کر اسد اللہ کے خاص کمرے میں لکھائی کی میز پر رکھ دیا تھا۔ وہ ان کی طرف سے ملنے والے خاندانی زیورات حویلی میں ہی چھوڑ کر آئی تھی البتہ جوزفین کا لاکٹ اس نے ماں کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ وہ حویلی سے صرف کپڑوں کے چند جوڑے اور ضرورت کی رقم لے کر چلی تھی۔

اسٹیشن پر اس وقت خاصا رش ہو رہا تھا۔ شاید کوئی ٹرین ابھی وہاں پہنچی تھی اور اس سے اترنے والے مسافر قلیوں سے اپنا سامان اٹھوانے سواری کے لیے کوشاں تھے۔ کچھ تنہا مسافر بھی تھے جو اپنا مختصر سامان خود ہی اٹھائے ہوئے تھے۔ ٹکٹ خریدنے کے لیے ٹکٹ گھر کی طرف جاتی ہوئی جولیٹ ایسے ہی ایک مسافر کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ وہ بمبئی کے اس شناسا کو یہاں حیدر آباد کے ریلوے اسٹیشن پر دیکھے گی۔

''جانی برادر۔'' بے ساختہ ہی وہ اسے پکار بیٹھی۔

''جولی..... سسٹر! یہ تم ہے۔'' جانی شناسا آواز پر متوجہ ہوا لیکن ایک برقع پوش خاتون کو سامنے پا کر تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔

''یہ میں ہی ہوں برادر..... پر تم یہاں؟'' جولیٹ کی حیرت قائم تھی۔

''اپن تمہاری تلاش میں ہی آیا ہے سسٹر! ادھر سب تمہارے واسطے بہت پریشان تھا۔ دادا اور فاروق بھائی پتا نہیں کدھر کدھر تم کو تلاش کرتا رہا پھر پتا چلا تم ادھر حیدر آباد آیا ہے۔ ابھی دادا نے اپنے کو آرڈر دیا کہ حیدر آباد جاؤ اور سب سے پہلے نواب سلیم اللہ کی حویلی پر جولیٹ کا پتا کرو تو اپن ادھر ہی جانے کا تھا، پر تم تو یہیں اسٹیشن پر ہی اپنے کو مل گیا سسٹر۔'' جانی کے لہجے میں سچی خوشی تھی لیکن جولیٹ پر تو حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ اپنے تئیں بہت خفیہ طور پر حیدر آباد آئی تھی لیکن وہ کمال کے لوگ تھے کہ انہوں نے یہ کھوج تک لگائی تھی کہ وہ حیدر آباد میں نواب سلیم اللہ کی حویلی میں موجود ہے۔

''دادا کو کیسے پتا چلا کہ میں کہاں ہوں؟'' وہ اپنی حیرت کو سوال بن کر لبوں پر آنے سے نہیں روک سکی۔

''پوری ڈیٹیل تو اپنے کو نہیں معلوم پر اتنا پتا ہے کہ نواب سلیم اللہ کی حویلی کا پتا فاروق بھائی نے دادا کو بولا تھا۔'' جانی نے اس کے سر پر ایک اور بم پھاڑا۔ فاروق کیسے جانتا تھا کہ وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ہو گی، اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا اور نہ ہی یہ موقع ایسا تھا کہ اس موضوع پر سوچ بچار کی جا سکتی۔ اس نے سب سے پہلے کوچوان کو فارغ کرنے کا ارادہ کیا اور پلٹ کر اس سے بولی۔

''اب تم واپس جاؤ بابا۔ اب میں یہاں اکیلی نہیں ہوں۔ یہ میرے بھائیوں جیسے ہیں، میرا اچھی طرح خیال رکھیں گے۔''

''ٹھیک ہے بی بی! جیسی آپ کی مرضی۔'' کوچوان بولا اور سلام کر کے واپس پلٹنے لگا۔ جولیٹ نے اسے روک کر اپنے پرس سے کچھ رقم نکال کر اسے تھمائی جسے اس نے تھوڑے سے پس و پیش کے بعد قبول کیا اور دعائیں دیتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

''تم نے اپنے ساتھ بڑا اجیازتی (زیادتی) کیا سسٹر! ایسے غیروں کی طرح بمبئی سے نکل گیا۔ ادھر آنے کا تھا تو اپنے سے بولتا، اپن خود تم کو ادھر لے کر آتا۔'' کوچوان کے جاتے ہی جانی نے جولیٹ سے شکوہ کیا۔

''جو میرے ساتھ ہوا تم اچھی طرح جانتے ہو برادر۔ میں اپنے مجرم کو انجام تک پہنچائے بغیر سکون سے نہیں بیٹھ سکتی۔ اگر تم کو میری اتنی ہی فکر ہے تو چلو میرے ساتھ چلو۔ جب میں اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے اپنے دادا کے پاس بھی لے جانا۔'' جولیٹ جذباتی کیفیت میں تو پہلے ہی مبتلا تھی۔ غم آشنا کو سامنے پا کر مزید جذباتی ہو گئی۔

''اکیلا اپن تمہارے واسطے وری (پریشان) نہیں ہے، پر اپن تم کو سسٹر بولا ہے تو اپن نبھا کر دکھائے گا۔ چلو جدھر چلنے کا ہے۔ بائے گاڈ! اگر تم اپنے کو اپنے مجرم کا نام بولا ہوتا تو ابھی تک اس کا دی اینڈ ہو چکا ہوتا۔ اپن سے بھی جاستی دادا تم سے اس کا پوچھا تھا پر ٹھیک ہے ابھی تم اپنے کو بولا ہے تو اپن تمہارے ساتھ چلے گا۔'' جانی بھی جذباتی ہو گیا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر کھڑے ہو کر ٹکٹ خریدے تو ان کی تعداد دو تھی اور جانی بھی جولیٹ کا شریکِ سفر بن چکا تھا۔

☆☆☆

حویلی پر رات کا سکوت چھایا ہوا تھا۔ مالکان اور ملازمین دونوں ہی اپنے دن بھر کے معمولات سے فارغ ہو کر چین کی نیند سو رہے تھے۔ ملازمین میں واحد سروری ایسی تھی جو بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ ملازمین میں اپنی افضل حیثیت کی وجہ سے وہ یوں بھی سب سے آخر میں سوتی تھی کہ ہر کام کا اختتام اپنی نگرانی میں کروائے کیونکہ کسی خرابی یا کمی بیشی کی صورت میں جواب بھی اسے ہی دینا ہوتا تھا۔ بہر حال آج اس کے تاخیر سے سونے کا سبب جولیٹ تھی۔ وہ جولیٹ جسے جوزفین کی بیٹی کی حیثیت سے جاننے

والوں میں وہ بھی شامل تھی اور جس کا جوزفین کے دل کی بربادی میں شریک افراد میں شمار ہوتا تھا، وہ برسوں پرانا قرض اتارنے کے لیے اسے آج جولیٹ کا مطالبہ ماننا پڑا تھا لیکن اس کی مان کر بھی وہ پُرسکون نہیں تھی۔ دل میں ہزار طرح کے اندیشے اور وسوسے تھے کبھی خیال آتا کہ جولیٹ یہاں سے نکل کر آخر کہاں گئی ہوگی، کبھی اسد اللہ کی واپسی کے بعد ان کے سامنے جواب دہی کے خیال سے تھرّا اٹھتی چنانچہ بستر پر لیٹنے کے باوجود نینداس کی آنکھوں سے روٹھی ہوئی تھی اور وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتی بہ مشکل غنودگی میں گئی تھی کہ اس نے کچھ شور سا سنا۔ آوازیں مدھم اور دور سے آتی ہوئی تھیں لیکن صاف ظاہر تھا کہ بہت سے لوگ اکٹھے بول اور چیخ رہے ہیں۔ وہ ہڑبڑائی ہوئی اپنے بستر سے اٹھی اور دھک دھک کرتے دل کے ساتھ صورتِ حال جاننے کے لیے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ ابھی وہ دروازے کی کنڈی کھول ہی رہی تھی کہ فضا میں گولی چلنے کی آواز گونجی اور وہ دل تھام کر اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

حویلی کے نگرانوں کے پاس بندوق کی موجودگی کا اسے علم تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ کبھی ان نگرانوں کو بندوق چلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی اور سروری اپنی پوری زندگی میں پہلی بار گولی چلنے کی آواز سن رہی تھی۔ سروری کے علاوہ دوسرا جاگنے والا فرد آصف خان تھا۔ وہ حویلی کے مہمان خانے میں موجود تھا اور بہت دیر تک ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف رہا تھا۔ مطالعے کے بعد اسے سو جانا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں کیوں آج اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی جہاں باپ اور اپنے لوگوں کی یاد نے بہت شدت سے دل پر یلغار کی تھی اور اس یاد نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ قلم تھام کر اپنوں کے نام ایک طویل خط لکھے۔ اس خط میں اس نے اپنے دل کی ہر بات لکھ ڈالی تھی۔ جولیٹ کے حوالے سے بھی بہت کچھ لکھا تھا اور ساتھ ہی اپنی ماں سے پوچھا تھا کہ وہ ہونے والی بہو کو منگنی پر چڑھانے کے لیے کیا سوغاتیں اپنے ساتھ لا رہی ہے۔ بس ایسی ہی چھوٹی چھوٹی دل کی باتیں تھیں جنھوں نے خط کو پھیلا کر کئی صفحات پر محیط کر دیا تھا۔ وہ اس طویل خط کی آخری سطور لکھ رہا تھا جب اس نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ یہ واحد آواز نہیں تھی۔ اس ایک فائر کے بعد پے در پے کئی فائر ہوئے تھے۔ ساتھ ہی چیخنے، چلاّنے اور للکارنے کی آوازیں بھی تھیں۔

''بلوائی۔'' آصف خان کے ذہن میں فوراً ہی یہ لفظ گونجا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آج کل مسلسل بلوؤں کی خبریں آرہی تھیں۔ حالات بے حد مخدوش تھے اور پورا انتظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی امید نہیں تھی کہ جو خط وہ اپنے گھر والوں کے نام لکھ رہا ہے، وہ ان تک پہنچ بھی سکے گا۔ گولیوں اور انسانوں کی آوازوں سے حویلی پر بلوائیوں کے حملے کا اندازہ لگا کر اس نے پھرتی سے اپنی بندوق نکالی اور خود بھی باہر کی طرف دوڑا۔ وہ پٹھان تھا اور اس کا ہتھیار ہمیشہ اس کے پاس ہی رہتا تھا۔ استعمال میں نہ ہونے کے باوجود باقاعدہ صفائی اور تیل وغیرہ دینے کی وجہ سے اس کی بندوق بہترین حالت میں تھی اور یہ طے تھا کہ جب تک اس کی بندوق نے ساتھ دیا، وہ کسی بلوائی کو حویلی میں گھسنے نہیں دے گا۔ وہ دوڑتا ہوا ایک نگران کی چوکی تک پہنچا۔ اس عرصے میں حویلی کے دیگر افراد بھی جاگ چکے تھے۔ اس نے حسیب اللہ کو بھی ہتھیار سمیت باہر نکلتے دیکھا۔ شکار کے شوق کے باعث حویلی کے تمام ہی مرد حضرات ہتھیاروں کا استعمال اچھی طرح جانتے تھے۔

''کون لوگ ہیں یہ؟ کیا بلوائی؟'' آصف خان نے نگران سے دریافت کیا۔

''وہی اچ ہیں سرکار۔ رگھو بدمعاش کو ان کے بیچ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوں۔'' نگران نے اسے جواب دیا اور ایک فائر داغا۔ آصف خان کو بھی رگھو کے بارے میں سن گن تھی۔ یہ نواب سلیم اللہ کے دوست کی حویلی میں کام کرنے والا وہی ملازم تھا جس کی جوان بیوی نواب صاحب کے دوست کے بیٹے شہزادہ کمال کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئی تھی اور وہ انتقام کی خواہش میں بلوائیوں کے ایک منظم گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔ رگھو اور اس کے گروہ نے نواب سلیم اللہ، ان کے دوست اور دوست کے بیٹے کو اس وقت نشانہ بنایا تھا جب وہ لوگ شکار کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ شہزادہ کمال کے علاوہ بے قصوروں کو بھی نشانہ بنانے کے باوجود جانے رگھو کے انتقام کی آگ نہیں بجھی تھی یا اس کے منہ کو خون لگ گیا تھا جو وہ اپنے ساتھیوں سمیت نواب صاحب کی حویلی پر چڑھ دوڑا تھا۔ نواب صاحب کی حویلی کی مضبوطی اور یہاں مسلح نگرانوں کی موجودگی یقیناً ان بلوائیوں کے علم میں تھی جو وہ مکمل تیاری کے ساتھ آئے تھے اور ان کی طرف سے بھی فائرنگ کی جا رہی تھی۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اور انہوں نے حویلی کو ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ پھر انہیں لڑائی بھڑائی اور فتنے فساد کا تجربہ بھی زیادہ تھا سو مزاحمت کے باوجود ان کے حملے میں شدت زیادہ تھی۔ وہ فائرنگ کے علاوہ آگ کے گولے بھی حویلی کے اندر اچھال رہے

تھے جو کسی بھی آگ پکڑنے والی چیز سے ٹکراتے تو اس میں آگ لگ جاتی۔ آگ کی وجہ سے دھواں بھی پیدا ہورہا تھا جس کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ مزاحمت کرنے والے کھانس کھانس کر بے حال ہو رہے تھے اور ان کی مزاحمت کمزور پڑ رہی تھی جبکہ چالاک بلوائی پہلے ہی سے انتظام کرکے آئے تھے۔ انہوں نے اپنے منہ اور ناک کے گرد گیلے کپڑے لپیٹ لیے تھے۔ یہاں والوں کے پاس اس کی بھی مہلت نہیں تھی۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں حویلی پر حملہ ہوگا۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کی طرح یہاں والوں نے تو ہجرت کا بھی نہیں سوچا تھا۔ یہی خیال تھا کہ ہم ایک آزاد ریاست کے باسی ہیں جو آزادانہ ہی رہتے رہیں گے۔ قیام پاکستان کے بعد ریاست کے پاکستان سے الحاق کے بارے میں پیش گوئیاں ضرور کی جارہی تھیں جس میں ظاہر ہے تشویش کا کوئی پہلو نہیں تھا لیکن ان متعصب ہندوؤں کے پیٹ میں تو مروڑ اٹھ رہے تھے جو ریاست کے نوابین کی دولت پاکستان منتقل ہوجانے کے اندیشے سے بے حال ہوئے جارہے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ یہ دولت کسی بھی طرح مسلمانوں اور پاکستان کے کام آسکے۔

نواب سلیم اللہ کی حویلی پر رات کے اس پہر حملے کا مقصد بھی ان کی دولت ہتھیانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مسلمانوں کی جانوں اور عزتوں سے کھیلنے کا موقع انہیں بونس میں مل جاتا۔ وہ مکمل تیاری کے ساتھ آئے تھے اور ان کی آنکھوں پر دولت اور نفرت کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، اس لیے ان کے حملے کا جوش، غیظ اور غضب ہی الگ تھا۔ مزاحمت کے باوجود وہ حویلی کی بائیں جانب کی دیوار میں شگاف بنانے میں کامیاب ہوگئے اور اس شگاف سے بلوائیوں کا ریلا سا اندر گھس آیا۔ آصف خان اور حسیب اللہ کو خبر ہوئی تو دونوں بیک وقت اس طرف دوڑے۔ پریشانی اور افراتفری میں انہیں اس بات کا بھی ہوش نہیں تھا کہ ان کے پاس گنتی کی چند گولیاں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ اسلحہ تو محض شکار کے شوق میں جمع کیا گیا تھا، یہ گمان کب تھا کہ اس اسلحے سے اپنے دفاع کی جنگ بھی لڑنا پڑے گی جو ہتھیاروں اور گولیوں کا ڈھیر جمع کرلیا جاتا۔ گولیاں ختم ہوئیں تو پہلے حسیب اللہ بلوائیوں کا نشانہ بنا۔ ایک بلوائی کی کرپان نے یوں اس کی گردن کو چھیدا کہ وہ اپنے منہ سے چیخ تک بلند نہ کرسکا۔ ہاں کھلی آنکھوں میں حسرت، وحشت ضرور جم کر رہ گئی۔ جوان عمری میں دنیا کو چھوڑ کر جانے کی کسک اور عزیز بیوی اور ننھی بیٹی سمیت حویلی کی دیگر خواتین کی فکر یوں خلط ملط ہوئی کہ اس کی روح بدن کو چھوڑ کر جاتے ہوئے تڑپ تڑپ گئی لیکن موت پر کہاں کسی کا اختیار ہے۔

آصف خان لندن کا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ایک قبائلی تھا جس کے لیے ہتھیار اور لڑائی بھڑائی کوئی انوکھی چیز نہیں تھی۔ وہ حسیب اللہ کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح ان بلوائیوں کا مقابلہ کر رہا تھا لیکن بلوائی تعداد میں بہت زیادہ اور مختلف اقسام کے ہتھیاروں سے لیس تھے چنانچہ نقصان اٹھانے کے باوجود ان کا زور کم نہیں ہورہا تھا۔ آصف خان کی بندوق کی گولیاں ختم ہوگئیں تو اس نے ایک بلوائی کی کرپان چھین لی اور اسے بے تحاشا چلاتے ہوئے ان کے بدنوں کو چھیدنے لگا۔ وہ کرپان استعمال کرنے کے ہنر سے واقف نہیں تھا لیکن اپنے محسنوں کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کا خیال اسے بے جگری سے لڑنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس حویلی نے اسے اس وقت پناہ دی تھی جب خود اس کے وطن کی زمین اس کے لیے تنگ پڑ گئی تھی پھر وہ آج وقت پڑنے پر حویلی والوں کے لیے اپنی جان کیسے نہیں لڑاتا لیکن وہ اکیلا کب تک لڑسکتا تھا۔ بلوائیوں کے ہتھیاروں نے اس کے جسم پر اتنے گھاؤ لگائے کہ جسم چھلنی ہوکر رہ گیا۔ سب سے زیادہ نقصان اس گولی نے پہنچایا جو اس کے بائیں گردے میں لگی تھی۔ گولی کے اس زخم نے ہی باہمت آصف خان کو ڈھا دیا اور آخرکار وہ گر گیا۔ گرے ہوئے شیر کا شکار ان بھیڑیوں کے لیے کیا مشکل تھا۔ بالآخر اس آصف خان کی زندگی کی کہانی ختم ہوگئی جسے اس کے والدین نے جیتا رکھنے کے لیے ہی خود سے اتنی دور بھیجا تھا۔ موت اپنے وقت پر ہی آئی تھی لیکن فرق تھا تو یہ کہ وہ اپنے علاقے میں اپنوں کی دشمنی کی بھینٹ چڑھنے کے بجائے یہاں شہادت کا رتبہ پا گیا تھا۔

حویلی کے نگرانوں نے بھی حق نمک ادا کرتے ہوئے ایک ایک کرکے اپنی جان دے دی تھی۔ اب واحد صفی اللہ تھے جو اپنی بندوق تھامے زنان خانے کی پہرے داری کر رہے تھے۔ زنان خانے میں اس وقت کہرام مچا ہوا تھا۔ بیبیاں اور ملازمائیں جو شور سن کر ایک ایک کرکے جاگ گئی تھیں، ایک بڑے کمرے میں اکٹھی ہوگئی تھیں۔ خوف نے ان سب کے چہروں سے خون نچوڑ لیا تھا اور وہ زاروقطار رو رہی تھیں۔ بلوائیوں کے بارے میں خبریں حویلی میں بھی پہنچ رہی تھیں اور جملہ خواتین کو علم تھا کہ یہ بلوائی صرف جان، مال کے دشمن نہیں ہوتے، ان سے عزتیں بچانا بھی

مشکل تھا اور وہ عزت دار بیبیاں سب سے زیادہ اپنی آبرو کے لیے فکر مند تھیں۔ زنان خانے کا پہرا دیتے صفی اللہ ایک جھروکے سے باہر جاری ہنگامے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں نے دیکھ لیا تھا کہ دفاع کرنے والے اپنی کوشش میں ناکام ہو گئے ہیں اور اب بلوائی حویلی کی مرکزی عمارت میں گھسنے کو ہیں۔ جان و مال کی انہیں اتنی پروا نہیں تھی لیکن اپنی آبرو کو اپنے سامنے لٹتا دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے چنانچہ جھروکے سے ہٹ کر اس کمرے میں آئے جہاں ساری خواتین ان کی صورت تکتی تھیں۔ دفاع کرنے والوں کو شکست سے دوچار کرنے کے بعد بلوائیوں کا جوش و خروش مزید بڑھ گیا تھا اور وہ وحشیانہ نعرے لگاتے ہوئے شاید اسی طرف آرہے تھے۔ ان کا یہ عمل دلوں کو لرزا رہا تھا۔ صفی اللہ کے چہرے پر بھی زلزلے کے آثار تھے انہوں نے خود پر اٹھی سوالیہ نظروں کو محسوس کیا اور گمبھیر لہجے میں فقط اتنا بولے۔ ''کلمہ طیبہ پڑھ لیجیے۔''

ان کا یہ مختصر جملہ وہاں موجود خواتین کے لیے مکمل پیغام تھا۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ اب ان کا دفاع ممکن نہیں رہا ہے اور انہیں وہی کرنا ہے جو آبرو مند بیبیاں اپنی آبرو بچانے کے لیے کرتی ہیں۔ وہ سب روتی کرلاتی کمرے سے باہر نکل کر پچھلے صحن کی طرف دوڑتی چلی گئیں۔ صفی اللہ نے مارے کرب کے اپنی آنکھیں بند کرلیں لیکن یہ بھی نہیں کر سکے...... کہ ان کے کانوں نے زنان خانے کا مضبوط دروازہ توڑے جانے کی آوازیں سن لی تھیں۔ وہ تیزی سے اس جانب بڑھے۔ ان کے پاس گنتی کی چند گولیاں تھیں لیکن ان کی مدد سے وہ اتنی مہلت تو حاصل کر سکتے تھے کہ خواتین اپنی آبرو بچانے کا انتظام کر لیں۔ وہاں اتنا شور تھا کہ کسی آواز کے سنائی دینے کا کوئی امکان نہیں تھا پھر بھی وہ حملہ آوروں پر گولیاں برساتے اپنے کانوں میں وہ چھپاکے گونجتے محسوس کر رہے تھے جو ہر بی بی کے کنوئیں میں چھلانگ لگانے پر پیدا ہوتا تھا۔ زنان خانے کے پچھلے صحن میں بنا وہ کنواں بہت گہرا تھا اور انہیں یقین تھا کہ اس میں حویلی کی عزت و آبرو اچھی طرح سما جائے گی۔ اپنی بندوق سے آخری گولی چلاتے ہوئے انہیں یہ اطمینان تھا کہ ان کے کمزور بازو حویلی کی آبرو لٹنے سے بچا چکے ہیں۔ ان کی طرف سے گولیاں چلنے کا سلسلہ ختم ہوا تو ٹوٹے ہوئے دروازے سے بلوائی بھرا مار کر اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے بھی چند ایک کے ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار موجود تھے۔

کوئی آتشیں ہتھیار چلا اور گولی صفی اللہ کے بدن میں گھپ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے نیچے گر گئے۔ بلوائی ان کے گرے ہوئے بدن کو روندتے ہوئے اندر گھس کر زنان خانے کے مختلف حصوں میں گھستے چلے گئے۔ انہیں زمین پر اوندھے گرے صفی اللہ سے زیادہ اب ان بیبیوں سے دلچسپی تھی جن کے چہرے کبھی کسی نامحرم نے نہیں دیکھے تھے پھر بھی ان کے حسن کا چرچا تھا۔ وہ حسن کے ساتھ ساتھ حسن کو دو آتشہ کرنے والے ان زیورات کے بھی خواہاں تھے جن کی بیش قیمتی اور خوب صورتی کو ہر دیکھنے والے کی زبان سراہتی تھی۔ زیورات تک رسائی میں وہ خاصی حد تک کامیاب ہو گئے لیکن حسن والیاں پچھلے صحن میں بنے عمیق کنوئیں میں سما چکی تھیں۔ عورت کے نام پر وہاں صرف ندرت جہاں کا بوڑھا وجود بچا تھا۔ ان کے بوڑھے اور بیمار وجود میں اتنا دم ہی نہیں تھا کہ وہ بھاگ کر پچھلے صحن تک جا پاتیں۔ کوشش البتہ انہوں نے ضرور کی تھی اور اس کوشش میں ناکام ہو کر کمرے کی چوکھٹ پر ہی گر گئی تھیں۔ نفرت سے بھرے بلوائی اس بوڑھے وجود کو بھی شاید نہ چھوڑتے لیکن باہر سے آنے والی آوازوں نے انہیں راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ یقیناً حویلی پر بلوے کی خبر دربار تک پہنچ گئی تھی اور والی ریاست کے سپاہی اپنے وفادار دوست خاندان کی مدد کے لیے وہاں آپہنچے تھے یہ اور بات کہ انہیں آنے میں بہت دیر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وحشت زدہ سا فاروق انتہائی نگہداشت کے وارڈ کی طرف بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ نرس سوزی سے اسے یہی پتا چلا تھا کہ کیتھی کے عزیز کو وہاں رکھا گیا ہے۔ یہاں انتہائی حساس مریضوں کو رکھا جاتا تھا، اس لیے ملاقاتیوں اور عزیزوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ فاروق کو بھی روکنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ کہاں رک سکتا تھا۔ اس نے روکنے والے کو جھٹکے سے ایک طرف ہٹایا اور خود اندر داخل ہو گیا۔

''کون ہے تو بدمعاش۔ میں ابھی سیکورٹی کو بلاتا ہوں۔'' وہ شخص اس کی حرکت پر زور سے چلایا لیکن فاروق نے پروا نہیں کی۔ اسی اثنا میں اندر موجود کیتھرائن شور کی وجہ سے متوجہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی سرخ آنکھوں سے اندر آجانے والے فاروق اور اس کے پیچھے موجود وارڈ بوائے کو دیکھا اور پھر وارڈ بوائے سے بولی۔

''انہیں آنے دو، روبن یہ میرے ریلیٹو ہیں۔''

روبن نے منہ بنایا لیکن خاموش ہو گیا۔ ادھر فاروق ہر بات سے بے نیاز ربن کے قریب پہنچ چکا تھا۔ سفید بستر پر دراز ربن کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے کی رنگت یوں زرد تھی جیسے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود نہ ہو۔ دونوں ہاتھوں سمیت اس کا پورا جسم پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ منہ پر آکسیجن ماسک لگا تھا اور رگوں میں خون اور گلوکوز منتقل کرنے والی سوئیاں پیوست تھیں۔ کیتھی کے علاوہ وہاں ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا جو ربن کا معائنہ کر رہا تھا۔ وہ اس کام میں اتنا منہمک تھا کہ فاروق کے اندر داخل ہونے کے وقت ہونے والے ہنگامے کی طرف اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ فاروق کے لیے یہ سارا منظر ناقابلِ یقین تھا۔ ربن اور اس حالت میں اسپتال کے بستر پر لیٹا ہوا مل سکتا ہے، اس کے دل کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں ربن کو دیکھ رہا تھا جیسے اس کے دل و دماغ حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہوں۔ کیتھرائن نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا اور دلاسا دینے والے انداز میں اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''ان کی حالت اب کیسی ہے ڈاکٹر صاحب؟'' کیتھرائن کے ہاتھ کے دلاسے نے فاروق کے اندر اتنی ہمت پیدا کی کہ وہ ڈاکٹر سے کوئی سوال کر سکے۔

''بہت سیریس کنڈیشن ہے۔ بلڈ اتنی زیادہ مقدار میں بہہ چکا ہے کہ نارملی ایسی کنڈیشن میں پیشنٹ کی ڈیتھ ہو جاتی ہے لیکن یہ شخص حیرت انگیز طور پر زندہ رہا ہے۔ ہم بلڈ دے رہے ہیں لیکن صرف اس سے پرابلم سولو نہیں ہوگی۔ باڈی کے اندر گولی موجود ہے جسے آپریٹ کرنا ضروری ہے لیکن اس کنڈیشن میں آپریٹ کرنا بھی بہت ڈینجرس ہوگا۔ بات صرف بیرونی زخموں کی نہیں ہے۔ بہت شدید اندرونی چوٹیں بھی آئی ہیں۔ لیفٹ کڈنی اور اسٹمک متاثر ہیں۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ یہ شخص حیرت انگیز طور پر زندہ ہے۔ ہاسپٹل کے کئی سینئر ڈاکٹرز نے اس کا چیک اپ کیا ہے۔ تھوڑی دیر میں ہمارے سب سے سینئر ڈاکٹر پہنچنے والے ہیں۔ ان کے ساتھ اس کیس کو ڈسکس کر کے فائنلی ڈیسیژن لیا جائے گا کہ اب کیا کرنا ہے؟ آپ کی پرمیشن کی بھی ضرورت ہوگی۔ ویسے آپ پیشنٹ کے کون ہیں؟'' ڈاکٹر نے اسے ایک ہی سانس میں ساری تفصیل بتانے کے بعد آخر میں اس کی بابت پوچھا۔

''یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ آپ لوگ ان کے اچھے سے اچھے علاج کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔ میں پانی کی طرح پیسا بہانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے بس ان کی زندگی چاہیے۔'' فاروق اس وقت بہت جذباتی کیفیت میں تھا۔ بستر پر پڑا ربن کا وجود اس کے دل کو بری طرح بھینچ رہا تھا اور اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح ربن کو بستر سے اٹھا کر کھڑا کر دے۔

''زندگی دینا اوپر والے کا کام ہے۔ ہم ڈاکٹرز بس اپنی بہترین کوشش ہی کر سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے اس کی بات کے جواب میں کہا اور پھر کیتھرائن کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بولا۔

''پلیز سسٹر! آپ ان کا خیال رکھیں۔ میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ راؤنڈ لگاؤں گا، اگر کوئی پرابلم ہو تو فوراً مجھے انفارم کیجیے گا۔''

''او کے ڈاکٹر!'' کیتھرائن نے ڈاکٹر کو جواب دیا تو وہ فاروق کے شانے کو تھپتھپاتا ہوا باہر نکل گیا۔

''دادا کو یہاں کون لایا تھا؟'' ڈاکٹر چلا گیا تو فاروق نے کیتھرائن سے دریافت کیا۔ اسپتال میں اڈے کے کسی بھی فرد کی غیر موجودگی کا یہی مطلب تھا کہ وہاں کسی کو اس حادثے کی خبر نہیں ہے اور ربن کو کہیں تنہائی میں گھیر کر مارا گیا ہے۔

''دینو تانگے والا لایا تھا۔ میرا اکثر اس کے تانگے میں آنا جانا رہا ہے اس لیے میں اسے جانتی ہوں۔ اس نے بتایا تھا کہ دادا کو اس نے راستے میں اس حال میں پڑا دیکھا تو ہمدردی میں اسپتال لے کر آ گیا۔ وہ یہاں زیادہ رکا بھی نہیں کہ پولیس کے چکر میں پڑنا پڑے گا۔'' کیتھرائن نے اسے بتایا۔

''تم نے اڈے پر اطلاع کیوں نہیں بھجوائی؟'' فاروق نے وہ سوال کیا جو مسلسل اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا۔ کیتھرائن ربن کا کتنا بھی خیال رکھتی، وہ اڈے کے لوگوں کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس کے اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ ربن کے علاج معالجے کے اخراجات برداشت کر پاتی۔ منطقی طور پر بھی اڈے والوں کو یہاں ہونا چاہیے تھا کہ ربن کے سارے رشتے ناتے ان ہی لوگوں سے تھے اور ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا تھا۔

''میں نے ایک آدمی ادھر بھجوایا تھا لیکن.....'' کیتھرائن خاموش ہو گئی۔

''لیکن کیا؟'' فاروق جس کی نظریں مسلسل ربن پر ٹکی ہوئی تھیں، چونک کر کیتھرائن کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرے بھیجے ہوئے آدمی نے بتایا ہے کہ اڈے پر صبح صبح پولیس کا ریڈ ہوا تھا۔ پولیس والے اڈے سے کئی

افراد کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں اور کچھ فرار ہیں۔ اڈا خالی پڑا ہے اور پولیس نے باہر تالا لگا کر اپنا ایک سپاہی وہاں کھڑا کر دیا ہے۔ اچھا ہوا کہ میرا بھیجا ہوا آدمی سیدھا اڈے پر نہیں پہنچا۔ وہ اڈے کا پتا معلوم کرنے کے لیے ایک دکان پر رکا تھا۔ دکان دار نے ہی اسے ساری کہانی سنائی۔'' ایک اور روح فرسا خبر فاروق کی منتظر تھی جسے سن کر وہ دنگ رہ گیا۔ پچھلے کچھ عرصے سے ان کے لیے حالات سخت چل رہے تھے لیکن یوں دیکھتے ہی دیکھتے سب اجڑ جائے گا، اس کا تو کوئی گمان ہی نہیں تھا۔ وہ جیسے سن سا ہو گیا اور یک ٹک ربن کی شکل دیکھنے لگا۔ کیسا جی دار اور شان والا آدمی تھا وہ۔ دشمنوں نے نہ جانے کس عیاری سے چال چل کر اسے اس حال کو پہنچایا تھا۔ پیچھے سے اس کی راجدھانی بھی اجاڑ کر رکھ دی تھی۔ دشمن کون تھے یہ پوچھنے کی اسے ضرورت نہیں تھی۔ اس قصے میں پولیس کی شمولیت سے ہی ظاہر تھا کہ یہ پولیس اور مجو دادا کا مشترکہ کارنامہ تھا۔ مجو دادا اور اس کے گرگوں کا پولیس کے ساتھ عرصے سے گٹھ جوڑ چل رہا تھا لیکن کمال یہ ہوا تھا کہ انہوں نے انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے انتہائی اقدامات کر ڈالے تھے جن کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''ظالموں نے دادا کے دونوں ہاتھوں کی ساری انگلیاں کاٹ ڈالی ہیں۔ انہیں دوسری زندگی ملی بھی تو وہ معذوری کی زندگی ہوگی۔'' کیتھرائن نے فاروق کو رقت آمیز لہجے میں بتایا تو وہ مزید چونک گیا اور اس کا شک یقین میں بدل گیا کہ اس سب کے پیچھے مجو دادا کا ہاتھ ہے۔ ربن نے اسے ہمیشہ کے لیے چاقو پکڑنے سے محروم کر دیا تھا۔ جواب میں اس نے بھی یہی کر ڈالا تھا لیکن دونوں کے طرزِ عمل میں فرق تھا۔ ربن نے مجو دادا کو باقاعدہ للکار کر اس کی مرضی سے بمبئی بھر کے داداؤں کی موجودگی میں اپنے زورِ بازو پر زیر کیا تھا، اس کے مقابلے میں مجو نے باقاعدہ سازش کی تھی۔ فاروق نے کرب کے عالم میں پٹیوں میں جکڑے ربن کے ہاتھوں کو آہستہ سے چھوا۔ ان ہاتھوں کی انگلیوں میں کیسا ہنر چھپا ہوا تھا۔ چاقو ان ہاتھوں کی انگلیوں کے اشارے پر ناچتا تھا لیکن اب وہ انگلیاں ہی نہیں رہی تھیں۔ اپنے مربی و محسن کی یہ حالت اس کے دل پر کیا گزار رہی تھی، یہ وہی جانتا تھا۔ ممکن ہوتا تو وہ اپنے جسم کا ایک ایک عضو ربن کو دان کر کے اس کے بدن کے ٹوٹے ہوئے اعضا کی کمی دور کر دیتا، وہ اس کے بدن میں اپنی روح منتقل کر دیتا لیکن یہ سب ممکن ہی تو نہیں تھا اور بے بسی آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگی تھی۔ آنسو اتنی روانی سے بہہ رہے تھے کہ کہیں ٹھہرے بغیر قطروں کی صورت ٹپ ٹپ ربن پر گرتے چلے گئے۔ فاروق کے آنسو ربن کے چہرے پر گرتے اور وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہتا بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ بند پپوٹوں میں دھیرے سے تحرک پیدا ہوا اور پلکیں کھلنے کے لیے لرزنے لگیں۔

''دادا...... اٹھو دادا! دیکھو میں آیا ہوں تمہارا فاروق۔'' پلکوں کی جنبش کو محسوس کر کے فاروق بے چینی سے اسے آواز دینے لگا۔ اس کی آواز نے مہمیز کا کردار ادا کیا اور بند آنکھیں دھیرے دھیرے کھلتی چلی گئیں۔ ناطاقتی ایسی تھی کہ پوری آنکھیں بھی نہ کھل پائیں اور وہ بس نیم وا آنکھوں سے فاروق کی شکل دیکھنے لگا۔ ان نیم وا آنکھوں میں بھی فاروق کے لیے ایک جہانِ محبت آباد تھا۔

''میں آ گیا ہوں دادا۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پھر ہم دونوں مل کر دشمنوں کو اچھی طرح سبق سکھائیں گے۔'' فاروق نے اپنی آواز میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے اس سے کہا تو اس کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں پھیل گئے لیکن صاف ظاہر تھا کہ اس ذرا سی مسکراہٹ کے لیے بھی اسے بڑی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

''ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہے۔'' کیتھرائن جو اس دوران پوری مستعدی سے ربن پر دھیان رکھے ہوئے تھی اور اس کا معائنہ کرتی جا رہی تھی، آہستہ سے بولی اور ڈاکٹر کو بلانے کے لیے باہر کی طرف دوڑی۔ فاروق نے بھی محسوس کیا کہ آکسیجن ماسک کے پیچھے ربن کے لبوں کی مسکراہٹ میں کرب ہے لیکن وہ کمال آدمی تھا کہ اب بھی اپنے منہ سے ایک آہ نہیں نکالتا تھا۔ اس کا تیزی سے پھولتا پچکتا سینہ گواہ تھا کہ اسے آکسیجن لگی ہونے کے باوجود سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ فاروق کا دل چاہا کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر یوں بھینچ لے کہ کوئی اسے اس سے چھین کر نہ لے جا سکے لیکن وہ یہ بھی تو نہیں کر سکتا تھا کہ ربن کا زخم زخم وجود بہت احتیاط سے چھوئے جانے کا متقاضی تھا۔

''پلیز! آپ پیچھے ہٹیں۔'' کیتھرائن کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہونے والے ڈاکٹرز میں سے ایک نے فاروق سے کہا تو وہ خود پر جبر کر کے پیچھے ہٹا کہ وہ لاکھ ربن سے محبت کرتا ہو مگر ڈاکٹر کا کام تو ڈاکٹر ہی کر سکتے تھے۔ دونوں ڈاکٹر پوری جاں فشانی سے اپنا فریضہ انجام دینے میں مصروف ہو گئے۔ کیتھرائن بھی مستعدی سے ان کی ہدایت پر عمل کر رہی تھی۔ ڈاکٹرز کیا کر رہے ہیں اور کیا کہہ

رہے ہیں، فاروق کو نہ تو سمجھ آرہی تھی اور نہ ہی سمجھنے کا ہوش تھا۔ وہ تو بس سراپا دعا ربن کی زندگی کی بھیک مانگنے میں مصروف تھا لیکن ہر دعا کہاں مستجاب ہوتی ہے۔ بعض اوقات دعائیں روزِ آخرت کے لیے اٹھا کر رکھ دی جاتی ہیں۔ فاروق کی بہت شدت سے مانگی گئی دعاؤں کے لیے بھی یہی فیصلہ کیا گیا اور ڈاکٹرز نے ربن کے بیڈ سے دور ہٹتے ہوئے اعلان کیا۔

''ہی از نو مور۔'' یہ محض الفاظ نہیں تھے۔ فاروق پر تو آسمان ٹوٹ کر گرا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ اپنی جگہ بالکل سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ غم پر نفرت اور انتقام کی قوتیں غالب آگئی تھیں اور وہ ربن کے بے جان وجود کو یک ٹک دیکھتے ہوئے خود سے وعدہ کر رہا تھا کہ اس کے قاتلوں کو روئے زمین پر کہیں پناہ نہیں لینے دے گا۔

''ہم حیران تھے کہ اس شخص کو اب تک کس چیز نے زندہ رکھا ہوا ہے۔ اب اندازہ ہوا کہ ان کا دم آپ میں اٹکا ہوا تھا۔ بہرحال ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہم کوشش کے باوجود ان صاحب کی جان نہ بچا سکے۔'' ایک ڈاکٹر نے فاروق کے قریب آکر اس سے انگریزی میں کہا لیکن فاروق اسے کوئی جواب نہیں دے سکا۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے دونوں ڈاکٹرز آگے پیچھے باہر نکل گئے۔ اب یہاں ان کا کوئی کام باقی نہیں رہا تھا لیکن دوسرا اسٹاف مستعد ہو گیا تھا۔ یہ اسپتال تھا اور یہاں اموات ایک معمول کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اسی اعتبار سے عملے کے افراد بھی ایک معمول ہی کی طرح غیر جذباتی انداز میں کام کرنے کے عادی تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ربن کی لاش کو سفید چادر میں لپیٹ دیا۔

''آپ میرے ساتھ باہر آئیں فاروق بھائی۔'' کیتھرائن جس کی اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، فاروق کا بازو تھام کر اسے باہر لے گئی۔ باہر اس نے فاروق کو ایک کرسی پر بٹھایا اور خود اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ آپ کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے لیکن جو حالات نظر آرہے ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے آپ کو خود پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بیک گراؤنڈ تو آپ ہی کو معلوم ہوگا ابھی زیادہ ڈیٹیل میں جانے کا ٹائم بھی نہیں ہے۔ میں آپ کو بس یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ آپ کے لیے بھی خطرہ ہے۔ دادا کو جس حال میں ہاسپٹل لایا گیا تھا، وہ پولیس کیس بنتا ہے۔ پولیس یہاں آئی بھی تھی لیکن پولیس پر دادا کی شناخت ظاہر نہیں کی گئی۔ ایسا میرے کہنے پر ہوا اور ڈاکٹر پرکاش نے میرا ساتھ دیا۔ آپ کی بیماری کے دنوں میں ڈاکٹر پرکاش کی دادا سے اچھی دوستی ہو گئی تھی اس لیے وہ میری ریکویسٹ پر آؤٹ آف دا وے جا کر فیور دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اسٹاف کا ہر فرد تو دادا کے بارے میں ویسے بھی نہیں جانتا، کچھ زخموں کی وجہ سے بھی شناخت نہیں ہوئی۔ اب آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ منظر سے ہٹ جائیں۔ پولیس اپنی کارروائی کے لیے دوبارہ یہاں آئے گی، آپ سے ان کا سامنا نہ ہو تو ٹھیک رہے گا۔ لاوارث لاش میں پولیس بھی زیادہ دلچسپی نہیں لے گی اور ڈیڈ باڈی کو سرد خانے میں رکھوا دیا جائے گا۔''

''کیا مطلب؟ میرے ہوتے دادا کی لاش لاوارث کیسے ہو سکتی ہے؟'' فاروق بھڑکا۔

''پلیز ایزی۔ میں پولیس سے بچنے کے لیے آپ کو یہ ایڈوائز کر رہی ہوں۔ ڈیڈ باڈی آپ کو ہی ملے گی، یہ میرا آپ سے پرامس ہے۔ بس ابھی آپ سامنے سے ہٹ

دولت مند

ایک دولت مند شخص کسی ڈاکٹر کے یہاں بغرضِ علاج گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس شخص سے کہا۔

''اس کرسی پر تشریف رکھیے۔''

دولت مند شخص کو شاید یہ توقع تھی کہ ڈاکٹر صاحب اسے دوسرے عام مریضوں کی نسبت زیادہ اہمیت دیں گے۔ وہ بلند آواز سے بولا۔

''ڈاکٹر صاحب! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں اس شہر کا امیر ترین شخص ہوں۔''

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو پھر آپ دو کرسیوں پر تشریف رکھیے۔''

بیچارہ چوہا

استاد شاگرد سے۔ ''دنیا کا سب سے طاقتور جانور کونسا ہے؟''

شاگرد۔ ''جناب...... چوہا۔''

استاد حیران ہو کر۔ ''وہ کیسے؟''

شاگرد۔ ''جناب! میرے ابو امی سے ڈرتے ہیں اور امی چوہے سے تھر تھر کانپتی ہیں۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

جائیں اور مجھے اپنا پتا دے دیں۔ میں موقع دیکھ کر خود آپ کے پاس آجاؤں گی۔" کیتھرائن بہت رسانیت سے اسے سمجھا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ فاروق کو اس کی بات سمجھ آنے لگی۔ واقعی اس کا آزاد رہنا بہت ضروری تھا۔ وہ آزاد رہتا تب ہی قاتلوں کو سزا دے سکتا تھا۔ اس نے کیتھرائن کو اس ہوٹل کا پتا بتایا جہاں وہ قیام پذیر تھا اور بوجھل دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

اسد اللہ اپنے ایک وفادار ملازم کے ساتھ بمبئی پہنچے تھے۔ بمبئی میں ان کے چند احباب موجود تھے جن میں سے ڈی سوزا نامی گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے تو ان کی بہت اچھی دوستی تھی اور بمبئی آمد کی صورت میں وہ ہمیشہ ڈی سوزا کے گھر ہی قیام کیا کرتے تھے۔ خود ڈی سوزا بھی کئی بار حیدرآباد آکر ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہو چکا تھا لیکن آج وہ اپنے اس اچھے دوست سے ملاقات کے بجائے اپنے پیارے بھتیجے کی تلاش میں بمبئی آئے تھے اور بے قراری کا یہ عالم تھا کہ وہ لمحوں میں اس تک پہنچ جانا چاہتے تھے، اس لیے اسٹیشن سے ٹیکسی میں سیدھے جولیٹ کے دیے ہوئے پتے کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے جبکہ ان کا ملازم ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر موجود تھا۔ انہوں نے نوابین کے روایتی لباس کے بجائے پینٹ اور کوٹ والا انگریزی لباس زیب تن کر رکھا تھا تاکہ ان کی شخصیت زیادہ نمایاں نہ ہو۔ انگریزی لباس پہن کر گھومنے والے بمبئی میں بہتیرے لوگ تھے۔ انگریزوں کی ہندوستان سے روانگی کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا لیکن وہ یہاں کی عوام پر وہ اثرات چھوڑ کر جا رہے تھے جو عوام خود بخود ہی حکمرانوں سے ایڈاپٹ کر لیتی ہے۔ حکمرانی کا اپنا ایک رعب و دبدبہ ہوتا ہے اور عوام کی اکثریت اس کے رعب میں آکر دانستہ و نادانستہ حکمرانوں کے انداز و اطوار کی نقالی کرتی چلی جاتی ہے۔

ہندوستان کے اونچے طبقے نے خصوصاً انگریزوں کی تہذیب و تمدن کا بہت زیادہ اثر قبول کیا تھا اور وہ انگریزی بولنے سے لے کر انگریزی لباس پہننے اور ان کے اطوار کا مظاہرہ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اسد اللہ کو بھی اسی طبقے کے افراد میں سے تصور کیا جا سکتا تھا۔ ان کے بشرے سے البتہ خاندانی نجابت اور شان کا الگ ہی اظہار ہو رہا تھا اور ٹیکسی ڈرائیور بھی مودب سا ٹیکسی چلا رہا تھا۔ ملازم نے پہلے ہی اس سے بات کر لی تھی کہ اسے اس وقت تک ان کے ساتھ رہنا ہوگا جب تک وہ چاہیں۔ بدلے میں اسے اس کا منہ مانگا معاوضہ دیا جائے گا۔ ایسا بار بار سواری کے انتظام سے بچنے کے لیے کیا گیا تھا۔ وہ اپنے دوست ڈی سوزا کو اطلاع دے کر آئے ہوتے تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ گاڑی اور ڈرائیور کے ساتھ خود انہیں لینے کے لیے پہنچ جاتا لیکن اپنے نہایت نجی نوعیت کے دورے کی وجہ سے انہوں نے ڈی سوزا کو اطلاع دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ان کے پاس جولیٹ کے اس گھر کی چابی موجود تھی جہاں وہ جوزفین اور جوزف کے سائے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ انہوں نے یہی طے کیا تھا کہ سیدھے اڈے پہنچنے کے بجائے جولیٹ کے گھر جائیں گے اور وہیں اڈے کے کرتا دھرتا ربن دادا سے ملاقات کریں گے۔ ملازم کو ان کے اس پروگرام کی خبر تھی اور وہ جانتا تھا کہ اسے کب اور کیا کرنا ہے۔ مطلوبہ علاقے میں پہنچ کر ملازم نے اسد اللہ سے تھوڑی دیر ٹیکسی میں ہی تشریف رکھنے کی درخواست کی اور خود ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ جولیٹ کے گھر کی طرف پیش قدمی کی۔ چابی اس کے پاس موجود تھی۔ تالا کھول کر اندر داخل ہوتے ہی اس نے گھر کا جائزہ لیا۔ حسب توقع عرصے سے بند پڑے گھر میں گرد کی تہ جمی ہوئی تھی لیکن ہر شے سلیقے اور ترتیب سے رکھی تھی۔ اس نے ڈرائیور کی مدد سے تیزی سے ایک کمرے کی جھاڑ پونچھ کر کے اسے اس لائق بنایا کہ اسد اللہ وہاں بیٹھ سکیں اور پھر انہیں یہاں لانے کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس مختصر دورانیے میں بھی اہلِ علاقہ اسد اللہ کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور ٹیکسی سے ذرا فاصلے پر کھڑے چند افراد یقینی طور پر ان ہی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے لیکن خود اسد اللہ سب سے بے نیاز پشت گاہ سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہوئے تھے، اسی لیے کسی کی قریب آکر بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ ملازم سے البتہ للیتا موسی سمیت محلے کی ایک دو خواتین نے پکار کر یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ وہ لوگ کون ہیں اور جولیٹ کے گھر میں کیا کر رہے ہیں لیکن ملازم نے کسی کو کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اسد اللہ کے سر پر چھتری تان کر انہیں اس چھوٹے سے گھر کی طرف لے گیا تھا۔

آج دھوپ خاصی تیز تھی اور گرمی مزاج پوچھ رہی تھی، اسی لیے وہ اسد اللہ کو چھتری کے سائے میں مکان تک لے کر پہنچا تھا۔ گنجان آبادی والی تنگ سی گلی میں اب مزید متجسس چہروں کا اضافہ ہو چکا تھا اور ہر ایک جاننے کا خواہش مند تھا کہ جولیٹ کے گھر آنے والے لوگ کون

ہیں۔ وہ چابی سے تالا کھول کر گھر کے اندر آ گئے تھے اس لیے یہ طے تھا کہ مکان کی بیچ جانے والی واحد مالکن کی رضامندی واجازت سے یہاں آئے ہیں۔ اسد اللہ کی شاندار شخصیت کو دیکھتے ہوئے بھی وہ لوگ حیران تھے کہ آخر ایسی شان والے آدمی سے جولیٹ کا کیا تعلق ہے۔ اسد اللہ کو اندازہ تھا کہ ان کی یہاں آمد سے کھلبلی سی مچ گئی ہے اور اہلِ محلہ کو ان کے بارے میں جاننے کا تجسس ہے لیکن فی الحال ان کی توجہ لوگوں کی طرف نہیں تھی۔

یہاں آکر خود ان کے جذبات میں ہلچل مچ گئی تھی۔

ایک طرف برسوں پہلے بچھڑنے والے بھتیجے سے ملنے کی بے قراری تھی تو دوسری طرف وہ اس چھوٹے سے مکان میں داخل ہوتے ہی جوزفین کی خوشبو کے حصار میں گھر گئے تھے۔ وہ برسوں اس گھر میں رہی تھی۔ اس کے خوبصورت ہاتھوں نے اس گھر کو سجایا سنوارا تھا۔ وہ بھلا اس گھر میں اس کی خوشبو کیسے محسوس نہیں کرتے۔ وہ تو اسے یہاں سے وہاں تک ہر جگہ محسوس کر رہے تھے۔ انہیں اس کے لباس کی سرسراہٹ اور قدموں کی چاپ تک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جیسے اس گھر کے ایک ایک ذرّے میں سمائی ہوئی تھی اور اسی لیے انہیں یہ چھوٹا سا گھر اپنی بڑی اور اونچی حویلی کے مقابلے میں زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ اس چھوٹے سے گھر میں ایک کم حیثیت لیکن مخلص شخص نے زندگی کے مشکل ترین وقت میں جوزفین کو پناہ دی تھی اور ساری زندگی اس کا دامن چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھرتا رہا تھا۔ دیکھا جائے تو ان کا جوزف سے رقابت کا تعلق بنتا تھا لیکن وہ اپنے دل میں اس شخص کے لیے محبت اور ممنونیت محسوس کرتے تھے۔ وہ انہیں خود سے اونچے مرتبے پر محسوس ہوتا تھا کہ اس نے رسمِ محبت یوں نبھائی تھی کہ اپنی محبوب کی غلطی تک کو اپنا بنا لیا تھا اور اسے کہیں رسوا نہیں ہونے دیا تھا۔ اگر وہ جوزفین کو نہ اپناتا تو وہ کیسے ذلت وبدنامی کے ساتھ جی پاتی اور کیسے وہ اپنی پیاری جولیٹ کو دیکھ پاتے۔ لہٰذا وہ اس گھر میں صرف جوزفین کو محسوس نہیں کر رہے تھے بلکہ اس پیارے شخص کو بھی محسوس کر رہے تھے جس نے ان کی جوزفین اور جولیٹ کو زمانے کے سرد وگرم سے بچا کر اپنی محبت اور شفقت کی پناہ میں لے لیا تھا۔

”شربت نوش فرمائیے سرکار!“ وفادار ملازم انہیں کمرے میں آرام کرتا چھوڑ کر خود باورچی خانے میں جا گھسا تھا۔ ان کے سامانِ سفر میں خورد ونوش کا بھی کافی سامان موجود تھا۔ گرمی کے پیشِ نظر ملازم نے اسٹیشن پر اترتے ہی تھرماس میں برف بھروا لی تھی۔ اس لیے پہلی فرصت میں اسد اللہ کو صندل کا شربت بنا کر پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اسد اللہ کا اتنا وفادار اور قابلِ بھروسا ملازم تھا کہ انہوں نے راستے میں ہی اسے اپنی یہاں آمد کا مقصد بتا دیا تھا۔ چنانچہ وہ قطعی حیران نہیں تھا کہ اسد اللہ نے ٹھہرنے کے لیے اپنے کسی دوست کے گھر یا اچھے ہوٹل کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ وہ اس چھوٹے سے گھر میں بھی ان کے آرام کا حتی الامکان خیال رکھ رہا تھا۔ اسد اللہ نے شربت نوش کیا۔ اس دوران اس نے غسل خانہ صاف کر کے ان کے لیے ایک ہلکا کرتہ پاجامہ اور تولیا وہاں لٹکا دیا۔ اسد اللہ نے ایک مخصوص ماحول میں پرورش پائی تھی اور دلی بے قراری کے باوجود ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ طویل مسافت کے بعد غسل کیے بغیر کسی سے میل ملاقات کے لیے تیار ہو جاتے۔ وہ چھوٹے سے غسل خانے میں غسل کر کے باہر نکلے تو ملازم ان کا منتظر تھا۔

”محلے سے ایک آدمی آیا بیٹھا ہے سرکار! اسے محلے والوں نے بھیجا ہے کہ ہم لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔“ ملازم نے انہیں کنگھا اور خوشبو وغیرہ پیش کرنے کے ساتھ اطلاع پہنچائی۔

”اچھی بات ہے۔ ان صاحب کو ہمارے پاس لے آؤ۔“ اسد اللہ نے اجازت دی۔ ربن دادا کے اڈے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے خود انہیں بھی کسی ذریعے کی ضرورت تھی، اس لیے آنے والے ملاقاتی سے ملاقات کر لینا ہی مناسب تھا۔

”السلام علیکم۔“ سلام کی آواز پر وہ آنے والے کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے سلام کا جواب دیتے ہوئے اخلاق سے اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دی۔

”میرا نام غلام محمد ہے۔ اسی محلے کا رہائشی ہوں۔ محلے کے زیادہ تر افراد مجھے غلامو چاچا کہتے ہیں۔ جولیٹ جس کے مکان میں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں، مجھے غلامو چاچا ہی کہتی تھی۔ ہمارے اس محلے میں محلے داروں کو ان کی عمر وغیرہ کے اعتبار سے کسی نہ کسی رشتے سے مخاطب کیے جانے کا رواج ہے اور مختلف مذہب ورواج سے تعلق رکھنے کے باوجود ہم ایک دوسرے کو اپنا رشتے دار ہی تصور کرتے ہیں۔ جولیٹ بیٹی کے اچانک غائب ہو جانے کی وجہ سے مجھ سمیت تمام اہلِ محلہ پریشان تھے اور اپنے طور پر اسے تلاش کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن ہمارے پاس اس کے کسی عزیز یا رشتے دار کا اتا پتا نہیں تھا اس لیے موثر طور پر تلاش نہیں کیا

جاسکا۔ آج آپ جس انداز سے یہاں تشریف لائے ہیں، محسوس ہوا کہ آپ کا جولیٹ اور اس کے خاندان سے کوئی قریبی تعلق ہے اور ہم آپ سے اس کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ مجھے اہلِ محلہ نے اپنی نمائندگی کے لیے یہاں بھیجا ہے تاکہ میں آپ سے جولیٹ بیٹی کی خیروعافیت معلوم کرکے سب کے لیے اطمینان حاصل کرسکوں۔'' غلامو چاچا یوں بھی بمبئی والوں سے ہٹ کر بہت قرینے سے گفتگو کیا کرتے تھے اور اس وقت تو ان کے مقابل اسداللہ تھے اس لیے وہ اور بھی سنبھل کر منتخب الفاظ میں گفتگو کررہے تھے۔

''جولیٹ کی زبانی ہم یہاں کے ماحول اور آپس کے خلوص سے واقف ہیں اور اندازہ لگا سکتے ہیں کہ واقعی آپ لوگ ان کے لیے بہت پریشان ہوں گے۔ یہ جولیٹ کی نادانی تھی کہ وہ آپ کو مطلع کیے بغیر ہمارے پاس آگئیں۔ اصل میں وہ والدین کے علاوہ اپنے کسی عزیز یا رشتے دار سے واقف نہیں تھیں۔ ان پر اچانک یہ انکشاف ہوا کہ اس دنیا میں ان کے کچھ قریبی عزیز موجود ہیں تو وہ جذباتی ہوگئیں اور عجلت میں ہم سے ملنے آپہنچیں۔ بہرحال آپ اور دیگر اہلِ محلہ اطمینان رکھیے کہ وہ بالکل خیروعافیت سے اور خوش وخرم ہیں، وہ یہاں آکر آپ سب لوگوں سے ملاقات کی خواہش مند تھیں لیکن آج کل ہندوستان کے جو حالات ہیں ان سے آپ بھی واقف ہی ہیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر ہم نے مناسب نہیں سمجھا کہ انہیں سفر پر اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوں۔ حالات کو تھوڑا سنبھلنے دیجیے پھر انشاء اللہ جولیٹ ضرور آپ سب سے ملاقات کے لیے تشریف لائیں گی۔'' اسداللہ نے نپے تلے انداز میں غلامو چاچا کو ایک ساتھ ہی مکمل جواب دے ڈالا۔ اپنے جواب میں انہوں نے جولیٹ سے اپنے تعلق کی وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا اور ان کی بارعب شخصیت کے آگے غلامو چاچا کی ہمت نہیں ہوسکی تھی کہ وہ ان سے کوئی سوال کرسکیں۔ ان کے درمیان خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا پھر اسداللہ ہی نے دوبارہ گفتگو کا سلسلہ جوڑا اور بولے۔

''جولیٹ کی زبانی ہمیں ربن دادا نامی ایک صاحب کا علم ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اہلِ محلہ کے علاوہ جوزف اور جوزفین کے انتقال کے بعد جس شخص نے ان کا بہت زیادہ خیال رکھا، وہ ربن دادا تھے۔ کیا ان صاحب سے ہماری ملاقات ممکن ہوسکے گی؟'' اسداللہ بہت سلیقے سے اپنے اصل مدعا تک پہنچے۔ ان جیسی حیثیت کے شخص کے لیے ممکن ہی نہ تھا کہ براہِ راست کسی اڈے پر جا اترتے اور وہاں محب اللہ عرف فاروق کے بارے میں دریافت کرتے، اسی لیے یہ طریقہ کار اپنایا تھا۔

''جولیٹ بیٹی نے آپ کو ربن دادا کے بارے میں بالکل درست بتایا ہے۔ واقعی اس شخص نے مشکل وقت میں اہلِ محلہ سے زیادہ جولیٹ کا خیال رکھا تھا۔ صرف جولیٹ ہی کی بات نہیں ہے، اس محلے کے اور بھی لوگ اس کے احسان مند ہیں۔ کہنے کو وہ ایک اڈے کی چوکی پر بیٹھنے والا دادا ہے لیکن اس کے کردار و اخلاق کے سب قائل ہیں اور محلے میں کسی کو اس سے یا اس کے اڈے کے کسی مرد سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ آپ اس سے ملاقات کرتے تو جان پاتے کہ اصل میں وہ کتنا شاندار انسان ہے لیکن افسوس کہ میں اس ملاقات کا انتظام کرنے سے قاصر ہوں۔'' غلامو چاچا کے جواب نے اسداللہ کو تشویش میں مبتلا کردیا۔

''کیوں؟'' بے ساختہ ہی ان کے ہونٹوں سے یک لفظی سوال پھسلا۔

''آج صبح سویرے ہی اڈے پر پولیس نے چھاپا مارا ہے اور اڈے کے زیادہ تر افراد کو اپنے ساتھ گرفتار کرکے لے گئے ہیں۔ صرف چند لوگ جو اہلِ محلہ کے تعاون سے روپوش ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے، باقی بچے ہیں۔ ان افراد کی زبانی ہی ہمیں یہ علم ہوا ہے کہ چھاپے کے وقت دادا اڈے پر موجود نہیں تھا۔ وہ صبح سورج نکلنے سے بہت پہلے ہی تنہا کہیں چلا گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ کیوں اور کہاں گیا تھا، اس کی کسی کو خبر نہیں ہے لیکن اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فی الحال وہ اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ اڈے کو پولیس والوں نے بند کرکے باہر اپنا ایک سپاہی کھڑا کردیا ہے۔ جس وقت آپ تشریف لائے، وہ سپاہی قریبی ہوٹل میں کھانا کھانے گیا ہوا تھا اس لیے آپ کی نظر میں نہیں آیا ہوگا، ورنہ وہ کونے والی عمارت ہی تو ہے اڈے کی۔''

غلامو چاچا کے جواب نے اسداللہ کے دل کی دھڑکن بڑھا دی۔ متعدد گرفتاریوں کی صورت میں امکان تھا کہ فاروق بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل ہو۔ فاروق...... یعنی محب اللہ۔ ان کے اعلیٰ نسب خاندان کا چشم وچراغ...... کیا ستم تھا کہ وہ بمبئی کے ایک اڈے پر اتنے برسوں سے زندگی گزار رہا تھا اور اب عین ممکن تھا کہ وہ گرفتار ہوکر تھانے پہنچ چکا ہو۔ ان کی سات نسلوں میں بھی کسی کے ایسے حالات میں تھانے، کچہری کا منہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن یہ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ان کا

سب سے پیارا بھتیجا ایسی صورت حال سے دوچار ہو گیا تھا۔ رشتوں میں عدم توازن، اختیارات کے غلط استعمال اور انا پرستی نے مل کر یہ دن دکھایا تھا۔ اسد اللہ جو پہلے ہی اپنے دل پر بہت کچھ سہہ کر بیٹھے ہوئے تھے، پہلے دھچکے کے بعد خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گئے اور اپنے لہجے کے وقار کو قائم رکھتے ہوئے قدرے بے نیازی سے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

''ہم نے ربن دادا کے چہیتے ایک نوجوان فاروق کے بارے میں بھی سنا تھا۔ کیا گرفتار ہونے والوں میں وہ بھی شامل ہیں؟''

''نہیں۔ فاروق استاد گرفتار نہیں ہوا۔ اسے تو کچھ دنوں سے اڈے پر دیکھا ہی نہیں گیا۔ اصل میں وہ نوجوان اڈے کے دیگر لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ اسے اِدھر اُدھر بلاوجہ کبھی گلی کوچوں میں گھومتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ کبھی کبھار ہاتھ میں کتابیں لیے لائبریری آتا جاتا ہی دکھائی دیتا تھا۔ کسی حادثے میں زخمی ہو گیا تھا تو دادا نے ڈاکٹر کے مشورے پر اسے آرام کے لیے شملہ بھیج دیا تھا۔ کافی عرصہ وہ شملہ میں ہی رہا۔ واپس آنے کے بعد بھی کم کم ہی دکھائی دیتا تھا۔ آج کل کہاں ہے، مجھے معلوم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اڈے کے افراد کو علم ہو۔ جو لوگ گرفتار ہونے سے بچ گئے ہیں، ان میں سے ایک میرے گھر میں بھی موجود ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس سے آپ کی ملاقات کروا سکتا ہوں۔'' غلامو چاچا نے انہیں پیشکش کی۔ ان کے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔ فاروق تک پہنچنے کا اب یہی واحد راستہ نظر آرہا تھا اس لیے انہیں ہامی بھرنا ہی تھی۔

''میں اس آدمی کو یہاں لے آتا ہوں۔ آپ اس سے ملاقات کرلیں پھر کھانا تناول کرلیجیے گا۔ میرے غریب خانے پر جو کچھ موجود ہے، آپ کے لیے حاضر کردوں گا۔'' غلامو چاچا نے عاجزی سے کہا۔

''براہِ مہربانی کھانے کا تکلف مت فرمایئے۔ کھانا ہم نے راستے میں ہی کھا لیا تھا۔ ہمیں یہاں اپنے کچھ اہم کام نمٹانے ہیں، وہ نمٹالیں تو واپسی کا قصد کریں گے۔ آپ بس مذکورہ شخص سے ہماری ملاقات کروادیں، اسی کو ہم اپنی خاطر مدارت تصور کریں گے۔'' اسد اللہ کا انداز مہذب لیکن حتمی تھا۔ غلامو چاچا مزید اصرار کی جرأت بھی نہیں کرسکے اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے صرف اتنا بولے۔

''میں ابھی اسے حاضر کرتا ہوں، بس ذرا سا انتظار فرمایئے۔'' اسد اللہ جواب میں سر ہلا کر رہ گئے۔ ذرا سا انتظار بھی ایک امتحان تھا لیکن انہوں نے ساری زندگی امتحان ہی تو دیے تھے تو پھر ایک اور سہی۔

☆☆☆

ہوٹل کے کمرے میں بستر پر پڑے فاروق کا اندرون غم، غصے اور انتقام کی آگ سے تپ رہا تھا۔ ربن کا زخموں سے چُور چُور بدن اس کی نگاہوں سے ہٹتا ہی نہیں تھا، بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ ربن نے اس کی نگاہوں کے سامنے اپنی زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں لیکن پھر بھی دل کو اس کے جانے کا یقین نہیں آتا تھا۔ وہ بھلا ایسے کیسے جاسکتا تھا؟ وہ جو اتنا شاندار تھا، جس کی بہادری میں کوئی کلام نہیں تھا، جس کی پھرتی، مشاقی اور مہارت کی سب مثالیں دیتے تھے، جو وقت سے پہلے خطرے کو بھانپ لینے کی حس رکھتا تھا، جسے مخالف کو زیر کرلینے کا ہر ہنر آتا تھا، جو راہ چلتوں کو اپنا گرویدہ بنالیتا تھا، جو دل اور دماغ دونوں پر حکمرانی کا گر جانتا تھا..... وہ موت کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہوا تو بھلا کیسے ہوا تھا؟ ربن کے جانے نے اسے عجیب عالمِ تحیر میں دھکیل رکھا تھا حالانکہ یہ فطرت کا طے شدہ اصول ہے کہ جو اس دنیا میں آیا ہے، اسے اپنے مقررہ وقت پر لوٹ کر جانا ہی ہے لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا جانا ان کے پیچھے رہ جانے والوں کے لیے قبول کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ربن بھی انہی نایاب لوگوں میں سے ایک تھا۔ قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ ایسا قیمتی آدمی جس کے مرنے کی خبر اس کے پچھلوں کو ملتی تو آدھے بمبئی میں کہرام مچ جاتا، اس خاموشی سے چلا گیا تھا کہ سوائے فاروق کے کسی کو خبر ہی نہیں ہوسکی تھی۔ اسے بھی کوئی ان دیکھی ڈور باندھ کر ربن تک لے گئی تھی۔ یہ تعلقِ خاص ہی تھا جو قدرت نے خود اس کے ربن تک پہنچنے کا انتظام کردیا تھا ورنہ وہ تو لندن کے لیے روانہ ہوچکا ہوتا۔ اسے لگتا تھا کہ اسے خاص طور پر ربن کا زخم زخم وجود دکھایا گیا ہے اور اب اس پر قرض ہے کہ وہ ربن کے ہر زخم کا حساب لے۔

حساب اسے ہر حال میں لینا تھا لیکن پہلے وہ ربن کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس کام کے لیے اسے کیتھرائن کی طرف سے سبز بتی دکھائے جانے کا انتظار تھا۔ کیتھرائن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ربن کی لاش رازداری سے اس کے حوالے کرنے کا انتظام کرکے اسے اطلاع دے دے گی چنانچہ وہ کانٹوں پر لیٹا اس کی آمد کا انتظار کررہا تھا۔ غم نے اس کے جسم کو یوں نچوڑ لیا تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھنے کا بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ بستر پر لیٹے کتنی مدت

گزری اس کے پاس کوئی حساب نہیں تھا لیکن محسوس یہی ہوتا تھا کہ وہ صدیوں سے انتظار کی کیفیت میں ہے۔ خدا خدا کر کے یہ کڑا وقت گزرا اور دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز ابھری۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کیتھرائن کو ہوٹل پہنچ کر اسی بیرے سے ملنے کی ہدایت کی تھی جس نے اسے یہاں کمرا دلوایا تھا۔ بیرے کو بھی اس نے کیتھرائن کی متوقع آمد کے بارے میں آگاہ کر کے سختی سے تاکید کی تھی کہ اس کی مہمان کی آمد کے علاوہ کسی بھی سلسلے میں اسے قطعی ڈسٹرب نہ کیا جائے چنانچہ دستک کا ایک ہی مطلب تھا کہ کیتھرائن آچکی ہے۔ اس نے دروازہ کھولا تو اس کے خیال کی تائید بھی ہوگئی۔ کیتھرائن کو اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے اس نے پیچھے کھڑے بیرے کو کسی بھی قسم کے سوال جواب کا موقع دیے بغیر ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا اور فوراً ہی دروازہ بند کرلیا۔ کیتھرائن کے ہاتھ میں نائیلون کے تار سے بنی ہوئی ایک ڈھکن دار ٹوکری تھی۔ اس نے ٹوکری میز پر رکھی اور خود بستر کے مقابل رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا؟ تم نے انتظام کیا؟'' فاروق نے کھڑے کھڑے ہی بے تابی سے پوچھا۔

''آپ آرام سے بیٹھیں۔ میرے پاس آپ کو بتانے کے لیے بہت سی باتیں ہیں۔'' کیتھرائن نے نرمی سے کہتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بادل ناخواستہ اس کے سامنے بستر پر بیٹھ گیا۔

''اب بتاؤ کیا بات ہے؟ تم نے دادا کو میرے حوالے کرنے کا انتظام کرلیا ہے نا؟''

''ریلیکس فاروق بھائی! میں بتا رہی ہوں۔ یہ اتنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ مجھے اس سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لینا پڑ رہا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ دادا کے کمرے میں ڈیوٹی دینے والے اسٹاف میں سے کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا ورنہ پولیس کو مخبری کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ میں نے اس کام کے لیے ڈاکٹر پرکاش سے ریکویسٹ کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر پرکاش دادا کو بہت پسند کرتا تھا۔ اسے خود بھی دادا کی ڈیتھ کا افسوس ہوا ہے اور وہ آپ کی پوزیشن سمجھتے ہوئے ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوگیا ہے۔ اس نے پرامس کیا ہے کہ وہ مردہ خانے کے کیئر ٹیکر کو آج رات لاش وہاں سے ٹرانسفر کرنے کا آرڈر دے دے گا لیکن لاش کو اسپتال سے لے جانے اور آگے کی ساری ذمے داری آپ کی اپنی ہوگی۔ اب آپ سوچ لیں کہ آپ اس سلسلے میں کیا اور کیسے ارینج کریں گے۔''

کیتھرائن نے پوری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔

''میں سب کرلوں گا، تم بتاؤ کہ مجھے کتنے بجے تک اسپتال پہنچنا ہوگا؟'' فاروق نے اس سے دریافت کیا۔

''رات گیارہ بجے۔ اس ٹائم پر اسپتال میں زیادہ چہل پہل نہیں رہتی۔'' کیتھرائن نے اسے بتایا۔

''تم نے کہا تھا تمہارے پاس مجھے بتانے کے لیے بہت سی باتیں ہیں تو کیا اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے؟'' کیتھرائن کے انداز سے فاروق کو اس کے کہے ابتدائی الفاظ یاد آئے۔

''جی ہاں، آج میں نے بہت بھاگ دوڑ کی ہے اور آپ کے لیے بہت سی کام کی باتیں جمع کر کے لائی ہوں لیکن پہلے ہم کھانا کھائیں گے۔ میں نے کل رات کے کھانے کے بعد سے کچھ نہیں کھایا، اس لیے آتے ہوئے کھانا ساتھ لے کر آئی ہوں کہ آپ کے ساتھ مل کر کھالوں گی۔ آئی ایم شیور کہ آپ نے بھی کچھ نہیں کھایا ہوگا۔'' وہ اٹھ کر میز پر رکھی اپنے ساتھ لائی ہوئی ٹوکری کھول کر اس میں سے سامان نکالنے لگی۔

''تم کھالو کھانا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' فاروق نے انکار کیا۔

''کھانا چھوڑنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کو زندہ رہنا ہے اور دادا کے لیے کچھ کرنا ہے تو کھانا کھانا ہی پڑے گا۔'' کیتھرائن نے اپنے ہاتھوں کی حرکت روکے بغیر ایک جملے میں اس کے سامنے زمینی حقائق رکھ دیے تو وہ اس چھوٹی سی لڑکی کے سامنے مزید کچھ نہیں کہہ سکا۔ کھانا بہت سادہ تھا۔ ماش کی بھنی ہوئی دال، دہی کا رائتا اور چپاتیاں۔ اس نے کھانا، کھانا شروع کیا تو پہلا لقمہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ کیتھرائن نے اسے پانی کا گلاس پیش کیا۔ اس نے مشکل سے پانی کے گھونٹ کے ساتھ نوالہ حلق سے نیچے اتارا۔ اس نے کڑوی روٹی کا ذکر سنا تھا اور آج اس حقیقت کو محسوس کر رہا تھا کہ کسی پیارے کے جانے کے بعد جو پہلا کھانا حلق سے نیچے اتارا جاتا ہے، وہ واقعی کتنا کڑوا لگتا ہے۔ وہ بہت کوشش کے باوجود بھی آدھی روٹی سے زیادہ نہیں کھا سکا۔ کیتھرائن نے بھی مزید اصرار نہیں کیا۔ حقیقتاً اس نے خود بھی بہت کم کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے تیزی سے برتن سمیٹ کر واپس ٹوکری میں رکھے اور فاروق کے سوال کے بغیر خود ہی اسے بتانے لگی۔

''شملہ میں اسٹے کے ٹائم میں میری گولو سے بہت باتیں ہوئی تھیں۔ باتوں باتوں میں اس نے مجھے کچھ میرز

کے نام بھی بتائے تھے۔ میرے کو للیتا موسی کا نام یاد تھا۔ میں ہاسپٹل سے نکل کر موسی سے ملنے گئی تاکہ اس سے ساری چویشن معلوم کروں۔ ادھر ان ایکس پیکیڈ لی گولو مل گیا۔ بہت روتا تھا اور سب کو سپیشلی تمہیں اور دادا کو یاد کرتا تھا۔ میں نے سمجھا بجھا کر اسے چپ کروایا اور راضی کیا کہ وہ ابھی موسی کے گھر پر ہی چھپا رہے۔ بعد میں، میں موقع دیکھ کر اسے فاروق بھائی سے ملوادوں گی۔ موسی سے میری بات ہوئی تو اس نے مجھے بتایا کہ اڈے کے تین چار لوگ اور ایسے ہیں جو مختلف گھروں میں چھپے ہوئے ہیں اور موقع دیکھ کر انہیں وہاں سے نکالا جاسکتا ہے لیکن پرابلم یہ ہے کہ وہ نکل کر کہاں جائیں گے اس لیے ابھی وہیں دبکے ہوئے ہیں۔ گولو نے بتایا کہ آج کل دادا کی پولیس کے ساتھ ان بن چل رہی تھی، شاید اسی واسطے پولیس نے اڈے پر ریڈ کیا۔ دادا اندھیرے اڈے سے نکل کر کدھر کو گیا تھا، اس کا گولو کو بھی نہیں معلوم تھا۔ میں ادھر سے نکل کر دینو تانگے والے کے پاس گئی۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا اور کچھ بتانے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ میرے بہت انسسٹ کرنے پر اس نے بتایا کہ دادا کو اس نے بندرگاہ جانے والی روڈ سے اٹھایا تھا۔ انہوں نے تھوڑا فاصلہ طے کیا تھا کہ انہیں تین گاڑیوں نے گھیر لیا۔ ان میں سے دو ٹیکسیاں اور ایک پولیس کی گاڑی تھی۔ گھیرے جانے پر دادا نے دینو کو ادھر سے بھاگ جانے کو کہا لیکن دینو کا تانگا اور گھوڑا ادھر ہی تھا، تھوڑی اس کو جانکاری کی بھی لگن تھی اس لیے وہ زیادہ دور بھاگنے کے بجائے ایک جگہ چھپ کر سب دیکھتا رہا۔ اس نے بتایا کہ دادا اکیلا ہی درجن سے اوپر لوگوں سے بہت بریولی لڑا پر پولیس والے کی چلائی ہوئی گولی نے اسے ڈھا دیا۔ وہ گرا تو پھر بزدلوں نے اسے چھاپ لیا اور بہت ظلم کیا۔ وہ شاید دادا کو مرا ہوا سمجھ کر چلے گئے تھے لیکن دینو نے چیک کیا تو اس کی سانس باقی تھی۔ اس نے ترس کھا کر اپنے تانگے میں اسے اسپتال پہنچا دیا۔''

کیتھرائن اسے تفصیلات سناتی جارہی تھی اور اس کا ذہن ایک نکتے پر اٹک گیا تھا۔ ربن کو بندرگاہ والی روڈ سے دینو نے اٹھایا تھا۔ ربن اس وقت اس روڈ پر کیوں موجود تھا اس بات کو فاروق سمجھ سکتا تھا۔ وہ یقیناً فاروق پر الوداعی نگاہ ڈالنے بندرگاہ پہنچا تھا۔ ملاقات یوں نہیں کی تھی کہ اسے اندیشہ ہوگا کہ کہیں اس کی وجہ سے فاروق نظروں میں نہ آجائے۔ ایسی محبت اور اتنی احتیاط ربن ہی کر سکتا تھا۔ فاروق کو بندرگاہ پر اپنی کیفیت بھی اچھی طرح یاد تھی۔ جہاز پر سوار ہوتے ہوئے اس کا دل بمبئی کی زمین سے لپٹا جاتا تھا اور نگاہیں ہر سو اپنے کسی پیارے کی صورت کو تلاشتی تھیں۔

کتنی بار اسے لگا تھا کہ لوگوں کے ہجوم میں کہیں ربن بھی موجود ہے لیکن اس کی آنکھوں کو وہ دکھائی نہیں دیا تھا، ہاں دل نے اس کی موجودگی کے اشارے ضرور دیے تھے لیکن اس وقت وہ کہاں کچھ سمجھ سکا تھا۔ دل کی بے قراری، بے چینی اور اضطراب کو کوئی معنی دینا اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہوا تھا اور جو معنی نکلے تھے، وہ تو اس کے دھیان میں آ ہی نہیں سکتے تھے۔ بھلا وہ کیسے سوچ سکتا تھا کہ آج کا سورج ربن کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے طلوع ہوا ہے۔

''آپ میری بات سن رہے ہیں نا فاروق بھائی؟''
کیتھرائن نے اس کی گم صم کیفیت کو محسوس کیا تو باقاعدہ پکار کر اس سے پوچھا۔

''تم بولو کیتھی، میں سب سن رہا ہوں بلکہ تم یہ بتاؤ کہ کیا دینو، دادا پر حملہ کرنے والوں میں سے کسی کو پہچانتا تھا۔ وہ تانگے والا ہے اور ایسے لوگ اچھے برے بہت سے لوگوں سے واقف ہوتے ہیں۔'' فاروق نے اس سے ایک اہم سوال کیا جس پر کیتھرائن نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور بولی۔

''دینو ان میں سے ایک ٹیکسی والے کو پہچانتا تھا۔ اس کا نام رمیش ہے۔ دینو کا کہنا تھا کہ رمیش کے بارے میں بھی کچھ ایسا ویسا سننے کو نہیں ملا پر پتا نہیں کیوں وہ کچھ عجیب سا آدمی لگتا ہے۔ دینو نے دو نام اور بتائے ہیں۔ اس نے یہ نام دادا کی زبان سے سنے تھے۔ اس نے بتایا کہ پولیس آفیسر کو دادا نے راٹھور کے نام سے پکارا تھا اور اس کے ساتھ جو کالا سا موٹا، ٹھگنا آدمی تھا اسے دادا مجو بولتا تھا۔''

کیتھرائن اس کے لیے بڑی اہم اطلاعات ڈھونڈ کر لائی تھی۔ اسے اپنے جن دشمنوں پر شک تھا ان کے ناموں کی تصدیق ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ چند نام اور بھی سامنے آگئے تھے اور یہ طے تھا کہ نیا پرانا کوئی بھی دشمن اب اس سے بچنے والا نہیں تھا۔ وہ لاکھ امن پسند، خون خرابے سے دور رہنے اور عفو و درگزر سے کام لینے والا آدمی تھا لیکن ربن دادا کا ایسا بہیمانہ قتل کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دادا کا خون معاف کر دیتا تو اس کی محبتوں کا قرض کیونکر ادا ہو پاتا۔ اس کے خیالات کا عکس اس کے چہرے پر بھی آ رہا تھا اور کیتھرائن خوف زدہ نظروں سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی۔

''آپ کیا کرنے والے ہیں فاروق بھائی؟ کیا آپ ان لوگوں سے بدلہ لیں گے؟'' اس کا خوف سوال بن کر

ہونٹوں پر آ گیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے مجھے کیا کرنا چاہیے؟" اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے فاروق نے تیز لہجے میں اس سے پوچھا تو ایک پل کے لیے وہ گڑبڑا گئی اور پھر خود کو سنبھال کر بولی۔

"فیصلہ تو آپ ہی کو کرنا ہے، میں تو بس یہ کہہ سکتی ہوں کہ جو کرنا ہے دیکھ بھال کر کریں۔ مسلم کمیونٹی کے لیے آج کل حالات پہلے ہی بہت سخت ہیں۔ مسلم آبادی پر حملے کیے جا رہے ہیں۔ جو لوگ یہاں سے نکلنا چاہ رہے ہیں، انہیں نکلنے نہیں دیا جا رہا۔ پھر اڈے سے جانے پولیس کی کیا دشمنی ہوگئی ہے کہ یوں ایک دن میں انہوں نے سب الٹ ڈالا ہے۔ آپ بھی اڈے سے تعلق رکھتے ہیں، اگر آپ کے بارے میں پولیس کو خبر ہوگئی تو وہ لوگ آپ کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔" کیتھرائن بہت سمجھ دار لڑکی تھی اور فاروق کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی اس لیے اس سے یہ نہیں بولی کہ انتقام کی راہ پر مت چلو لیکن اسے حالات کی نزاکت کا احساس ضرور دلایا۔

"ڈونٹ وری کیتھی۔ میں خود بھی ان سب باتوں کو سمجھتا ہوں اور اندھا دھند کچھ نہیں کرنے والا۔ ابھی تو ویسے بھی سب سے پہلے مجھے دادا کی تدفین کا انتظام کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی میں کچھ اور سوچوں گا۔" فاروق نے اسے تسلی دی۔ اپنے رویے سے وہ خود کو پرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی بے تحاشا سرخ آنکھیں اس کے اندر دہکتے آتش فشاں کا عکس بنی ہوئی تھیں۔ اس آتش فشاں سے لاوا نکلتا تو کس کس کو جلا کر راکھ کرتا، ابھی کچھ معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

"کیا نام ہے آپ کا؟" اسد اللہ نے اپنے سامنے بیٹھے شخص سے پوچھا۔

"وسجے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ حالات بہت مخدوش تھے۔ اڈے پر پہلی بار اس طرح پولیس کا چھاپا پڑا تھا کہ پہلے سے تھانے سے کوئی خبر نہیں آئی تھی اور پولیس والے آنکھیں بالکل ماتھے پر رکھے وہاں پہنچے تھے۔ اڈے کی عمارت میں موجود افراد میں سے تو کم ہی کسی کو نکل بھاگنے کا موقع ملا تھا جو لوگ علاقے میں اِدھر اُدھر پہرا دے رہے تھے، وہی نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ پولیس سے براہ راست تصادم کی حکمتِ عملی کبھی بھی اختیار نہیں کی گئی تھی اس لیے علاقے میں پولیس کی آمد کی خبر ہو جانے پر بھی پہرے پر موجود لوگوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا اور حالات خراب ہوتے دیکھ کر اِدھر اُدھر ہوگئے تھے۔ وسجے اڈے کے قریب ہی موجود تھا اور ایک آڑ میں چھپ کر صورت حال کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ پولیس والے اڈے کے لوگوں سے بڑی بے دردی سے پیش آئے تھے۔ ان کی لاٹھیاں اور بید بے دریغ برستے رہے تھے اور زبانیں فراٹے سے گالیاں بک رہی تھیں۔ اڈے سے کئی لوگوں نے گھبرا کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن زیادہ تر پکڑے گئے۔ صرف چند ایک کے حصے میں ہی کامیابی آئی اور انہیں اہلِ محلہ نے اپنے گھروں کے دروازے کھول کر اپنی پناہ میں لے لیا۔

آڑ میں چھپے وسجے کے پاس بھی کسی گھر میں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ غلامو چاچا کے گھر کے قریب ہی چھپا ہوا تھا اس لیے ان کے کھلے دروازے سے اندر چلا گیا۔ چاچا نے اس سے کہا تھا کہ معاملہ ٹھنڈا ہونے تک وہ یہیں پڑا رہے۔ چارو ناچار اسے راضی ہونا پڑا اور اب چاچا ہی اس کے پاس یہ اطلاع لایا تھا کہ ایک نہایت معزز آدمی جولیٹ کے قریبی عزیز کی حیثیت سے اس کے گھر میں آکر ٹھہرا ہے اور رین دادا اور فاروق کو پوچھتا ہے۔ وہ دونوں تو موجود نہیں تھے اس لیے وہ آدمی اڈے کے کسی اور فرد سے ملنا چاہتا تھا۔ غلامو چاچا کی سفارش اور تجسس کی وجہ سے وہ اس ملاقاتی سے ملنے کے لیے راضی ہوگیا تھا اور منہ ایک چادر میں چھپائے غلامو چاچا کے ساتھ جولیٹ کے گھر آگیا تھا جہاں اسد اللہ اس کے منتظر تھے۔ ان کی شخصیت کی دلکشی اور رکھ رکھاؤ اور وقار نے وسجے کو بھی متاثر کیا لیکن ساتھ ہی وہ محتاط بھی تھا۔

"آپ کتنے عرصے سے رین دادا کے ساتھ منسلک ہیں؟" اسد اللہ نے اس سے دوسرا سوال کیا۔

"کیا ہیں؟" وسجے کی سمجھ میں لفظ "منسلک" نہیں آیا چنانچہ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ اس کے لیے تو اسد اللہ کے "آپ جناب" ہی ایک اجنبی چیز تھے اوپر سے ایسی مرصع اردو...... وہ تو شپٹا ہی گیا۔

"ہمارا مطلب ہے کہ آپ کتنے عرصے سے دادا کے ساتھ رہ رہے ہیں؟" اسد اللہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ بمبئی کے ایک غنڈے سے جن الفاظ میں گفتگو کر رہے ہیں، وہ اس کے لیے ناقابلِ فہم ہیں چنانچہ سادہ الفاظ میں اپنا سوال دہرایا۔

"جب سے ہوش سنبھالا ہے دادا کے ٹکڑوں میں ہی پڑے ہیں۔ تم کاہے کو پوچھتے ہو؟" جواب دینے کے ساتھ

وقت

چاہتوں کے دل فریب گداز میں پل پل رنگ بدلتی فسوں خیز کہانی...... ماں پر ہونے والے اندوہناک ظلم کا انتقام لینے پر تلا ہوا نوجوان اندر کی شرر بار آگ میں جل رہا تھا۔ اسے حالات نے قہر بار اور صف شکن بنا دیا تھا۔ ظلم کی چنگاریاں اس کے وجود میں ہولناک شعلوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ وہ دشمنوں کو خاک و خون میں نہلا کر ساری رکاوٹوں کو روندتا جا رہا تھا پھر اس کی شناسائی ایک سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دوشیزہ سے ہوئی اور کیوپڈ کا تیر چل گیا۔ عزت سے رسوائی اور پھر سرخ روئی کے اس روح فرسا سفر میں وقت اس کے ساتھ تھا۔

سنسنی اور تحیر میں لپٹی دل گداز داستان

بہت جلد

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

کے صفحات پر ملاحظہ کریں

ہی وجے نے ایک سوال بھی جڑ دیا۔

''اصل میں ہم فاروق کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ آپ اتنے عرصے سے دادا کے ساتھ ہیں تو یقیناً جانتے ہوں گے کہ فاروق کب اور کیسے اڈے پر پہنچے؟'' اسد اللہ نے بات آگے بڑھائی۔

''تم کاہے کو پوچھتے ہو؟ تمہارا کیا سمبندھ ہے فاروق بھائی سے؟'' وجے نے اس بار بھی الٹا سوال کر ڈالا۔

''تعلق کی تلاش میں ہی تو یہاں تک آئے ہیں۔ جولیٹ نے ہمیں ان کے متعلق کچھ ایسی اطلاعات دی ہیں کہ ہمیں ان پر اپنے ایک بچھڑے ہوئے عزیز کا گمان ہوتا ہے۔ ہم اپنے اس گمان کی تصدیق کے لیے ہی یہاں تک آئے ہیں۔'' اسد اللہ کا لہجہ حسرت زدہ ہو گیا۔ ان کا اندازِ گفتگو وجے کے لیے اب بھی اتنا سہل نہیں تھا لیکن اس نے مفہوم سمجھ لیا تھا اور اب غور سے اسد اللہ کو دیکھ رہا تھا۔ روشن چہرہ، واضح نقوش، اجلی ہوئی شفاف آنکھیں...... یہ سب اتنا اجنبی تو نہیں تھا۔ اسے اسد اللہ کے چہرے کے پیچھے سے فاروق کا چہرہ جھانکتا ہوا محسوس ہوا۔ چمکتی ہوئی فراخ روشن پیشانی جو فاروق کے کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق کی گواہی دیتی تھی، اس اجنبی مہمان سے کتنی مشابہ تھی۔

''آپ نے ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' وجے ان کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسد اللہ نے اپنا سوال دہرایا۔

''یہی کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ سال پہلے دادا فاروق استاد کو اڈے پر لایا تھا۔ اس ٹیم وہ ایک خاموش اور تھوڑا ڈرا سہما پندرہ سولہ سال کا لونڈا ہوگا۔ دادا بولتا تھا اسے اس کے گھر واپس بھجوا دے گا پر فاروق استاد نے کبھی زبان ہی نہیں کھولی کہ اس کے پچھلے کون ہیں بس پھر وہ ادھر اڈے پر ہی رہ گیا اور ہم سب نے اسے اپنا مان لیا۔ دادا کی تو جان ہے اس میں، بالکل سگے بیٹے کے ماپھک چاہتا ہے اسے۔'' وجے جواب تک اختصار سے کام لے رہا تھا یکدم ہی کھل گیا۔ اس کی فراہم کردہ معلومات پر اسد اللہ کا دل پرجوش ہو کر دھڑکنے لگا۔ وقت اور فاروق کی عمر کا تعین ایسا تھا کہ خودبخود ہی اس بات کی تصدیق ہو رہی تھی کہ فاروق ہی اصل میں ان کا بچھڑا ہوا محب اللہ ہے۔

''کیا آپ اس تصویر کو دیکھ کر تصدیق کر سکتے ہیں کہ یہ فاروق ہی ہے یا نہیں؟'' اسد اللہ نے قریب رکھے لفافے سے وہی بلیک اینڈ وائٹ تصویر نکال کر وجے کے سامنے کی جس میں تیرہ چودہ سالہ فاروق کھیل کے لباس میں آنکھوں میں چمک اور اعتماد لیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وجے نے تصویر ہاتھ میں لے کر اس پر ایک نظر ڈالی اور بے ساختہ ہی بولا۔

''یہی تو ہے اپن کا فاروق استاد۔ اپنے کو اس کے لڑکپن کی شکل اچھی طرح یاد ہے۔ دادا جب اسے اڈے لایا تو وہ اس فوٹو سے سال دو سال ہی بڑا ہوگا۔''

''یہ فاروق نہیں۔ ہمارے خاندان کے چشم و چراغ، ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور محب اللہ ہیں۔ ہم ان کے حقیقی چچا ہیں اور انہی کی جستجو میں یہاں پہنچے ہیں۔ محب اللہ کے والدین اور دیگر اہلِ خانہ برسوں سے ان کے فراق میں تڑپ رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں بتائیے کہ محب اللہ کہاں ہیں؟ وہ برسوں پہلے ناراض ہو کر حویلی سے نکل گئے تھے، ہم انہیں منا کر واپس لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ بہت برس گنوا دیے انہوں نے اپنی ضد میں۔ اب انہیں ہمارے ساتھ واپس اپنے اصل کی طرف جانا ہوگا۔ بتائیے کہاں ہیں محب اللہ؟'' اسد اللہ کا ضبط جواب دے گیا اور وہ وجے کے روبرو انکشافات کرتے چلے گئے۔ ہونق سا وجے پہلے تو اس شاندار شخص کو دیکھتا رہا جس کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی امڈ آئی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ وہ شخص اس سے کوئی جواب سننے کا منتظر ہے۔ اس کے پاس کوئی بہت خوش کن جواب نہیں تھا لیکن جواب تو دینا ہی تھا اس لیے پہلے ذرا سا گلا کھنکھارا پھر بولا۔

''فاروق استاد کو تو دادا نے لندن بھجوا دیا۔ اپنے کو زیادہ جانکاری نہیں پر اتنا پتا ہے کہ ادھر فاروق استاد کے لیے خطرہ تھا اس لیے دادا نے اسے لندن بھجوا دیا۔ وہ کب کیسے اور کس کے ساتھ گیا یہ سب باتیں دادا ہی جانتا ہے لیکن دادا خود گائب (غائب) ہے اور اپنے پر بڑا کشٹ سے پڑا ہے۔ آپ اوپر والے سے بنتی کرو کہ یہ سے ٹل جائے تو اپن آپ کی کچھ مدد کر سکے گا۔'' فاروق کے محب اللہ ہونے کی تصدیق نے اسد اللہ کو جتنی خوشی بخشی تھی، وہ اس کی لندن روانگی کا سن کر ماند پڑ گئی۔ ساتھ ہی اس تشویش نے بھی گھیر لیا کہ جانے محب اللہ یہاں کن خطرناک کاموں میں ملوث رہا ہے کہ اسے جان بچا کر لندن بھاگنے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ بہرحال سب باتوں پر یہ ایک تسلی بھاری تھی کہ ان کا محب اللہ زندہ ہے اور آدمی زندہ ہو تو ملنے کی امید بھی قائم رہتی ہے۔

''آپ ایسا کرو صاحب، ادھر اپن کو اپنا کوئی اتا پتا دے جاؤ۔ دادا سے مل کر اپنے کو جو بھی پتا لگے گا، اپن آپ کو اطلاع کر دیں گے یا اگر ابھی آپ ادھر ہی ہو تو تھوڑا انتظار

کرلو۔ اِدھر کے حالات ٹھیک ہوتے ہی آپ کو کوئی نہ کوئی خبر مل جائے گی۔'' وجے نے ان کی کیفیت دیکھتے ہوئے انہیں پیشکش کی۔ ایک تو اسد اللہ کی اپنی شخصیت پھر یہ انکشاف کہ وہ فاروق کے حقیقی چچا ہیں، وجے خود کو ان کا احترام کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔ عام حالات ہوتے تو وہ ابھی ربن کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا اور اسد اللہ سے اس کی ملاقات کروا دیتا لیکن وہ خود یہاں پھنسا ہوا تھا، وہ بھلا ان کے لیے کیا کرتا۔

''ہم یہاں بمبئی میں اپنے ایک دوست کا پتا دے دیتے ہیں۔ کچھ دن ہم ان کے گھر قیام کریں گے۔ اس عرصے میں اگر آپ کی اپنے داوا سے ملاقات ہوجائے تو آپ ہمیں مطلع کردیجیے گا۔ اگر ہم واپس بھی چلے گئے تو ہمارا دوست ہم سے رابطے کا انتظام کردے گا۔'' اسد اللہ نے فی الفور وہاں سے اپنے دوست ڈی سوزا کے گھر منتقل ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے وجے کو ہدایت دی۔

اس گھر میں آکر جہاں انہیں بہت اچھا لگا تھا، وہیں دل کو ایک بے قراری نے بھی گھیر لیا تھا۔ اس گھر کے چپے چپے سے جوزفین کی خوشبو آتی تھی اور یہاں کا سکون گواہی دیتا تھا کہ جوزفین نے بے شک یہاں من چاہی زندگی نہیں گزاری تھی لیکن یہاں اسے وہ سب ملا تھا جو اسد اللہ اپنی بڑی سی حویلی میں رہ کر بھی اسے نہ دے پائے تھے۔ یہ گھر جوزفین کی خوشبو ہی کا نہیں جوزف کی محبت، خلوص اور بے غرضی کا بھی امین تھا اور انہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس گھر میں رہ کر اس شخص کے معبد کدے میں دخل اندازی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ گھر جوزف کا تھا جہاں اس نے ساری زندگی جوزفین کو اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے گزاری تھی۔ انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ اس گھر میں رہ کر جوزف کی روح کو بے چین کرتے چنانچہ انہوں نے ڈی سوزا کے گھر منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وجے کے جاتے ہی انہوں نے اپنے ملازم شمس کو آواز دی اور اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ شمس تو تھا ہی حکم کا غلام۔ فوری طور پر جملہ سامان ٹیکسی میں منتقل کیا اور وہ لوگ ڈی سوزا کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

ڈی سوزا کے ملازم نے انہیں اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ اگلے ہی لمحے ڈی سوزا خود بھی وہاں پہنچ گیا اور بہت شدت سے انہیں بھینچ لیا۔ ہر ملاقات پر ڈی سوزا بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان کے گلے لگتا تھا لیکن آج اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ اسد اللہ کھٹک گئے۔

''کہاں تھے تم؟ میں نے سارے دوستوں سے پتا کرلیا لیکن تمہارا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ بمبئی آئے تھے تو سیدھے میرے گھر کیوں نہیں آئے؟'' ڈی سوزا نے ان سے شکوہ کیا لیکن وہ اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس الجھن میں پڑ گئے کہ ڈی سوزا کو ان کے بمبئی آنے کی خبر کیسے ہوگئی۔ انہوں نے ڈی سوزا سے بھی یہ سوال کر ڈالا۔

''وہ......'' ڈی سوزا تھوڑا ہچکچایا پھر بولا۔

''تمہارے بھائی جان صفی اللہ کا ٹیلی فون آیا تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ تم بمبئی آئے ہوئے ہو۔''

''بھائی جان کا فون...... بھائی جان کا ٹیلی فون کیوں آیا؟'' وہ مزید حیران ہوئے اور دل کو بے چینی ہونے لگی کہ کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگیا ہے ورنہ صفی اللہ کبھی اس طرح انہیں فون نہیں کیا کرتے تھے۔

''تم آرام سے بیٹھ جاؤ اور کچھ کھا پی لو پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔'' ڈی سوزا نے ان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ان کے شانے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر انہیں صوفے پر بٹھایا اور خود بھی ان کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ملازم چائے لا رہا ہوگا۔ تمہارے آنے کا سن کر میں نے پہلے ہی اسے چائے تیار کرنے کا کہہ دیا تھا۔'' اسد اللہ نے اس کی بات سن کر یونہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈی سوزا کی مہمان نوازی ایسی کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن اس کے انداز میں کوئی انوکھی بات تھی جو انہیں پریشان کر رہی تھی۔ چائے آئی تو اس کے ساتھ کئی لوازمات بھی موجود تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے ڈی سوزا بصد اصرار انہیں کھلاتا پلاتا رہا۔ انہوں نے بھی اس کا دل رکھنے کے لیے تھوڑا بہت چکھ لیا۔ ان کا دل ویسے ہی عجیب سی کیفیت میں تھا۔ جوزفین کے گھر میں گزرے وقت نے ان کے زخموں کو ادھیڑ دیا تھا، اس پر وہ محب اللہ سے ملاقات کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور اب ڈی سوزا کا اجنبی انداز انہیں بے چین کر رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ان سے گفتگو کرتے ہوئے اسے کوئی پریشانی لاحق ہے۔

''کیا بات ہے ڈی سوزا! آپ ہمیں پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟'' آخر کار انہوں نے براہِ راست اس سے دریافت کر ڈالا۔ ان کے سوال پر ڈی سوزا لحہ بھر کے لیے چپ ہوگیا پھر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے نہایت دل سوزی سے بولا۔

''آئی ایم سوری ٹو سے مائی فرینڈ! میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی نیوز نہیں ہے۔ میں تمہیں جو کچھ

بتانے جارہا ہوں، تمہیں سننے کے لیے بہت حوصلے سے کام لینا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ بھائی جان کا فون آیا تھا، کیا انہوں نے کچھ کہا ہے؟'' ڈی سوزا کی تمہید نے اسداللہ کی بے قراری کو بڑھا دیا۔

''بھائی جان صفی اللہ نے بہت بیڈ نیوز دی ہے۔'' ڈی سوزا نے اعتراف کیا۔

''کیسی نیوز؟'' اسداللہ حق دق رہ گئے۔

''تمہیں معلوم ہے نا آج کل ہندوستان کے کیا حالات چل رہے ہیں۔ ہندوستان کا Division ہونے کو ہے اور ہندو اور سکھ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح مسلمانوں کو اس جرم پر ڈسنے میں لگے ہوئے ہیں کہ انہوں نے اپنے رائٹس کے لیے آواز اٹھائی تو کیسے اٹھائی۔ مسلمان آبادیوں اور ہجرتی قافلوں پر ان کے بلووں کی خبر تمہیں بھی ہوگی۔ اس بار ان کی نفرت کی زد میں تمہارا خاندان اور حویلی آئی ہے۔ بھائی جان صفی اللہ بتارہے تھے کہ رات کے آخری پہر ہندو بلوائیوں نے حویلی پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ اور مسلح تھے۔ حویلی کے ملازمین اور مرد حضرات باوجود کوشش کے انہیں روکنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ انسانی جانوں کے زیاں کے علاوہ بلوائیوں نے لوٹ مار بھی کی اور حویلی کو آگ بھی لگادی۔ امداد آنے تک بہت زیادہ نقصان ہوگیا۔ بھائی جان صفی اللہ بتارہے تھے کہ وہ خود بھی بلوائیوں کے آتشیں اسلحے کی زد میں آگئے تھے۔ مگر یہ خیر رہی ہے کہ گولی ان کے شانے پر لگی جس سے وہ چکرا کر گر گئے اور ان کی جان محفوظ رہی' اب وہ نواب فراست بیگ کی حویلی میں پناہ گزیں ہیں اور تمہارے مشورے سے اگلا قدم اٹھانے کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔''

ڈی سوزا نے اس المناک واقعے کی اطلاع محتاط الفاظ میں ان تک پہنچائی۔ صفی اللہ انہیں بتاچکے تھے کہ اس واقعے میں ان کے اور پھپھی ندرت جہاں کے علاوہ حویلی کے جملہ افراد شہید ہوچکے ہیں لیکن وہ اسداللہ کو یہ بات نہیں بتاسکا۔

اسداللہ نے جتنی بات سنی تھی، اسے سن کر ہی گنگ بیٹھے تھے۔ وہ جو اپنے خاندان کے لیے خوشیاں لینے بمبئی آئے تھے، بھلا کیسے گمان کرسکتے تھے کہ ان کے پیچھے ان کے خاندان پر اتنی بڑی قیامت گزر جائے گی۔ ان کے خاندان کا حیدرآباد میں ایک نام، مقام اور مرتبہ تھا۔ لوگ ان کے خاندان کے افراد کو جھک کر سلام کرتے تھے اور اگر بیبیاں کسی ضرورت کے تحت حویلی سے باہر نکلتی تھیں تو احتراماً ان کی سواری کے راستے سے ہٹ جاتے تھے کہ پردہ دار بیبیوں کو پریشان نہ ہونا پڑے اور ڈی سوزا انہیں بتارہا تھا کہ بلوائی چادر و چاردیواری کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے زبردستی ان کی حویلی میں گھس گئے تھے اور وہاں کے در و دیوار کو خاک و خون میں نہلا دیا تھا۔ آخر کیسے ہوا تھا یہ سانحہ......؟ کیسے کسی کی ہمت ہوئی تھی کہ ان کے خاندان کو نظر اٹھا کر دیکھتا۔ ان کا خاندان تو وہ خاندان تھا جہاں سے ہندو اور مسلمان بلاتخصیص اپنی حاجتیں پوری کرتے تھے۔ حویلی کے وسیع دسترخوان پر ہر مذہب، نسل اور ذات برادری کے لوگ اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ حاجت مندوں کو جھولیاں بھر بھر کر دینے والے بھلا کیسے سوچ سکتے تھے کہ جواب میں احسان فراموشی سے کام لیا جائے گا لیکن انہیں سوچنا چاہیے تھا۔ بدلتے ہوئے حالات اور ہوا کے رخ کو پہچاننا چاہیے تھا، خاص طور پر اس وقت جب نواب سلیم اللہ اپنے دوست کے خاندان پر ہونے والے حملے میں زخمی ہونے کے بعد راہی ملک عدم ہوئے تھے۔ اس وقت اپنی سادہ لوحی میں ان لوگوں نے اپنے طور پر سمجھ لیا تھا کہ نواب سلیم اللہ اپنے دوست کے خاندان کے خلاف ہونے والی انتقامی کارروائی میں اتفاقی طور پر زد میں آگئے ہیں لیکن حقیقت تو اب کھل کر سامنے آرہی تھی۔ یہ صرف انتقام نہیں تھا۔ یہ وہ نفرت تھی جو مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے دلوں میں نہ جانے کتنے برسوں اور صدیوں سے پلتی چلی آرہی تھی اور اب موقع دیکھ کر وہ اپنی نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔

''اسداللہ......تم ٹھیک تو ہو میرے دوست؟'' ڈی سوزا کی سنائی گئی خبر کے ردعمل میں انہوں نے اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا تھا اور سوچوں کے گرداب میں گھرے بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ ڈی سوزا کو شک ہوا کہ وہ صدمے سے سکتے میں تو نہیں چلے گئے ہیں، اس لیے انہیں آہستہ سے ہلاتے ہوئے پکارنے لگا۔

''ہم ٹھیک ہیں ڈی سوزا۔ تم بس ہم پر ایک احسان کرو۔ ہمارے واپس حیدرآباد جانے کا انتظام کردو۔ مشکل کی ان گھڑیوں میں ہمارا بھائی جان کے شانہ بشانہ ہونا بہت ضروری ہے۔'' ڈی سوزا کی پکار پر انہوں نے خود کو مجتمع کرتے ہوئے بہ مشکل اس سے کہا۔

''فکر مت کرو میرے دوست۔ میں انتظام کردیتا ہوں۔ تم اتنی دیر آرام کرلو۔'' ڈی سوزا نے ان سے کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ذرا دیر میں وہ ایک خواب گاہ کی تنہائی میں موجود تھے۔ آرام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہاں اپنے پیاروں کا سوگ منانے کے لیے انہیں جو

تنہائی درکار تھی، وہ میسر آگئی تھی۔ خاندان کے ایک ایک فرد کی صورت ان کے سامنے آرہی تھی اور آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ ان کا سب کچھ تو حویلی میں تھا۔ عزیز از جان لاڈلی بہن عالیہ جو جوزفین کو ان سے جدا کرنے کی سازش میں شریک ہونے کے باوجود بھی انہیں عزیز ہی رہی تھی، پیارا بھتیجا حسیب اللہ اور اس کی شوخ و چنچل بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے جن کے دم سے حویلی میں رونق تھی۔ نمک خوار ملازمین، غاصب ہونے کے باوجود محترم پھپھی ندرت جہاں اور ان کی بیٹی عشرت جہاں، اکلوتی بڑی بھابی اور سب سے بڑھ کر ان کی جوزفین کی نشانی جولیٹ جسے انہوں نے ابھی تک دل بھر کر نہیں دیکھا تھا اور جس کے لیے ان کے دل میں جانے کتنے ارمان، کتنی آرزوئیں تھیں۔ ڈی سوزا نے انہیں نہیں بتایا تھا اور نہ ہی وہ پوچھنے کی ہمت کر سکے تھے کہ ان میں سے کون بچا تھا اور کون کون اپنی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ وہ چاہتے تو نواب فراست بیگ کی حویلی میں صفی اللہ سے رابطہ کر کے ان سے اس بارے میں پوچھ سکتے تھے لیکن انہوں نے نہیں پوچھا تھا کہ وہ ابھی خود کو خوش گمانی اور امید کی کیفیت میں جتلا رکھنا چاہتے تھے۔ ابھی وہ اللہ سے ان سب کی سلامتی اور حفاظت کی دعا مانگنا چاہتے تھے۔ ابھی وہ خود کو یہ دھوکا دینا چاہتے تھے کہ جب وہ حیدرآباد پہنچ کر نواب فراست بیگ کی حویلی میں داخل ہوں گے تو انہیں اپنے خاندان کے ہر فرد کی صورت دیکھنے کو مل جائے گی۔ ان کے پیارے انہیں زندہ سلامت مل جاتے تو در و دیوار اور مال و زر لٹ جانے کا کوئی غم نہیں ہوتا۔ وہ ایک آس، ایک امید کے سہارے حیدرآباد تک کا سفر طے کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا لیکن آنسو تھے کہ سیلِ رواں کی طرح ان کی آنکھوں سے نکلتے ہی چلے جا رہے تھے اور وہ اس سیلِ رواں کے آگے بند باندھنے سے قاصر تھے۔

☆☆☆

پیسا سب کچھ نہیں ہوتا لیکن پیسے سے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ ربن نے فاروق کے لندن میں قیام کے خیال سے روانگی سے قبل اسے بھاری رقم بھجوائی تھی۔ سفر میں چوری چکاری کے خدشات کے پیش نظر فاروق نے وہ رقم اپنے لباس میں ہی محفوظ کر لی تھی اور اب وہی رقم اس کے کام آرہی تھی۔ اس رقم کے سہارے وہ ہوٹل میں کمرا لینے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اسے یہاں کمرا دلانے والا بیرا رقم کے عوض دل و جان سے اس کی ہر خدمات انجام دے رہا تھا۔ اس وقت بھی اس نے فاروق کو وہ جملہ سامان مہیا کر دیا تھا جس کی مدد سے اس نے خود کو ایک سکھ سردار کے روپ میں ڈھال لیا تھا۔ اس روپ میں وہ ایک پرانی سی وین میں اس اسپتال کی طرف روانہ ہوا جہاں کیتھی ملازمت کرتی تھی اور جس کے مردہ خانے میں ربن کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ کافی رات ہو چکی تھی اس لیے سڑکوں پر زیادہ رش نہیں تھا اور فاروق کو گاڑی چلانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ اس نے اپنے شوق کی وجہ سے بہت نوعمری میں ڈرائیونگ سیکھی تھی لیکن بعد کے بدلے ہوئے حالات میں اسے بہت کم اس بات کا موقع ملا تھا کہ وہ اپنے اس شوق کی تکمیل کر سکے چنانچہ وہ بہت زیادہ اچھا ڈرائیور شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ تو اس کی ذہانت تھی کہ وہ اب بھی گاڑی چلا سکتا تھا اور چلا رہا تھا۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جس طرح اس نے گاڑی کا بندوبست کیا تھا، اسی طرح ڈرائیور کا بھی انتظام کر لیتا لیکن وہ کسی شخص کو اس حد تک اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا تھا کہ وہ شروع سے آخر تک ساری کارروائی کا عینی شاہد بن جاتا اور بعد میں اس کے لیے مصیبت کھڑی کرتا۔ وہ اللہ کا نام لے کر دکھی دل کے ساتھ ربن کی لاش وصول کرنے اسپتال کی طرف گامزن تھا۔ اسپتال پہنچا تو وہاں بھی دن کے مقابلے میں سناٹا تھا۔ گاڑی مردہ خانے کے قریب روک کر وہ نیچے اترا اور مردہ خانے کے دروازے کے نزدیک منتظر کھڑی کیتھرائن کی طرف پیش قدمی کی۔ کیتھرائن اسی کی منتظر تھی لیکن خلافِ توقع ایک سردار جی کو آتے دیکھ کر الجھن کا شکار ہو گئی۔

”کیتھی..... یہ میں ہوں فاروق۔“ اس نے نزدیک پہنچ کر اس کی الجھن دور کی تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اب اس نے خود بھی ذرا غور سے دیکھنے پر فاروق کو شناخت کر لیا تھا۔ شناخت ہو جانے کے بعد اس نے بہت تیزی سے باقی کارروائی پوری کروائی اور منٹوں میں ربن کا سفید چادر میں لپٹا وجود فاروق کی وین میں منتقل کر دیا گیا۔ کیتھرائن خود بھی فاروق کے ساتھ والی نشست پر آ بیٹھی۔ اسے معلوم تھا کہ ان مشکل حالات میں فاروق بالکل تنہا ہے۔ غم میں تنہائی آدمی کو مزید توڑ دیتی ہے اور وہ اسے ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تھی، اس لیے اسے ڈھارس دینے کے لیے اس کے ساتھ ہو گئی تھی۔ فاروق نے واقعی اس کی موجودگی سے حوصلہ محسوس کیا تھا اور اب اس قبرستان کی طرف گامزن تھا جہاں وہ ربن کی قبر کی تیاری کے انتظامات پہلے ہی کروا چکا تھا۔ قبرستان سے متصل ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی۔ فاروق نے گاڑی کو مسجد کے دروازے کے سامنے روکا تو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



کیتھرائن نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''دادا کے غسل، تکفین اور نماز جنازہ کے لیے یہاں آنا ضروری تھا۔'' فاروق نے اسے بتایا اور گاڑی سے اتر کر مسجد کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو تین بار دروازہ کھٹکھٹانے پر دروازہ کھل گیا اور ایک باریش جوان آدمی نمودار ہوا۔

''بے وقت زحمت دینے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس مسجد کے امام ہیں؟'' فاروق نے اس سے معذرت کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''جی نہیں۔ میں موذن ہوں۔ امام صاحب اپنے حجرے میں سو رہے ہیں۔'' رات گئے جگائے جانے کے باوجود موذن نے شائستگی سے جواب دیا حالانکہ وہ ایک سکھ کو مسجد کے دروازے پر دیکھ کر تھوڑا سا حیران بھی نظر آرہا تھا۔

''امام صاحب کو زحمت تو ہوگی لیکن آپ انہیں جگا دیں۔ مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے اور میں ان ہی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' فاروق نے اس سے درخواست کی۔

''اچھا آپ انتظار کریں۔ میں انہیں جگاتا ہوں۔'' موذن چند لمحے تذبذب میں رہا پھر فاروق کے التجائیہ انداز پر پسیج گیا۔ اس دوران وہ یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ دروازے کے سامنے کھڑی گاڑی میں صرف ایک لڑکی بیٹھی ہوئی ہے اور کہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ فاروق کا لب ولہجہ بھی اس کے سکھ حلیے سے مختلف تھا اور موذن کے دل میں تجسس سا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اندر گیا اور دو منٹ میں ہی امام صاحب کو جگا کر لے آیا۔ امام صاحب آئے تو ان سے بھی فاروق نے بے وقت جگائے جانے پر معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں ہے جناب، آپ اپنا مسئلہ بتائیں۔ آپ مجھے بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ اگر میں آپ کے کسی کام آسکا تو یہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔'' امام صاحب نے رواداری کا مظاہرہ کیا۔

''میں اس وقت اپنے بڑے بھائی کے غسل، تکفین اور نماز جنازہ کے لیے آپ کی مدد کا محتاج ہوں، ان کا انتقال ایسے حالات میں ہوا ہے کہ مجھے یہ سب خفیہ طور پر کرنا پڑ رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس مشکل وقت میں اپنے مسلمان بھائی کا ساتھ دیں گے۔'' فاروق نے کرب کے عالم میں ان سے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

''اوہ..... تو آپ مسلمان ہیں؟''

''جی ہاں۔ میرا نام فاروق ہے اور میں نے ضرورتاً سکھ کا روپ دھارا ہے۔'' فاروق نے انہیں بتایا تو وہ کشمکش میں مبتلا نظر آنے لگے۔ ظاہر ہے فاروق جس انداز میں ان تک آیا تھا، وہ معاملے کو مشکوک بنا رہا تھا۔ بھلا جنازے بھی یوں خفیہ طور پر اٹھائے جاتے ہیں۔ فاروق نے ان کی اس کشمکش کو محسوس کرلیا اور رقت آمیز لہجے میں بولا۔

''ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر بہت حق ہوتا ہے امام صاحب! میرے بھائی صاحب بہت تکلیف دہ حالات میں اس دنیا سے گئے ہیں۔ میں ان کی زندگی بچانے کے لیے کچھ نہیں کرسکا لیکن میرا فرض بنتا ہے کہ میں شرعی طریقے سے ان کی آخری رسومات کی ادائیگی کا اہتمام کروں۔ مہربانی فرما کر آپ اس فرض کی ادائیگی میں میری مدد فرمائیں۔'' اس بار امام صاحب انکار نہیں کرسکے اور آہستہ سے بولے۔

''آپ میت کو مسجد کے اندر لے آئیں۔ ہم غسل کا انتظام کرتے ہیں۔ آپ کے ساتھ جو خاتون ہیں انہیں آپ میرے حجرے میں بھیج سکتے ہیں۔ وہاں میری بیوی موجود ہے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' فاروق بولا۔ پہلے اس نے کیتھرائن کو امام صاحب کے حجرے میں بھیجا پھر موذن کی مدد سے ربن کی میت کو مسجد کے صحن میں لے گیا۔ موذن نے ہی غسل کے لیے پانی وغیرہ گرم کیا۔ کفن فاروق اپنے ساتھ لایا تھا جسے اس عرصے میں امام صاحب نے تیار کردیا۔ فاروق ان کی مدد کرواتا رہا۔ غسل کے لیے ربن کی لاش کو لکڑی کے تختے پر لٹا کر چادر کھولی گئی تو اس کی حالت دیکھ کر امام صاحب اور موذن دنگ رہ گئے۔ فاروق پہلے ہی اس کی یہ حالت دیکھ چکا تھا لیکن دوبارہ دیکھنے پر اس کے دل کو نئے سرے سے دھچکا لگا۔

''یااللہ! کون تھے وہ درندے جنہوں نے ایک انسان کو اس حال تک پہنچا دیا۔'' امام صاحب نے صدمے سے کہا۔ فاروق انہیں کوئی جواب نہیں دے سکا۔ انہوں نے بھی مزید کچھ نہیں کہا اور غسل دینے کا آغاز کردیا۔ ربن کے دریدہ جسم کو غسل دیے جانے کے دوران فاروق ان لوگوں کی مدد کرواتا رہا اور اس کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہتے رہے۔ غیر ہونے کے باوجود امام صاحب اور موذن تک کے آنسو نکل آئے کہ انسانی جسم کی یہ حالت انہوں نے بھی کبھی اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ غسل کے بعد تکفین کا مرحلہ طے ہوا تو کیتھرائن کو بھی ربن کے آخری دیدار کے لیے بلا لیا گیا۔ وہ خود پر بہت ضبط کیے ہوئے تھی کہ اسے فاروق کا خیال تھا لیکن آخری دیدار کرتے ہوئے اس کا ضبط بھی جواب دے گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

فاروق نے اسے بڑے بھائی کا دیدار کرواتے ہوئے

اسے حوصلہ دیا اور واپس امام صاحب کے حجرے تک چھوڑ آیا۔ واپس آکر وہ خود بے خود سا ربن کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ شخص اس کے دل میں کیا مقام رکھتا تھا اور اس کے یوں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانے سے اس کا دل کیسے پارہ پارہ ہو رہا تھا، یہ وہی جانتا تھا۔ یہ خیال کہ اب وہ کبھی اس چہرے کو نہیں دیکھ سکے گا، اس کے دل کو مٹھی میں بھینچ لیتا تھا۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور دیکھتا جا رہا تھا۔ اس کا دل اس چہرے سے نظریں ہٹانے کو راضی نہیں ہوتا تھا۔ امام صاحب اور موذن بہت دیر تک اس کی یہ کیفیت دیکھتے رہے پھر امام صاحب نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دینے والے انداز میں ہلکا سا دباؤ ڈالا اور ملائمت سے کہا۔

''میت کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے میں مزید تاخیر مناسب نہیں ہے۔ آیئے نماز جنازہ ادا کر لی جائے۔'' انہوں نے ہی ربن کے چہرے کو کفن میں ڈھانپا اور فاروق لڑکھڑاتے قدموں سے نماز جنازہ کے لیے کھڑا ہوا۔ وہ شخص جو بمبئی پر راج کرتا تھا جس کے ایک اشارے پر بے شمار لوگ اپنی جانیں نچھاور کر سکتے تھے، جو بہتوں کو اپنے سگوں سے زیادہ پیارا تھا، اس کی نماز جنازہ اس طرح پڑھی جا رہی تھی کہ اس میں کل تین افراد شامل تھے۔ نماز جنازہ کے بعد جنازے کو کاندھا دینے کے لیے چوتھے شخص کی کمی کو دور کرنے کے لیے فاروق گورکن کو بلا کر لایا اور یوں رب نواز عرف ربن دادا اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچا۔ وہ جو کہتا تھا کہ جیتے جی بمبئی کو نہیں چھوڑے گا اور بمبئی کی مٹی میں ہی دفن ہونا پسند کرے گا، آج اپنے قول میں سچا ثابت ہوا تھا۔ بمبئی کی زمین پر اس کے لیے جگہ کم ہو گئی تھی لیکن بمبئی کی مٹی کے نیچے اس کو پناہ مل گئی تھی۔

میت قبر میں اتارنے کے بعد جب مٹی ڈال کر قبر کو بند کر دیا گیا تو اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ شاید ایک عظیم انسان کے اس انجام پر عظیم آسمان بھی رو پڑا تھا اور ربن کے سارے چاہنے والوں کے حصے کے آنسو خود برسا رہا تھا۔ آسمان کے آنسوؤں میں فاروق کے آنسو گھل مل گئے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے غم سے گزر رہا تھا اور دلاسا دینے کے لیے وہ لوگ اس کے قریب نہیں تھے جو اس دکھ کو بالکل ویسا ہی محسوس کر پاتے جیسا وہ محسوس کر رہا تھا۔ رامو، وجے، جانی، بجو، گولو...... ایک لمبی فہرست تھی اس شخص کے چاہنے والوں کی جو آج یوں چوری چھپے بمبئی کے ایک قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ زمین آسمان کو کھا گئی تھی اور عجب تھا کہ قیامت برپا نہیں ہوئی۔ جو قیامت تھی وہ بس فاروق کے دل پر ہی بیت رہی تھی اور وہ ربن کی قبر کی گیلی مٹی اپنی مٹھی میں تھامے یہ عہد کر رہا تھا کہ ربن کو اس انجام سے دوچار کرنے والے کسی فرد کو روئے زمین پر چین سے نہیں جینے دے گا۔ اپنے دل کا چین واپس پانے کا اس کے پاس یہی ایک واحد راستہ تھا۔

☆☆☆

''تم جو کچھ کرنے جا رہی ہو اس پر اچھی طرح سوچ لیا ہے نا سسٹر؟ اپن تمہارے واسطے ڈرتی ہے، اپن کو لگتا ہے تم خود کو ڈینجر میں ڈالنے جا رہا ہے۔ تم اپن کو ادھر اپنے ساتھ لایا ہے پر اپن سے کچھ بولتا نہیں ہے۔ تم ایک بار اس کا نیم بولو، اپن اسے سیدھا اوپر نہیں پہنچایا تو پھر تم بولنا۔'' مضطرب سا جانی جولیٹ کے عقب میں کھڑا مسلسل اس کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جولیٹ نے اس وقت گلابی رنگ کی بنارسی ساڑی باندھ رکھی تھی۔ یہ ساڑی ان کپڑوں میں شامل تھی جو وہ حویلی سے اپنے ساتھ لے کر چلی تھی۔ حویلی سے نکلتے ہوئے وہ اپنی منزل کا تعین کر چکی تھی اس لیے اسی حساب سے تیاری بھی کی تھی۔ اس کے سامان میں میک اپ کا سامان بھی موجود تھا جو اس نے اپنے چہرے پر استعمال کر ڈالا تھا۔ بالوں کو بیچ کی مانگ نکال کر کھینچ کر جوڑے کی شکل دی گئی تھی اور مانگ میں ہندو عورتوں کی طرح سیندور لگا رکھا تھا۔ گلے میں ہندو عورتوں ہی کی طرح سیاہ موتیوں والا ایک ہار تھا جسے ہندو منگل سوتر بولتے ہیں لیکن اس نے حیدرآباد کی مسلمان بیاہتا خواتین میں بھی اسی قسم کے ہار کا رواج دیکھا تھا جسے وہاں ''لچھا'' یا ''سیاہ پوت'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس کے گلے میں موجود ہار وہی حیدرآبادی ''لچھا'' تھا جو منگل سوتر کا کام انجام دے رہا تھا۔ ہاتھوں میں اس نے پھولوں کے گہنے پہن رکھے تھے اور ہاتھ پیروں پر سرخ سرخ مہندی بھی بڑی نمایاں تھی۔ پھولوں اور مہندی کا انتظام اس کے کہنے پر جانی نے ہوٹل میں پہنچنے کے بعد کیا تھا اور اب خود ہی پریشان تھا کہ اس ساری تیاری کے پیچھے جولیٹ کا کیا مقصد ہے۔ اس کی پریشانی سے بے نیاز جولیٹ اپنی تیاری کو دیوار گیر آئینے میں جانچنے میں مصروف تھی۔ اس سارے اہتمام نے اس کی شخصیت کو کافی حد تک بدل دیا تھا اور وہ بمبئی کی باسی جولیٹ کے بجائے ایک بیاہتا ہندو عورت دکھائی دے رہی تھی۔ اپنی تیاری سے مطمئن ہو کر اس نے گلابی ساڑی کا آنچل اس طرح اپنے سر پر ڈالا کہ چہرے پر تھوڑا گھونگٹ سا آ گیا۔ اس گھونگٹ نے اس کی شناخت کو مزید چھپا لیا اور وہ

اعتماد سے آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے... جانی سے بولی۔
''سواری کا انتقام تو تم نے کر ہی لیا ہوگا برادر۔ اب ہمیں چلنا چاہیے، دیر ہو رہی ہے۔''
''اپن تم سے جو بولا تم وہ کیوں نہیں سنتا سسٹر! اپن کو اس...... کا نام بولو اور پھر دیکھو اپن کیا کرتا ہے۔'' جانی نے جولیٹ کے نامعلوم مجرم کو ایک بار پھر بڑی سی گالی دیتے ہوئے اس سے مطالبہ کیا تو جولیٹ اس بار اسے نظر انداز کرنے کے بجائے اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔
''تم نے خود بولا تھا نا برادر کہ داوا نے تم سے زیادہ مجھ سے اس آدمی کا نام پوچھا تھا لیکن میں نے اس کا نام نہیں بتایا حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ داوا اتنی پاور رکھتا ہے کہ اس آدمی کو اس کے انجام تک پہنچا دے لیکن میں خود اس شخص کو اپنے ہاتھوں اس کے اینڈ تک پہنچانا چاہتی ہوں کہ اس کے بغیر میرے انتقام کی آگ نہیں بجھ سکتی۔ تم بس اس حد تک میرا ساتھ دو جتنا میں تم سے بولتی ہوں۔''
''بٹ سسٹر! یہ تمہارے لیے ڈینجرس ہوگا۔'' جانی اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔
''کیا ڈینجرس ہوگا برادر! انسان کو سب سے زیادہ خطرہ اپنی جان کا ہوتا ہے اور میں تو کب کی مرچکی ہوں۔ یہ جو تم میری زندہ لاش کو چلتے پھرتے دیکھتے ہو، یہ تو بس اس لیے باقی ہے کہ میں اپنے مجرم کو اپنے ہاتھوں سے سزا دے سکوں۔ اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو میری روح بھی ہمیشہ تڑپتی رہے گی۔'' جولیٹ کا لہجہ رقت آمیز ہو گیا تو جانی بھی ڈھیلا پڑ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔
''او کے سسٹر! جیسا تم چاہو ویسا ہی ہوگا۔ اپن اب صرف تمہارا آرڈر سنے گا۔''
''تو پھر چلیں۔'' جولیٹ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو جانی نے فرمانبرداری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے پہلے کمرے اور پھر ہوٹل سے باہر نکلے۔ باہر ایک تانگا ان کا منتظر تھا۔ تانگے میں بیٹھ کر جولیٹ نے کوچوان کو ولدار آغا کے علاقے کا نام بتایا۔ وہ اتنی تیاری سے وہاں اس لیے جا رہی تھی کہ آغا گھر پر ہوا تو اتنی اپ ٹو ڈیٹ عورت سے ملاقات کو رو ہی نہیں کر سکے گا۔ وہ جتنا عیاش طبع آدمی تھا اس کے لیے ایسی عورت کو واپس لوٹانا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ایک بار آغا کے روبرو ہو جاتی تو پھر اس کے سینے میں چاقو اتارنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ جانی سے بمبئی میں حاصل کردہ چاقو آج بھی اس کے پاس تھا اور اس کی پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ بس ایک بار آغا سے ملاقات ہونا شرط تھی۔ اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچنے کے بعد اس نے کوچوان کو ولدار آغا کی کوٹھی پر چلنے کا حکم دیا تو جانی چونک گیا۔
''تم میرے ساتھ اندر نہیں جاؤ گے برادر۔ اگر میں اندر پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو تم یہاں سے واپس چلے جانا اور بعد میں حالات کے مطابق جو ٹھیک لگے وہ کرنا۔'' تانگا بڑے سے گیٹ کے سامنے رکا تو اس نے سرگوشی میں جانی کو ہدایت دی اور خود نیچے اتر گئی۔ گیٹ پر موجود دربان نے ایک بنی سنوری عورت کو گھونگٹ کاڑھے قریب آتے دیکھا تو چوکنا ہو گیا۔
''کس نوں ملنا ہے بی بی!'' گھونگٹ کے اندر جھانکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دربان نے حیرت اور تجسس کے ملے جلے لہجے میں دریافت کیا۔
''آغا صاحب اندر ہیں؟'' جولیٹ نے قدرے گنوار عورتوں کے لب و لہجے میں سوال کیا۔
''کون آغا صاحب بھلیے لوگے۔ ادھر تو کوئی آغا صاحب نہیں ہوندے ہیں۔'' دربان کے جواب نے جولیٹ کو دنگ کر دیا اور وہ بے چینی سے بولی۔
''میں دلدار آغا صاحب کو پوچھتی ہوں۔ وہ ادھر ہی تو رہتے ہیں۔''
''ہن تو ادھر نوں اڑ گئے سی۔ یہ کوٹھی میرے مالک نے خرید لی ہے۔'' دربان نے اسے اطلاع دی پھر ہمدردی سے پوچھنے لگا۔
''آپ انہاں نوں رشتے دار ہو؟''
''ہاں، پر وہ کدھر گئے؟'' جولیٹ نے مختصر جواب دے کر بہ عجلت دوسرا سوال داغا۔
''گئے تو لندن تھے پر سنا ہے ادھر سے کراچی نکل گئے۔ اپنی بیگم نوں بھی ادھر کراچی ہی بلوا لیا ہے انہوں نے۔'' دربان کی دی اطلاع اس کے اعصاب پر بم بن کر گری۔ وہ اتنی تیاری سے یہاں آئی تھی لیکن اس کی ساری تیاری دھری کی دھری رہ گئی تھی اور آغا ایک بار پھر اس کی گرفت میں آتے آتے چکنی مچھلی کی طرح پھسل گیا تھا۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



شکست

تنویر ریاض

بڑے سے بڑا وکیل شاید دنیاوی عدالتوں میں مشکل سے مشکل کیس بھی مختلف تدبیریں کرکے جیت سکتا ہے مگر جب معاملہ دل کا ہو تو یہ کیس بدقسمتی سے دنیا کی کسی عدالت میں نہیں چل سکتا۔ اس میں مدعی بھی خود اور گواہ بھی خود ہونے کے باوجود وہ فیصلہ محبوب کے ہاتھ میں دینے پر مجبور ہوتا ہے کہ جو مزاجِ یار میں آئے اور... اس نے بھی یہی کیا۔

عمر میں نمایاں فرق ہونے کے باوجود کیوپڈ کے تیر کی شرارت

اوکلاہوما کے جنوب مشرق میں واقع ہسنگ اسپرنگ ریزورٹ اینڈ کیسینو کی وسیع وعریض عمارت کسی ایسے قلعے کے مانند نظر آرہی تھی جس کا محاصرہ کیا گیا ہو۔ غصے میں بھرے ہوئے مظاہرین صدر دروازے پر کھڑے ہوئے نعرے لگا رہے تھے اور ٹی وی رپورٹرز نے بھی اپنے کیمروں کا رخ اسی طرف کر رکھا تھا جیسے انہیں کوئی بڑی خبر ملنے والی ہو۔ مظاہرین نے اپنے ہاتھوں میں پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے جن پر کچھ اس قسم کے نعرے درج تھے: ”ہراساں

کرنا قابل نفرت جرم ہے، ہارجو کی چھٹی کرو، عورتوں کے خلاف جرائم بند کرو۔' وغیرہ وغیرہ۔

میں یہاں اپنے دوست ٹوی کی مدد کے لیے آیا تھا جس کا پورا نام تھامس ہارجو تھا اور وہ اس کیسینو میں منیجر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس کی منگنی باس کی بیٹی سے ہوگئی تھی لیکن کیسینو کی دو ملازماؤں نے اس پر الزام لگایا تھا کہ وہ انہیں جنسی طور پر ہراساں کر رہا ہے اور یہ خبر کسی طرح پریس تک پہنچ گئی۔ اس وقت ٹوی کو شدت سے ایک دوست اور وکیل کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں یہ دونوں کام بخوبی کر سکتا تھا۔

میں گاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتا اور مظاہرین کی نظروں سے بچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ آدھے راستے میں ایک چیخ میری سماعت سے ٹکرائی اور میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ کوئی میرا نام لے کر پکار رہا تھا۔ ''مسٹر کروکیٹ..... مسٹر کروکیٹ۔''

میں اپنے شہر سے ساڑھے تین سو میل دور تھا اور سمجھ رہا تھا کہ یہاں مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا۔ عقب میں اونچی ایڑیوں کی آواز سن کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ میمفس ٹی وی کی رپورٹر تھی۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تم اپنے شہر سے ایک طویل فاصلہ طے کر کے آئے ہو۔''

''اور تم بھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں، اب میں اوکلاہوما ٹی وی سے منسلک ہوگئی ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ مسٹر ہارجو دراصل ٹینیسی کے ہی رہنے والے تھے اور میرا خیال ہے کہ یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ کیا تم اس کی نمائندگی کر رہے ہو؟''

''ٹوی ہارجو اخلاقی اعتبار سے اچھے کردار کا مالک ہے۔ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ان تمام الزامات سے بری ہو جائے گا۔''

''میں نے سنا ہے کہ تم کانگریس کے انتخابات میں حصہ لے رہے ہو۔ تمہاری خواتین ووٹرز کیا سوچیں گی؟'' رپورٹر نے پوچھا۔ ''کیا تم ایک جنسی مجرم کا دفاع کرنے کا الزام برداشت کر سکو گے؟''

''میں جز وقتی سیاست دان ہو سکتا ہوں لیکن کل وقتی وکیل اور دوست ہوں۔ ٹوی نے کوئی جرم نہیں کیا اور میں یہی ثابت کرنا چاہتا ہوں۔''

میں آگے بڑھنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے ایک اور سوال داغ دیا۔ ''کیا یہ عجیب بات نہیں مسٹر کروکیٹ کہ تم ایک مشہور انڈین فائٹر کی نسل سے ہو اور پیدائشی امریکن کا دفاع کر کے اپنے سیاسی مستقبل کو داؤ پر لگا رہے ہو؟''

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔

جیسے ہی میں کیسینو کی لابی میں داخل ہوا، ایک آدمی کرسی سے اٹھ کر آگے بڑھا اور میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی کیونکہ میں نے ٹوی کو ہائی اسکول کے بعد نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے امید تھی کہ وہ اپنے باپ جیسا ہی ہوگا۔ خوش وضع، خوش لباس، ترشے ہوئے سیاہ بال، نیلی آنکھیں اور چہرے پر مسکراہٹ لیکن میرے سامنے جو مخلوق کھڑی تھی اس نے بغیر استری کا بلیزر کوٹ اور بھدے رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کے کوٹ پر نام کا ٹیگ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔ ''تھامس ہارجو کیسینو منیجر۔''

''میں نے تمہیں رپورٹر سے باتیں کرتے دیکھ لیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ مجھے بچا لو گے؟'' اس کی سانسوں سے شراب کی بو آرہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ الٹے قدموں اپنی کار تک جاؤں اور ٹینیسی کے لیے روانہ ہو جاؤں لیکن میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہارے پاس کچھ شراب بچی ہے؟ لگتا ہے کہ مجھے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔''

ایک گھنٹے بعد ٹوی کا حلیہ بدل چکا تھا۔ شیو اور غسل کرنے کے بعد اس نے صاف ستھرا لباس زیب تن کیا اور کافی سے شغل کرنے لگا۔ اسکول کے زمانے میں ہم دونوں کی ہفتے میں کم از کم دو مرتبہ پرنسپل کے سامنے پیشی ہوتی تھی جہاں ہمیں اپنی شرارتوں پر ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ کبھی کبھی جرمانے کی سزا بھی سنائی جاتی۔ کمپنی کی سی ای او ماریا اوچی کے دفتر میں بیٹھے ہم دونوں کچھ ایسا ہی محسوس کر رہے تھے۔ سوائے اس کے کہ اس بار میں بے قصور تھا اور امید تھی کہ ٹوی کے لیے بھی ایسا ہی کہہ سکوں گا۔

ٹوی مجھے پورا قصہ سنا چکا تھا۔ دو خواتین ویٹرس نے اس پر الزام لگایا تھا کہ وہ ان کی ملازمت جاری رکھنے کے عوض ان سے جنسی تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر انہوں نے ہرجانے کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ وہ چاہتی تھیں کہ اسے ملازمت سے ہی نہیں بلکہ اوکلاہوما سے بھی نکال دیا جائے اور آئندہ کے لیے اس پر کیسینو کی ملازمت کے دروازے مستقل طور پر بند ہو جائیں۔ گو کہ ٹوی کے لیے کیریئر کا خاتمہ بھی تکلیف دہ تھا لیکن اس سے بھی زیادہ وہ

اپنی منگیتر سے بچھڑ جانے کے خیال سے خوفزدہ تھا۔ میں خود اس تجربے سے گزر چکا تھا لہٰذا میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

میرے ذہن میں ماریا کا تصور ایک عمر رسیدہ اور کرخت چہرے والی عورت کا تھا لیکن وہ اس کے برعکس نکلی۔ وہ دلکش چہرے اور جاذب نظر جسمانی خطوط والی ایک پرکشش عورت تھی۔ اس کی چال میں ایسی روانی تھی جیسے پانی پر تیر رہی ہو اور اس کی آنکھوں میں ستاروں جیسی جگمگاہٹ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچاس کے ہندسے کو چھو رہی تھی لیکن اس کا چہرہ بے داغ اور بال مکمل طور پر سیاہ تھے۔

میں اسے دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہوگیا اور جب میں نے مصافحے کے لیے اس کا ہاتھ تھاما تو یوں لگا جیسے وقت اپنی جگہ پر رک گیا ہو اور میری آنکھوں میں اس کی تصویر منجمد ہوگئی ہے۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب ٹومی نے میرا بازو دباتے ہوئے کان میں سرگوشی کی۔ ''ڈیوی! تم ٹھیک تو ہو؟ میں تمہیں ٹینا سے ملوانا چاہ رہا ہوں۔''

میں نے ماریا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔ ''ڈیوی کروکیٹ!'' ٹومی نے کہا۔ ''اور یہ ٹینا اوچی ہے۔ میری......'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس لڑکی کے چہرے کے نقوش بھی ماریا سے ملتے جلتے تھے۔ وہ عمر میں اس سے کہیں کم لیکن اس جیسی ہی خوب صورت تھی۔

سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ماریا بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ ٹومی نے تمہیں اس خطرناک صورت حال کے بارے میں تفصیل سے بتادیا ہوگا؟''

میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میری قوت گویائی سلب ہوگئی۔ ٹومی نے کہا۔ ''میں بتاچکا ہوں اور یہ بھی کہ یہ سب بکواس ہے۔''

''بکواس ہے یا نہیں۔'' ماریا نے کہا۔ ''اس نے مجھے ایک مشکل صورت حال سے دوچار کردیا ہے۔ کل صبح وہ لڑکیاں تمہارے اور کیسینو کے خلاف باقاعدہ الزامات عائد کردیں گی لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ ہمارا کاروبار ویسے ہی مندا ہے اور مقدمہ دائر ہونے کی صورت میں بالکل ہی تباہ ہوجائے گا۔ اس مسئلے کو آج رات تک حل ہوجانا چاہیے۔''

ٹومی نے کہا۔ ''ڈیوی جانتا ہے کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا اور وہ اسے ثابت کردے گا۔''

میں نے تائید میں سر ہلایا تو ماریا بولی۔ ''کیا یہ درست ہے مسٹر کروکیٹ؟''

میں نے اپنی قوت ارادی کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔'' ماریا بولی۔ ''تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا حق ہے ٹومی لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ مسٹر کروکیٹ کچھ زیادہ پراعتماد نظر نہیں آتے۔ شاید یہ ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور اپنی بیٹی پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''کہ تم اپنے جرم کا اعتراف کرلو اور یہاں سے چلے جاؤ۔''

باہمی گفت وشنید کے بعد یہ طے پایا کہ میں کمپنی کے وکیل کی موجودگی میں ان دو لڑکیوں سے ملاقات کرسکتا ہوں۔ ماریا نے مجھے ٹومی کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے دس بجے تک کا وقت دیا تھا۔ میٹنگ ختم ہوئی تو ماریا اپنی کرسی سے اٹھی اور ہوا کے جھونکے کی طرح دروازے سے باہر چلی گئی۔ میں نے اپنے سینے میں ایک ٹیس سی محسوس کی اور کرسی پر بیٹھ کر پلکیں جھپکنے لگا جیسے ساری دنیا کی روشنیاں گل ہوگئی ہوں۔

لابی میں آنے کے بعد بھی میں لڑکھڑا رہا تھا جیسے ابھی خواب سے بیدار ہوا ہوں۔ ٹومی اور ٹینا نے مجھے ناراضی سے دیکھا۔ ٹینا بولی۔ ''یہ تمہارا دوست ہے...... نامی گرامی وکیل جس سے تم نے بہت زیادہ امید لگا رکھی ہے؟ تم نے دیکھا کہ میری ماں پر کس طرح اس کی رال ٹپک رہی تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ اس نے دم اٹھا کر بھونکنا کیوں نہیں شروع کیا۔''

ٹومی نے کہا۔ ''تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔''

''یہ بھی تمہاری طرح نظرباز ہے، اس پر کیسے بھروسا کرسکتی ہوں۔'' وہ ناراض ہوتے ہوئے بولی۔

ٹومی مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں کیا ہوگیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پتھر کے ہوگئے ہو؟''

میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے اسے دیکھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔

''جانے دو۔'' وہ بے زار ہوتے ہوئے بولا۔ ''میری زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم میری مدد کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟''

''بالکل......'' میں نے کہا۔ ''تم سے وعدہ کرچکا ہوں۔ ان لڑکیوں سے مل کر معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ انہوں نے جھوٹ کیوں بولا؟''

''یہ شروعات ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں

سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ اگر تمہیں نشے کی عادت ہے تو میں کسی دوسرے وکیل کا انتظام کر لیتا ہوں۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا لیکن وہ مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔

ایک چوڑے جبڑے اور چھوٹے بالوں والا شخص میرے پاس آیا۔ اس کے بلیزر کوٹ پر جوزف اینڈریو سیکیورٹی چیف کا بیج لگا ہوا تھا۔ ''تم یقیناً کروکیٹ ہی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''مجھ سے کہا گیا ہے کہ تمہیں متاثرہ لڑکیوں تک لے جاؤں۔''

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے اس نے بے رخی کے ساتھ نظر انداز کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''کیا تم نہیں سمجھتے کہ ان لڑکیوں نے الزام تراشی کی ہے؟''

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''تم ہارجو کے دوست ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ''پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کتنا بدکردار شخص ہے۔ تمہارا کام اسے بچانا ہے لیکن ہمیں اسے بے گناہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔''

یہ کہہ کر وہ لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے پانچویں منزل کا بٹن دبایا اور میری طرف دیکھ کر بے ہودہ انداز میں مسکرانے لگا۔ میں نے کہا۔ ''کیا تم نے اپنی آنکھوں سے اسے لڑکیوں کو ہراساں کرتے دیکھا ہے؟''

''نہیں لیکن میری بھی آنکھیں ہیں۔ وہ جس طرح ان لڑکیوں کو دیکھتا ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے جیسے وہ بریڈ پٹ ہے۔''

اس کی بات میرے دل کو نہیں لگی۔ میں جس دوست کو جانتا تھا وہ ایسا نہیں ہو سکتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اسکول سے نکلنے کے بعد ہم کبھی نہیں ملے۔ اس لیے وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جوان ہونے کے بعد اس میں کیا تبدیلی آئی ہوگی۔

جوزف نے لفٹ سے باہر آتے ہوئے انگوٹھے سے اشارہ کیا۔ ''کمرا نمبر پانچ سو تیرہ...... تمہاری بائیں جانب تیسرا دروازہ ہے۔ امید ہے کہ وہ لڑکیاں تمہاری نظروں سے محفوظ رہیں گی۔''

ایک چیونگم چباتی سرخ بالوں والی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اس نے سفید بلاؤز اور براؤن رنگ کا اسکرٹ پہن رکھا تھا اور بلاؤز پر کیسینو کا لوگو بنا ہوا تھا۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک اس طرح دیکھا جیسے میرے وزن کا اندازہ لگا رہی ہو پھر بولی۔ ''اگر تمہارا تعلق روم سروس سے ہے تو فی الحال مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

''ڈیوی کروکیٹ!'' میں نے کہا۔ ''میں ٹونی کا وکیل ہوں۔''

''دیکھنے میں تو وکیل نہیں لگتے۔''

''تمہارے خیال میں ایک وکیل کو کیسا ہونا چاہیے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے بولی۔ ''خالی آنکھیں، مصنوعی مسکراہٹ، پیٹ نکلا ہوا...... تم تو ایک سیاست دان لگ رہے ہو۔''

اندر سے ایک آواز آئی۔ ''اسے اندر آنے دو۔''

وہ سرخ بالوں والی لڑکی مجھے اندر لے گئی۔ وہاں ایک موٹا شخص سرمئی سوٹ اور زرد ٹائی لگائے اپنے گلاس میں مشروب انڈیل رہا تھا۔ اس کا حلیہ ہوبہو وہی تھا جو لڑکی نے بیان کیا تھا۔ خالی آنکھیں، مصنوعی مسکراہٹ اور نکلی ہوئی توند۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تعارف کروانے کی ضرورت نہیں۔ تم ہرمن ہو۔ کمپنی کے وکیل۔''

''بہت خوب۔'' اس نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہارجو نے کیا کیا ہے۔ اس کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ وہ جتنی جلدی قبول کر لے، اس کے حق میں بہتر ہوگا۔''

''یعنی تم قائل ہو چکے ہو کہ وہ مجرم ہے؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس نے کہا۔ ''وہ ایک اسکینڈل میں ملوث ہو چکا ہے۔ اسے جانا ہی ہوگا۔''

ایک سنہرے بالوں والی لڑکی لیونگ روم سے برآمد ہوئی۔ اس نے بھی سرخ بالوں والی لڑکی جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ ہرمن نے کہا۔ ''تم ان لڑکیوں سے جو چاہو بات کر سکتے ہو لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہارجو بری طرح پھنس چکا ہے۔''

دونوں لڑکیاں اس بات پر قائم رہیں کہ ٹونی نے ان سے ایک سے زائد مرتبہ ناجائز مطالبات کیے تھے۔ انہوں نے حلفیہ کہا کہ وہ صرف ایک محفوظ جگہ چاہتی ہیں جہاں انہیں جنسی طور پر ہراساں نہ کیا جائے اور ٹونی کا بھی وجود نہ ہو۔ انہوں نے بار بار اس کی مبینہ ترغیب کا ذکر مزے لے لے کر کیا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ خفا ہونے کے بجائے خوش ہوئی تھیں لیکن میں ان کی کہانی کو جھٹلا نہیں سکا۔

ماریا ڈیجنے نے مجھ سے اس انٹرویو کی رپورٹ مانگی تھی چنانچہ مجھے ایک بار پھر اس کے دفتر جانا پڑا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ حسب عادت اپنی گردن میں پڑے ہوئے نیکلس سے کھیل رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں دستک دیتا اس کا

لاکٹ کھل گیا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ کندھے جھک گئے اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ یوں لگا جیسے میری آنکھیں بھی بھیگ گئی ہوں۔ میرا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر دیکھوں کہ اس لاکٹ میں کیا ہے لیکن یہ بداخلاقی ہوتی۔ میں نے اپنی آنکھیں خشک کیں اور ٹومی کی تلاش میں چل دیا۔

وہ مجھے کاک ٹیل لاؤنج میں مل گیا۔ غالباً اس وقت بھی وہ ٹینا کے سامنے اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ میں نے اسے ان لڑکیوں سے بات چیت کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔ ''وہ جھوٹ بول رہی ہیں۔ میں تو انہیں جانتا تک نہیں پھر وہ میرے بارے میں ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں۔''

''جب دو عورتیں ایک ہی بات کریں تو جیت انہی کی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ جھوٹ کیوں بول رہی ہیں۔''

''انہوں نے پیسوں کا مطالبہ نہیں کیا۔'' ٹینا بولی۔ ''کیا اس سے ان کی کہانی زیادہ قابلِ یقین معلوم نہیں ہوتی؟''

کوئی بھی اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ دیوار پر لگی ہوئی ٹی وی اسکرین پر غصے میں بھرے ہوئے مظاہرین نعرے لگاتے اور پلے کارڈز لہراتے مارچ کر رہے تھے۔ ایک پلے کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ ''ہار جو کو جانا ہوگا۔'' اسے پڑھ کر میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔

''ہم اسے ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں۔ ان کا مقصد ٹومی کو راستے سے ہٹانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس لیے؟ وہ اس پر مقدمہ چلانے یا سزا دینے کا مطالبہ کیوں نہیں کر رہے؟''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔'' ٹومی نے کہا۔

''ہم فرض کر لیتے ہیں کہ تمہاری نوکری چلی جاتی ہے تو اس کا فائدہ کسے ہوگا؟''

ٹومی نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ کوئی میری جگہ لینا چاہتا ہے؟''

''یہ ممکن ہے، تمہارے بعد کس کا نمبر ہے؟''

ٹومی بولا۔ ''میں نہیں جانتا۔ مجھے اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔''

''اس کے علاوہ ایک اور امکان بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ کسی کی نظر ملازمت کے بجائے تمہاری منگیتر پر ہو۔''

ٹینا نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ''میں نہیں کہہ رہا کہ اس میں تمہاری کوئی غلطی ہے۔'' میں نے لفظوں کے انتخاب میں احتیاط کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ''لیکن مجھے یقین ہے کہ کچھ اور لوگ بھی تمہیں پسند کرتے ہوں گے اور اس الزام تراشی سے ان کی امیدیں روشن ہو گئی ہوں گی۔''

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ کسی رقیب نے میری محبت میں مبتلا ہو کر ان لڑکیوں کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کیا۔'' ٹینا کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ میرے خیال سے متفق نہیں ہے۔ ''یہاں ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔ اب میں چلتی ہوں، مجھے اپنے کام پر جانا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مزید کوئی بات کیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

ٹومی مایوس نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اب میں پچھتا رہا ہوں کہ کیسینو میں ملازمت کیوں کی؟''

''میں اس کی وجہ جاننا چاہوں گا۔'' میں نے کہا۔

''میرے باپ کا تعلق اوکلاہوما سے تھا اور انہوں نے کئی برس کیسینو میں ملازمت کی۔ وہ اچھے دن تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان کا سر فخر سے بلند کر سکوں گا لیکن میرے منیجر بننے سے پہلے ہی وہ انتقال کر گئے۔''

''کوئی بات نہیں۔ تم اب بھی ان کی روح کو خوش کر سکتے ہو۔'' میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔

اگلے دو گھنٹے میں نے کیسینو کے عملے کے لوگوں سے گفتگو کرنے میں گزار دیے۔ ان میں خادمائیں، باورچی، دربان اور ڈیسک کلرک وغیرہ شامل تھے۔ شروع میں وہ کچھ محتاط تھے لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ ٹومی کے مفاد میں کام کر رہا ہوں تو وہ پھول کی طرح کھل اٹھے اور انہوں نے بتایا کہ وہ ایک مہربان اور دوسروں کا خیال رکھنے والا باس ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ٹینا کے ممکنہ امیدوار کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے لیکن جب میں نے انہیں معاملے کی نزاکت سے آگاہ کیا تو انہوں نے دو نام لیے۔ پہلے نمبر پر ہرمن اور دوسرے نمبر پر سیکیورٹی چیف جوزف تھا۔ یہی دونوں نام ٹومی کے جانشین کے طور پر بھی سامنے آئے۔ کوئی بھی ان کے حق میں نہیں تھا بلکہ کئی ایک نے کہا کہ وہ جوزف کے ساتھ کام کرنے کے بجائے ملازمت چھوڑنے کو ترجیح دیں گے۔

کسی نے بھی ان لڑکیوں کے بارے میں بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ وہ دونوں گزشتہ دو ماہ کے دوران آئی تھیں اور ان میں سے کسی نے بھی انہیں دوست بنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے آپ کو یونانی نسل کہتی تھیں لیکن انہوں نے اپنے آباؤاجداد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اسٹاف کے لوگوں کے لیے وہ اجنبی تھیں اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ یہاں آنے سے پہلے ایک دوسرے کو جانتی تھیں یا نہیں لیکن باورچی نے بتایا کہ اب وہ

ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئی تھیں۔

میں کیشیئر کی کھڑکی کے پاس کاؤنٹر پر جھکا عملے کے ایک نوجوان رکن سے سوالات کر رہا تھا کہ اچانک ہی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ ہکلانے لگا۔ اس کی نظریں میرے کندھوں کے عقب میں جم کر رہ گئی تھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ماریا اوچی دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ اس روپ میں بھی وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ میرا دل چاہا گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے ہاتھ چوم لوں۔

ماریا نے کہا۔ ''تم کس کی اجازت سے میرے ملازمین سے سوالات کر رہے ہو؟''

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے خاموش رہا۔

''میں کام کے دوران تمہیں لوگوں کو ڈسٹرب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' اس نے قدرے نرم لہجے میں کہا جیسے اسے میری پریشانی کا احساس ہو گیا ہو۔

''تم اپنا کام جاری رکھ سکتے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''بشرطیکہ تم اپنے آپ کو ان ملازمین تک محدود رکھو جو اس وقت ڈیوٹی پر نہیں ہیں لیکن تمہیں جلدی کرنا ہوگی۔'' وہ اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا وقت ختم ہونے میں چار گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔''

میں نے شکریہ ادا کرنے کے انداز میں سر کو خم کیا تو وہ بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ یہ معاملہ کسی نہ کسی طرح نمٹ جائے اور تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

اس کے الفاظ سن کر مجھے شدید صدمہ ہوا۔ گو کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا لیکن مجھے اس سے اس سنگ دلی کی بھی توقع نہیں تھی۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، اچانک میرے عقب سے ایک آواز آئی۔ ''تم پھر میری ماں پر بری نظر ڈال رہے ہو مسٹر کروکیٹ؟''

میں نے مڑ کر دیکھا، وہاں ٹینا کھڑی ہوئی تھی۔ ایک پھیکی مسکراہٹ میرے چہرے پر دوڑ گئی۔ میں اس سے بحث نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔

ماریا نے ملازمین سے انٹرویو کرنے کے لیے ایک پرائیویٹ میٹنگ روم دے دیا تھا جس سے مجھے یہ خوشی بھی ہوئی کہ شاید وہ مجھ پر مہربان ہو گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ فکر بھی لاحق ہوئی تھی کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور میں ابھی تک کوئی نئی بات معلوم نہیں کر پایا تھا۔ اس لیے میں نے جلدی جلدی سوالات کرنا شروع کر دیے۔ ''کیا تم نے کبھی ٹومی بار جو کو اپنے یا کسی اور کے بارے میں فحش جملے کہتے ہوئے سنا؟''

میں ذہنی طور پر اس سوال کا جواب نفی میں سننے کے لیے تیار تھا لیکن دوسری طرف سے خاموشی تھی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اپنی کرسی میں دھنسی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کی عمر چالیس سے زیادہ ہی ہوگی۔ یہاں سے پہلے وہ اوکلاہوما سٹی کے ایک کیسینو میں خادمہ کے طور پر بارہ سال تک کام کر چکی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم میرا سوال سمجھ گئی ہو؟''

اس کا منہ آدھا کھل گیا۔ آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

''تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں صرف سچ جاننا چاہتا ہوں۔''

''ہاں۔ میں نے سنا ہے کہ مسٹر ٹومی ایسی باتیں کہتے ہیں کہ اگر ان لڑکیوں نے ان کا کہنا نہ مانا تو وہ انہیں ملازمت سے فارغ کر دیں گے۔''

میں یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ میں اس سے کچھ اور نہیں پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن میرے ذہن سے یہ بات چپک گئی۔ اس لیے مختلف زاویوں سے یہ سوال کیا لیکن ہر بار ایک ہی جواب ملا۔ مجھے لگا کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بول رہی ہے لیکن میں اسے ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

''تم نے معاملات مزید خراب کر دیے۔'' ماریا اوچی نے کہا۔ ہم اس کے دفتر میں واپس آ چکے تھے۔ ٹومی میرے برابر میں بیٹھا ہوا تھا اور ٹینا دیوار سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ تینوں مجھے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے میری غلطی سے یہ تکلیف دہ صورت حال پیدا ہوئی ہو۔

''وہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔'' ٹومی نے کہا۔ ''تم نے غور نہیں کیا ٹینا؟''

ٹینا نے اس کی طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ماریا اپنے لاکٹ سے کھیلتے ہوئے بولی۔ ''وہ جھوٹ کیوں بولے گی؟''

''اسے مجھ سے کوئی عداوت ہوگی۔'' ٹومی نے کہا۔ ''یا کسی نے اس سے یہ بات کہلوائی ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میرے تین ملازمین جھوٹ بول رہے ہیں؟''

''یہ بکواس ہے۔'' ٹومی نے کہا۔ ''تم سب میرے خلاف ہو۔ یہاں تک کہ تم بھی ڈیڈی۔ تم میرا دفاع کرنے

سے زیادہ میری ہونے والی ساس کو متاثر کرنے میں دلچسپی رکھتے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے ٹینا کو آخری بار دیکھا اور آندھی طوفان کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

اب میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا لہٰذا میں ٹہلتا ہوا اس جانب چلا گیا جہاں جوا ہو رہا تھا۔ میری نظر سیکیورٹی چیف جوزف پر گئی جو سامنے والی دیوار کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ میں ایک میز کے پاس سے گزرا۔ وہاں ایک جواری ڈیلر کے ساتھ مل کر کھلے عام بے ایمانی کر رہا تھا۔ میں وہاں رک کر انہیں کھیلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں بے چین ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ جوزف ضرور اس جانب متوجہ ہوگا اور میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ اکڑ کر چلتا ہوا وہاں تک آیا اور بولا۔ "کیا یہاں کوئی مسئلہ ہے؟"

میں نے اس کی طرف طنزیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہاں کیمرے لگا رکھے ہیں۔ تمہیں اس میز کی طرف ضرور دیکھنی چاہیے۔ یہ دونوں کھلی بے ایمانی کر رہے ہیں۔"

جوزف منہ بناتے ہوئے بولا۔ "اب تم مجھے بتاؤ گے کہ میں اپنا کام کس طرح کروں؟"

"کسی نہ کسی کو تو بتانا ہی ہوگا۔" میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

اچانک ہی عقب سے ایک آواز آئی۔ "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

میں اس آواز کو پہچانتا تھا اور وہ بھی مجھے جوزف کی طرح ناپسند تھا۔ کمپنی کا وکیل ہرمن میرے قریب آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ٹینا اوچی بھی تھی۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک منصوبہ آیا۔

"تم بالکل صحیح وقت پر آئے۔" میں نے ہرمن سے کہا۔ "میں اسٹیوارڈ کو نئی ترتیب کے بارے میں بتانے ہی والا تھا۔"

جوزف نے کہا۔ "میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"نوی کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔" میں نے کہا۔ "گو کہ اس نے اپنے جرم کا اعتراف نہیں کیا ہے لیکن اس کے لیے صورت حال مایوس کن ہے۔ اسی لیے ماریا نے مجھے اس کی جگہ پر رکھ لیا ہے۔"

ہرمن یہ سن کر ششدر رہ گیا اور جوزف پہلے سے بھی زیادہ غصے میں نظر آنے لگا۔ جب وہ حیران و پریشان ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، میں ٹینا کو ایک طرف لے گیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ اس کھیل میں شامل ہو جاؤ۔ اس طرح ہم نوی کی مدد کر سکیں گے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، میں نے اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال دیا اور انتظار کرنے لگا کہ جوزف اور ہرمن کب اس جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ جیسے ہی ان کی نظر ہم پر پڑی، ان کے چہرے تاریک ہو گئے۔

''مجھے بطور منگیتر بھی ٹوی کا کردار نبھانا ہوگا۔'' میں نے ایک اور بم گراتے ہوئے کہا۔ ''نینا میری بیوی بننے پر رضامند ہوگئی ہے۔''

نینا تھوڑا سا کسمسائی لیکن میں نے اسے مضبوطی سے بھینچ لیا۔ ہرمن اداس نظر آنے لگا جیسے کتے سے ہڈی چھین لی گئی ہو اور جوزف کی تو جیسے سانس ہی رک گئی تھی۔ گو کہ اس حرکت پر میرا ضمیر ملامت کررہا تھا لیکن یہ میری مجبوری تھی اگر ان میں سے کوئی ایک مشتعل ہو کر مجھ پر جھپٹ پڑتا تو مجھے اندازہ ہوسکتا تھا کہ ان عورتوں کو جھوٹ بولنے کے لیے کس نے استعمال کیا ہے۔

عین اس وقت ایک مضبوط ہاتھ نے میرے کندھے کو اپنی گرفت میں لے کر جھٹکے سے کھینچا۔ میرے سامنے ٹوی خونخوار صورت بنائے کھڑا تھا۔ پھر اس نے پوری قوت سے میری ناک پر مکا دے مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ جب حواس بحال ہوئے تو وہ مجھے کاک ٹیل لاؤنج میں لے آیا اور میرے لیے مشروب منگوایا۔ نینا نے اسے بتایا کہ جو کچھ اس نے دیکھا، وہ محض ایک ڈراما تھا تاکہ سچ سامنے آسکے۔ جب پوری بات اس کی سمجھ میں آگئی تو اسے اپنے کیے پر افسوس ہونے لگا۔

میری وضاحت کے بعد وہ بولا۔ ''یہ اتنا برا آئیڈیا نہیں ہے۔ شاید تم میری ملازمت اور نینا کو حاصل کرسکو۔ میں تو پہلے ہی دونوں سے محروم ہوچکا ہوں۔''

''بالکل نہیں، ہمارے پاس دس بجے تک کا وقت ہے۔ کیا تم بیس ہزار ڈالرز کا بندوبست کرسکتے ہو؟''

''مجھے کیسینو کے سیف سے یہ رقم نکالنا ہوگی لیکن تم اس کا کیا کرو گے؟''

''یہ ایک آخری کوشش ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر کامیاب ہوگئی تو تم بچ جاؤ گے۔''

میں نے کمرا نمبر پانچ سو تیرہ کے دروازے پر دستک دی۔ وہی سرخ بالوں والی... لڑکی نمودار ہوئی اور سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''کیا تم یہ دیکھنا پسند کرو گی؟'' میں نے بریف کیس کھول کر اسے نوٹوں کی جھلک دکھلائی۔

''اگر یہ کوئی چال ہے تو تمہیں مایوسی ہوگی۔'' اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

''بالکل نہیں۔'' میں نے بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم اندر بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں؟''

وہ دونوں لڑکیاں اور میں لیونگ روم میں ایک گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی جو نو بج کر ستاون منٹ بتا رہی تھی۔ گویا میرے پاس ٹوی کو بچانے کے لیے صرف تین منٹ رہ گئے تھے۔ میں نے بریف کیس سے ایک کاغذ نکال کر ان کے سامنے رکھا اور کہا۔ ''تمہیں صرف اس میں خالی جگہوں کو پُر کرکے اپنے دستخط کرنا ہیں۔''

وہ ایک قانونی دستاویز تھی جس میں لکھا ہوا تھا کہ ٹوی ہار جو بے قصور ہے اور یہ کہ ان دونوں کو اس کے خلاف جھوٹے الزامات عائد کرنے کے لیے ایک معقول رقم ادا کی گئی تھی۔ خالی جگہ میں اس شخصیت کا نام لکھنا تھا جس نے ان کی خدمات حاصل کیں۔

''ہم تم پر کیوں بھروسا کریں؟'' سنہرے بالوں والی لڑکی نے کہا۔

''اس بریف کیس میں بیس ہزار ڈالرز ہیں۔ کیا بھروسا کرنے کے لیے یہ کافی نہیں ہیں؟''

انہوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا پھر سرخ بالوں والی بولی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''یہ کافی بڑی رقم ہے۔'' سنہرے بالوں والی لڑکی نے جواب دیا۔

''یہ سب تمہاری ہے۔'' میں نے ایک بار پھر جھوٹ بولا۔ ''کیا تم سودا کرنے کے لیے تیار ہو؟''

سرخ بالوں والی لڑکی کی آنکھوں میں چمک ابھری اور سنہرے بالوں والی اپنا سر ہلانے لگی۔ دونوں کی نظریں بریف کیس پر تھیں۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔ ''اس کا نام کیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''کس نے تمہیں جھوٹ بولنے کے لیے پیسے دیے تھے؟''

انہوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سنہرے بالوں والی نے اثبات میں سر ہلایا۔ سرخ بالوں والی لڑکی نے بولنا شروع کیا لیکن اس کی آواز دروازے پر ہونے والی دستک میں دب گئی۔

''دروازہ کھولو!'' میں نے جوزف کی کرخت آواز پہچان لی تھی۔

''میں ماریا اوچی ہوں۔'' ایک اور آواز آئی۔ ''اور تم سے مطالبہ کرتی ہوں کہ جو کچھ کررہے ہو، اسے فوراً روک دو۔''

میں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ دروازہ کھلنے پر ماریا، جوزف اور ہرمن اندر آئے۔ وہ سب غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ ماریا نے بریف کیس کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ کیسینو کی ملکیت ہے؟''

''تم جو سمجھ رہی ہو، ویسا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں کیا سوچ رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہی کہ ٹوی بار جو نے ان لڑکیوں کو خریدنے کے لیے کیسینو کے سیف سے یہ رقم چرائی ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں ان لڑکیوں سے صرف اس شخص کا نام معلوم کرنا چاہ رہا تھا جس نے انہیں جھوٹ بولنے کے لیے استعمال کیا۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ان کی ساری گفتگو ریکارڈ کرلی ہے اور یہ مسئلہ اب ختم ہو جائے گا۔ یہ رقم تو محض ایک چارا تھی۔''

''دس بج چکے ہیں۔'' ماریا نے کہا۔ ''تمہیں جو مہلت دی گئی تھی، وہ گزر گئی۔ کل صبح ٹوی اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے استعفا دے دے گا اور اس طرح ہماری اس سے جان چھوٹ جائے گی۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیوں نہ تم دونوں پر اس بڑی رقم کی چوری کا الزام عائد کیا جائے۔''

جوزف اور ہرمن میری طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرانے لگے۔ وہ دونوں خوش نظر آرہے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ جوزف غالباً ٹوی کی جگہ سنبھال لے گا اور ہرمن کو ٹینا سے تعلق قائم کرنے کا موقع مل جائے گا۔ میں اپنے آپ کو حقیر محسوس کر رہا تھا۔ میں نہ صرف ٹوی کو بچانے میں ناکام رہا تھا بلکہ میری وجہ سے اس پر ایک اور الزام لگ گیا تھا۔ میں نے لاؤنج میں بیٹھ کر دو پیگ چڑھائے اور اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ سوتی کپڑے کا لباس پہنے جنگل کے ایک کیبن میں ہوں اور میرے ہاتھ میں ایک رائفل ہے پھر میں کیبن کا دروازہ کھول کر باہر آتا ہوں۔ لگتا ہے کہ مجھے کسی کو شکار کرنا ہے۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھ کر گردوپیش کا جائزہ لیتا ہوں اور میری نظر ایک غار کے دہانے پر جاتی ہے۔ میں ایک شاخ کا سہارا لے کر وہاں تک پہنچتا ہوں۔ غار کے اندر گھپ اندھیرا ہے۔ قریب میں ہی کسی جانور کے خراٹے لینے کی آواز آتی ہے جو کسی ریچھ سے ملتی جلتی ہے۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ اب خراٹوں کی آواز تیز ہو جاتی ہے۔ میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہو گئی ہیں اور مجھے اندرونی منظر زیادہ صاف نظر آرہا ہے۔

وہاں دیوار کے ساتھ ایک میز رکھی ہوئی ہے جس پر کچھ چھوٹے زیورات موجود ہیں جو شاید ریچھ کو گشت کے دوران کہیں سے ملے ہوں گے۔ میں ان میں سے ایک زیور اٹھا کر مدھم روشنی میں اس کا معائنہ کرتا ہوں اور مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں۔

اچانک ہی ریچھ چلانا شروع کر دیتا ہے لیکن یہ کسی ریچھ کی چیخ نہیں لگتی۔ میں نے گھوم کر دیکھا، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور حرکت کر رہا تھا۔ اب میرے بھاگنے کی باری تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا، غار میں روشنی ہو گئی اور وہ چیخ ایک لفظ میں بدل گئی۔ ''ہیلپ!''

میں نے دیکھا کہ وہ غار نہیں بلکہ بیڈروم تھا اور جسے میں ریچھ سمجھ رہا تھا، وہ ماریا اوچی تھی۔ اس نے باریک جالی کا نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا اور کافی پرکشش نظر آرہی تھی۔ باوجود اس کے کہ خوف نے اس کے چہرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

یہ خواب میرے لیے عذاب بنتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے زیور کو دیکھا اور میرے قدموں تلے زمین کھسک گئی۔ وہ خواب نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک گول چاندی کا لاکٹ تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو میری نظر دو مسکراتے ہوئے چہروں پر گئی۔ ان میں سے ایک نوجوان ماریا تھی جس کی شکل ٹینا سے بہت مل رہی تھی اور دوسرے شخص کو بھی پہچان لیا۔ اسے میں نے بیس سال سے نہیں دیکھا تھا۔

ماریا ابھی تک چلا رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر لوگ دوڑے چلے آئے۔ پہلے آنے والوں میں ٹینا، ٹوی، جوزف اور ہرمن تھے۔

''پولیس کو بلاؤ۔'' ماریا چلاتے ہوئے بولی۔ ''میں اس شخص کو گرفتار کروانا چاہتی ہوں۔''

سب نے مجھے حیرت سے دیکھا لیکن ٹینا کچھ زیادہ ہی غصے میں تھی۔ شاید اس لیے کہ میں رات کے وقت نامناسب لباس میں اس کی ماں کے بیڈروم میں داخل ہوا تھا۔ دو باوردی سیکیورٹی گارڈ جوزف کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے، اس نے ان سے کہا۔ ''اسے یہاں سے لے جاؤ۔ ہم اسے پولیس کے حوالے کریں گے۔''

میں نے لاکٹ لہراتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم سب اسے دیکھ لو۔''

یہ کہہ کر میں نے لاکٹ ٹوی کو دے دیا۔ اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

ٹینا اس کے کندھے سے لگتے ہوئے بولی۔ ''یہ میری مام اور جمی کی تصویر ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ماں کی طرف دیکھا جس کا چہرہ سفید ہوگیا تھا۔

''جمی......!'' ٹومی نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''وہ مام کی پہلی محبت تھا جو اسے چھوڑ کر چلا گیا۔'' ٹینا نے کہا۔

ماریا بستر پر گر گئی اور زارو قطار رونے لگی۔ ٹومی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کہہ دو کہ یہ شخص تمہارا باپ نہیں تھا۔''

ٹینا اپنی مام کے گلے لگتے ہوئے بولی۔ ''نہیں۔ اس کے جانے کے بعد مام نے میرے باپ سے شادی کر لی تھی لیکن یہ شادی قائم نہ رہ سکی۔ میں نہیں سمجھتی کہ مام بھی جمی کو بھول پائی ہوں گی۔''

ٹومی پرسکون نظر آنے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم انہیں بتانا چاہو گے یا یہ کام بھی میں ہی کروں؟''

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''جمی کا اصل نام جیمس ہار جو ہے۔ وہ میرا باپ تھا۔''

ماریا کی ہچکیاں اور تیز ہو گئیں۔ میں نے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں پولیس کی ضرورت ہوگی۔ کم از کم آج رات نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم سب اپنے کمروں میں چلے جائیں۔ اس معاملے کو صبح دیکھیں گے۔''

جوزف اور ہرمن مایوس دکھائی دے رہے تھے لیکن انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ماریا مسلسل روئے جا رہی تھی اور ٹینا اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ باقی سب لوگ ایک ایک کر کے کمرے سے چلے گئے۔

دوسری صبح ہم سب ایک بار پھر ماریا کے دفتر میں جمع ہوئے۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھی نادم نظر آ رہی تھی جبکہ ٹینا ایک محافظ کی طرح اس کے برابر میں کھڑی ہوئی تھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اس کی ماں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر بیٹھے۔ سوجی ہوئی آنکھوں اور اترے ہوئے چہرے کے باوجود اس کی خوب صورتی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''ان لڑکیوں اور خادمہ نے حقیقت بیان کر دی ہے۔'' میں نے اعلان کیا۔ ''ماریا نے ٹومی پر جھوٹا الزام لگانے کے لیے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔''

ٹومی نے ٹینا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی تمہاری ماں مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہے؟''

''وہ تم سے نفرت نہیں کرتی۔'' ٹینا نے کہا۔ ''اس نے سوچا کہ تم بھی اپنے باپ کی طرح مجھے تکلیف پہنچاؤ گے۔''

''کیا تم ٹھیک بتا سکتی ہو کہ اس نے کیا تکلیف پہنچائی تھی؟''

''وہ اسے شادی کے وقت چھوڑ کر چلا گیا۔'' ٹینا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''بعد میں اسے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ اس نے کسی اور عورت سے شادی کر لی ہے اور ٹینیسی میں رہ رہا ہے۔''

''مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔'' ٹومی نے کہا۔ ''اس نے کبھی یہ تذکرہ نہیں کیا۔''

''جب ہم نے اپنی منگنی کا اعلان کیا تو اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے گھر سے چلے جانے کی دھمکی دے دی۔ اس کے بعد لگتا تھا کہ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک چلی جائے گی۔''

''اب سوال یہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کہ ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔'' میں نے جان بوجھ کر اپنی آواز میں تختی پیدا کی۔

ٹومی یہ سن کر چونک پڑا جیسے اس نے اس بارے میں غور ہی نہ کیا ہو۔ ''اس کی سزا یہ ہے کہ اسے فوری طور پر عہدے سے ہٹا دیا جائے۔'' میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے علاوہ اس پر سنگین نوعیت کے الزامات ہیں اگر اس کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ دائر ہوگیا تو یہ کنگال ہو جائے گی۔''

''میں صرف یہ چاہتا ہوں۔'' ٹومی نے کہا۔ ''ماریا باس ہونے کے ساتھ ساتھ میری ساس بھی بن جائے، یہی اس کی سب سے بڑی سزا ہے۔''

ٹینا کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ بولی۔ ''تم کتنے اچھے ہو ٹومی۔''

ماریا نے کہا۔ ''لیکن ہم پریس کو کیا بتائیں گے؟''

''انہیں کسی شخص نے فرضی نام اختیار کر کے ٹومی پر جھوٹا الزام لگانے کے لیے خریدا تھا۔ میں شرطیہ کہتا ہوں کہ وہ اس کا اعتراف کر لیں گی اور اس سے پہلے کہ کوئی ان سے سوال کرے، ہم انہیں ریاست سے باہر بھیج دیں گے۔''

ماریا نے ٹومی کی طرف دیکھا اور شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بہت افسوس ہے۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔''

''میں اپنے باپ کو جانتا ہوں۔'' ٹومی نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ میرے والدین نے کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں کی لیکن میری

پیدائش سے صرف ایک ہفتہ قبل ان کی شادی ہوئی تھی جب ڈیڈی نے تمہیں پروپوز کیا۔ غالباً اس وقت وہ میرے بارے میں نہیں جانتے تھے۔''

ماریا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ معاملات سلجھانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' ٹوی نے کہا۔ ''اس نے میری ماں سے بحالتِ مجبوری شادی کی تھی۔ اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس کی آنکھیں کس کی تلاش میں بھٹکتی رہتی تھیں۔ جب وہ پورچ میں بیٹھتا تو اس کی نظریں مغرب کی جانب اوکلاہوما پر ہی جمی رہتیں۔''

ٹینا ایک بار پھر ٹوی کی بانہوں میں سما گئی اور اس طرح یہ معاملہ ختم ہوگیا۔ مجھے مطمئن ہو جانا چاہیے لیکن اب بھی مجھے کسی بات کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور میں اس کی وجہ جانتا تھا۔ ٹوی نے ٹینا کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''ڈیوی! آجاؤ..... ہم جشن منانے جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔''

''ایک منٹ۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں تمہاری ہونے والی ساس سے چند باتیں کرلوں۔''

ماریا نے بھویں اچکا کر مجھے دیکھا گو کہ رونے سے اس کا میک اپ خراب ہو گیا تھا لیکن وہ ہمیشہ کی طرح پیاری لگ رہی تھی۔ اب جبکہ میں اور وہ اس کمرے میں تنہا تھے، میری گھبراہٹ دوبارہ لوٹ آئی اور میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''مسز اوچی! مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرا فوری طور پر واپس جانا اتنا ضروری نہیں۔ کیا تم آج شام میرے ساتھ ڈنر کرنا پسند کرو گی؟''

اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ میز کے گرد چکر لگایا اور میرے سامنے آکر رک گئی پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''میں پہلی ملاقات میں ہی تمہاری نظریں پہچان گئی تھی لیکن اعتراف ہے کہ اسے میں نے خوشامد سمجھا۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟''

''چونتیس سال۔''

''میں اڑتالیس کی ہو چکی ہوں۔ کیا تمہارے لیے یہ بات پریشان کن نہیں ہے؟''

''بالکل نہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ تم اپنے ارادوں میں کتنے مخلص ہو؟''

''سو فیصد۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔''

''اسی لیے میں خوفزدہ ہوں۔ تم بہت زیادہ خوبرو اور باصلاحیت شخص ہو۔ جس کا مظاہرہ تم نے یہاں بھی کیا ہے۔ گو کہ تم دیکھنے میں مرد لگتے ہو لیکن اب بھی تمہاری بہت سی باتیں لڑکوں جیسی ہیں۔ میں نے ایک بچے کی پرورش کی ہے مسٹر کروز لیکن ایک اور بچے کو پالنا نہیں چاہتی۔''

اس نے آخری بار میرے چہرے کو چھوا۔ وہ کچھ افسردہ نظر آ رہی تھی پھر وہ مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اسے واپس بلانا چاہ رہا تھا۔ یہ بتانے کے لیے کہ شاید میں اپنے ارادوں میں اتنا مخلص نہ ہوں جیسا کہ سوچ رہا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے ان سے محبت ہو گئی ہے مگر وہ چلی گئی اور میں سوچتا ہی رہ گیا۔

ٹینا اور ٹوی صدر دروازے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ ٹینا نے میرا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو بولی۔

''میں جانتی تھی کہ تمہیں مایوسی ہوگی۔ شاید مام بھی تمہیں پسند کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ تمہارا بڑھا ہوا ہاتھ نہیں تھام سکتیں۔ وہ عمر کے فرق سے خوفزدہ ہیں۔ پہلے جی انہیں چھوڑ کر چلا گیا پھر شوہر بھی ان سے بچھڑ گیا۔ اب وہ تیسرا تجربہ کرتے ہوئے ڈر رہی ہیں۔ تم ان سے چودہ سال چھوٹے ہو۔ تمہارے سامنے ایک روشن مستقبل ہے۔ اگر تم بھی انہیں چھوڑ کر چلے گئے تو وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائیں گی۔''

''میں کیسے یقین دلاؤں.....''

''اس کی ضرورت نہیں۔ کچھ حقائق بڑے تلخ ہوتے ہیں۔ انہیں قبول کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس وقت تم وقتی جوش اور جذبے کے تحت میری ماں پر فدا ہو رہے ہو لیکن چند ہفتوں یا مہینوں بعد جب یہ بخار اترے گا تو تم رسی تڑا کر بھاگ جاؤ گے۔ تب وہ کیا کریں گی؟ میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ انہیں ایک اور امتحان میں مت ڈالو۔''

میں جانتا تھا کہ اب میرا مزید وہاں رکنا بے کار ہے۔ اس لیے کمرے میں آکر اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ واپسی کے سفر میں بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے ٹوی کا مقدمہ جیت لیا۔ شاید کانگریس کے انتخابات میں بھی کامیاب ہو جاؤں لیکن ایک عورت کا دل نہیں جیت سکا۔ عمر کے فرق کی وجہ سے ایسا ہوا یا واقعی میں اپنے ارادے میں سو فیصد مخلص نہیں تھا؟ شاید میری نیت میں ہی کھوٹ تھا جو یہ مقدمہ ہار گیا۔

نسلی امتیاز

ملک صفدر حیات

گروہی نظام کے اگر مثبت معنی تلاش کیے جائیں تو آپس میں ایک قانون کے تحت اتحاد واتفاق سے رہنے کے ''اصول'' نکلتے ہیں مگر افسوس ... انسان نے اسے اپنے گرد ایک اونچی دیوار بنا کر اس طرح کھینچ لیا ہے کہ کوئی ان پر نگاہ ڈال سکے اور نہ ہی یہ خود کسی اور کے بارے میں آگاہی پا سکیں۔ وہ لوگ بھی کچھ ایسے ہی نظام کا شکار ہوئے تھے جنہیں اپنی ذات برادری اور نسل پر بڑا گھمنڈ تھا اور اسی گھمنڈ نے جانے کتنے ہنستے بستے گھر اجاڑ ڈالے مگر آج بھی بے شمار خونیں واقعات کے باوجود یہ نسلی امتیاز جوں کا توں موجود ہے اور تسلسل سے وارداتیں بھی رقم کرتا جا رہا ہے یہ اور بات کہ ملک صفدر حیات جیسے لوگوں کا کردار ان وارداتوں کے وقوع پذیر ہونے کے بعد سامنے آتا ہے جو قتل وغارت گری کی الجھی گتھیاں تو سلجھا سکتے ہیں مگر نسلی امتیاز ختم کرنے میں یہ بھی ناکام رہیں گے۔

پولیس کی سرگرمیوں پر مشتمل ملک صاحب کی ڈائری سے ایک اور واقعہ

ایک صبح میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ ساتھ والے گاؤں میں قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے۔ میں نے کانسٹیبل فرید خان کو ... انگی کی تیاری کا حکم دیا اور اس واقعے کی اطلاع لانے والے کو اپنے پاس بلا لیا۔

اس بندے کا نام اسحاق تھا اور وہ اسی گاؤں کا رہنے والا تھا جہاں قتل کی واردات ہوئی تھی۔ مذکورہ گاؤں ''چک چوراسی'' کہلاتا تھا۔ اسحاق ادھیڑ عمر کا ایک سادہ لوح شخص تھا۔

''ہاں بھئی!'' میں نے اسحاق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کون قتل ہوا ہے اور کس نے قتل کیا ہے؟''

''جناب! میں یہ تو نہیں جانتا کہ قاتل کون ہے......'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''مقتول کو تو جانتے ہو نا......'' میں نے کہا۔ ''اسی کے بارے میں کچھ بتا دو؟''

''جی......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''جو بندہ قتل ہوا ہے، اس کا نام مشتاق باجوہ ہے جناب۔''

''مشتاق باجوہ کرتا کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''کھیتی باڑی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مشتاق باجوہ اپنے چھوٹے بھائی یوسف باجوہ اور باپ نذیر باجوہ کے ساتھ زمینداری کرتا تھا جناب۔ ابھی ایک سال پہلے ہی تو اس کی شادی ہوئی تھی۔''

''مشتاق باجوہ کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تھی؟''

''مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''واردات قتل کس جگہ پر واقع ہوئی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے، مشتاق باجوہ کو کس مقام پر قتل کیا گیا ہے؟''

''بھینسوں والے باڑے میں۔'' اس نے بتایا۔ ''آج کل مویشیوں کی چوری کی بہت وارداتیں ہو رہی ہیں۔ مشتاق باجوہ اسی لیے رات میں باڑے ہی میں سویا



کرتا تھا۔

اسحاق سے سوال و جواب کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ کانسٹیبل فرید خان نے میرے کمرے میں آکر بتایا۔ ''ملک صاحب! چک چوراسی جانے کی تیاری مکمل ہے۔ تھانے کے باہر تانگا آپ کا انتظار کررہا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسحاق و فرید کے ہمراہ تانگے میں بیٹھ کر چک چوراسی کی جانب روانہ ہوگیا۔

چک چوراسی میرے تھانے سے لگ بھگ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع تھا اور اس گاؤں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی نہر کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ مذکورہ نہر کی چوڑائی کم و بیش تیس فٹ رہی ہوگی۔ یہ بچہ نہر (چھوٹی نہر) آس پاس کی زرعی زمین کو سیراب کرنے کا فریضہ ادا کرتی تھی۔ وہ ماہ جون کے دن تھے اور یہ نہر اپنے کناروں تک بھری ہوئی مشرق سے مغرب کی سمت رواں دواں تھی۔ جلد ہی ہم چک چوراسی پہنچ گئے۔

وہ صبح کا وقت تھا لیکن ماہ جون کا سورج ہر ذی روح کو یہ باور کرانے پر تلا بیٹھا تھا کہ قیامت کی تیاری کرلو۔ میں ابھی آسمان سے تم لوگوں پر آگ برسانے والا ہوں۔

جائے وقوعہ یعنی بھینسوں والا باڑا مقتول مشتاق باجوہ کے گھر سے متصل تھا۔ اس کی چاردیواری کی اونچائی چار فٹ یا اس سے چند انچ زیادہ رہی ہوگی۔ باڑے کے احاطے کے اندر بارہ ضرب پندرہ فٹ کا ایک کمرا بنا ہوا تھا جس میں کاشت کاری سے متعلق مختلف آلات پڑے تھے۔ اس احاطے کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک قطار میں چند بھینسیں اپنی کھرلیوں (کنڈلیوں) پر بندھی ہوئی تھیں۔ مقتول مشتاق باجوہ کی لاش باڑے کے اکلوتے کمرے کے دروازے کے سامنے ایک چارپائی پر پڑی تھی۔

مجھے بتایا گیا کہ مقتول روزانہ اسی جگہ چارپائی ڈال کر سویا کرتا تھا۔ میں نے لاش کا بغور جائزہ لیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ مشتاق باجوہ کو سوتے میں قتل کیا گیا تھا۔ اگر بوقتِ موت وہ جاگ رہا ہوتا تو اپنی جان بچانے کے لیے یقیناً مزاحمت کرتا اور اس کوشش میں اس کے ہاتھ پاؤں ضرور زخمی ہوتے لیکن ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے مشاہدے کے مطابق سینے پر خنجر کے وار کرکے اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی چھاتی پر تیز دھار آلے کے متعدد زخم موجود تھے۔ میرے تجربے کی روشنی میں یہ مہلک وار کسی خنجر ہی کے ہوسکتے تھے۔ بعدازاں میرا یہ خیال صدفیصد درست ثابت ہوا۔

میں نے آلۂ قتل کی تلاش میں پورا باڑا چھان مارا مگر کہیں اس کا سراغ نہ مل سکا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ قاتل جو کوئی بھی تھا، وہ مشتاق باجوہ کو موت کی نیند سلانے کے بعد آلۂ قتل اپنے ساتھ لے گیا تھا یا پھر باڑے سے باہر کہیں پھینک دیا تھا۔

میں نے ساتھ آئے ہوئے کانسٹیبل فرید خان کو ہدایت کی کہ وہ جائے وقوعہ کی تفصیلات نوٹ کرے اور میں خود مقتول مشتاق باجوہ کے لواحقین سے پوچھ گچھ کرنے گھر میں آگیا۔ مقتول کے باپ نذیر باجوہ نے مجھے بیٹھک میں بٹھایا اور خود بھی میرے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ ان لمحات میں غم واندوہ کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ جس شخص کا ستائیس، اٹھائیس سالہ بیٹا موت کے منہ میں چلا گیا ہو اس کے دکھ اور تکلیف کا اندازہ لگانا ناممکن نہیں ہے۔

''نذیر!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مقتول کے باپ کو مخاطب کیا۔ ''مجھے تمہارے جوان بیٹے کی موت کا بہت صدمہ ہے۔ میں مشتاق کو واپس تو نہیں لاسکتا لیکن تم سے یہ میرا وعدہ ہے کہ میں مشتاق کے قاتل کو گرفتار کرکے عدالت سے بڑی عبرت ناک سزا دلواؤں گا مگر......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''مگر...... اس کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔ مجھ سے تعاون کروگے نا؟''

اس نے زخمی نظر سے مجھے دیکھا اور کمزور سی آواز میں مستفسر ہوا۔ ''کس قسم کا تعاون تھانے دار صاحب!''

''میں جو بھی پوچھوں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ضرور۔'' وہ سرکو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ پوچھیں جو بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''تمہارے خیال میں مشتاق کو کس نے قتل کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''م...... میں کیا کہہ سکتا ہوں تھانے دار صاحب۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔''

''کسی پر شک تو ہوگا......'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''نذیر! پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ جب تک تم مجھے کوئی اشارہ نہیں دوگے، میں اپنے کام کو آگے نہیں بڑھا سکوں گا۔''

''جناب! میں نے مر کر خدا کے پاس جانا ہے۔'' وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''خوا مخواہ کسی پر شک کا اظہار کر کے میں خود کو گناہ گار نہیں کر سکتا۔''

''مشتاق کی کسی شخص سے کوئی دشمنی وغیرہ تھی؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''کسی سے کوئی جھگڑا ہوا ہو......؟''

''بالکل نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''مشتاق بہت ہی خوش مزاج اور ملنسار تھا۔ آج تک کسی سے اس کا لڑائی جھگڑا تو کیا، چھوٹی موٹی ناراضی بھی نہیں ہوئی۔''

''نذیر! تم نے اپنے بیٹے کی لاش دیکھی ہے نا؟''

''جی دیکھی ہے۔'' وہ کمزوری آواز میں بولا۔

''جس طرح خنجر کے متعدد وار کر کے تمہارے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل اس کے لیے اپنے دل و دماغ میں بے انتہا غصہ اور نفرت رکھتا تھا۔'' میں نے واضح انداز میں کہا۔ ''اس نوعیت کا کام کوئی دوست نہیں کر سکتا۔ قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ تمہارے بیٹے کا دشمن تھا۔''

''جناب! میری بات کا یقین کریں۔'' وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں مشتاق کے کسی دشمن کو نہیں جانتا۔''

''مشتاق کب سے باڑے میں سو رہا تھا اور یہ بات کس کس کے علم میں تھی؟'' میں نے ایک نئے زاویے سے کرید کا عمل جاری رکھا۔

''جناب! بات دراصل یہ ہے کہ آج کل مال مویشی کی چوری کی بہت وارداتیں ہو رہی ہیں۔'' وہ بڑی رسان سے بتانے لگا۔ ''اس لیے باڑے میں سونے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ پہلے یہ ڈیوٹی مشتاق کا چھوٹا بھائی یوسف انجام دے رہا تھا لیکن جب سے مشتاق کی بیوی میکے گئی ہے، باڑے میں سونے کی ذمے داری مشتاق نے سنبھال لی تھی۔''

''مشتاق کی بیوی خیریت ہی سے میکے گئی ہے نا......؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔

''جی سب خیریت ہی ہے۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔

''کیا چک چورا سی والوں کو یہ بات پتا تھی کہ مشتاق آج کل باڑے میں سو رہا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔ ''اور اس سے پہلے یوسف یہ ڈیوٹی دیا کرتا تھا؟''

''جی یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔'' اس نے کہا۔

''نذیر! تمہیں کب پتا چلا کہ تمہارے بیٹے کو قتل کر دیا گیا ہے؟''

''آج صبح ہی جی...... سورج نکلنے سے بھی پہلے۔'' اس نے بتایا۔ ''ہم ابھی سو کر اٹھے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے کرم دین کھڑا تھا......''

''کون کرم دین؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کرم دین موچی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کرم دین چک چورا سی ہی میں رہتا ہے۔''

''کرم دین نے تمہیں کیا بتایا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''کرم دین فجر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آ رہا تھا تو اس نے دیکھا، ایک آدمی باڑے کی دیوار پھلانگ کر باہر نکلا۔'' نذیر باجوہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''کرم دین کو حیرت ہوئی کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ کرم دین نے آواز دے کر اس بندے کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ رکا نہیں اور تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ کرم دین اسے کوئی چور اچکا سمجھا اور میرے دروازے پر آ کر اطلاع دی کہ مجھے جا کر باڑے کا جائزہ لینا چاہیے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس کے بعد ہی ہم نے باڑے کا رخ کیا تھا۔''

''سب سے پہلے باڑے کے اندر کون داخل ہوا تھا؟''

''میں اور میرا چھوٹا بیٹا یوسف ایک ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے۔'' نذیر باجوہ نے بتایا۔ ''باڑے کے اندر پہلے یوسف داخل ہوا تھا۔''

''جب آپ لوگ باڑے پر پہنچے تو اس کا دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''دروازہ اندر سے بند تھا جناب۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

''پھر تم لوگ باڑے کے اندر کیسے داخل ہوئے؟''

''پہلے یوسف دیوار پھلانگ کر باڑے کے اندر گیا۔'' اس نے بتایا۔ ''پھر اس نے دروازہ کھولا۔ اس کے بعد میں باڑے میں داخل ہوا تھا۔''

''کیا مشتاق ... رات کو سونے سے پہلے دروازے کو لاک کر دیا کرتا تھا یا محض کنڈی ہی لگاتا تھا؟''

''وہ باڑے کے دروازے کو اندر سے باقاعدہ تالا لگایا کرتا تھا جناب۔'' نذیر باجوہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''اس تالے کی چابی مشتاق کے سرہانے کے نیچے

رکھی ہوئی تھی۔ یہ بات یوسف کو بھی پتا تھی۔ یوسف جب چارپائی لینے مشتاق کی چارپائی کی جانب بڑھا تو اس کی چیخیں نکل گئیں۔ بڑے بھائی کی خون آلود لاش دیکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ وہ بلند آواز میں چیخنے چلّانے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے دروازہ کھلوایا پھر جب میں اندر پہنچا اور صورتِ حال واضح ہوئی تو گویا مجھ پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی۔ میرے مشتاق کو کسی ظالم نے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا......''

ادھر اس نے بات ختم کی، ادھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس وقت بیٹھک میں میرے اور نذیر باجوہ کے علاوہ مقتول کا چھوٹا بھائی یوسف اور چک چوراسی کے چند دیگر بھی موجود تھے۔ میں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑانے کے بعد پوچھا۔

''کرم دین موچی تم میں سے کون ہے؟''

''وہ یہاں نہیں ہے جناب۔'' نذیر نے بتایا۔ ''وہ اس وقت اپنی دکان پر ہوگا جو اس کے گھر کے سامنے والے حصے ہی میں ہے۔''

میں نے کرم دین موچی کے گھر کی لوکیشن اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد نذیر باجوہ سے پوچھا۔ ''کیا تمہاری بہو گھر میں موجود ہے؟''

اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتا، ایک ادھیڑ عمر عورت بین کرتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئی۔

''اس نامراد پر اللہ کا قہر نازل ہو جس نے میرے جوان جہان بیٹے کی جان لی ہے۔''

مجھے یہ سمجھنے میں چنداں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ وہ مقتول کی ماں تھی۔ بعدازاں اس عورت کا نام عابدہ معلوم ہوا۔ جوان بیٹے کی موت نے اس کا کلیجا چیر کے رکھ دیا تھا۔ وہ فرطِ غم سے نڈھال ہو رہی تھی اور اپنے بیٹے کے قاتل کو بددعائیں دے رہی تھی۔

میں نے یوسف کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی ماں کو سنبھالے اور وہاں سے لے جائے مگر عابدہ مسلسل سینہ کوبی کر رہی تھی اور کسی بھی طور وہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھی تاہم نذیر باجوہ کے سمجھانے بجھانے پر وہ گھر کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔ پھر خاصی دیر تک اس کی آہ وزاری کی آوازیں بیٹھک تک رسائی حاصل کرتی رہیں۔

''نذیر! تم نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا تھا کہ مقتول کی بیوی اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔'' میں نے مشتاق کے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اس کا میکا ادھر چک چوراسی ہی میں ہے؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جمیلہ کے ماں باپ نبی پورہ میں رہتے ہیں۔ یہ گاؤں چک چوراسی سے ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔''

''کیا جمیلہ کو خبر دے دی گئی ہے کہ اس کا شوہر قتل ہو چکا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک تو اسے اطلاع نہیں بھیجی گئی جناب۔'' نذیر نے متذبذب انداز میں بتایا۔

''کیوں......!'' میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''اطلاع نہ دینے کا کوئی خاص سبب؟''

''اصل میں بات یہ ہے تھانے دار صاحب کہ جمیلہ بیمار ہے......'' نذیر نے بتایا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ بتانا چاہ رہا ہے لیکن وہاں لوگوں کی موجودگی کے باعث ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔ میں نے ان لوگوں سے سرسری پوچھ گچھ کرنے کے بعد انہیں رخصت کر دیا پھر نذیر سے پوچھا۔

''تمہاری بہو کو ایسی کون سی بیماری ہے جو وہ میکے جا بیٹھی ہے اور...... اتنے بڑے واقعے کی اسے اطلاع بھی نہیں دی جا رہی؟''

''جمیلہ کے گھر بچہ ہونے والا ہے جناب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ہمارے خاندان کا رواج ہے کہ پہلا بچہ ننھیال میں ہوتا ہے اسی لیے وہ نبی پورہ گئی ہوئی ہے۔ بس آج کل میں زچگی ہونے والی ہے اسی لیے ہم نے یہ بری خبر اس تک نہیں پہنچائی۔''

''نبی پورہ اور چک چوراسی میں صرف ایک میل کا فاصلہ ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں، آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی مشتاق کے قتل کی خبر نبی پورہ پہنچ جائے گی۔''

وہ خاموش نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''مشتاق اور جمیلہ کے آپس میں کیسے تعلقات تھے؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''میں سمجھا نہیں تھانے دار صاحب!'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''میرا مطلب ہے، وہ پیار محبت سے رہتے تھے یا ان میں اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا؟'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں جناب۔'' وہ جلدی سے بولا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُم مِریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

''جمیلہ بہت اچھی ہے۔ ان کی شادی کو ابھی ایک سال ہی ہوا ہے لیکن ایسا لگتا ہے، وہ کئی برسوں سے اس گھر میں رہ رہی ہے۔ جمیلہ نے پورا گھر سنبھال رکھا ہے۔ مشتاق بھی اس کے ساتھ بہت خوش تھا۔''

میں نے نذیر باجوہ سے مزید تین چار سوالات پوچھے پھر اسے فارغ کر کے باڑے کی طرف آ گیا۔

☆☆☆

کانسٹیبل فرید خان اس دوران اپنی کارروائی مکمل کر چکا تھا۔ میں باڑے میں داخل ہوا تو وہ دو چیزیں میری سمت بڑھاتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

''یہ دیکھیں ملک صاحب......!''

''یہ کیا ہے فرید خان؟'' میں نے مذکورہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے سرسری انداز میں کہا پھر بغور ان چیزوں کا معائنہ کرنے لگا۔

ان میں سے ایک لاکٹ تھا۔ چاندی کی زنجیر میں ایک خوب صورت عقیق جڑا ہوا تھا۔ یہ سرخ عقیق تھا جسے عقیقِ یمنی بھی کہا جاتا ہے۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق یہ عقیق پندرہ قیراط کے قریب وزن کا تھا اور اس کی جڑائی کسی صراف کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

دوسری چیز چمڑے کی ایک چپل تھی، مطلب چپل کا ایک پاؤں۔ اپنے سائز کے اعتبار سے یہ کسی بارہ تیرہ سالہ بچے کی چپل کا پاؤں لگتا تھا۔ اس چپل کا نمبر پانچ یا چھ رہا ہوگا۔

''فرید خان!'' میں نے کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ دونوں چیزیں تمہیں کہاں سے ملی ہیں؟''

''جناب! یہ مجھے اس دیوار کے پاس سے ملی ہیں۔'' وہ گلی کی جانب والی دیوار کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے، دیوار کودتے وقت قاتل کے پاؤں سے چپل کا یہ پاؤں اور گلے سے یہ زنجیر گر گئی ہے۔''

''ہاں...... ایسا ہو سکتا ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اگر واقعی یہ چیزیں قاتل سے تعلق رکھتی ہیں تو......!''

''جی...... کیا مطلب؟'' کانسٹیبل نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

اسی دوران میں نذیر باجوہ اور اس کا چھوٹا بیٹا یوسف باجوہ بھی باڑے میں آ گئے تھے۔ میں کانسٹیبل کو یہ جواب دیتے ہوئے ان باپ بیٹا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''یہ چپل تو مجھے کسی بارہ سالہ بچے کی لگتی ہے......!''

پھر میں نے چپل کا وہ پاؤں اور عقیق والا چاندی کا لاکٹ انہیں دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ''ان چیزوں کو پہچانتے ہیں آپ لوگ؟ یہ اسی باڑے میں سے ملی ہیں۔''

انہوں نے باری باری دونوں چیزوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد نفی میں گردن ہلا دی پھر نذیر باجوہ نے کہا۔

''تھانے دار صاحب! ہمارے گھر میں اس عمر کا کوئی بچہ نہیں۔ پتا نہیں، چپل کا یہ پاؤں باڑے میں کیسے پہنچ گیا اور یہ...... یہ کس کا؟''

یوسف باجوہ نے کہا۔ ''اور یہ زنجیر بھی ہم میں سے کسی کی نہیں۔''

''یاد کرو، کسی اور شخص کی گردن میں تم نے اس زنجیر کو دیکھا ہو......؟'' میں نے یکے بعد دیگرے سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

''جی نہیں۔'' یوسف باجوہ نے قطعیت سے جواب دیا۔ ''یہ زنجیر چک چوراسی میں تو میں نے کسی کے پاس نہیں دیکھی۔''

''اور چک چوراسی کے باہر......؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

''وہ۔جی...... میرا مطلب یہ تھا کہ......'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ زنجیر میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے۔''

''اور یہی حال میرا بھی ہے۔'' نذیر باجوہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

''اس گاؤں میں سنار کی کوئی دکان ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''جی......'' یوسف باجوہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''دلدار مہر کی دکان ہے۔''

''دلدار مہر......'' میں نے زیرِ لب دہراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ ایک ہی صراف ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور بھی یہ کام کرتا ہے؟''

''جی، اس گاؤں میں صرف ایک ہی سنار ہے...... دلدار مہر۔'' نذیر باجوہ نے جواب دیا۔

''اور چک چوراسی میں موچی کتنے ہیں؟''

''موچی بھی ایک ہی ہے...... کرم دین۔''

''اور اسی کرم دین نے آج صبح تمہیں اطلاع دی تھی کہ اس نے باڑے میں سے کسی بندے کو کود کر باہر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا؟'' میں نے نذیر باجوہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... جی ہاں......'' وہ جلدی سے سر کو اثباتی

جنبش دیتے ہوئے بولا۔

میں نے نذیر باجوہ سے دلدار سہر صراف کی دکان کا محل وقوع سمجھ لیا پھر مقتول مشتاق باجوہ کی لاش کی جانب متوجہ ہوگیا۔ کسی تیز دھار آلے کے متعدد وار کر کے مشتاق باجوہ کو اتنی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا کہ اس کی لاش کی حالت کافی خراب ہوچکی تھی، اوپر سے موسم بھی خاصا گرم ہورہا تھا۔ اس تپتی ہوئی قیامت خیز دوپہر میں مشتاق کی لاش کو زیادہ دیر تک کھلے آسمان کے نیچے رکھنا مناسب نہیں تھا لہٰذا میں نے جلدی سے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا اور مقتول مشتاق باجوہ کی کٹی پھٹی لاش کو ایک تانگے میں رکھوا کر پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوادیا۔

اس کے بعد میں نے کانسٹیبل فرید خان سے کہا کہ وہ کھوجی اللہ رکھا کو بلا لائے۔ فرید خان ''یس سر'' کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

میں نے یوسف باجوہ اور اس کے باپ سے مزید چند سوالات کیے پھر وہاں موجود دیگر افراد سے پوچھ تاچھ کرنے لگا۔ چک چوراسی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور مشتاق باجوہ کے قتل کی خبر اب تک گاؤں کے بچے بچے کے علم میں آچکی تھی۔

میں نے گاؤں کے لوگوں سے مقتول کے چال چلن کے بارے میں مختلف سوالات کیے اور ان کی رائے دریافت کی۔ زیادہ تر کے خیال میں مشتاق باجوہ ایک صلح جو اور امن پسند شخص تھا اور یہ کہ اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ گویا میں سردست اس قتل کا محرک جاننے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

مشتاق باجوہ کے قتل کے سلسلے میں ابتدائی کارروائی میں نے مکمل کرلی تھی اور اہم گواہوں کے بیانات بھی قلم بند کرلیے تھے لہٰذا جیسے ہی کھوجی اللہ رکھا باڑے میں پہنچا، میں نے اسے کانسٹیبل فرید خان کے حوالے کرتے ہوئے صورت حال اور اس کی ماہرانہ صلاحیت کی ضرورت سے آگاہ کردیا۔ میں نے چمڑے کی چپل کا وہ پاؤں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ مجھے جائے واردات سے ملا ہے۔ اس کی مدد سے تم اپنی مہارت کو استعمال کرتے ہوئے قاتل کا کھوج لگاؤ تو میں تمہیں اپنی جیب خاص سے انعام دوں گا۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب۔'' وہ چپل کے پاؤں کو اوپر نیچے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سمجھ لیں کہ آپ کا کام ہوگیا۔''

''ایسے کیسے سمجھ لوں کہ کام ہوگیا۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''پہلے کچھ کر کے تو دکھاؤ چاچا۔''

میری بات کا جواب دینے سے پہلے اس نے زمین کا بغور جائزہ لیا۔ اس وقت ہم عین اس مقام پر کھڑے تھے، کرم دین موچی کے مطابق جہاں سے اس نے ایک شخص کو باڑے کی دیوار پھلانگ کر کھیتوں کی جانب فرار ہوتے دیکھا تھا۔

''ملک صاحب! میں نے قاتل کا کھرا پکڑ لیا ہے۔'' اللہ رکھا نے سرسراتی ہوئی آواز میں اعلان کیا۔ ''وہ بندہ یہاں سے نکل کر کھیتوں کی طرف گیا ہے۔''

کھوجی اللہ رکھا خاصا ہوشیار آدمی تھا۔ گویا اس نے کرم دین موچی کے بیان کی تصدیق کردی تھی۔ وہ چپل والا پاؤں میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ آپ رکھ لیں۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں لیکن ٹھہریں......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر باڑے کی اندرونی سمت دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے کام کا آغاز وہاں سے کروں گا جہاں بندہ قتل ہوا ہے۔''

''چاچا! میں تمہیں فری ہینڈ دیتا ہوں۔ تمہارا جہاں سے دل چاہے اور جیسے دماغ کہے، تم اپنا کام کرنے کے لیے آزاد ہو۔'' میں نے چپل کا پاؤں ایک تھیلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اور میرا یہ کانسٹیبل فرید خان بھی تمہارے حوالے ہے۔ مجھے آج شام سے پہلے قاتل تک رسائی چاہیے...... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کردیا ہے اور سوہنا رب ہی مجھے منزل تک بھی پہنچائے گا۔ اگر میں آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے آپ کو قاتل تک رسائی نہ دلا سکا تو کم از کم اس بدبخت کا سراغ ضرور لگا لوں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم اپنا کام کرو اور میں اپنا کام کرتا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''آج شام تھانے میں ملاقات ہوگی۔''

''انشاءاللہ......!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں باڑے سے نکل کر کرم دین موچی کی دکان کی جانب بڑھ گیا۔

کرم دین کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا مالک ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ مجھے اپنی دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ یکلخت اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھ ملا کر مجھے سلام کرنے کے بعد بولا۔

''مائی باپ! مجھے حکم کیا ہوتا، میں خود چل کر آپ کی

سال نو کا تحفہ...... خوشیاں بکھیرتا جنوری 2017ء پاکیزہ کا خوب صورت شمارہ



ماہنامہ پاکیزہ کراچی

شیریں حیدر کے نئے سلسلے وار ناول **امرت** کی پہلی تعارفی قسط

سحر ساجد کی دل گداز تحریر...... **من جانبازم**

سیمارضا ردا کے منی ناول **ہم کو عبث بدنام کیا** کا اگلا باب

رفعت سراج اور **انجم انصار**

کے ناول تیزی سے تکمیل کے مراحل طے

کرتے ہوئے

نئے سال کا بھرپور تحفہ...... **نگہت سیما، بنت سحر** اور **رضوانہ پرنس** کی
خوشگوار تحریریں...... دلچسپ اور معلومات افزا...... منفرد مضامین آپ کی خوش ذوقی کا سامان

اس کے علاوہ

نامور رائٹرز کی تحریریں جن میں **بشریٰ سیال ،سفینہ یاسمین،**
نفیسہ سعید، ام ایمان ،ھاجرہ ریحان و دیگر شامل ہیں۔

خدمت میں حاضر ہو جاتا۔"

"اگر تمہیں اتنا ہی احساس ہوتا تو دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی جائے وقوعہ کے آس پاس ہی منڈلاتے دکھائی دیتے۔" میں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔ "جبکہ اس واقعے کی اطلاع تم ہی نے نذیر باجوہ کو دی تھی۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سرکار۔" وہ ایک موڑھے کو کپڑے سے جھاڑتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔ "مجھے مشتاق باجوہ کو پیش آنے والے واقعے کا پتا چل چکا ہے اور میں صبح وہاں گیا بھی تھا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میرے واپس آجانے کے بعد آپ تشریف لائے تھے اور اگر آپ یقین کریں تو میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دوبارہ وہاں جا کر حالات حاضرہ کا جائزہ لوں کہ......"

"کہ...... یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ......" میں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "تمہارے ایسا سوچتے ہی میں تمہاری دکان پر چلا آیا...... ہیں نا؟"

"جی جی......" وہ جلدی سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں...... آپ تشریف رکھیں۔"

میں...... موڑھے پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا۔ "آپ بیٹھیں۔ میں آپ کے لیے لسی پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔"

میں نے کسی تکلف سے کام نہ لیتے ہوئے اسے ایسے "بندوبست" سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے شدید نوعیت کی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پچھلے ڈیڑھ، دو گھنٹے سے میں چلچلاتی دھوپ میں تحقیق و تفتیش میں لگا ہوا تھا۔

ٹھنڈی ٹھار، دل بہار لسی کا ایک گلاس حلق سے اتارنے کے بعد میں کرم دین موچی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"کرم دین! مجھے پتا چلا ہے کہ آج صبح تم نے نذیر باجوہ کا دروازہ کھٹکھٹا کر اسے ایک سنسنی خیز اطلاع دی تھی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی...... میں اس وقت مسجد سے فجر کی نماز پڑھ کر واپس آرہا تھا تو میں نے ایک آدمی کو نذیر باجوہ کے باڑے کی دیوار پھلانگ کر باہر نکلتے دیکھا تھا۔"

"کرم دین! جب تم نے اس بندے کو باڑے کی دیوار پھلانگ کر باہر آتے دیکھا تو پھر تم نے اسے پکڑنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "نذیر باجوہ کو اطلاع دینا زیادہ ضروری تھا یا اس بندے کو قابو کرنا؟"

"سرکار! میں نے پہلے وہی کوشش کی تھی جو آپ فرما رہے ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یعنی تم نے اس بندے کو پکڑنے کی کوشش کی تھی؟"

"جی بالکل۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ بندہ کسی چھلاوے کے مانند کھیتوں میں غائب ہو گیا تھا۔"

"اس کی وضع قطع...... کوئی حلیہ وغیرہ......" میں نے بہ دستور ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ "قد کاٹھ...... کچھ تو تم نے نوٹ کیا ہوگا؟"

"جناب......" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "اس نے منڈاسا سا باندھ رکھا تھا اس لیے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا لیکن قد کاٹھ اور جسامت کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ وہ خوشیا ہے......"

"خوشیا...... کون خوشیا؟" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"ڈنگر چور خوشیا جناب۔" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "اس کا اصل نام خوشی محمد ہے لیکن علاقے میں وہ خوشیا ڈنگر چور کے نام سے مشہور ہے، یعنی مویشی چور۔"

"اوہ......!" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔ "کرم دین! کیا تم نے اس بندے کے پاؤں کو بھی دیکھا تھا؟"

"جی ملک صاحب! وہ پاؤں سے ننگا تھا۔" اس نے بتایا۔ "میرا مطلب ہے، اس نے جوتے نہیں پہن رکھے تھے۔"

"وہ ایک پاؤں سے ننگا تھا یا دونوں پاؤں سے؟" میں نے تھیلے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"دونوں پاؤں سے۔" اس نے جواب دیا۔ "اسی لیے مجھے یقین ہے کہ وہ خوشیا ڈنگر چور ہی ہوگا۔ خوشیا اسی طرح چہرے پر منڈاسا باندھ کر اور ننگے پاؤں مویشی چوری کرتا ہے۔"

"کیا تم نے خوشیا کو دیکھ رکھا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"جی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

"چک چوراسی کے کسی اور وسنیک نے اسے دیکھا ہے؟"

"نہیں جناب! آج تک کسی نے خوشیا کو نہیں دیکھا۔" اس نے بتایا۔ "لیکن اس کی دہشت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔"

"جب آج تک کسی شخص نے اسے دیکھا ہی نہیں تو پھر یہ کیسے پتا چلا کہ اس کا نام خوشی محمد عرف خوشیا ڈنگر چور ہے۔"

میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''اگر آج صبح تم نے خوشیا ہی کو نذیر باجوہ کے باڑے سے نکل کر فرار ہوتے دیکھا ہے تو پھر اس ڈنگر چور نے ان لوگوں کے مویشی چوری کیوں نہیں کیے۔ وہ مشتاق باجوہ کو قتل کر کے کیوں چلا گیا؟''

''یہ تو مجھے نہیں پتا جناب......'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

''اور جو تمہیں پتا ہے اگر اس میں تمہاری کوئی بات غلط نکلی تو پھر مجھ سے کسی رورعایت کی توقع نہیں رکھنا کرم دین۔'' میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، وہ روہنی صورت بنا کر بولا۔ ''میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھانے دار صاحب! اگر میری کوئی بھی بات جھوٹی ثابت ہو تو جو کالے چور کی سزا......وہ میری سزا۔''

''ٹھیک ہے، سچ جھوٹ کا فیصلہ وقت کرے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ یہ جوتے بنانے کا کام تم کتنے عرصے سے کر رہے ہو؟''

''سرکار! خاندانی موچی ہوں۔ یہ کام باپ دادا سے ورثے میں ملا ہے۔'' اس نے بڑے فخر سے بتایا۔

''اپنے کام کو پہچانتے بھی ہو؟''

''جی سرکار۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے جوتے کو دس سال بعد بھی دیکھتے ہی پہچان لیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں ابھی تمہارا امتحان لیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے کپڑے کے تھیلے میں سے چپل کا وہ پاؤں نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا جو نذیر باجوہ کے باڑے میں سے ملا تھا۔

کرم دین موچی نے مذکورہ چپل کو گھما پھرا کر دیکھا پھر بڑے اعتماد سے بولا۔ ''یہ چپل میرے ہاتھ کی نہیں بنی ہوئی لیکن......''

وہ بولتے بولتے رک گیا تو میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''لیکن کیا کرم دین؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ''سرکار! آپ کیا سمجھتے ہیں، یہ چپل کتنی عمر کے انسان کی ہوگی؟''

''یہی کوئی بارہ تیرہ سال کے بچے کی۔'' میں نے جواب دیا پھر الجھن زدہ انداز میں اسے تکنے لگا۔

''جی اس کے سائز سے تو یہی لگتا ہے۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔''

''تم کیا سوچ رہے ہو کرم دین؟''

''میرا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ کسی بڑے شخص کی چپل کا پاؤں ہے۔'' وہ بدستور گمبھیر انداز میں بولا۔ ''کوئی ایسا شخص جس کا قد بہت چھوٹا ہو اور ہاتھ پاؤں بھی کسی بارہ تیرہ سالہ بچے کے برابر ہوں اور یہ بات میں چپل کی بناوٹ کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔''

''ہوں......'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

کرم دین کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ تجربہ کسی کسوٹی کا محتاج نہیں ہوتا اور تجربے کا کوئی نعم البدل بھی نہیں ہوتا۔ کرم دین کی تجربہ کار نگاہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس کے درست ہونے کے قوی امکانات تھے۔ اچانک کرم دین کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''سرکار......آپ کو یہ چپل کہاں سے ملی ہے؟''

''نذیر باجوہ کے باڑے میں سے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''جہاں نذیر کا بڑا بیٹا مشتاق باجوہ قتل ہوا ہے۔''

''اب تو میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''مشتاق باجوہ کے قتل میں خوشیا ڈنگر چور ہی کا ہاتھ ہے۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے کریدا۔ ''تم یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو۔ اس کا کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''جناب! خوشیا ڈنگر چور ایک دبلا پتلا اور پستہ قامت شخص ہے جو اپنی جسامت سے چودہ پندرہ سال ہی کا لگتا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس سائز کی چپل وہی پہن سکتا ہے۔''

''لیکن تم نے تو کبھی خوشیا کو دیکھا نہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس کے باوجود بھی تمہیں اس کے حلیے اور قد کاٹھ کا بخوبی علم ہے......؟''

''وہ......وہ جی...... میں نے خوشیا ڈنگر چور کے بارے میں جو کچھ سن رکھا ہے، وہی بیان کر رہا ہوں۔'' وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا۔

''لیکن قانون سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے معاملات کو آگے نہیں بڑھاتا کرم دین۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے لیکن شک میں بھی وزن کی ضرورت ہوتی ہے۔''

"ٹھیک ہے سرکار! آپ اپنے کام کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "مجھے تو جو پتا تھا، وہ میں نے آپ کو بتادیا۔"

"صرف میں ہی نہیں، تم بھی اپنے کام کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہو کرم دین۔" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے بڑی عمر کے چھوٹے پاؤں کے حوالے سے جو انکشاف کیا ہے، وہ میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا ہے۔ میں اپنی تفتیش کے دوران میں اس نکتے کو بھی اپنے ذہن میں رکھوں گا......"

میرے اس تبصرے پر وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے اس کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے اٹھ کر ولدار سنار کی دکان میں چلا گیا۔ ولدار مہر چک چوراسی کا اکلوتا صراف تھا۔

ولدار مہر نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا۔ وہ ایک متناسب قد کا مالک اچھا خاصا موٹا انسان تھا۔ وہ صراف سے زیادہ کوئی پہلوان یا دودھ والا نظر آتا تھا۔ میں نے اپنی آمد کی غرض وغایت سے اسے آگاہ کیا اور چاندی کی زنجیر جیب سے نکال کر اس کی جانب بڑھا دی۔

وہ اس خوب صورت زنجیر کو ہاتھوں میں گھمانے پھرانے کے بعد تعریفی انداز میں بولا۔ "بڑی سوہنی زنجیر ہے تھانے دار صاحب اور اس میں لگا ہوا نگ بھی عمدہ قسم کا عقیق ہے۔ جس سنار نے بھی اسے بنایا ہے، وہ اپنے کام کا ماہر کاریگر لگتا ہے۔"

ولدار کے بیان سے بہت سی باتیں واضح ہوگئی تھیں تاہم پھر بھی میں نے سوال کرنا ضروری جانا۔

"تو تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ یہ زنجیر تمہارے ہاتھوں نے نہیں بنائی؟"

"جی پکا یقین ہے۔" وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔ "میں اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے زیورات کو دور سے دیکھ کر ہی پہچان لیتا ہوں۔"

"کیا تم کوئی اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہ زنجیر کس سنار نے بنائی ہوگی؟" میں نے پُرامید نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں جناب!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔"

"کیا تم نے آج سے پہلے اس زنجیر کو کہیں دیکھا ہے۔" میں نے پوچھا۔ "میں یہ جاننا چاہ رہا ہوں کہ یہاں چک چوراسی کے کسی بندے کے پاس اس زنجیر کو دیکھا ہو؟"

اس بار بھی اس نے نفی میں جواب دیا۔

میں مزید چند منٹ تک ولدار مہر کی دکان میں موجود رہ کر اس سے مختلف سوالات کرتا رہا پھر وہاں سے اٹھ کر تھانے آگیا۔ اس وقت ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔ دن نے ڈھلنا شروع کردیا تھا لیکن ابھی تک گرمی کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

شام سے کچھ پہلے کانسٹیبل فرید خان اور کھوجی اللہ رکھا بھی واپس آگئے۔ کھوجی خاصا الجھا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کی الجھن کا سبب دریافت کیا تو وہ بولا۔

"ملک صاحب! میں نے باڑے سے لے کر گاؤں کے آخری سرے تک کھرا نکالا ہے۔ یہاں بہت سے لوگوں کے قدموں کے نشان آپس میں گڈمڈ ہو رہے ہیں تاہم میں نے دو آدمیوں کا کھرا الگ سے نکالا ہے اور مجھے یقین ہے کہ انہی میں سے کوئی ایک آپ کا مطلوبہ بندہ ہے۔"

"اب ذرا ان دو بندوں کے کھرے کی تفصیل بھی بتاؤ چاچا۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"جناب! ان میں سے ایک تو کسی ننگے پاؤں والے شخص کا کھرا ہے۔" اس نے بتایا۔ "یہ کھرا چک چوراسی سے نکل کر موضع ٹگروالی کی طرف چلا گیا ہے۔"

"اوہ......" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "کرم دین موچی نے جس شخص کو باڑے کی دیوار پھلانگ کر کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا وہ بندہ بھی ننگے پاؤں ہی تھا اور لوگوں کا عمومی خیال بھی ہے کہ وہ خوشیا ڈنگر چور ہوسکتا ہے۔ خوشیا کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ چہرے پر منڈاسا باندھ کر اور ننگے پاؤں ہی مویشی چوری کرنے آتا ہے۔ وہ ایک دبلا پتلا اور پستہ قامت ڈنگر چور ہے۔ دیکھنے میں بارہ تیرہ سال کا لڑکا نظر آتا ہے۔"

"ملک صاحب! خوشیا کے بارے میں یہ ساری باتیں تو میں نے بھی سن رکھی ہیں۔" اللہ رکھا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "لیکن یہاں معاملہ خاصا گڑبڑ ہے جناب......"

"مثلاً...... کیا گڑبڑ ہے؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"یہ جو میں نے ننگے پاؤں والے آدمی کے کھرے کی بات کی ہے نا...... اس کے پاؤں کا سائز نارمل ہے یعنی جتنا ایک عام آدمی کا ہوتا ہے لہٰذا وہ خوشیا ڈنگر چور تو نہیں ہوسکتا البتہ میں نے جو دوسرا کھرا نکالا ہے اس پر غور کیا جاسکتا ہے۔"

"اور وہ دوسرا کھرا کس کا ہے؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

''آپ نے مجھے چپل کا ایک پاؤں دکھا کر کھرا نکالنے کے لیے کہا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دوسرا کھرا اسی چپل والے پاؤں کا ہے یعنی بارہ تیرہ سال کے کسی لڑکے کا کھرا مگر اس کھرے کے ساتھ ایک عجیب معاملہ ہے ملک صاحب۔''

''کیسا عجیب معاملہ؟'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''آپ نے مجھے چپل کا دایاں پاؤں دکھایا تھا۔'' کھوجی اللہ رکھا نے بتایا۔ ''دوسرا کھرا اسی چپل کے بائیں پاؤں کا ہے۔''

''ظاہر ہے چاچا...... جب اس کے دائیں پاؤں کی چپل دیوار پھلانگتے ہوئے باڑے میں گر گئی تو پھر باہر بائیں پاؤں کا کھرا ہی ملے گا نا!''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ باڑے سے باہر نکلتے ہی کیا وہ بندہ ایک پاؤں کا ہو گیا تھا؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جناب! باڑے سے کھیتوں تک صرف اس بندے کے بائیں پاؤں کا کھرا ہے اور اس کے ساتھ دایاں پاؤں کہیں نظر نہیں آتا۔ اگر دائیں پاؤں کی چپل باڑے میں رہ گئی تھی تو باہر ایک چپل اور ایک ننگے پاؤں کا کھرا ملنا چاہیے نا؟''

''بالکل...... ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

''لیکن ایسا نہیں ہوا ملک صاحب!'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی شخص نے بائیں پاؤں کی اس چپل کا کھرا اپنے ہاتھ سے بنایا ہے یعنی اس چپل کے نشانات زمین پر ڈالے ہیں کیونکہ......'' لحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے نامی گرامی ڈاکوؤں اور مجرموں کے کھرے نکالے ہیں جو اپنی عیاری اور مکاری میں کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اپنے اسی تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے باڑے سے کھیتوں تک بائیں پاؤں کی چپل کا جو کھرا دیکھا ہے وہ مصنوعی ہے۔ یعنی وہ چپل کسی پاؤں نے نہیں پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں کے مخصوص دباؤ سے مختلف انداز کا کھرا بنتا ہے۔''

''اوہ...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ بائیں پاؤں کی چپل کا وہ کھرا دھوکا دینے کے لیے بنایا گیا ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''سرا سر دھوکا ملک صاحب۔'' وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے باڑے کے اندر بھی مختلف مقامات کو بڑی توجہ سے چیک کیا ہے۔ ننگے پاؤں والے آدمی کا کھرا تو مقتول کی چارپائی کے نزدیک اور وہاں سے بیرونی دیوار تک پایا گیا ہے لیکن چپل کا یا اس سائز کے پاؤں کا کھرا کہیں بھی نظر نہیں آیا۔''

''اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشتاق باجوہ کا قاتل وہی ننگے پاؤں والا شخص ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اس نے کیس کو الجھانے اور ہمیں گمراہ کرنے کے لیے چپل کا ایک پاؤں باڑے کے اندر پھینکا اور دوسرے پاؤں سے باہر نشانات بنائے تاکہ ہمارا دھیان کسی چھوٹے ہاتھ، پاؤں والے شخص کی طرف جائے جیسے خوشیا ڈنگر چور......''

''قاتل کافی چالاک اور ہوشیار معلوم ہوتا ہے ملک صاحب۔'' اللہ رکھا نے تبصرہ کیا۔ ''چپل والا کھرا صرف باڑے کی دیوار سے کھیتوں تک ہے۔ اس کے بعد کہیں نہیں جبکہ ننگے پاؤں والا کھرا چک چور اسی سے نکل کر نگر والی تک چلا گیا ہے۔''

''کیا تم اس ننگے پاؤں والے کھرے کے تعاقب میں نگر والی گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

موضع نگر والی چک چور اسی سے لگ بھگ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور چک چور اسی کی اسی سمت واقع تھا جدھر نبی پورہ۔ نبی پورہ اور نگر والی آپس میں قریبی گاؤں تھے۔

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس کھرے کا نگر والی تک پیچھا کیا ہے۔ وہ کھرا نگر والی کے اندر جا کر گم ہو گیا ہے۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ گاؤں میں داخل ہونے کے بعد اس شخص نے جوتے پہن لیے ہوں گے اسی لیے ننگے پاؤں کا کھرا غائب ہو گیا تھا۔''

''ہوں......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاتل کا تعلق نگر والی ہی سے ہے۔''

''فی الحال تو ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔'' وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ ''اگر وہ بندہ نگر والی سے نکل کر آگے کہیں گیا ہے تو اس کے کھرے کو پکڑنا ممکن نہیں۔''

''اس بدبخت کا کھرا پکڑا جائے یا نہیں پکڑا جائے لیکن میں اس کی گردن ضرور دبوچ کر رہوں گا۔'' میں نے

سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کی ایک اور نشانی ہے میرے پاس۔“

اللہ رکھا نے میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے پوچھا۔

”چاچا! تم نے چک چوراہی سے گکروالی تک کھرا نکالتے ہوئے احتیاط سے کام لیا تھا نا..... کسی کو شک تو نہیں ہوا تمہاری کارروائی پر؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ملک صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میں اپنے کام کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ میں کس کام پر لگا ہوا تھا۔“

”ٹھیک ہے چاچا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم گھر جا کر آرام کرو اور کل صبح تھانے حاضر ہو جانا۔ تمہیں کل میرے ساتھ نبی پورہ جانا ہوگا۔“

”نبی پورہ کس لیے جناب؟“ اس نے پوچھا۔

”ہے کوئی کام۔“ میں نے سرسری انداز میں بتایا۔ ”وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم گکروالی کا رخ کریں گے۔“

”سمجھ گیا ملک صاحب پر.....“

وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو میں نے پوچھا۔ ”پر کیا؟“

”وہ جی..... آپ نے مجھ سے انعام کا وعدہ کیا تھا.....“ وہ یاد دلانے والے انداز میں بولا۔

”تو میں کب اپنے وعدے سے مکر رہا ہوں۔“ میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ ”پہلے قاتل کو قابو کرلوں پھر تمہیں انعام بھی دوں گا۔“

”بھول نہ جانا سرکار.....“ وہ بے یقینی سے بولا۔

”فکر نہیں کرو چاچا!“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں نے تم سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا بھی کروں گا۔“

وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں اور کھوجی اللہ رکھا گھوڑوں پر سوار ہو کر نبی پورہ پہنچ گئے۔ نبی پورہ مقتول مشتاق باجوہ کا سسرالی گاؤں تھا جو چک چوراہی سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ نذیر باجوہ نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول کی بیوی جمیلہ ان دنوں اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس کے یہاں بچے کی پیدائش متوقع تھی۔

نبی پورہ پہنچ کر جمیلہ کے گھر تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مشتاق باجوہ کے قتل کی خبر نبی پورہ پہنچ چکی تھی۔ جمیلہ اپنے شوہر کی عبرت ناک موت سے آگاہ ہو چکی تھی۔ جمیلہ پر تو گویا دہری قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

ایک طرف اس نے جس بچے کو جنم دیا، وہ اپنی پیدائش کے آدھے گھنٹے کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جاملا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جمیلہ تک یہ اطلاع پہنچی کہ کسی ظالم نے بڑی بے دردی سے اس کے خاوند کو قتل کر دیا ہے۔ گزشتہ رات جمیلہ نے ایک بچے کو جنم دیا تھا جو اپنی زندگی کی چند سانسیں لینے کے بعد چل بسا تھا۔ اس دہرے غم نے جمیلہ کو اس بری طرح نڈھال کر رکھا تھا کہ اس سے کچھ بھی پوچھنا ممکن نہیں تھا۔ جب تک اس کی ذہنی حالت اس قابل نہ ہوتی کہ میں اس سے سوال و جواب کر سکتا، اس سے بات کرنا بھی اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا۔

میں پندرہ بیس منٹ تک جمیلہ کے گھر والوں سے بات چیت کرتا رہا اور انہیں تسلی دی کہ میں بہت جلد مشتاق کے قاتل کو پکڑ لوں گا۔ وہ نامراد خونی زیادہ عرصے تک آزاد نہیں گھوم سکے گا۔ اس کے بعد ہم گکروالی کی جانب روانہ ہو گئے۔

میں گکروالی میں پہلے بھی ایک دوبار آچکا تھا۔ یہاں کے چودھری فرزند علی سے میری دعا سلام تھی۔ میں سیدھا چودھری کی حویلی پہنچ گیا۔ فرزند علی اس وقت حویلی میں موجود تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا اور اپنی بیٹھک میں بٹھایا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔

”ملک صاحب! خیریت تو ہے نا..... آج صبح ہی صبح ہمارے گاؤں کا رخ اور وہ بھی بغیر کسی اطلاع کے.....“

”چودھری صاحب! پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت صبح نہیں ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دوسری بات یہ کہ میں اسپیشلی آپ سے ملاقات کرنے نہیں آیا۔ ڈیوٹی اور فرض جب اور جس سمت دھکا دے دیں..... آنا پڑتا ہے۔“

”اوہ..... لگتا ہے، آپ کسی خطرناک مجرم کی تلاش میں گکروالی آئے ہیں۔“ اس نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

”چودھری صاحب! ایک روز پہلے موضع چک چوراہی میں قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں اسی قاتل کی تلاش میں ہوں۔“

”کہیں آپ مشتاق باجوہ کے قتل کی بات تو نہیں کر رہے؟“

”جی جی..... وہی.....“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تو اس واردات کی اطلاع آپ تک پہنچ چکی ہے؟“

''مجھے آج صبح ہی اس واقعے کا پتا چلا ہے۔'' چودھری فرزند علی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ملک صاحب......!''

''کون سی بات چودھری صاحب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''مشتاق باجوہ کے قتل کا ککروالی سے کیا تعلق؟''

''بہت گہرا تعلق ہے چودھری صاحب۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے قاتل کا کھرا نکلوایا ہے۔ قاتل چک چوراسی سے سیدھا ککروالی پہنچا ہے۔''

''ککروالی میں کہاں؟'' وہ سنسناتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کھرے نے یہ بھی تو بتایا ہوگا نا کہ قاتل کس گھر میں گیا ہے۔''

''نہیں......'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ پتا نہیں چل سکا۔ اصل میں قاتل جو کوئی بھی ہے، اس نے چک چوراسی سے ککروالی تک ننگے پاؤں سفر کیا ہے۔ ککروالی میں داخل ہونے تک اس کے ننگے پاؤں کا کھرا ملا ہے۔ اس کے بعد کھرا غائب ہو جاتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ککروالی کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے جوتے پہن لیے تھے۔''

''اوہ...... یہ تو خاصی پیچیدہ صورت حال ہے۔'' چودھری نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''پھر کیسے پتا چلے گا کہ قاتل کون ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس بندے کا ککروالی سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہ ہو۔ ککروالی میں داخل ہونے کے بعد اس نے جوتے پہنے اور پھر آرام سے چلتے ہوئے ککروالی سے باہر نکل گیا...... مطلب کسی اور طرف چلا گیا ہو۔''

''ہاں، ایسا بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جو قاتل تک راہنمائی کرسکتی ہے۔''

''کیا چیز؟'' اس نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

میں نے اپنی جیب میں سے وہ لاکٹ نکال کر چودھری کی جانب بڑھا دیا جس میں ایک عمدہ قسم کا عقیق جڑا ہوا تھا اور کہا۔ ''یہ ہمیں جائے وقوعہ سے ملا ہے اور اس کا تعلق مقتول یا اس کے گھر کے کسی فرد سے نہیں ہے۔''

''اوہ...... خاصا خوب صورت لاکٹ ہے۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے تعریفی لہجے میں بولا۔ ''اگر جائے وقوعہ سے ملا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ قاتل کی ملکیت ہوسکتا ہے۔''

''میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں چودھری صاحب۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''کیا آپ اس لاکٹ کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟''

''جانتا تو نہیں ہوں......'' وہ پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''مگر جاننے کی کوشش کرسکتا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں......!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے بیٹھک کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے آواز لگائی۔

''اوئے ظفر......!''

اگلے ہی لمحے ایک ہٹا کٹا ملازم صورت شخص دروازے میں نمودار ہوا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ ظفر نامی وہ شخص چودھری فرزند علی کا ملازم خاص تھا۔

''حکم چودھری صاحب!'' ظفر نے بڑی فرماں برداری سے پوچھا۔

''کسی بندے کو بھیج کر منظور سنار کو یہاں بلا لے۔'' چودھری نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''جی چودھری صاحب۔'' ظفر گردن کے ہلکے سے خم کے ساتھ بولا۔

''اور وہ...... اندر کہہ دیا ہے نا؟'' چودھری نے پوچھا۔

''جی جی...... بس دو منٹ لگیں گے۔''

چودھری نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی اور ظفر کو جانے کا اشارہ کرنے کے بعد میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''منظور بڑا کاریگر سنار ہے ملک صاحب۔ وہ اس زنجیر کو دیکھ کر فوراً پہچان لے گا کہ ککروالی کے کس بندے نے اس سے یہ لاکٹ بنوایا تھا۔ اس طرح قاتل تک پہنچنے میں آپ کو کافی آسانی ہوجائے گی۔''

چودھری اس تجربے کو دہرانا چاہتا تھا جو میں چک چوراسی میں دلدار مہر سنار کے ساتھ کرچکا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اگر یہ لاکٹ منظور سنار ہی کا تیار کردہ ہے تو پھر واقعی آسانی ہوجائے گی لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تفتیش کی گاڑی کو بریک لگ جائے گا۔''

اسی لمحے دو ملازم دو ٹرے اٹھائے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ مذکورہ ٹرے سامانِ خورونوش سے لدی پھندی ہوئی تھیں۔ میں نے فوراً سمجھ لیا کہ تھوڑی دیر پہلے ظفر نے اسی ''سامان'' کے یہاں پہنچنے کے حوالے سے ''دو منٹ لگیں گے'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

کا بنا ہوا تھا جو اس نے ٹگر والی کے ایک وشنیک بھولا کے لیے بنایا تھا۔ بھولا کا اصل نام اسلم تھا مگر وہ "بھولا" کے نام سے مشہور تھا۔ میں نے بھولا کے گھر کا ایڈریس اور لوکیشن کو نوٹ کیا اور چودھری کی حویلی سے اٹھ آیا۔

"ملک صاحب!" میرے ساتھ چلتے ہوئے کھوجی اللہ رکھا نے کہا۔ "جو بندہ ننگے پاؤں مقتول کے باڑے سے نکل کر کھیتوں کی طرف گیا اور پھر چک چوراسی سے نکل کر ننگے پاؤں ٹگر والی تک آیا ہے، اس کے پاؤں کا کھرا میرے ذہن میں محفوظ ہے اور زمین پر بھی بعض جگہ محفوظ ہوگا۔ ہم جس بھولا کی طرف جارہے ہیں ان کے پاؤں کو دیکھ کر اس کھرے سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔"

اللہ رکھا نے بڑے پتے کی بات کی تھی۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے چاچا! بھولا ہتھے چڑھ جائے تو یہ بھی چیک کرلیں گے۔"

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم اسلم عرف بھولا کے دروازے پر کھڑے تھے۔ تیسری دستک پر دروازہ ایک جوان جہان عورت نے کھولا پھر میری وردی پر نگاہ پڑتے ہی وہ بدکی اور فوراً دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے دروازے کے بیچ میں پاؤں پھنسا کر اس کی کوشش ناکام بنادی اور کہا۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں بی بی۔ میں معمول کی ایک کارروائی کے لیے یہاں آیا ہوں۔ کیا یہ بھولا کا ہی گھر ہے؟"

"جج...... جی......" وہ دروازے کی اوٹ سے بولی۔

"بھولا کو باہر بھیجو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے اس سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"بھولا تو اس وقت گھر میں نہیں ہے جی۔"

"وہ کہاں گیا ہے اور تم کون ہو؟" میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

"میرا نام زاہدہ ہے جی۔" اس نے بتایا۔ "اور میں بھولا کی بیوی ہوں۔ بھولا اپنی بہن سے ملنے اگوکی گیا ہوا ہے۔"

اگوکی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو ٹگر والی کے شمال میں دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے زاہدہ سے پوچھا۔

"بھولا اگوکی کب گیا ہے اور اس کی واپسی کب تک ہوگی؟"

"جی، وہ آج صبح ہی اگوکی گیا ہے اور شام تک واپس آجائے گا۔" اس نے جواب دیا پھر پوچھا۔ "آپ کو بھولا

گاڑی کو بریک نہیں لگے گی تو کچھ پیٹ پوجا ہو جائے گی نا۔" چودھری نے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر ان ملازمین کو مختلف ہدایات جاری کرنے لگا۔

ملازمین نے بڑی صفائی اور سلیقے سے وہ نعمتیں ہمارے سامنے چن دیں۔ چونسے آم کی قاشیں، پکے ہوئے جامن، دودھ سے بھرے ہوئے دو جگ اور زیرے والی چاٹی کی نمکین لسی کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ ملازمین واپس چلے گئے تو میں نے کہا۔

"چودھری صاحب! آپ نے بہت زیادہ تکلف کرلیا ہے۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے ملک صاحب۔" وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ "ابھی تو آپ نے دوپہر کا کھانا بھی ادھر ہی کھانا ہے۔ میں آپ کے لیے دیسی ککڑ اور بکری کا گوشت بنوا رہا ہوں......"

"بس بس چودھری صاحب۔" میں نے ہینڈز اپ ہوتے ہوئے کہا۔ "جو سامنے حاضر ہے، اسی سے احسن طریق نمٹ لیا جائے تو کافی ہے۔ دیسی ککڑ اور بکری کی ڈشیں پھر کبھی سہی۔"

"جیسی آپ کی مرضی جناب۔" وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ "میں آپ کے ساتھ زور زبردستی تو نہیں کرسکتا ورنہ آپ مجھے حوالات میں بند کردیں گے۔"

"میں صرف ان لوگوں کو حوالات میں بند کرتا ہوں جنہوں نے کوئی جرم کیا ہوتا ہے۔" میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ "آپ کے حوالے سے ابھی تک میرے پاس ایسی کوئی اطلاع نہیں آئی۔"

"اور انشاء اللہ...... کبھی آئے گی بھی نہیں۔" چودھری نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

ہم خدا کی نعمتوں سے انصاف کرتے ہوئے باہمی گفتگو بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں منظور سنار بھی وہاں حاضر ہوگیا۔ منظور کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ متناسب جسم کا مالک ایک پستہ قامت شخص تھا جس کا سر بالوں ایسی فصل سے لگ بھگ محروم ہوچکا تھا۔

منظور نے جب ماہرانہ انداز میں چاندی کے اس لاکٹ کا معائنہ کیا تو اس کی آنکھوں میں ایک مخصوص قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ شناسائی کی چمک تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے میرے خیال کی تائید کردی۔

منظور کے مطابق، عقیق والا وہ لاکٹ اسی کے ہاتھوں

سے کیا کام ہے..... سب خیریت تو ہے نا؟''

اس دوران میں چند افراد بھی ہمارے ارد گرد جمع ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کے چہروں پر تشویش جھلکتی تھی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ پولیس بھولا کے دروازے تک کیوں پہنچی ہے۔

''اگر سب خیریت ہوتی تو مجھے چل کر یہاں نہ آنا پڑتا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تمہارے گھر میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں آرام سے بیٹھ کر بات ہو سکتی ہو؟''

''جی، میں آپ کے لیے بیٹھک کھولتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ جلدی سے گھر کے اندرونی حصے میں غائب ہو گئی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں زاہدہ کے روبرو اس کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا تھا کہ اس وقت زاہدہ کے سوا اس گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ جب یہی سوال میں نے زاہدہ سے کیا تو اس نے جواب دیا۔

''تھانے دار صاحب! اس گھر میں بھولا اور میں ہی رہتے ہیں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''اب بتائیں، معاملہ کیا ہے؟''

''معاملہ خاصا گمبھیر ہے زاہدہ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چک چوراسی میں ایک بندہ قتل ہو گیا ہے۔''

''چک چوراسی.....'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''کون بندہ قتل ہوا ہے جی؟''

''کیا تم چک چوراسی اور وہاں کے بندوں کو جانتی ہو جو اتنی دلچسپی سے پوچھ رہی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''جی..... جی ہاں.....'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''چک چوراسی میرا میکا ہے جناب۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی تو میں بیاہ کر گھر والی آئی ہوں۔''

''اوہ.....!'' میں زاہدہ کے انکشاف پر چونک اٹھا۔

''اب بتائیں، چک چوراسی میں کون بندہ قتل ہو گیا ہے؟'' اس نے فکرمندی سے دریافت کیا۔

''بندے کا نام ہے مشتاق باجوہ۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''کل رات میں کسی شقی القلب شخص نے اسے باڑے کے اندر سوتے میں بڑی بے دردی سے قتل کر دیا ہے۔''

زاہدہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم مشتاق باجوہ کو اچھی طرح جانتی ہو؟''

''نن..... نہیں جی.....'' اس نے متذبذب انداز میں سرکونفی میں جنبش دی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''دیکھو زاہدہ! میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں ڈراوکھری ٹاپ کا تھانے دار ہوں۔ جو لوگ مجھ سے تعاون کرتے ہیں، میں انہیں ہر قسم کی رعایت دے دیتا ہوں اور جو لوگ مجھے چکر دینے کے لیے غلط بیانی سے کام لیتے ہیں، میں انہیں سخت سزا دے کر نمونۂ عبرت بنا دیتا ہوں اس لیے.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر دھمکی آمیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم مشتاق باجوہ یا اس کے قتل کے بارے میں کچھ جانتی ہو تو مجھے سچ سچ بتا دو.....!''

''نہیں جی..... میں مشتاق باجوہ کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولی۔

''اور مشتاق باجوہ کے بارے میں.....؟''

''کچھ زیادہ نہیں جی۔'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔ ''بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ نذیر باجوہ کا بیٹا تھا اور یہ کہ..... ایک سال پہلے جمیلہ سے اس کی شادی ہوئی تھی لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ آپ مشتاق باجوہ کے قتل کے سلسلے میں ہمارا دروازہ کیوں کھٹکھٹا رہے ہیں؟''

''وہ اس لیے کہ مشتاق باجوہ کے قتل میں تمہارے خاوند بھولا کا ہاتھ ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہائے ربا! میں مر جاواں۔'' وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے پریشانی سے بولی۔ ''بھولا ایسا کام نہیں کر سکتا۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''پولیس غلط فہمی کو بنیاد بنا کر تفتیش نہیں کرتی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ٹھوس ثبوت ہاتھ لگتا ہے جبھی ہم پیش قدمی کرتے ہیں۔''

''بھولا کے خلاف آپ کے پاس کون سا ٹھوس ثبوت ہے؟'' وہ مجھ سے مستفسر ہوئی۔

میں نے عقیق والی چاندی کی زنجیر نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔ ''اس لاکٹ کو

پہچانتی ہو؟"

"یہ تو بھولا کا ہے جی۔" وہ بے ساختہ بول اٹھی۔ "یہ تو ہمیشہ اس کے گلے میں رہتا ہے۔ آپ کو یہ کہاں سے ملا؟"

"جائے وقوعہ سے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مشتاق باجوہ کو قتل کرنے کے بعد فرار کے وقت باڑے کی دیوار پھلانگتے ہوئے یہ لاکٹ اس کے گلے سے گر گیا تھا۔"

پھر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں زاہدہ کو بتایا کہ کس طرح بھولا نے قتل کی اس واردات کو خوشیا ڈنگر چور کے سر ڈالنے کے لیے کسی بارہ پندرہ سالہ بچے کے پاؤں کے نشانات باڑے سے کھیتوں تک بنائے تھے اور اس سائز کی ایک چپل کا پاؤں بھی باڑے میں پھینک دیا تھا اور کس طرح اس نے خود ننگے پاؤں چک چوراسی سے ککر والی تک سفر کیا تاکہ اس کا کھرا پکڑ میں نہ آسکے۔ اس کی بدقسمتی کہ باڑے کی دیوار پھلانگتے ہوئے اس لاکٹ کی زنجیر کھل گئی اور لاکٹ باڑے کے اندر گر گیا۔ پھر اسی لاکٹ نے مجھے تمہارا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور کردیا۔

"پتا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔ "میرا تو دماغ گھوم رہا ہے۔"

"دیکھو زاہدہ......" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر تم اس واردات کے بارے میں کچھ جانتی ہو تو مجھے صاف صاف بتا دو۔ اگر بعد میں مجھے پتا چلا کہ تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے تو بھولا کے ساتھ تم بھی سیدھی جیل جاؤ گی۔"

"نن...... نہیں۔" وہ جلدی سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ "میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں چھپایا جی۔ میں جتنا جانتی تھی، وہ سب آپ کو بتا دیا ہے۔"

"ہوں......" میں نے بدستور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ "تم نے بتایا ہے کہ بھولا اپنی بہن سے ملنے اگوکی گیا ہے۔ اس کی اگوکی والی بہن کا نام کیا ہے؟"

"سلمیٰ......" اس نے جواب دیا۔ "سلمیٰ، بھولا کی بڑی بہن ہے۔"

"سلمیٰ کے گھر والے کا نام کیا ہے؟"

"شوکت علی۔" زاہدہ نے جواب دیا۔ "ان کے پانچ بچے ہیں۔ دو لڑکے اور تین لڑکیاں۔"

"ٹھیک ہے زاہدہ۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ جب شام میں بھولا اگوکی سے واپس آئے تو تم اسے سیدھا میرے پاس تھانے بھیجو گی۔ سمجھ میں آئی میری بات......!"

"تو کیا آپ اسے گرفتار کرنے اگوکی نہیں جائیں گے؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"میں کیا کروں گا اور کیا نہیں کروں گا، یہ تمہارے نہیں، میرے سوچنے کا کام ہے۔" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم مجھے میرا کام سکھانے کی کوشش نہ کرو۔ میں نے تم سے جو کہا ہے، بس اسے یاد رکھو۔"

"جی، جی...... بالکل...... میں سمجھ گئی۔" وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "بھولا جیسے ہی گھر آئے گا، میں اسے آپ کے پاس بھیج دوں گی۔"

میں کھوجی اللہ رکھا کے ہمراہ بھولا کے گھر سے نکل آیا۔ کھوجی نے مجھ سے پوچھا۔

"ملک صاحب! کیا آپ واقعی بھولا کی واپسی کا انتظار کریں گے؟"

"نہیں!" میں نے پوری قطعیت کے ساتھ کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے، ہم اگوکی جارہے ہیں......؟" اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

"ہم نہیں...... تم۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں جناب۔" اس کے لہجے میں حیرانی در آئی۔ "کیا میں اکیلا ہی اگوکی جاؤں گا؟"

"ایسی بھی بات نہیں ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم دونوں تھانے جائیں گے۔ پھر میں تمہارے ساتھ کسی چاق و چوبند اہلکار کو اگوکی کی طرف روانہ کروں گا اور تم دونوں بھولا کو گرفتار کر کے تھانے لاؤ گے، چاہے کتنی بھی دیر لگ جائے۔ بھولا اگوکی سے ککر والی نہیں بلکہ سیدھا حوالات میں پہنچے گا۔"

"جی...... میں سمجھ گیا ساری بات۔" وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر چونک کر مستفسر ہوا۔ "ایک بات تو بتائیں ملک صاحب!"

"ہاں پوچھو چاچا۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

"اگر بھولا کے پاؤں کا کھرا اس ننگے پاؤں والے بندے کے کھرے سے میچ کر جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے قاتل کا سراغ لگا لیا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اور اگر بھولا کا کھرا اس سے مختلف نکلا تو کیا پھر بھی

اسے گرفتار کر کے لانا ہے؟''

''لگتا ہے، تمہیں اپنے انعام کی کچھ زیادہ ہی جلدی ہے۔'' میں نے ڈانٹ سے مشابہ انداز میں کہا۔ ''صورت کوئی بھی ہو، میں آج کی تاریخ میں بھولا کو اپنے سامنے تھانے میں دیکھنا چاہتا ہوں اور جہاں تک کھرے کی میچنگ کا تعلق ہے......'' میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس میچنگ کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے قاتل کو پکڑ لیا۔ جب تک بھولا کا ٹرائل نہ ہو جائے اور یہ پتا نہ چل جائے کہ وہ کون سی اسٹوری سناتا ہے، حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''جی...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم تھانے پہنچ گئے۔

☆☆☆

موسم گرما میں رات چھوٹی اور دن طویل ہوتا ہے اور اس حوالے سے ماہِ جون گرمی کا سردار مہینا تصور کیا جاتا ہے۔ نو جون کی شام ادھر مغرب کی اذان ہوئی، ادھر کھوجی اللہ رکھا اگوکی سے واپس آ گیا۔ میں نے سب انسپکٹر گل داد کو اللہ رکھا کے ہمراہ، بھولا کی گرفتاری کے لیے اگوکی روانہ کیا تھا...... اور وہ دونوں کامیاب لوٹے تھے۔

اسلم عرف بھولا کی عمر کا اندازہ میں نے تیس کے قریب لگایا۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مالک ایک پستہ قامت شخص تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں کا بھی مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ گل داد نے اسے الٹی ہتھکڑی لگا رکھی تھی۔ بھولا اپنی گرفتاری پر کافی مچل بھی رہا تھا۔ جب اسے میرے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے شکایتی لہجے میں مجھ سے کہا۔

''تھانے دار صاحب! ان لوگوں نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔''

گل داد نے اسے دبکا مارا۔ ''اوئے باگڑ بلّے کی اولاد...... قتل کی واردات کرتے ہو اور معصوم بھی بنتے ہو۔ زیادتی کیا ہوتی ہے، یہ تو تمہیں حوالات میں جا کر پتا چلے گا۔''

میں نے اشارے سے اللہ رکھا کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ ''تم نے کھرے کا تجربہ کر لیا...... کیا رپورٹ ہے؟''

''تجربہ تو ادھر اگوکی ہی میں کیا ہے جناب۔'' اللہ رکھا نے بتایا ''جب ہم یہاں پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ چک چوراسی میں مقتول کے باڑے سے کھیتوں تک کا تجربہ کل صبح ہی ہو سکے گا۔''

''وہ کل کی کل ہی دیکھی جائے گی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''اگوکی والے تجربے کی کیا رپورٹ ہے؟''

''وہ رپورٹ تو حوصلہ افزا نہیں ہے جی۔'' وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے ننگے پاؤں والے جس بندے کا کھرا نکالا ہے، وہ بھولا کے پاؤں سے میچ نہیں کرتا جناب۔'' اللہ رکھا صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اصل پتا اسی وقت چلے گا جب صبح جائے وقوعہ پر جا کر بھولا کے پاؤں کے نشانات کو چیک کیا جائے گا۔''

کھوجی کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اسے اگلی صبح تھانے میں حاضر ہونے کی تاکید کرنے کے بعد گھر جانے کی اجازت دے دی پھر بھولا کی جانب متوجہ ہو گیا۔

وہ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا اور یہ کہ ہم کسی غلط فہمی کی بنا پر اسے پکڑ لائے ہیں۔ میں چند لحات تک ٹٹولنے والی نگاہ سے اسے دیکھتا رہا پھر چاندی کی زنجیر والا لاکٹ اس کی نگاہ کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

''اسے پہچانتے ہو؟''

اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہوئی اور وہ سرسراتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوا۔

''یہ آپ کو کہاں سے ملا؟''

''پہلے میرے سوال کا جواب دو۔'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی پہچانتا ہوں۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ میرا ہے...... اپنی چیز کو کوئی کیسے نہیں پہچانے گا تھانے دار صاحب۔''

''اگر تم نے مشتاق باجوہ کو قتل نہیں کیا تو تمہارا یہ لاکٹ مقتول کے باڑے میں بیٹھا انڈے دے رہا تھا کیا......'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''یہ ہمیں جائے وقوعہ سے ملا ہے۔''

''جناب...... سوہنے رب دی قسم! میں نہیں جانتا یہ جائے واردات تک کیسے پہنچا۔'' وہ گھگیانے والے انداز میں بولا۔ ''میں تو خود اسے تلاش کر کر کے تھک گیا ہوں۔ میں نے بڑے چاؤ سے یہ لاکٹ منظور سنار سے بنوایا تھا۔''

''تم اسے تلاش کیوں کر رہے تھے؟'' میں نے سخت

لہجے میں دریافت کیا۔
"تین چار دن پہلے یہ گم ہو گیا تھا۔" اس نے بتایا۔
"کیا تم اسے کہیں رکھ کر بھول گئے تھے؟" میں نے ایک امکانی بات کی۔ "تمہارا نام بھولا ہے نا...... بھولا سے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔"
"نہیں جی۔ مجھ سے کوئی بھول چوک نہیں ہوئی۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں تو اسے گلے سے اتارتا ہی نہیں تھا۔"
"اوئے ایکٹر کی اولاد......" میں نے گھور کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "میرے سامنے اداکاری کی تو اتنا ماروں گا کہ آنے والی سات نسلیں گنجی پیدا ہوں گی۔"
"جناب! میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ فریادی لہجے میں بولا۔
"سچ کے گھوڑے!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اگر تم اس لاکٹ کو گلے سے اتارتے ہی نہیں تھے تو پھر یہ غائب کیسے ہو گیا۔ کیا اس کے پر نکل آئے تھے جو "پھر" سے اڑ گیا اور تمہیں کانوں کان خبر نہ ہوئی؟"
"تھانے دار صاحب! جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ تین چار دن پہلے یہ لاکٹ گم ہو گیا تھا۔" وہ حسب استطاعت وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ایک رات میں گھر آ کر سویا اور جب صبح اٹھا تو یہ میرے گلے میں موجود نہیں تھا۔ میں نے اور زاہدہ نے گھر کا چپا چپا دیکھ لیا لیکن کہیں بھی لاکٹ نہیں ملا۔ پھر میرے ذہن میں یہی آیا کہ رات کو کھیتوں سے واپسی پر راستے میں کہیں گر گیا ہوگا......"
لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
"اگلی صبح میں نے سارا راستہ چھان مارا اور کھیتوں میں بھی اچھی طرح دیکھ لیا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا اور اب...... آپ کے پاس ہے یہ...... میں کچھ نہیں جانتا کہ یہ آپ تک کیسے پہنچا......؟"
"تمہارے تو بڑے بھی جان جائیں گے کہ کیسے پہنچا، ایسے پہنچا، یا ویسے پہنچا۔" سب انسپکٹر گل واد نے گردن سے پکڑ کر اسے ایک جھٹکا دیا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔
"ملک صاحب! آپ آج رات کے لیے اسے میرے حوالے کر دیں۔ صبح تک اس کی زبان کے سارے قفل کھل جائیں گے۔"
"جناب! میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"
ایک لمحے کے لیے وہ مجھے انتہائی بے بس دکھائی دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا اور اگر وہ ایکٹنگ کر رہا تھا تو پھر اس کی اداکاری کو لاجواب اور بے مثال کہا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
"بھولا! تم سات اور آٹھ جون کی درمیانی رات کہاں تھے؟"
مشتاق باجوہ کے قتل کی اطلاع آٹھ جون کی صبح تھانے پہنچائی گئی تھی اور لاش کی حالت سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اسے رات کے آخری حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا یا نصف شب کے قریب یہ واقعہ پیش آیا تھا۔
"جی...... اس رات میں چک چوراسی میں تھا۔" بھولا نے جواب دیا۔
میرا ماتھا ٹھنکا۔ "چک چوراسی......" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "مشتاق باجوہ کو بھی تو چک چوراسی ہی میں قتل کیا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ تمہارا اس واردات سے کوئی تعلق واسطہ نہیں...... ہوں؟"
"جناب! مجھے تو آپ کے لوگوں کی زبانی پتا چلا کہ مشتاق باجوہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔" وہ مسکین سے لہجے میں بولا۔ "میں تو آٹھ جون کی صبح ہی چک چوراسی سے نکل آیا تھا اور اس وقت تک ایسی کوئی بات میرے سننے میں نہیں آئی تھی۔"
"تم چک چوراسی گئے کب تھے؟" میں نے اسے کریدا۔
"جی سات جون کی شام میں چک چوراسی پہنچا تھا۔" اس نے بتایا۔
"تم چک چوراسی کس مقصد سے گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔ "اور کس کے گھر گئے تھے؟"
"جی، میں اپنی سسرال گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "ادھر چک چوراسی میں زاہدہ کے ماں باپ رہتے ہیں۔ زاہدہ نے کچھ سامان دے کر مجھے ان کے پاس بھیجا تھا۔"
زاہدہ کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ اس کا تعلق بھی چک چوراسی ہی سے تھا۔ چند ماہ پہلے وہ بیاہ کر لکھوانی آئی تھی۔
"کیا زاہدہ کے گھر والے یعنی تمہارے سسرالی اس

بات کی گواہی دیں گے کہ تم نے سات اور آٹھ جون کی درمیانی رات ان کے گھر میں گزاری تھی؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

''جی ضرور...... وہ لوگ گواہی دیں گے۔'' اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، میں کل صبح انہیں یہاں بلا کر ان کا بیان لوں گا پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور جب تک تمہاری ذات شک کے دائرے سے باہر نہیں آجاتی، تم سرکاری مہمان خانے میں رہو گے۔''

''سرکاری مہمان خانہ......'' وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''تھانے کی حوالات......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ میرے تھانے کا عملہ بہت مہمان نواز ہے۔ تمہیں یہاں کسی قسم کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا جائے گا۔''

میری معنی خیز، سنسناتی گفتگو کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کے بعد وہ فکرمند نظر آنے لگا۔ میں نے اسے سب انسپکٹر گل داد کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارا مہمان ہے گل داد! ذرا اس کی ٹہل سیوا کرو۔ صبح اس سے بات ہوگی۔ اس کے طعام قیام اور منجی بسترے کا خاص خیال رکھنا۔''

میرے تھانے کا عملہ ان پیشہ ورانہ مخصوص جملوں کا مفہوم اچھی طرح سمجھتا تھا۔ گل داد بھولا کو میرے کمرے سے لے جانے لگا تو میں نے پوچھا۔

''گل داد...... صبح تک کام ہو جائے گا نا؟''

''آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک ہی رات میں اس بھولا کو دنیا کا تیز طرار انسان بنا دوں گا۔ صبح تک اس کی زبان کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگے گی۔''

مجھے گل داد کی ''تفتیشی'' صلاحیتوں پر مکمل بھروسا تھا۔ تھوڑی سی پھینٹی شینٹی لگتی تو بھولا راہِ راست پر آجاتا اور اپنے جرم کا اقرار کر لیتا۔ جو بات مجھے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ ابھی تک قتل کا کوئی محرک سامنے نہیں آیا تھا۔ اگر کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا کہ بھولا نے مشتاق باجوہ کو کیوں قتل کیا ہے تو اس عقدے کو حل کرنا بہت آسان ہو جاتا۔

میں ابھی تک تذبذب کا شکار تھا۔ بھولا کا ردِعمل اور رویہ یہ محسوس کراتا تھا کہ اس کا قتل کی اس واردات میں کوئی ہاتھ نہیں لیکن واقعات کی کڑیاں کچھ اور ہی بیان کر رہی تھیں۔ بھولا کا پسندیدہ لاکٹ جائے وقوعہ پر پڑا ملا تھا اور ابھی تازہ تازہ انکشاف یہ ہوا تھا کہ سات اور آٹھ جون کی درمیانی رات بھولا نے موضع چک جورا ہی میں گزاری تھی۔ چک جورا وہی گاؤں تھا جہاں ایک باڑے میں اسی رات کے درمیانی یا آخری حصے میں مشتاق باجوہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ گویا وقوعہ کی رات بھولا جائے واردات کے بہت قریب موجود تھا۔ یہ تمام عوامل بھولا کے مجرم ہونے کی جانب اشارہ کرتے تھے۔

میں اسی ادھیڑ بن میں تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آگیا تاہم رات جب تک میں سو نہیں گیا، مشتاق باجوہ کے قتل اور اس کے محرکات کی ایک فلم سی میرے دماغ میں چلتی رہی اور مجھے نہیں پتا، میں کب نیند کی وادی میں اتر گیا۔

☆☆☆

دس جون کی صبح خلافِ معمول نرم خو تھی، مطلب یہ کہ اس روز سورج جلالیت کے بجائے جمالیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ آسمان ابر آلود اور فضا ساکت تھی۔ نہ گرمی اور نہ خنکی۔ بس غیر یقینی سی صورتِ حال تھی البتہ دھوپ کا کہیں نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو میں نے نذیر باجوہ اور اس کے چھوٹے بیٹے یوسف باجوہ کو برآمدے میں بیٹھے دیکھا۔ نذیر باجوہ نے اٹھ کر مجھے سلام کیا۔ میں سر کی اثباتی جنبش سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کھوجی بابا اللہ رکھا میرے پاس آگیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ ''کیا حکم ہے ملک صاحب!''

''جو کام کل ادھورا چھوڑا تھا اس کی تکمیل ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''بس فی الحال تو تمہارے لیے یہی حکم ہے۔''

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بھولا کو اپنے ساتھ جائے وقوعہ تک لے جاؤں؟'' وہ سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کے پاؤں کے فریش کھرے کی موجودگی میں کام آسان اور جلدی ہو جائے گا۔ میں گھنٹے، دو گھنٹے میں واپس آکر آپ کو فائنل رپورٹ دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''تم باہر جا کر بیٹھو۔ میں تھوڑی دیر میں تمہیں بلاتا ہوں۔''

''بہتر جناب!'' اس نے کہا اور میرے کمرے سے

نکل گیا۔

میں نے سب انسپکٹر گل داد کو اپنے پاس بلالیا۔ گزشتہ رات میں نے بھولا کو اسی کے سپرد کیا تھا۔ جب گل داد میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا۔

''مہمان کا کیا حال ہے؟''

''بندہ بڑا سخت جان ہے جناب!'' گل داد نے بتایا۔ ''زبان کھولنے کو تیار نہیں۔''

''اوہ......'' میں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اس کی زیادہ خاطر داری تو نہیں کر دی؟ وہ چلنے پھرنے کے قابل تو ہے نا......!''

''نہیں جناب......'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کی ہدایات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ ہڈی پسلی سب سلامت ہے اس کی۔''

''اسے میرے پاس لے آؤ۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے کہ گل داد بھولا کو میرے پاس لے کر آتا، مشتاق باجوہ کی پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی۔ میں نے فوراً وہ رپورٹ پڑھی۔ تحریر انگریزی میں تھی جس کا اردو میں مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق مشتاق باجوہ کی موت سات اور آٹھ جون کی درمیانی رات، نصف شب کے قریب واقع ہوئی تھی۔ موت کا وقت رات بارہ اور دو بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ یہ رپورٹ میرے اندازے کی بھی تصدیق کرتی تھی، مطلب یہ کہ مشتاق باجوہ کو حالتِ نیند میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی گردن اور سینے پر کسی تیز دھار آلے کے متعدد وار کیے گئے تھے۔ آلۂ قتل کے بارے میں خنجر کا گمان ظاہر کیا گیا تھا۔ درجنوں مہلک وار میں سے سب سے کاری ضرب وہ تھی جب تیز دھار خنجر کو اس کی شہ رگ پر آزمایا گیا تھا۔ رگِ جان کٹ جانے کے باعث اتنا زیادہ خون بہہ گیا تھا کہ مشتاق باجوہ موت کے منہ میں چلا گیا۔

یہاں پر ایک بات قابلِ غور تھی اور وہ یہ کہ قاتل جو کوئی بھی تھا وہ مقتول سے شدید نوعیت کی نفرت بھی کرتا تھا۔ اگر محض مشتاق باجوہ کی جان لینا ہی مقصود ہوتا تو اس کی یقینی موت کے لیے شہ رگ پر کیا جانے والا وار ہی کافی تھا۔ سینے، گردن اور پیٹ کے مختلف حصوں کو خنجر کی نوک کی مدد سے گودڈالنا قاتل کی ذہنی اور قلبی کیفیت کی عکاسی کرتا تھا۔ یہ ایک شدید نوعیت کی انتقامی کارروائی تھی۔ قاتل اپنا کلیجا ٹھنڈا کرنے کے لیے درندہ بن گیا تھا۔

میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد لفافے میں ڈالا اور اس لفافے کو اپنی میز کی دراز میں رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے گل داد، بھولا کو لے کر میرے پاس پہنچ گیا۔

بھولا نوٹ پھوٹ کا شکار تو نظر نہیں آتا تھا تاہم اس کی حالت سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ گل داد نے اسے خاطر داری کے نام پر پوری رات جگایا تھا اور یقیناً بھوکا پیاسا بھی رکھا تھا۔ وہ میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! آپ لوگ میرے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہیں۔ میں کس طرح آپ کو یقین دلاؤں کہ میں نے مشتاق باجوہ کو قتل نہیں کیا۔ میں بے گناہ ہوں جناب......''

''تم کتنے بے گناہ ہو اور کتنے گناہ گار، اس کا فیصلہ بس تھوڑی ہی دیر میں ہونے والا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اور جہاں تک زیادتی کی بات ہے تو دعا کرو مجھے تمہارے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو ورنہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ٹرائل روم میں کیا کیا ہوتا ہے اور کیا کیا ہو سکتا ہے۔''

''جناب......میں نے کوئی جرم نہیں کیا......'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''آپ مجھے معاف کر دیں اور گھر جانے دیں۔''

''بڑی جلدی ہے تمہیں گھر جانے کی۔'' گل داد نے اس کی پنڈلی پر سرکاری بوٹ سے ٹھوکر رسید کرتے ہوئے خونخوار لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے سچ نہ اگلا تو یہاں سے سیدھے بڑے گھر جاؤ گے......ڈسٹرکٹ جیل!''

''ایک تو آپ نے مجھے کل سے بھوکا پیاسا رکھا ہوا ہے، اوپر سے مارتے بھی ہیں۔'' وہ فریادی لہجے میں بولا پھر آسان (میرے کمرے کی چھت) کی جانب نگاہ اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔

''یا اللہ......تو ہی میری مدد فرما...... میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں......''

''اللہ اپنے انہی بندوں کی مدد فرماتا ہے جو اس کی راہ پر چل رہے ہوتے ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''زاہدہ کے ماں باپ کے نام کیا ہیں؟''

اس نے ایک لمحے کے لیے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا پھر بتایا۔ ''زاہدہ کی ماں کا نام بشیراں اور باپ کا نام قاسم ہے۔''

ٹھیک ہے جب میں ابھی قاسم اور بشیراں کو تھانے بلا

کر تمہارے بیان کی تصدیق کرتا ہوں کہ وقوعہ کی رات تم ان کے گھر پر تھے یا نہیں اور اگر تھے تو رات کے آخری حصے میں تم تھوڑی دیر کے لیے کہیں گئے تو نہیں تھے۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مشتاق باجوہ کو اس رات بارہ اور دو بجے کے درمیان قتل کیا گیا ہے۔''

''آپ جیسے دل چاہے، اپنی تسلی کرلیں تھانے دار صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔''

میں نے گل داد کو خصوصی ہدایات دے کر اللہ رکھا اور بھولا کے ہمراہ چک چوراسی کی جانب روانہ کر دیا۔ اللہ رکھا کو بھولا کا کھرا نکال کر جائے وقوعہ پر پائے جانے والے کھرے سے اس کا ملاپ اور موازنہ کرنا تھا اور گل داد کو بھولا پر گہری نگاہ رکھنا تھی کہ وہ ادھر ادھر کھسکنے کی کوشش نہ کرے۔ ویسے بھولا کو احتیاطاً ہتھکڑی بھی پہنا دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں گل داد کو ایک اور کام بھی کرنا تھا اور وہ یہ کہ.... چک چوراسی کے وسنیک اور بھولا کے سسر قاسم کو تھانے حاضر ہونے کا حکم دینا تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے نذیر باجوہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

جب آج میں تھانے آیا تھا تو میں نے نذیر باجوہ کو اپنے چھوٹے بیٹے یوسف باجوہ کے ساتھ تھانے کے برآمدے میں بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ بھولا کی گرفتاری ان کی نظر سے اوجھل رہی ہو۔ ابھی چند لمحے پہلے وہ ہتھکڑی لگے ہاتھوں کے ساتھ ان کے سامنے سے گزر کر میرے کمرے تک آیا تھا اور پھر یہاں سے واپس گیا تھا۔ میں نے صرف نذیر باجوہ کو اپنے پاس بلایا تھا۔ اس کا چھوٹا بیٹا باہر ہی بیٹھا ہوا تھا۔

نذیر باجوہ نے مجھے سلام کیا اور میرے اشارے پر ایک کرسی کھینچ کر میز کی دوسری طرف بیٹھ گیا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس نے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! مشتاق کے قاتل کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے؟''

''ہاں نذیر، کافی کچھ پتا چلا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''دو تین گھنٹے میں بہت سی چیزیں فائنل ہوجائیں گی۔''

''جناب! یہ کیا ماجرا ہے......'' وہ آواز دبا کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے ابھی بھولا کو دیکھا ہے۔ اسے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟''

''کیا تم بھولا کو جانتے ہو؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔

''جی...... بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو چک چوراسی کا جمائی (داماد) ہے سرکار اور......''

نذیر باجوہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور استفسار کیا۔

''اور...... کیا؟''

''وہ جناب......'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ بھولا کی جس لڑکی سے شادی ہوئی ہے نا، اس کا تعلق بھی چک چوراسی ہی سے ہے۔ وہ چند ماہ پہلے ہی تو یہاں سے بیاہ کر لگر والی گئی تھی۔''

یہ بات مجھے بھولا کی بیوی زاہدہ کی زبانی معلوم ہو چکی تھی۔ میں نے نذیر باجوہ کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''تم زاہدہ کی بات کر رہے ہو نا...؟''

''جی جی...... زاہدہ ہی سے بھولا کی شادی ہوئی ہے۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ جو زاہدہ ہے نا......'' وہ ایک مرتبہ پھر بولتے بولتے اٹک گیا۔

''کیا ہوا زاہدہ کو؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ جی...... یہ تو بتائیں کہ آپ نے بھولا کو کس چکر میں گرفتار کیا ہے؟'' میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ کنی کاٹ گیا تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''نذیر! جو میں نے پوچھا ہے، پہلے اس کا جواب دو۔''

''جناب چھوڑ دیں...... مٹی ڈالیں......'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

''میں نہ تو اس بات کو چھوڑ سکتا ہوں اور نہ ہی اس پر مٹی یا مٹی کا تیل ڈال سکتا ہوں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تم زاہدہ کا ذکر اچانک گول کیوں کر گئے؟''

وہ مجھے خاصا متذبذب دکھائی دیا۔

''نذیر! کیا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارے بیٹے کے قاتل کو جلد از جلد گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دوں۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اگر تم اسی طرح عدم تعاون کا مظاہرہ کرتے رہے تو مجھے نہیں لگتا کہ پھر یہ نیل

منہ سے چڑھ سکے.....'' میں نے ذرا سا توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر ڈرامائی لہجے میں کہا۔

''بھولا کو میں نے مشتاق کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے......!''

''کک......کیا......!'' وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔

''کیا بھولا نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا ہے؟''

''ابھی تک اس نے اپنی زبان سے اقرار نہیں کیا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرے پاس بڑی مضبوط واقعاتی شہادتیں ہیں اس کے خلاف......''

پھر میں نے نذیر باجوہ کو جائے وقوعہ سے ملنے والے چاندی کے اس لاکٹ کی کہانی سنائی جس میں ایک عمدہ قسم کا عقیق جڑا ہوا تھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر میری بات سنتا رہا اور میرے خاموش ہونے پر اس کے ہونٹوں سے سرسراتا ہوا جملہ جدا ہوا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ بھولا کی مشتاق سے کیا دشمنی تھی......!''

''تمہاری سمجھ میں جو بات ٹھیک طرح سے بیٹھ نہیں رہی، اس کے لیے اپنے دماغ کو مت تھکاؤ نذیر باجوہ۔ دوپہر تک اس کیس کی ہر گتھی سلجھ جائے گی۔ تم مجھے زاہدہ کے بارے میں بتاؤ۔ تم اس کے ذکر پر مٹی ڈلوا کر دفن کیوں کرنا چاہتے ہو؟''

وہ ایک لمحے کے لیے ''نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن'' والی کیفیت میں گرفتار رہا پھر تھوڑا سا آگے جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! میرا نام نہیں آنا چاہیے۔ میں ایک عزت دار آدمی ہوں اور دوسروں کی بھی عزت کرتا ہوں۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں نذیر۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم بے فکر ہوکر پورے اعتماد کے ساتھ مجھ سے بات کرسکتے ہو۔ سمجھ لو کہ ہمارے درمیان ہونے والی باتیں اسی کمرے میں دفن ہوجائیں گی۔ کوئی ان کی بازگشت بھی نہیں سن سکے گا۔''

میرے حوصلہ دلانے پر وہ خاصا ریلیکس اور ایزی نظر آنے لگا اور بولا۔ ''اصل میں جناب...... یہ زاہدہ بڑی فتنہ پرور لڑکی ہے۔ سوہنے رب نے تو اپنا کرم کرکے ہمیں صاف بچالیا۔ بے چارہ بھولا اس سے شادی کرکے اپنے نصیب کو کھا بیٹھا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں نذیر۔'' میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ ''ذرا کھل کر بتاؤ کہ زاہدہ کی فتنہ پروری کا تمہارے ساتھ کیا تعلق ہے۔ تمہیں خدا نے کن معنوں میں اس کے شر سے بچالیا؟''

''بات دراصل یہ ہے جناب کہ زاہدہ میرے مشتاق کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔''

''پیچھے پڑی ہوئی تھی...... کیا مطلب؟'' نذیر کے انکشاف پر میں چونک اٹھا۔

''جی وہ مشتاق سے شادی کرنا چاہتی تھی۔'' نذیر باجوہ نے بتایا......

میرا ذہن تیز رفتاری سے کام کرنے لگا۔ مجھے یقین ہو چلا کہ مشتاق باجوہ کے قتل کے حوالے سے کسی عظیم راز سے پردہ اٹھنے والا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''اور تم نے اپنے بیٹے کی شادی زاہدہ سے نہیں ہونے دی...... ہیں نا؟''

''کیسے ہونے دیتا تھانے دار صاحب۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''ایک تو وہ نیچ ذات ہے۔ کہاں تو ہم باجوہ اور کہاں وہ نائی......''

''میری نظر میں ذات برادری کی کوئی اہمیت نہیں نذیر باجوہ۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمام انسانوں کا ایک ہی خالق ہے۔ انسان نے خود ہی اپنے آپ کو مختلف گروہوں، ذاتوں اور خاندانوں میں تقسیم کرلیا ہے۔''

''میں آپ کی بات کو رد نہیں کروں گا تھانے دار صاحب۔'' وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ ''لیکن انسان کا کردار بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نا......!''

''بالکل!'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔ ''انسان کے کردار اور اخلاق کی بڑی اہمیت ہے۔''

''بس جناب! یہی اصل بات ہے۔'' وہ چاروں جانب نگاہ دوڑانے کے بعد سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔ ''اسی وجہ سے میں نے مشتاق کے لیے زاہدہ کا رشتہ قبول نہیں کیا تھا۔''

''گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ زاہدہ ایک بداخلاق اور بدکردار عورت ہے؟'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ''زاہدہ ایک تو زبان کی بہت تیز ہے۔ مطلب یہ کہ بدکلام ہے اور دوسرے یہ کہ اس کا چال چلن بھی ٹھیک نہیں لیکن تھانے دار صاحب......'' لحاتی توقف کرکے اس نے امید بھری نظر

سے مجھے دیکھا اور یاد دہانی کرانے والے انداز میں بولا۔
''میرا نام نہیں آنا چاہیے۔ میں خدا کے قہر سے ڈرتا ہوں۔ زاہدہ کا کردار اس کے ساتھ ہے۔ مجھے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں۔''
''میں نے کہا ہے نا، تمہارا کہیں نام نہیں آئے گا۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس سلسلے میں تمہیں بالکل پریشان نہیں ہونا چاہیے لیکن......''
میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تشویش بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''لیکن کیا جناب؟''
''لیکن یہ کہ میں تمہاری طرح اس معاملے سے ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''مجھے اس معاملے سے بہت کچھ لینا دینا ہے۔ بھولا تمہارے بیٹے کے قتل کے الزام میں زیرِ حراست ہے اور زاہدہ اسی بھولا کی بیوی ہے اور تم بتا رہے ہو کہ زاہدہ ایک بدکلام اور بدکردار عورت ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ زاہدہ تمہارے بیٹے سے شادی کی خواہاں تھی۔ جب اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تو وہ انتقاماً کچھ بھی سوچ سکتی ہے...... کچھ بھی کرسکتی ہے۔ میں اس نکتے کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔''
''آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''مشتاق کی شادی کے بعد اس نے بڑی بکواس کی تھی۔''
''کس قسم کی بکواس؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔
''زاہدہ کا خیال تھا کہ جمیلہ کی وجہ سے اس کی شادی مشتاق سے نہیں ہوسکی۔'' نذیر باجوہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ ہر طرف یہ کہتی پھرتی تھی کہ مشتاق بھی اس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر جمیلہ نے اس کے کردار کے حوالے سے گندی باتیں کر کے مشتاق کو بدگمان کردیا تھا اس لیے یہ شادی نہ ہوسکی۔''
''تو کیا واقعی مشتاق بھی زاہدہ سے شادی کی خواہش رکھتا تھا؟''
''زاہدہ جھوٹ بولتی ہے جناب۔'' میرے استفسار کے جواب میں نذیر باجوہ نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ زاہدہ کا دماغ خراب ہوگیا تھا۔ شکر ہے، اس کی شادی ہوگئی۔ وہ چک چوراسی سے رخصت ہوکر لکھوالی گئی اور ہماری جان چھوٹی۔''
''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ زاہدہ کی جمیلہ سے کیا دشمنی تھی؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں دریافت کیا۔ ''وہ سارا الزام جمیلہ پر کیوں ڈال رہی تھی؟''
''میں نے عرض کیا نا...... اپنے مقصد میں ناکامی نے اس کی مت ماردی تھی۔'' اس نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ایک دو جگہ تو وہ یہ کہتے ہوئے بھی سنی گئی کہ وہ بہت جلد جمیلہ کا گھر اجاڑ کر رکھ دے گی۔''
نذیر باجوہ کی زبانی یہ ایک سنگین انکشاف تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا تم ان ایک دو افراد کے نام بتا سکتے ہو جن سے زاہدہ نے جمیلہ کا گھر اجاڑنے کی بات کی تھی؟''
''نہیں جناب......'' وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو ایک سال پرانی بات ہے۔ اب میرے ذہن میں نہیں کہ وہ کون لوگ تھے۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں کل بھولا کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ لیتا ہوں۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا اور اس کے علاوہ میں زاہدہ کو تھانے بلا کر اس کا انٹرویو بھی کرتا ہوں۔''
''میرے لیے کیا حکم ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مشتاق کی لاش مجھے کب تک مل جائے گی؟''
''میرا خیال ہے، آج دوپہر کے بعد اسپتال سے تمہارے بیٹے کی لاش تھانے پہنچ جائے گی۔'' میں نے امکانی لہجے میں کہا۔ ''رسمی سی کاغذی کارروائی کے بعد میں مشتاق کی لاش تمہارے حوالے کردوں گا۔''
''میں یوسف کو تھانے ہی میں چھوڑ کر جارہا ہوں۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''ادھر گھر میں بھی کام کافی پڑے ہیں۔ مشتاق کی تجہیز و تکفین کا بندوبست بھی کرنا ہے۔''
''ٹھیک ہے، تم بے فکر ہوکر چک چوراسی جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں مشتاق کی لاش یوسف کے سپرد کردوں گا۔''
نذیر باجوہ کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ زاہدہ کے حوالے سے اس نے جو انکشافات کیے تھے، وہ موجودہ صورت حال میں بہت اہمیت کے حامل تھے۔ وہ اپنی خواہش میں ناکام ہونے کے بعد جمیلہ اور مقتول مشتاق باجوہ کے لیے اپنے دل و دماغ میں نفرت کا ایک طوفان چھپائے بیٹھی تھی۔ ممکن ہے، اسی نے خوشیا ڈنگر چور کے ذریعے مشتاق کا کام تمام کروادیا ہو......
اگر زاہدہ نے ہی اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مشتاق کو ٹھکانے لگوایا تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا

کہ اس نے اپنے شوہر کو قربانی کا بکرا کیوں بنایا؟ اس بات کا قوی امکان تھا کہ زاہدہ ہی نے بھولا کا یمنی عقیق والا لاکٹ چرا کر قاتل کے حوالے کیا ہوگا تاکہ وہ مذکورہ لاکٹ کو جائے وقوعہ پر پھینک دے اور اس واردات کا شک بھولا کی طرف چلا جائے مگر پھر بات وہی تھی کہ وہ اس واردات میں اپنے خاوند کو کیوں پھنسانا چاہتی تھی؟

میں جوں جوں سوچتا گیا، میری الجھن میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی دوران میں مجھے زاہدہ کی چند ایسی باتیں بھی یاد آئیں جو اس تازہ ترین صورتِ حال میں اس کی ذات کو شکوک و شبہات کی دبیز چادر میں لپٹتی دکھائی دیتی تھیں۔ میں اسی فیصلے پر پہنچا کہ مجھے زاہدہ کو فوری طور پر تھانے بلا کر اس سے کڑی پوچھ تاچھ کرنا چاہیے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی میں نے ایک مستعد پولیس اہلکار کو گکروالی کی جانب روانہ کر دیا تاکہ وہ پہلی فرصت میں زاہدہ کو اپنے ساتھ تھانے لے آئے۔

☆☆☆

دس جون دوپہر کے بعد حالات میں اچانک بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اسپتال سے مشتاق باجوہ کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش آئی تو میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لاش کو یوسف باجوہ کے حوالے کر دیا۔

یوسف باجوہ جیسے ہی اپنے بھائی کی لاش لے کر تھانے سے نکلا، بارش شروع ہوگئی۔ آج صبح ہی سے موسم کے تیور بدلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ مطلع ابرآلود تھا اور اب باقاعدہ بارش شروع ہوگئی تھی تاہم اس برسات میں وہ تیزی اور تندی ہرگز نہیں تھی کہ اسے موسلا دھار کے خطاب سے نوازا جاتا۔

کچھ دیر کے بعد زاہدہ کے ماں باپ بھی تھانے پہنچ گئے۔ قاسم اور اس کی بیوی بشیراں کافی پریشان نظر آتے تھے۔ انہیں یہ خبر مل چکی تھی کہ میں نے ان کے داماد بھولا کو مشتاق باجوہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر رکھا ہے۔

''تھانے دار صاحب! اس رات تو بھولا ہمارے گھر میں تھا۔'' قاسم نے بتایا۔ ''اس نے قتل نہیں کیا۔''

''میں نے اسی لیے آپ دونوں کو تھانے بلایا ہے کہ وقوعہ کی رات بھولا تمہارے گھر میں تھا۔'' میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تاکہ یہ تصدیق ہوسکے کہ وہ پوری رات گھر کے اندر ہی موجود رہا تھا یا تھوڑی دیر کے لیے ادھر ادھر بھی ہوا تھا؟''

''وہ جی... گھر پر ہی تھا...'' بشیراں نے اٹک اٹک کر بتایا پھر پوچھا۔ ''آپ نے کس بنا پر بھولا کو گرفتار کیا ہے؟''

میں نے ان دونوں میاں بیوی کو یمنی عقیق والا چاندی کا لاکٹ دکھایا اور اس لاکٹ کے حوالے سے ساری کہانی سنا دی۔ میرے خاموش ہونے پر قاسم نے کہا۔

''جناب! یہ زنجیر تو بھولا ہی کی ہے۔ پر اس نے تو بتایا تھا کہ اس واقعے سے تین چار دن پہلے یہ لاکٹ کہیں گم ہوگیا تھا۔''

''اس نے مجھے بھی یہی کہانی سنائی ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کی کہانی کی تصدیق کے لیے میں نے زاہدہ کو تھانے بلایا ہے۔''

''زاہدہ...!'' بشیراں یک بیک پریشان دکھائی دینے لگی۔ ''وہ کیا تصدیق کرے گی تھانے دار صاحب؟''

''زاہدہ سے گکروالی میں میری بات ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اس کی کچھ باتیں بھولا کے بیان سے لگا نہیں کھاتیں۔ بس انہی کے بارے میں زاہدہ سے پوچھ کچھ کرنا ہے۔''

''مثلاً کون سی باتیں جناب؟'' قاسم نائی نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے تفتیش میں رکاوٹ کھڑی ہوسکتی ہے۔''

وہ دونوں الجھن زدہ نظروں سے مجھے تکنے لگے۔

میں نے باری باری ان کے چہروں پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیا اور کہا۔ ''تم لوگوں کو یقین ہے کہ وقوعہ کی پوری رات بھولا تمہارے گھر کے اندر موجود رہا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے بھی گھر سے غائب نہیں ہوا تھا خصوصاً آدھی رات کے بعد جب مشتاق باجوہ کو قتل کیا گیا تھا؟''

''جی بالکل نہیں۔'' قاسم نائی نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''وہ ساری رات بھولا نے ہمارے ہی گھر میں گزاری تھی۔''

''ٹھیک ہے، تم لوگ واپس جاسکتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں دوبارہ بلا لوں گا۔''

''کیا ہم بھولا سے دو باتیں کرسکتے ہیں؟'' بشیراں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ''وہ زیرِ تفتیش ہے، کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔''

سچی بات تو یہ تھی کہ بھولا اس وقت تھانے میں موجود

ہی نہیں تھا۔ میں نے اسے کھوجی اللہ رکھا اور سب انسپکٹر گل داد کے ہمراہ چک چورا ہی بھیجا ہوا تھا۔

قاسم نے پوچھا۔ ''کیا ہم اس وقت تک تھانے میں رک سکتے ہیں جب تک زاہدہ یہاں نہ پہنچ جائے؟ اصل میں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی پوچھ گچھ کے بعد جب وہ فارغ ہو تو ہم اسے اپنے ساتھ چک چورا ہی لے جائیں۔ بھولا آپ کی حراست میں ہے۔ زاہدہ ادھر گکروالی میں اکیلی کیا کرے گی۔''

اس کی خواہش معقول اور جائز تھی لہٰذا میں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ باہر برآمدے میں بیٹھ کر اپنی بیٹی کا انتظار کر سکتے ہیں۔''

وہ دونوں میرا شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل گئے۔

تھوڑی دیر میں کھوجی اللہ رکھا، بھولا کو لے کر واپس آ گیا۔ میں نے گل داد کو حکم دیا کہ وہ بھولا کو حوالات میں بند کر دے اور کسی کو اس سے ملنے نہ دے پھر میں اللہ رکھا کی جانب متوجہ ہوا۔

''ہاں بھئی چاچا! کیا رپورٹ ہے؟''

''رپورٹ جیسی تھی، ویسی ہی ہے سرکار!'' وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''جناب! آپ دیکھ رہے ہیں، اس بارش نے کھرے کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن جب تک بارش شروع نہیں ہوئی تھی، میں نے کھرے کا اچھا خاصا کام نمٹا لیا تھا اور میری اس تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ ننگے پاؤں والے جس شخص کا کھرا میں نے باڑے سے کھیتوں تک نکالا تھا، وہ بھولا کا کھرا نہیں ہے۔''

''تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ بھولا وقوعہ کی رات نہ تو باڑے کے اندر داخل ہوا اور نہ ہی دیوار پھلانگ کر وہ وہاں سے فرار ہوا تھا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مشتاق باجوہ کے قتل میں اس کا ہاتھ نہیں؟''

''جناب! بھولا قاتل ہے یا نہیں، یہ پتا چلانا تو آپ کا کام ہے۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولا۔ ''میں نے تو اپنا کام مکمل کر دیا ہے۔ بھولا وقوعہ کی رات جائے واردات کی طرف نہیں آیا تھا۔ میرا علم غلط نہیں ہو سکتا۔''

''ٹھیک ہے، اب تم گھر جا سکتے ہو۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں دوبارہ زحمت دوں گا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''سرکار...... سوکھے شکریے سے میرا پیٹ نہیں بھرے گا۔'' وہ پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے لہٰذا مجھے میرا انعام ملنا چاہیے۔''

میں نے اپنی جیب خاص میں سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو...... یہ رکھ لو اپنا انعام۔''

اس نے جلدی سے کرنسی نوٹ کو اپنی جیب میں ٹھونسا اور مجھے زوردار سیلوٹ کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

آج کل پچاس روپے میں انسان پیٹ بھر کر ایک وقت کا...... کھانا نہیں کھا سکتا لیکن اس زمانے میں پچاس روپے کی بڑی قدر و قیمت ہوا کرتی تھی۔ ایک متوسط فیملی کا مہینے بھر کا راشن پچیس سے تیس روپے میں آ جایا کرتا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے میرا بھیجا ہوا بندہ زاہدہ کو لے کر آ گیا۔ زاہدہ اکیلی نہیں آئی تھی بلکہ اس کے ساتھ اس کی نند سلمٰی اور سلمٰی کا شوہر شوکت علی بھی تھے۔ یہ دونوں میاں بیوی آج صبح ہی اگوکی سے گکروالی آئے تھے تاکہ بھولا کی خبر لے سکیں کہ پولیس نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ جب میرے عملے کا بندہ زاہدہ کے گھر پہنچا تو بھولا کی بہن اور بہنوئی وہاں پہلے سے موجود تھے لہٰذا یہ دونوں بھی ان کے ہمراہ تھانے آ گئے۔

میں نے زاہدہ کو اپنے کمرے میں روک کر باقی سب کو باہر نکال دیا۔ وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس نے سوال کیا۔

''بھولا نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے تھانے دار صاحب؟''

''تم مجھ سے پوچھ رہی ہو یا اپنی خواہش کا اظہار کر رہی ہو......!'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''نہ جی...... میں کیوں ایسا چاہوں گی......'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تو چاہتی ہوں کہ آپ بھولا کو جلد از جلد رہا کر دیں۔''

''اسی لیے تم نے بھولا کو گردن تک دلدل میں دھنسا دیا ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تاکہ وہ ساری زندگی جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سڑتا رہے۔''

''میں نے ایسا کیا کیا جی......!'' وہ چہرے پر حیرت سجاتے ہوئے بولی۔

''تم نے کیا کیا ہے اور کیا نہیں کیا، یہ تو میں تمہیں بعد

میں بتاؤں گا۔'' میں نے تندرے سخت لہجے میں کہا۔'' پہلے تم یہ بتاؤ کہ مجھ سے غلط بیانی کیوں کی؟''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھانے دار صاحب.....!'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔'' کیا یہ سچ ہے کہ تمہارے ہی کہنے پر بھولا وقوعہ کی رات ٹکر والی سے چک چوراسی گیا تھا؟''

''جی..... وہ صبح گیا تھا مگر رات کو وہاں رک گیا تھا۔''

اس نے سادے سے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ مشتاق کے قتل سے تین چار روز پہلے بھولا کا عقیق والا لاکٹ گم ہوگیا تھا؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جی!'' اس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

''بھولا نے اس لاکٹ کو پورے گھر میں تلاش کیا تھا اور گھر کے باہر بھی مگر یہ لاکٹ کہیں نہیں مل سکا تھا۔''

''تم نے یہ دونوں باتیں مجھ سے کیوں چھپائیں؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔'' جب میں تمہارے گھر آیا تھا تو تم نے یہ سب مجھے نہیں بتایا تھا؟''

''جناب! میں گھبرا گئی تھی۔'' وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولی۔'' یہ باتیں میرے ذہن سے نکل گئی تھیں۔''

''لیکن بھولا کی گرفتاری والی بات تمہیں اچھی طرح یاد رہی تھی۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔'' ہیں.....؟''

''میں سمجھی نہیں تھانے دار صاحب.....!'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگی۔

''جب میں تمہارے گھر سے نکل کر تھانے کی طرف آنے لگا تھا تو یاد ہے، تم نے کیا کہا تھا.....'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔'' تم نے مجھ سے پوچھا تھا..... تھانے دار صاحب! کیا آپ بھولا کو گرفتار کرنے اگوکی نہیں جائیں گے..... جیسے تمہاری خواہش ہو کہ بھولا جلد از جلد مشتاق باجوہ کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوکر جیل چلا جائے.....''

''میں ایسا کیوں چاہوں گی جی۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولی۔'' آپ خوانخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔''

''اور تم نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ مقتول کے ساتھ تمہارا دلی تعلق رہا ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔'' تم مشتاق باجوہ سے شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی تھی۔ بعد میں تم نے جمیلہ کو مورد الزام ٹھہرا کر چک چوراسی میں بہت شور شرابا

بچایا تھا؟''

''تو آپ کو وہ کہانی پتا چل چکی ہے.....'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

''صرف وہی نہیں..... مجھے تمہاری ہر کہانی پتا چل چکی ہے زاہدہ!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔'' بھولا تو کیا ساری زندگی کے لیے جیل میں مگر تم بھی بچنے والی نہیں ہو۔''

وہ بے حد ہراساں نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چارا پھینکنے والے انداز میں کہا۔

''زاہدہ! اگر تم چاہو تو بھولا کو بچا سکتی ہو.....!''

''میں..... میں بھلا کیا کرسکتی ہوں جی۔'' وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''تم سچ بول کر اپنی مشکلات کو بڑی حد تک کم کرسکتی ہو۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔'' بس مجھے اتنا بتا دو کہ بھولا کا لاکٹ اس کی گردن سے غائب ہوکر مشتاق باجوہ کے باڑے میں کیسے پہنچ گیا؟''

''مجھے کیا پتا جناب۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''آپ خوانخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔''

''دیکھو زاہدہ! تم مجھے سختی کے لیے مجبور کر رہی ہو۔'' میں نے بے رحمی سے کہا۔'' تم تصور بھی نہیں کرسکتی ہو کہ تمہاری زبان کھلوانے کے لیے میں کون کون سے گر آزما سکتا ہوں۔''

وہ سراسیمہ انداز میں اِدھر اُدھر تکنے لگی۔

میں نے زاہدہ کو مزید خوف زدہ کرنے کے لیے ایک کانسٹیبل کو بلا کر اس کے کان میں خصوصی ہدایات دیں پھر بہ آواز بلند کہا۔

''اس کو تفتیشی کمرے میں لے جاؤ اور آدھے گھنٹے کے اندر مجھے رزلٹ چاہیے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟''

''جی، چنگی طراں سمجھ گیا ملک صاحب۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔'' آپ فکر نہ کریں۔ یہ آدھے گھنٹے سے پہلے ہی زبان کھول دے گی۔ آپ نے جو طریقہ بتایا ہے نا، اسے جھیلنا اس بے چاری کے بس کی بات نہیں۔''

زاہدہ کانسٹیبل کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھی لیکن جب میں نے دبکا مارا تو وہ بادلِ ناخواستہ وہاں سے چلی گئی۔

میں نے کانسٹیبل کو آدھے گھنٹے کی مہلت دی تھی لیکن وہ دس منٹ کے اندر ہی زاہدہ کو لے کر دوبارہ میرے

کمرے میں آ گیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''تم نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا؟''

پھر میں نے زاہدہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ خوف زدہ دکھائی دی۔ کانسٹیبل نے جواب دیا۔

''ملک صاحب! میں آپ کا بتایا ہوا فارمولا آزمانے ہی والا تھا کہ چوہوں والے پنجرے کو دیکھ کر یہ ڈر گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے التجا کی کہ اگر میں اس کی زبان کھلوانے کے لیے یہ طریقہ اختیار نہ کروں تو یہ سچ بتانے کو تیار ہے۔''

''ہوں......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کانسٹیبل سے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں اس کا انٹرویو کر لیتا ہوں۔''

کانسٹیبل کے جانے کے بعد میں نے زاہدہ کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ میری میز کی دوسری جانب کرسی پر بیٹھ گئی تو میں نے کہا۔ ''تم نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ذرا تصور کرو۔ اگر کانسٹیبل تمہاری شلوار کے پانچوں میں چوہے داخل کر کے ان پانچوں کو رسی سے باندھ دیتا تو پھر تمہارا کیا حشر ہوتا۔''

وہ ایک جھرجھری لینے کے بعد سراسیمہ لہجے میں بولی۔ ''تھانے دار صاحب! اسی لیے میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''سچ کیا ہے، بتاؤ؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''مجھے یقین ہے کہ بھولا ہی نے مشتاق باجوہ کو قتل کیا ہے۔''

زاہدہ کے انکشاف نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ گویا اسے اپنے شوہر کے قاتل ہونے پر ذرا سا بھی شبہ نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے زاہدہ پر نفسیاتی دباؤ بڑھانے کے لیے اس کے شوہر کو سزائے موت یا عمر قید ہونے کی باتیں کی تھیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ ابھی تک مجھے اس کے خلاف کوئی ایسا ٹھوس ثبوت نہیں ملا تھا جس کی بنیاد پر میں اسے قاتل ٹھہرا سکتا۔

''تم بڑے وثوق کے ساتھ بھولا کے قاتل ہونے کی بات کر رہی ہو۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اس بات کا کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''اس نے کئی مرتبہ مشتاق کو جان سے مارنے کی بات کی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ وہ ایسا کر بھی گزرے گا۔''

''اس کی وجہ......'' میں نے تھوڑا آگے جھکتے ہوئے سوال کیا۔ ''بھولا، مشتاق باجوہ کی جان کیوں لینا چاہتا تھا؟''

''اسے شک تھا کہ میرے مشتاق باجوہ کے ساتھ تعلقات رہے ہیں...... میرا مطلب ہے، شادی سے پہلے۔'' زاہدہ نے گردن جھکا کر جواب دیا۔ ''جبکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں مشتاق سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔''

''تم نے بھولا کا شک دور کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''بہت کوشش کی تھی جناب......'' وہ بے چارگی سے بولی۔ ''بڑی سے بڑی قسم کھا کر میں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن آپ کو پتا ہے، اگر ایک بار کسی کے دل میں شک بیٹھ جائے تو پھر اس کا نکلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔''

''مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن کہو۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس بیماری کا علاج نہیں ہے۔ سنا ہے، شک اور وہم کو دور کرنے کا کوئی نسخہ حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔''

آئندہ دس منٹ میں زاہدہ نے مجھے بتایا کہ اس کی شادی کے بعد جب بھولا کو یہ پتا چلا کہ وہ مشتاق باجوہ سے شادی کی خواہش مند تھی تو کس طرح بھولا نے شدید ردِعمل کا مظاہرہ کیا تھا اور پھر آئے دن وہ کوئی نہ کوئی نئی بات نکال کر زاہدہ کی بے عزتی کرتا رہتا تھا۔ اس حوالے سے کئی بار وہ زاہدہ کو زدوکوب بھی کر چکا تھا اور ایسا جب بھی ہوتا، بھولا خطرناک انداز میں مشتاق باجوہ کو قتل کرنے کی بات کرتا تھا۔ ان لمحات میں وہ کسی خونی درندے کے مانند نظر آتا تھا۔

زاہدہ کی کہانی بھولا کے مجرم ہونے کی جانب اشارہ کرتی تھی۔ اگر اس نے کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا تو پھر مجھے بھولا کے ساتھ سختی کا رویہ اپنانے کی ضرورت تھی۔ اس وقت رات ہو چلی تھی لہٰذا میں نے زاہدہ کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ماں باپ باہر برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ تم ان کے ساتھ چک چوراہی چلی جاؤ۔ گھروالی میں اب تمہارا کون ہے جو دہاں جاؤ گی۔''

''جی...... میں یہاں سے اپنے میکے ہی جاؤں گی۔''

اس نے تنفید کن لہجے میں کہا۔

''ایک بات کا خیال رکھنا زاہدہ......'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''جب تک یہ کیس سیدھے راستے پر نہیں آجاتا تم چک چوراہی سے باہر کہیں نہیں جاؤ گی۔ میں آج رات بھولا کو کڑی تفتیش سے گزاروں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے جرم کا اقرار کرلے گا۔ بہ صورتِ دیگر میں کل صبح اسے عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ بھی لینے والا ہوں۔ اگر اس نے زبان نہ کھولی تو پھر مجھے گواہی کے لیے تمہیں چک چوراہی سے بلوانا پڑے گا۔''

''میں نے کہاں جانا ہے جی۔'' وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں چک چوراہی ہی میں رہوں گی۔''

جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ زاہدہ اپنے والدین کے ساتھ تھانے سے رخصت ہو چکی ہے تو میں نے سلمٰی اور شوکت علی کو بھی رخصت کر کے بھولا کو اپنے پاس بلالیا۔ اس بات کا میں نے خیال رکھا تھا کہ بھولا کی بہن اور بہنوئی کو اس سے مختصر بات چیت کا موقع دے دوں تا کہ ان کی پریشانی میں کسی حد تک کمی واقع ہو جائے۔

میں نے جب بھولا کو بتایا کہ زاہدہ نے اس کے خلاف بیان دیا ہے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور اس دوران میں وہ زاہدہ کو غلیظ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے شانت کیا تو اس نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت مجھے اس کیس میں پھنسایا گیا ہے......''

''کون......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''تمہارے خلاف ایسی سازش کون کرسکتا ہے؟''

''یہ تو مجھے پتا نہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن زاہدہ نے جو میرے خلاف آپ کو الٹا سیدھا بتایا ہے، اس سے میرا شک اسی کی طرف جارہا ہے۔''

''بہت خوب......'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم دونوں ایک دوسرے کے اوپر الزام رکھ کر مجھے الجھانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن تم دونوں کو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ چویشن میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے......''

لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''قتل کے اکثر مجرم جب پوری طرح قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں تو وہ اسی قسم کے بیان دیتے ہیں کہ انہیں کسی گہری سازش کے تحت اس مقدمے میں ملوث کیا گیا ہے۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا، یک ٹک رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

''بھولا! میں تمہیں بس ایک رات کی مہلت دے سکتا ہوں۔ کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے تم نے فیصلہ کرنا ہے کہ سچ بولو گے یا جھوٹ پر ہی ڈٹے رہنا ہے تمہیں......!''

پھر میں بھولا کو شیڈ ڈیوٹی والے ایک حوالدار کے حوالے کر کے اپنے کوارٹر میں آگیا۔ میں نے حوالدار کو ہدایت کردی تھی کہ آج کی رات ملزم پر صرف نفسیاتی حربے ہی آزمانا ہیں، اس کے بدن کو ٹچ نہیں کرنا۔

☆☆☆

اگلا دن بڑا ہنگامہ پرور اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ ہنگامہ پرور اس لیے کہ اس روز اس طرح پے درپے واقعات پیش آئے کہ ایک لمحے کی بھی فرصت نہ ملی اور نتیجہ خیز ان معنوں میں کہ مشتاق باجوہ کے قتل کا معما حل ہو گیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ زاہدہ کے ماں باپ روتے دھوتے تھانے پہنچ گئے۔ میں نے فوراً انہیں اپنے پاس بلالیا۔ وہ بے حد پریشان اور بوکھلائے ہوئے تھے۔

میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''تھانے دار صاحب! ہم برباد ہو گئے۔'' قاسم نے فریادی لہجے میں کہا۔ ''وہ نامراد ہماری زاہدہ کو لے گیا ہے۔''

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، میں نے پوچھا۔ ''کون نامراد؟''

''جبرو'' اس نے بتایا۔

''یہ جبرو کون ہے؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''جبرو بہت خطرناک بندہ ہے تھانے دار صاحب۔'' بشیراں نے روتے ہوئے بتایا۔ ''چوری، ڈکیتی اور غنڈا گردی اس کا کام ہے۔ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے زاہدہ کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ ہم تو لٹ گئے...... تباہ ہو گئے۔''

''یہ کیسا اندھیر مچ گیا ہے تھانے دار صاحب۔''

قاسم نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''اب تو کسی شریف آدمی کی عزت بھی محفوظ نہیں رہی۔''

میں نے جبرو بدمعاش کا نام سنا ہوا تھا لیکن آج تک اس سے میرا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ میں جب سے اس تھانے میں تعینات تھا، میرے تھانے کی حدود میں جبرو نے کوئی واردات نہیں کی تھی لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ جبرو، زاہدہ کو کیوں اٹھا کر لے گیا تھا۔ جب یہی سوال میں نے قاسم سے پوچھا تو بشیراں جلدی سے بولی۔

''پتا نہیں جناب...... ہماری ڈاکوؤں اور ملنگوں سے کوئی دوستی ہے اور نہ دشمنی۔''

''کوئی بدمعاش کسی عورت کو خواہ مخواہ اٹھا کر نہیں لے جاتا۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آرہا ہے۔ سچ بتائیں حقیقت کیا ہے؟''

''آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں سرکار۔'' قاسم نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''ایک تو ہماری بچی اغوا ہوگئی اور الٹا آپ ہم ہی پر شک کررہے ہیں۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے جناب۔''

''کمی اور زیادتی کا فیصلہ تو بعد میں کریں گے۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''پہلے مجھے بتاؤ، زاہدہ کے اغوا والا واقعہ کب پیش آیا؟''

''آج صبح جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ابھی ہلکا ہلکا اندھیرا تھا کہ وہ بدبخت میری زاہدہ کو اٹھا لے گیا۔''

''وہ اکیلا ہی تھا یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟''

''کوئی نہیں تھا اس کے ساتھ۔'' بشیراں نے بتایا۔ ''اس نے مجھے اور زاہدہ کے باپ کو بندوق کے نشانے پر رکھا اور زاہدہ کو کندھے پر ڈال کر لے گیا۔''

''اس واقعے کا کوئی گواہ......'' میں نے باری باری دونوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''اس وقت موقع پر اور کون کون موجود تھا؟''

''اس وقت موقع پر کوئی بھی نہیں تھا تھانے دار صاحب۔'' قاسم نے جواب دیا۔ ''پھر جب ہم نے رونا دھونا شروع کیا تو آس پڑوس کے لوگ ہمارے گھر میں جمع ہوگئے اور...... اب ہم آپ کے پاس بیٹھے ہیں۔''

''جبرو، زاہدہ کو لے کر کس طرف گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی پتا نہیں جی۔'' بشیراں ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔

''اس نے جب بندوق ہم پر تانی تو ہماری جان ہی نکل گئی تھی۔''

''پھر اس نے جاتے وقت خطرناک انداز میں یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر ہم نے اس کے پیچھے آنے کی کوشش کی تو پہلے وہ زاہدہ کو گولی مارے گا۔ اس کے بعد ہمیں بھی بھون کر رکھ دے گا۔'' قاسم نے بے چارگی سے بتایا۔ ''ہم اس کی دھمکی سے ڈر گئے تھے اس لیے ہم نے یہ دیکھنے کی ہمت نہیں کی کہ وہ کمینہ کس طرف گیا ہے۔''

ایک فوری خیال کے تحت میں نے قاسم سے پوچھا۔

''میری معلومات کے مطابق جبرو چک چوراسی کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنے ہی پنڈ کی کسی عورت کو بلاوجہ اٹھا کر نہیں لے جاسکتا۔ مجھے سچ سچ بتاؤ، زاہدہ کے اغوا کے پیچھے اصل کہانی کیا ہے؟''

''کوئی کہانی نہیں ہے جی۔'' بشیراں برا سامنہ بناتے ہوئے بولی۔ ''چوروں، ڈاکوؤں کی نیت کا کیا بھروسا۔ یہ مردود تو کسی وقت کچھ بھی کرسکتے ہیں اور جہاں تک جبرو کے چک چوراسی میں رہنے کی بات ہے تو......'' لحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''کافی عرصہ پہلے جبرو چک چوراسی چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا۔ ہمیں نہیں پتا، وہ اب کہاں رہتا تھا......''

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بشیراں مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہی ہو۔ کیا......؟ اس بات کا میں اندازہ نہ لگا سکا لہٰذا میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''تم نے بتایا ہے کہ کافی عرصہ پہلے جبرو چک چوراسی چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا...... کتنا عرصہ پہلے؟''

''یہ تو اب مجھے یاد نہیں۔'' وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''جناب! ایک تو ہماری بچی اغوا ہوگئی ہے، الٹا آپ ہم ہی سے تفتیش کررہے ہیں۔''

''یہ تفتیش تمہاری بیٹی کو بازیاب کرنے کے لیے بہت ضروری ہے بشیراں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بتاؤ، جبرو نے زاہدہ کی شادی سے پہلے چک چوراسی چھوڑ دیا تھا یا بعد میں وہ وہاں سے گیا ہے؟''

''جج...... جی...... وہ زاہدہ...... کی شادی کے بعد...... چک چوراسی سے گیا تھا۔'' قاسم نے بتایا۔ ''پر تھانے دار صاحب! یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوسکتی ہیں۔ ابھی آپ زاہدہ کو واپس لانے کی کوئی سبیل کریں۔''

''کرتا ہوں سبیل۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا پھر

بشیراں کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''بی بی..... تم تھوڑی دیر کے لیے باہر جا کر بیٹھو۔''

بشیراں نے سوالیہ نظر سے اپنے خاوند کو دیکھا پھر بادل ناخواستہ وہ میرے کمرے سے نکل گئی۔ میں نے قاسم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''دیکھو قاسم! تم مجھے ایک معقول انسان دکھائی دیتے ہو۔ کیا میں امید رکھوں کہ جو کچھ تم سے پوچھوں، اس کا سچا اور کھرا جواب دو گے؟''

''جی......'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''پوچھیں جی۔''

''تمہارا داماد اسلم عرف بھولا اس وقت مشتاق باجوہ کے قتل کے الزام میں حوالات میں بند ہے۔ میرے پاس ایسے ٹھوس ثبوت موجود ہیں جو بھولا کو پھانسی کے پھندے تک لے جا سکتے ہیں۔ زاہدہ نے بھی کل واشگاف الفاظ میں بھولا کے خلاف گواہی دی ہے اور آج صبح زاہدہ کو بھی جبرو اٹھا کر لے گیا ہے۔ باقی بچے تم اور تمہاری گھر والی بشیراں۔'' میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم دونوں کی باقی ماندہ زندگی بھی جیل کی دیواروں کے پیچھے گزرے؟''

''نن...... نہیں جناب......'' وہ سر کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے ایسا کون سا جرم کیا ہے کہ آپ ہمیں جیل بھجوا دیں گے۔''

''تمہارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ تم قانون سے تعاون نہیں کر رہے ہو۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''میں بڑے دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ زاہدہ اور جبرو کے معاملے میں تم مجھ سے بہت کچھ چھپا رہے ہو......''

بات کرنے کے دوران میں، میں مسلسل اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میرے دوٹوک انداز نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ ہراساں نظر سے ادھر ادھر تکنے لگا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اب ایک چوٹ...... ایک کاری ضرب کی مار تھا......

اسے گہرے تذبذب میں گرفتار دیکھ کر میں نے کاری ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ نہیں مان سکتا کہ جبرو کو کسی پاگل کتے نے کاٹا تھا جو وہ خوامخواہ تمہاری بیٹی کو اٹھا کر لے گیا ہے۔ بتاؤ، زاہدہ اور جبرو کے بیچ کیا معاملہ تھا؟''

قاسم کے چہرے پر بے بسی اور ندامت کے ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے پھر اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور روہانسی آواز میں اس نے مجھے بتایا۔

''تھانے دار صاحب! جبرو، ہاتھ دھو کر میری زاہدہ کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ زاہدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ آپ ہی بتائیں، ایک لٹیرے سے میں کس طرح اپنی بیٹی کو بیاہ دیتا۔ زاہدہ مشتاق باجوہ کو پسند کرتی تھی لیکن نذیر باجوہ نے ہمیں کم ذات کا طعنہ دے کر اس رشتے سے انکار کر دیا۔ آپ ایک مجبور باپ کی مجبوریوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ زاہدہ کی شادی کے بعد ہم لوگوں نے سکھ کی سانس لی تھی لیکن جبرو نے ہمیں ایک نئی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔''

''جب تم نے زاہدہ کے رشتے سے انکار کیا تو اس پر جبرو نے کیا ردعمل ظاہر کیا تھا؟'' میں نے پنچایت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں جناب۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''بس وہ چپ چاپ پنڈ سے چلا گیا تھا۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس بدمعاش سے ہماری جان چھوٹ گئی لیکن ہمیں کیا پتا تھا اس کی خاموشی کے پیچھے کوئی طوفان چھپا ہوا ہے اور وہ ایک دن یوں زاہدہ کو گھر سے اٹھا لے جائے گا۔''

مجھے اندازہ ہو گیا کہ قاسم نے دروغ گوئی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات سے سچائی جھلکتی تھی۔ میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔

''قاسم! تم اپنی بیوی کے ساتھ گھر چلے جاؤ۔ میں بہت جلد تمہاری بیٹی کو ڈھونڈ نکالوں گا کیونکہ وہ بھولا والے معاملے میں ایک گواہ بھی ہے۔''

وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

میں نے زاہدہ کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس سے تفصیلی بات بھی کی تھی۔ وہ ایک پرکشش عورت تھی۔ اس کے حسن میں ایک عجیب سی مقناطیسی جاذبیت پائی جاتی تھی۔ اگر جبرو بدمعاش اس پر مرمٹا تھا تو اس میں اچنبھے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ زاہدہ کو جبرو نے اغوا کیا تھا یا وہ خود اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی تھی۔ گزشتہ روز زاہدہ نے مجھے بھولا کے حوالے سے جو کہانی سنائی تھی، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھولا کے ساتھ بہت ہی مجبوری کی حالت میں رہ رہی تھی۔ ان واقعات میں حقیقت کا کیا تناسب تھا یہ تو اسی وقت پتا چل سکتا تھا جب میں زاہدہ کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

اسی روز دوپہر میں، میں نے جبرو کی تلاش اور گرفتاری کے لیے چار چھاپا مار ٹیمیں تشکیل دیں اور انہیں اردگرد کے گاؤں دیہات کی جانب روانہ کر دیا۔ علاوہ ازیں میں نے ان علاقوں کے تمام مخبروں کو بھی ریڈ الرٹ

کردیا۔ اس دن میں نے بھولا کو عدالت میں پیش کر کے اس کا سات روز کا ریمانڈ بھی حاصل کرلیا تھا۔

☆☆☆

دورانِ ریمانڈ میں، میں نے اسلم عرف بھولا کو مختلف ٹرائل سے گزارا مگر مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ وہ کسی بھی صورت مشتاق باجوہ کی جان لینے کی ذمے داری قبول نہیں کررہا تھا۔ وہ بار بار اس بات پر زور دے رہا تھا کہ قتل کے اس مقدمے میں اسے کسی گہری سازش کے تحت پھنسایا گیا ہے اور اس سلسلے میں اس نے زاہدہ پر اپنے شک کا اظہار بھی کیا تھا لیکن اب زاہدہ منظر سے غائب ہوچکی تھی۔ اب مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ بھولا شاید بے گناہ ہی ہے مگر زاہدہ کی واپسی سے پہلے میں اسے رہا نہیں کرسکتا تھا کیونکہ ابھی تک مشتاق باجوہ کے قتل کا معاملہ دبا ہی پڑا ہوا تھا۔

یہ چھاپا مار ٹیموں کو روانہ کرنے کے تین دن بعد کی بات ہے کہ ایک ہوشیار مخبر نے موضع کوٹ گھمن میں مجھے جبرو بدمعاش کی موجودگی کی اطلاع دی۔ کوٹ گھمن، چک چوراسی کے شمال میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دونوں گاؤں کے بیچ لگ بھگ آٹھ میل کا فاصلہ تھا۔ میرے مخبر کے مطابق جبرو کوٹ گھمن سے باہر کھیتوں میں بنے ہوئے ایک ڈیرے میں دیکھا گیا تھا۔

میں نے اپنے عملے کے مستعد کانسٹیبلوں کی ایک ٹیم بنائی اور سرِ شام جبرو کی سرکوبی کے لیے کوٹ گھمن کی طرف روانہ ہوگیا۔ ہم سب سادہ لباس میں تھے۔ اگر جبرو اس ڈیرے میں چھپا بیٹھا تھا تو یقیناً زاہدہ بھی اس کے ساتھ ہی ہوگی۔ میں نے اطلاع لانے والے مخبر سے یہی سوال کیا۔

''جبرو چک چوراسی سے ایک عورت کو اغوا کرکے لے گیا تھا۔ کیا زاہدہ نامی وہ عورت بھی تمہیں دکھائی دی ہے؟''

مذکورہ مخبر کا نام عارف تھا اور وہ بھی اس وقت ہماری ٹیم کا حصہ ہی تھا۔ اس نے جواب دیا۔

''نہیں ملک صاحب! وہ عورت اس کے ساتھ نظر نہیں آئی۔ ہوسکتا ہے، اس نے زاہدہ کو ڈیرے کے اندر کہیں چھپا رکھا ہو۔''

''ہاں۔ یہ ہوسکتا ہے۔'' میں نے سرسری انداز

میں کہا۔

جب ہم کوٹ گھسن کی حدود میں داخل ہوئے تو اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ میں نے خاص طور پر رات کی تاریکی میں اس مشن کو ترتیب دیا تھا تاکہ جبرو کو پولیس کی کارروائی کی کن سن نہ مل سکے۔ مجھے امید تھی کہ جبرو میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکے گا۔ کوٹ گھسن ایک چھوٹا سا گاؤں تھا لہٰذا اس کی آبادی بھی بہت کم تھی۔ جبرو اگر فرار ہونے کی کوشش بھی کرتا تو فوراً ہماری نظر میں آجاتا۔ میں نے اپنے ساتھ آنے والے مستعد کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ وہ تھوڑا فاصلہ رکھ کر ڈیرے کے چاروں طرف پھیل جائیں پھر میں نے عارف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم میرے ساتھ آؤ......!''

''آپ کا ارادہ کیا ہے ملک صاحب؟'' عارف نے متذبذب لہجے میں دریافت کیا۔

عارف پولیس ڈیپارٹمنٹ کا باقاعدہ ملازم نہیں تھا۔ میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''پتر! میرا ارادہ تو بہت نیک ہے۔ اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو پھر ادھر ہی رک جاؤ...... میں اکیلا ہی جبرو سے نمٹ لیتا ہوں۔''

''نہیں جناب! ڈرنے والی کوئی بات نہیں۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اس نیک کام میں، میں بھی آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا۔''

مذکورہ ڈیرا اونچی چھتوں والے دو کمروں اور ایک وسیع وعریض صحن پر مشتمل تھا۔ موسم کی مناسبت سے جبرو اور زاہدہ کی چارپائیاں صحن میں ہونا چاہیے تھیں لیکن سچویشن کا تقاضا یہ تھا کہ وہ کسی کمرے کے اندر پناہ گزیں ہوں گے۔

ہم دونوں باڑے کی نیچی دیوار کو بہ آہستگی پھلانگ کر اندر داخل ہو گئے۔ چند جانور ایک دیوار کے ساتھ بندھے دکھائی دیے تاہم صحن میں کسی ذی روح کا ''بستر'' لگا نظر نہ آیا۔ ہم دبے قدموں بڑھتے ہوئے ان کمروں کی جانب پہنچ گئے جن میں سے ایک کا دروازہ بند اور دوسرے کا ادھ کھلا تھا۔ بند دروازے کی کنڈی باہر سے بند تھی۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ جبرو مغوی زاہدہ کے ساتھ ادھ کھلے دروازے والے کمرے کے اندر موجود ہوگا۔

مذکورہ ڈیرا جانوروں کی موجودگی کے باعث اپنے آباد ہونے کا اعلان کرتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ڈیرے کی دیکھ ریکھ کے لیے وہاں کوئی بندہ بشر بھی ضرور رہتا ہوگا اور اسی بندے کے تعاون سے جبرو نے وہاں پناہ لی ہوگی۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی تھی کہ مذکورہ بندہ اس وقت جبرو کے ہمراہ تھا یا نہیں......!

میں نے ادھ کھلے دروازے کی اوٹ میں رہتے ہوئے عارف سے کہا۔ ''تم گھوم کر دبے قدموں بند دروازے تک پہنچو اور پھر اس دروازے پر دستک دو۔''

''بند دروازے پر دستک کیوں جی؟'' اس نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

''چند لمحے بعد تمہیں تمہارے اس سوال کا جواب مل جائے گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم سے جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو......'' بات کے اختتام پر میں نے اپنا سروس پسٹل نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

''اوکے سر!'' عارف بے چون وچرا میرے حکم کی تعمیل کے لیے آگے بڑھ گیا۔

میں پستول تھامے ریڈ الرٹ تھا۔ پہلی دستک کے جواب میں ادھ کھلے دروازے والے کمرے میں کھسر پھسر کی آواز ابھری جیسے دو افراد آپس میں ''خفیہ مشاورت'' کر رہے ہوں۔ آواز اتنی دھیمی تھی کہ کچھ بھی میرے پلے نہ پڑ سکا۔

دوسری دستک پر کمرے کے اندر چلتے ہوئے قدموں کی مخصوص صدا ابھری پھر یہ آواز دروازے کی سمت بڑھتی سنائی دی۔ میں سانس روک کر کمرے سے کسی کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اگلے ہی لمحے ایک دبلا پتلا اور قدآور شخص دروازے سے نمودار ہوا اور بند کمرے والے دروازے کی طرف رخ کرکے غصیلے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''کون ہے......؟''

میں اس غصیلے لم ڈھینگ کی پشت پر تھا۔ میں بجلی کی سرعت سے حرکت میں آیا اور میں نے سرکاری بوٹ کی مدد سے اس لمبو کی تشریف پر ایک زوردار کک رسید کی اور غضب ناک لہجے میں کہا۔

''کون نہیں...... تمہارا باپ آیا ہے...... تھانے دار ملک صفدر حیات......!''

وہ اپنے بدن کے حیادار حصے پر لات کھانے کے بعد منہ کے بل زمین پر گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو سمجھ پاتا، میں پسٹل بدست اس کے سر پر پہنچ گیا۔ پھر میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں حکم دیا۔

''ہینڈز اپ جبرو...... تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ خود کو قانون کے حوالے کردو......''

''میں جبرو نہیں، جیلا ہوں سرکار......'' لم ڈھینگ منمناتے لہجے میں گڑگڑایا تو میں چونک اٹھا۔

'' تم جیلا...... نیلا...... پیلا...... جو بھی ہو، اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔'' میں نے تحکمانہ انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ '' اور ہاں، کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہیں کرنا ورنہ چھ کی چھ گولیاں تمہارے بھیجے میں اتار دوں گا۔''

وہ دونوں ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تب مجھے اس کا چہرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کا قد تو جبرو ایسا ہی تھا تاہم وہ جبرو نہیں تھا۔ میں نے اسے پستول کے نشانے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

'' جبرو کہاں ہے؟''

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا، فضا میں '' دھپ '' کی آواز ابھری جیسے کوئی بلندی سے نیچے کودا ہو۔ مذکورہ آواز اس کمرے کے عقبی حصے سے سنائی دی تھی جہاں سے وہ لبو برآمد ہوا تھا۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے جیلا کو الٹی ہتھکڑی لگا کر عارف کے حوالے کیا اور اس سمت دوڑ لگا دی جدھر سے دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ جبرو نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی ہو گی۔ حفظ ما تقدم کے طور پر میں نے اپنے سادہ لباس جوانوں کو الرٹ کرنے کے لیے وسل بھی بجا دی۔ وسل کی مخصوص آواز نے تاریک رات کے سناٹے میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

میں دیوار پھلانگ کر جب ڈیرے کے عقبی حصے میں پہنچا تو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ مذکورہ کمرے کی ایک کھڑکی کے دونوں پٹ وا تھے۔ یقیناً جبرو اس کھڑکی کے راستے فرار ہوا تھا۔ پھر جلد ہی وہ میری نگاہ میں آ گیا۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے کھیتوں کی جانب جا رہا تھا۔ میں نے ایک ہوائی فائر کیا اور گرج دار آواز میں کہا۔

'' رک جاؤ جبرو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔''

میری دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے دوڑنا جاری رکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سادہ لباس پولیس اہلکاروں کے نرغے میں تھا۔ پھر میں بھی اس کے سر پر پہنچ گیا۔ چاق و چوبند جوانوں نے اسے لاتوں مکوں پر رکھ لیا اور چند لمحوں میں میلے کپڑوں کے مانند اسے دھو ڈالا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

'' اسے ڈیرے پر لے چلو۔''

چند سیکنڈ کے بعد ہم سب مذکورہ ڈیرے پر تھے۔ اس دوران میں جبرو کی خاطر تواضع کرنے کے علاوہ اسے ہتھکڑی بھی پہنا دی گئی تھی۔ میں نے ٹارچ جلا کر اس کمرے کا جائزہ لیا جہاں سے جبرو فرار ہوا تھا لیکن وہاں بھی زاہدہ کے آثار دکھائی نہ دیے۔ تینوں جوانوں کو میں نے ڈیرے کی تلاشی لینے کا حکم دیا پھر جبرو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے جبرو کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔ '' زاہدہ کہاں ہے؟''

'' وہ میرے ساتھ نہیں ہے جی۔'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

'' پھر کس کے ساتھ ہے وہ......'' میں نے دہاڑ سے مشابہ آواز میں استفسار کیا۔ '' چک چورا سی سے تین دن پہلے تو تم ہی اسے اٹھا کر لائے تھے؟''

'' وہ...... وہ جی......'' اس کی آواز بھرا گئی۔ '' زاہدہ جھوک فرید ہی میں ختم ہو گئی تھی۔''

جھوک فرید، چک چورا سی سے چھ میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع ایک گاؤں تھا۔ میں نے جبرو کے دوسرے گال پر بھی ایک زوردار تھپڑ مارا اور سوال کیا۔

'' تم جھوک فرید میں اپنی ماں کی شادی اٹینڈ کرنے گئے تھے...... اور وہ ختم کیسے ہو گئی؟''

'' جناب! آپ مجھے جیل بھجوا دیں...... مجھ سے خطا ہو گئی، زاہدہ کو اٹھا لانے کی۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ '' زاہدہ کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔''

'' جیل تو میں تمہیں بھجواؤں گا اور بڑا ٹھیک ٹھاک بھجواؤں گا۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ '' لیکن پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ زاہدہ کی موت کیسے واقع ہو گئی؟''

'' سرکار......!'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ '' یہ سچ ہے کہ میں زاہدہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ جب اس کے باپ نے میرا رشتہ ٹھکرایا تو میں دل برداشتہ ہو کر چک چورا سی ہی سے چلا گیا تھا لیکن میں زاہدہ کے حالات سے ہمیشہ باخبر رہا تھا اور جب میرے علم میں یہ بات آئی کہ زاہدہ کا گھر والا بھولا اسے مشتاق باجوہ کے حوالے سے طعنے دیتا ہے اور اس کے ساتھ مار پیٹ بھی کرتا ہے تو مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر زاہدہ سے ملنے نکروالی پہنچ گیا۔ میں نے زاہدہ سے کیسے ملاقات کی، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ مختصراً آپ یوں سمجھ لیں کہ میں زاہدہ کو اپنی محبت کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ زاہدہ نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر میں اس کا ایک کام کر دوں تو وہ مجھ سے شادی کر لے گی......

'' کون سا کام؟'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے سوال داغ دیا۔

'' دوسروں نے زاہدہ کا بہت دل دکھایا تھا۔'' وہ بات ... کے ... بتاتے ہوئے بولا ... ایک مشتاق باجوہ

نے اس کا رشتہ مسترد کر کے اور دوسرے بھولا نے اس کے کردار پر شک کر کے۔ زاہدہ نے مجھ سے کہا کہ اگر میں ان دونوں سے بھیانک انتقام لوں تو اس کا کلیجا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پھر وہ مجھ سے شادی کر لے گی۔''

''لہٰذا تم نے مشتاق باجوہ کو اس طرح موت کے گھاٹ اتارا کہ اس کے قتل کا شبہ بھولا پر جائے۔'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ''بھولا کا عقیق والا لاکٹ زاہدہ ہی نے تمہیں فراہم کیا ہوگا؟''

''جی......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''بس میری قسمت ہی خراب ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی زاہدہ مجھے حاصل نہ ہو سکی...... وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئی۔'' بات کے اختتام پر اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہ آیا اور میں نے خونخوار لہجے میں دریافت کیا۔ ''اب یہ بھی بتا دو کہ جھوک فرید میں زاہدہ کے ساتھ کون سا جان لیوا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''زاہدہ کا اغوا ہم دونوں کی پلاننگ کے عین مطابق ہوا تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم جلد از جلد کسی دور دراز ضلع کی جانب نکل جائیں گے۔ جب ہم جھوک فرید کے قریب سے گزرے تو زاہدہ کو رفع حاجت کے لیے رکنا پڑا اور بس یہیں پر قسمت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''زاہدہ رفع حاجت کے لیے ایک کھیت کے اندر گئی اور وہاں ایک موذی ناگ نے اسے ڈس لیا۔ اس کی چیخ سن کر جب میں اس کے پاس پہنچا تو وہ جان کنی کے عالم میں تھی۔ اس وقت اندھیرا چھٹ رہا تھا اور ہلکا ہلکا اجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ وہ ناگ بہت ہی زہریلا تھا۔ چند ہی لمحوں میں زاہدہ دوسری دنیا میں پہنچ گئی......'' بات کے اختتام پر اس کے ہونٹوں سے ایک سسکاری برآمد ہوئی۔

اس سسکاری میں درد، کرب، افسوس اور ندامت...... سب کچھ شامل تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''اس کے بعد......؟''

''مجھے زاہدہ کی موت کا یقین ہو گیا تھا۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ ''میں اس کی لاش کو اٹھائے نہیں پھر سکتا تھا لہٰذا......''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔ ''تم نے زاہدہ کی لاش کے ساتھ کیا کیا؟''

''میں نے...... اس کی لاش کو...... بڑی نہر میں بہا دیا......'' اس نے بتایا۔

موضع جھوک فرید کے نزدیک سے ایک بڑی نہر گزرتی تھی جو ان دنوں کناروں تک بھری ہوئی بہہ رہی تھی۔ جھوک فرید کے آگے میلوں دور تک کوئی گاؤں دیہات واقع نہیں تھا اسی لیے ابھی تک لاش کی دریافت یا بازیافت کی کوئی اطلاع منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔

زاہدہ کا منصوبہ اپنی جگہ مکمل تھا۔ اس نے جبرو کے تعاون سے بیک وقت دو مردوں مشتاق باجوہ اور اسلم عرف بھولا سے انتقام لے لیا تھا تاہم اپنی کامیابی کا جشن منانے کے لیے قدرت نے اسے موقع نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے انجامِ واقعی تک پہنچ گئی تھی۔ یہ فتنہ سامان عورت اپنے ساتھ کتنے لوگوں کا کباڑا کر گئی تھی۔

میں جبرو بدمعاش اور اس کی معاونت کرنے والے جیلا کو گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔ جمیل عرف جیلا سے جبرو کی یاد اللہ تھی جبھی اس نے جبرو کو اس ڈیرے پر پناہ دی تھی۔ اس رات میرے تھانے کی حوالات میں جبرو اور جیلا کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ اگلی صبح میں نے جیلا اور بھولا کو رہا کر دیا۔

جبرو چونکہ مشتاق باجوہ کے قتل کا اقرار کر چکا تھا لہٰذا اقبالِ جرم کے بعد اس کے ریمانڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس کے خلاف مضبوط قسم کا چالان تیار کیا اور اسے حوالۂ عدالت کر دیا۔ چند پیشیوں کے بعد عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنا دی تھی۔

نذیر باجوہ نے اس موقع پر زاہدہ کے حوالے سے ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ''تھانے دار صاحب! وہ کیا کہتے ہیں...... اصل سے خطا نہیں اور کم نسل سے وفا نہیں......''

زاہدہ ذات کے لحاظ سے ایک نائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ نائی، موچی، دھوبی اور اسی سطح کے دیگر پیشوں کو کم ذات سمجھ کر ان سے نسلی امتیاز برتا جاتا ہے اور انہیں ''کمی کمین'' کہا جاتا ہے۔

نذیر باجوہ اور اسی سوچ کے حامل دوسرے افراد کی رائے اپنی جگہ مگر میرا نظریہ اپنی جگہ اٹل تھا تاہم زاہدہ کے معاملے میں نذیر باجوہ نے نسلی امتیاز برت کر غلط کیا تھا یا درست، اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں......!

(تحریر: حسام بٹ)

شاہ بابا کی کہی ہوئی بات آج بھی شفقت کی یادداشت میں محفوظ تھی، جو انہوں نے اچانک اس کی ننھی منی ہتھیلی دیکھ کر اس کی ماں سے مخاطب ہو کر کہی تھی۔ ”رابعہ بی بی! اللہ خیر کرے تیرے بیٹے کے ہاتھوں کی لکیروں میں ایک لکیر بڑی پریشان کن ہے۔“

رابعہ بی بی نے بے چین ہو کر اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ”ایسی کون سی لکیر ہے شاہ بابا اس کے ہاتھ میں؟“

شاہ بابا نے مدھم لہجے میں کہا۔

”بی بی! اس بچے کے ہاتھ میں قتل کی لکیر ہے یہ زندگی میں ایک قتل ضرور کرے گا۔“

اپنی بات ختم کرنے کے بعد شاہ بابا خود بھی اداس ہو گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنی زبان پر قابو نہ رکھنے کا

قتل کی لکیر

آصفہ ضیا احمد

کہتے ہیں کہ ہتھیلی کی لکیروں اور قدموں تلے بچھے رستوں کا آپس میں کوئی نہ کوئی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ شاید اس گٹھ جوڑ کو ہی مقدر کہتے ہیں۔ . . بہرحال یہ طے ہے کہ لکیروں میں کچھ لکھا ہو یا نہ ہو مگر تقدیر کی ہر تحریر ضرور پوری ہوتی ہے . . . جانے انجانے میں وہ بھی انہی راستوں پر چلنے کے لیے مجبور تھا جو کاتب تقدیر نے لکھ ڈالے تھے۔

ایک مجرم کی بے بسی و بے کسی کا عبرت اثر واقعہ



انہیں خود بھی افسوس ہورہا ہو لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ یہ سن کر رابعہ بی بی کے ہوش اڑ گئے۔ بدقت تمام اس نے یاس انگیز لہجے میں شکستہ آواز سے کہا۔

"شاہ بابا! کیا تقدیر کا لکھا ہمیشہ پورا ہوتا ہے؟ کاتب تقدیر تو ہر چیز پر قادر ہے، کیا وہ یہ لکھا ہوا تبدیل نہیں کرسکتا؟"

شاہ بابا نے ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "دعا...... دعا میں اوپر والے نے یہ طاقت رکھی ہے کہ وہ کبھی کبھی لوح محفوظ کا لکھا بھی تبدیل کردیتا ہے۔ اور تو ماں ہے۔ گڑگڑا کر مانگے گی تو ہوسکتا ہے اس کا دریائے رحمت جوش میں آجائے۔"

رابعہ بی بی نے شفقت کی انگلی تھامی اور شاہ بابا کے آستانے سے اٹھی، اس عزم کے ساتھ کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے اتنی دعائیں اور التجائیں کرے گی کہ بارگاہِ الٰہی میں یہ حل کی لکیر ہوا میں تحلیل ہوجائے گی لیکن اس دکھیاری کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے پاس تو دعائیں مانگنے کی مہلت ہی نہیں ہے۔ دوسری صبح جب وہ اپنے بیمار اور فالج زدہ شوہر اور اکلوتے بیٹے شفقت کے لیے دودھ اور ڈبل روٹی لینے کے لیے گھر سے نکلی تو ایک تیز رفتار ٹرک کے نیچے آکر زندگی کی بازی ہار گئی۔ رابعہ کی موت کے بعد اس کا شوہر شاہ نواز بھی زیادہ دن نہیں جی سکا اور شفقت کو اس بھری پری دنیا میں تنہا چھوڑ کر ملک عدم سدھار گیا۔ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ شفقت کا معصوم ذہن کچھ سمجھ ہی نہ سکا۔ محلے والوں اور عزیز رشتے داروں نے کچھ دن اس کا خیال بھی رکھا اور دلاسے تسلی بھی دیتے رہے لیکن آخر کب تک...... سب کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔

چند دن بعد شفقت کو احساس ہوا کہ وہ دنیا کے اس لق و دق صحرا میں بالکل اکیلا کھڑا ہے۔ اس بری گھڑی میں اسے اپنے والد کے ایک دوست یاد آئے جنہیں وہ امجد چچا کہتا تھا۔ امجد چچا اس کے خاندان کے ہمدرد تھے اور اکثر ان لوگوں کی مدد بھی کرتے رہتے تھے۔ جھجکتے جھجکتے قدم اٹھاتا وہ امجد چچا کے دروازے پر پہنچا اور ہولے سے دستک دی۔ امجد نے نہ صرف اس کے لیے دروازہ کھولا بلکہ اپنی بانہیں بھی وا کردیں۔ امجد کی وجہ سے ہی وہ اسکول کی صورت بھی دیکھ پایا۔ چند جماعتیں ہی پڑھ پایا تھا کہ امجد کی بیوی صغریٰ نے جسے وہ چچی کہتا تھا، یہ کہہ کر اس کا تعلیمی سلسلہ روک دیا۔

"آج کل پڑھے لکھے لوگ برساتی کیڑوں کی طرح زمین سے ابل رہے ہیں۔ کوئی نوکریاں ان کے پاس چل کر آرہی ہیں۔ گریجویشن اور ماسٹرز کرنے کے بعد بھی یا تو وہ سبزی بیچ رہے ہیں یا ٹیکسی چلا رہے ہیں۔ تو کیوں نہ یہ کام پہلے کرلیا جائے، وقت ضائع کرنے سے فائدہ۔"

چچی کا پچاس کلو کا گٹھا ہوا جسم اور پھر ان کا انداز بیاں۔ چچا امجد نے اس کی حمایت میں کچھ کہنا بھی چاہا تو بیوی کی خونخوار نظروں کی تاب نہ لاکر فوراً باہر کی راہ لی۔

جس روز چچی نے اس کو اسکول جانے سے روکا، وہ اس دن خوب رویا۔ ابھی تک محض اسکول جانے کے شوق میں وہ چچی کا ہر کام دوڑ دوڑ کے کرتا تھا۔ آج اسے اپنے ماں باپ بے پناہ یاد آئے۔

☆☆☆

شفقت شکل و صورت کے اعتبار سے کسی افریقی باشندے سے کم نہیں تھا۔ پکا سیاہی مائل رنگ۔ موٹے موٹے نقوش اور الجھے گھنے سیاہ بال لیکن اس کے مرحوم والدین اسے شہزادہ گلفام سمجھتے تھے۔ شکلاً وہ ضرور کمتر تھا لیکن عقلاً بلا کا تیز تھا۔ بلکہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے کوئی غلط کام کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلتا تو فوراً انگلیاں ٹیڑھی کرلو اور اس وقت بھی اس نے یہی کیا۔ فوراً امجد اور صغریٰ کے گھر سے فرار کا منصوبہ بنا کر دوسرے دن اس پر عمل بھی کر ڈالا۔

صغریٰ نے حسب سابق مہینے کی دو تاریخ کو اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک موٹی گڈی تھماتے ہوئے کہا۔ "شفو! آج تم نے تمام بلوں کی ادائیگی، ورزی کی سلائی کا بل، مہینے بھر کا راشن لے کر بقایا رقم بینک میں جمع کروانی ہے۔ جلدی سے گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے یہ کام کرڈال۔ چل جلدی کر۔"

شفو نے فرماں برداری سے اثباتی انداز میں سر ہلایا اور آہستہ سے کہا۔ "جی چچی! آپ اطمینان رکھیے، بس ابھی گیا اور ابھی آیا۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔" اس کے جانے کے بعد جب شام تک شفو کی صورت نظر نہ آئی تو چچی صغریٰ تھی سے چچا امجد سے لڑلڑ کر پاگل ہوگئی۔ ہزار ہا صلواتیں نہ صرف شفو کو سنائیں بلکہ اس کے مرحوم والدین کو بھی نہ بخشا۔

☆☆☆

تیز رفتاری سے چلتی ہوئی ٹرین میں بیٹھا شفو کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرکے لطف اندوز ہورہا تھا۔ ٹرین کراچی کی جانب رواں دواں تھی۔ کراچی جانے کا فیصلہ اس نے کافی سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں ضرور اسے کوئی کام کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ کئی

دنوں کی تگ و دو کے بعد اسے احساس ہوا کہ انسانوں کے اس جنگل میں روزگار تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے ریت میں سوئی تلاش کرنا۔ چچی کے سر پر دست شفقت پھیر کر اس نے جو رقم حاصل کی تھی، وہ اب قریب الختم تھی۔ کراچی کی چھوٹی بڑی شاہراہوں اور ان گنت گلیوں میں چلتے ہوئے وہ کچھ ایسے لوگوں سے ٹکرایا جو پیسا کمانے کے لیے شارٹ کٹ اپناتے ہیں۔ جرائم پیشہ طبقے سے جو لوگ تعلق رکھتے تھے، شنو ان میں ایسا گھل مل گیا جیسے شیر و شکر لیکن اتنے لوگوں میں ان کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ صرف دو انسان تھے۔ ایک گلو اور دوسرا کفیل۔

گلو جسے اپنے اصلی نام کا خود بھی علم نہیں تھا۔ بس لوگوں نے اسے گلو کہہ کر پکارنا شروع کیا اور یہی اس کا نام بن گیا تھا۔ عام سی صورت شکل لیکن مضبوط کاٹھی کا نوجوان تھا۔ طبیعتاً چالاک، مکار تھا۔ ہمیشہ دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلاتا اور ایسی حکمت عملی اختیار کرتا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس کے مقابلے میں کفیل سیدھا سادہ اور کمزور سا تھا۔ تینوں ہر چوری، ہر ڈکیتی نہایت منظم طریقے سے اور منصوبہ سازی کے ساتھ کرتے اور جب کوئی بڑا ہاتھ مارنا ہوتا اور معاملہ پرخطر ہوتا تو دونوں شنو کی طرف دیکھتے۔ شنو جرم کی نوعیت کو مدنظر رکھتے ہوئے جائے واردات کا نقشہ، طریقہ واردات، خطرناک صورت حال میں راہ فرار کس طرح اختیار کی جائے، دونوں کو اس طرح سمجھاتا کہ دونوں بخوبی سارا کیس ہینڈل کر لیتے۔ تینوں میں یہ معاملہ پہلے ہی طے پا گیا تھا کہ حاصل شدہ رقم کا پچاس فیصد شنو رکھے گا اور باقی پچاس فیصد گلو اور کفیل آپس میں بانٹیں گے۔

کچھ عرصے تو کام برابر چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے گلو اور کفیل کو اس بات کا ادراک ہونے لگا کہ شنو انہیں غلام سمجھنے لگا ہے۔ آخر میں صرف زبان ہلانے کی فیس جو ففٹی پرسنٹ بنتی، وہ لے کر علیحدہ ہو جاتا۔ شنو کا وجود دونوں کو کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اس وقت بھی تینوں شہر کے اوسط درجے کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے اور اسی موضوع پر بحث و تکرار کر رہے تھے۔ گلو اور کفیل کا متفقہ فیصلہ تھا کہ پیسے کا بٹوارا تین حصوں میں برابر کیا جائے اور وہ حکمت عملی تبدیل کرنے پر بھی زور دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خطرناک لمحات میں شنو کو بھی ان کے ساتھ ہونا چاہیے تاکہ اگر حوالات کی سیر کرنے کا موقع آئے تو تینوں مشترکہ طور پر انجوائے کریں لیکن شنو کے لیے کسی طور پر یہ فیصلہ قابل قبول نہیں تھا۔ فی الحال بیرے کے آنے سے بحث کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن تینوں کے چہرے اندرونی... مد و جزر کی چغلی کھا رہے تھے۔ گلو نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ کفیل کی مدد سے وہ شنو کو ایسا سبق سکھائے گا جو وہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔ انگلیاں ٹیڑھی کر کے گھی نکالنے والا شنو کا اصول وہ بھی اپنائے گا۔

☆☆☆

کہتے ہیں کہ انسان پر سب سے برا وقت وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ کو عقلمند سمجھنے لگتا ہے اور یہی سب کچھ شنو کے ساتھ ہوا۔ جرم و سزا کی دنیا اسے ایسی راس آئی کہ مٹی کو ہاتھ لگاتا تو وہ سونا بن جاتی۔ شب و روز روپے پیسے کی جھنکار تھی۔ اکثر وہ سوچتا کہ کاش آج اس کی ماں اور شاہ بابا بقید حیات ہوتے تو انہیں دکھاتا کہ اس کی تقدیر لکھنے والے نے سونے کے قلم سے لکھی ہے اور وہ خط تقدیر جو اس کی ماں کے لیے پریشانی کا باعث بنا تھا، اسے تدبیر کے زور پر بھی کا مٹا چکا ہے۔ وہ ہر کام اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر اتنی صفائی سے کرتا کہ پولیس تاکتی رہ جاتی لیکن ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اسے آسمان کی بلندی سے اٹھا کر زمین کی پستیوں میں لا پھینکا۔

☆☆☆

آج تینوں بہت خوش تھے۔ خلاف توقع تھوڑی سی محنت کے بعد ایک تگڑی رقم ہاتھ لگی تھی۔ فتو جوان کا یار غار تھا، اس کے مویشی باڑے میں بیٹھک طے پائی تھی۔ رقم کا بٹوارا بھی وہیں ہونا تھا۔ تینوں نے مشترکہ طور پر ایک کھٹارا کار خرید رکھی تھی۔ اسی کھٹارا کار میں بیٹھ کر وہ اپنے مقررہ وقت پر فتو کے باڑے میں پہنچ گئے۔ شام کے سناٹے گہرے ہوتے جا رہے تھے اور ساتھ ہی سردی بھی بڑھ رہی تھی۔ باڑے میں خشک گھاس کے ڈھیر پر تینوں اس طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھے جیسے راجا مہاراجا اپنے سنگھاسن پر بیٹھتے ہیں۔ زرد مدھم جلتے ہوئے بلب کی روشنی میں شنو نے دونوں دوستوں پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے بیگ کو تھپتھپاتے ہوئے مطمئن لہجے میں دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یارو! آج تو ہمارے وارے نیارے ہو گئے۔ چلو اب مال کی تقسیم کا کام بھی نمٹا لیتے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے بیگ کی زپ کھولنا چاہی۔ معاً گلو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سرد لہجے میں کہا۔ ''ٹھہرو...... شنو بھائی! پہلے ہماری بھی ایک بات سن لو۔ پیسے کا بٹوارا آج ہم

دونوں کی مرضی سے ہوگا۔ اس مال میں تین برابر کے حصے ہوں گے۔ ابھی تک بالائی آپ لے جاتے تھے اور نیچے کا پانی ہمارے حصے میں آتا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔''

شفو نے غور سے گلو کی بات سنی اور پھر غراتی ہوئی آواز میں کفیل سے مستفسر ہوا۔ ''کفیل! کیا تیری بھی ڈیمانڈ یہی ہے؟''

کفیل نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں شفو بھائی! میں بھی اس احتجاج میں شامل ہوں۔''

''ہوں......''

شفو کے اعصاب تن گئے اور جبڑوں کو اس نے بری طرح بھینچ لیا تھا اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''عقل کے اندھو! تم دونوں بڑے احسان فراموش ہو۔ میں اپنی ذہانت سے تم دونوں کے لیے ایسی اسکیم ایسی ترتیب دیتا ہوں کہ سر کڑھائی میں ہوتا ہے اور انگلیاں گھی میں...... لیکن تمہیں یہ سب راس نہیں آرہا تا۔ تم دونوں کو ایک بار نہیں کئی بار پولیس کی ناک کے نیچے سے نکال کر لایا ہوں۔ ورنہ اب تک تو تم دونوں سڑ گئے ہوتے جیل کی کال کوٹھری میں۔''

ہمیشہ خاموش رہنے والا کفیل کفن پھاڑ کر بولا۔ ''بس بس شفو بھائی! کون کتنے پانی میں ہے، ہمیں بھی پتا ہے۔ اگر ہم دونوں احسان فراموش ہیں تو آپ کون سے دودھ سے نہائے ہوئے ہو۔''

شفو چونکا۔ اس کے وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ سیدھا سادہ نظر آنے والا اسے طعنہ مارے گا۔

کفیل کے شیر ہوتے ہی گلو کی آواز بھی بلند ہوگئی۔ اس نے بھی کرخت آواز میں کہا۔ ''شفو بھائی! ہم نے ہمیشہ آپ کا ادب کیا ہے۔ ہر کیس میں آپ کی ذہانت ہے تو ہماری بھی محنت ہوتی ہے لیکن آپ مگر مچھ بن کر سب کچھ نگل جاتے ہیں اور ہم دیکھتے رہ جاتے ہیں۔''

''کیا کہا مگر مچھ۔'' شفو نے چلا کر کہا اور بیگ ایک طرف رکھ کر تنتا کر کھڑا ہوگیا۔ اب شفو کا ہاتھ تھا اور دونوں کے گریبان۔ گلو کا جسم کسرتی اور مضبوط تھا اور وہ سارے داؤ پیچ بھی جانتا تھا جبکہ کفیل جسمانی طور پر کمزور اور اس میدان میں اناڑی تھا۔ وہ شفو کی لاتوں اور گھونسوں کا جواب نہیں دے سکا اور گھاس کے ڈھیر پر ہی چکرا کر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کی حالت دیکھ کر گلو نے چھلانگ لگائی اور کفیل کو جھنجوڑ ڈالا اور پھر پھنسی پھنسی آواز میں چیخا۔

''ارے شفو بھائی! یہ کیا کر ڈالا؟ یہ تو سانس ہی نہیں لے رہا ہے۔ لگتا ہے کوئی کرارا ہاتھ لگا دیا جب ہی یہ دنیا سے کوچ کر گیا۔''

شفو کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ خوف اور وحشت سے اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور پھر جھک کر کفیل کو ہلانے لگا اور گلوگیر آواز میں کہا۔ ''ارے اٹھ جا میرے یار...... جو تو کہے گا وہی ہوگا۔ بس اب مجھے زیادہ پریشان نہ کر۔'' اس کے لہجے میں پچھتاوا، تاسف اور دکھ کا عنصر نمایاں تھا۔ گلو اور شفو کی لاکھ کوشش کے باوجود کفیل نے کوئی جنبش نہیں کی۔

شاہ بابا کی برسوں پہلے کہی ہوئی بات شفو کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں گلو کو مخاطب کیا اور کہا۔ ''یقین کر گلو میں نے کوئی ایسا کاری وار نہیں کیا جس کی وجہ سے اس کی موت ہوگئی۔''

گلو نے استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''واہ شفو بھائی واہ...... اس غریب نے جان سے ہاتھ دھو لیے اور آپ کہتے ہیں میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ میں چشم دید گواہ ہوں اس قتل کا۔ اگر میری زبان کھل گئی نا تو آپ کی ساری عمر آہنی سلاخوں کے پیچھے کٹ جائے گی۔''

شفو نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے گلو سے کہا۔ ''گلو! اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتے ہیں۔''

گلو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر سے کیا کہو گے کہ میرے ایک ہاتھ نے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا ہے۔ یہ سب سن کر ڈاکٹر آپ کی خیریت نہیں پوچھے گا بلکہ پہلی فرصت میں پولیس کو فون کرے گا اور ایسا برا وقت آنے سے پہلے میں آپ سے رخصت چاہوں گا۔''

شفو کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس نے گھگیاتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں روہانسی آواز میں کہا۔ ''نہیں نہیں گلو، میرے دوست! اس مشکل وقت میں میرا ساتھ نہ چھوڑو۔ اب بتاؤ اس لاش کو کہاں ٹھکانے لگائیں۔ تو جو بولے گا میں وہی کروں گا۔''

گلو نے اپنے گرد و نواح میں ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ جیسے جیسے رات بھیگ رہی تھی، سردی زور پکڑ رہی تھی۔ گلو نے گرم مفلر اپنے کانوں کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''چلو اٹھو اور اس نومن کی لاش کو اٹھانے میں میری مدد کرو۔''

شفو نے گھبرا کر کہا۔ ''اسے...... اسے کہاں لے

جائیں گے؟''

اس سخت سردی میں بھی وہ پسینے سے شرابور ہوگیا تھا۔ سراسیمگی اور خوف سے اس کا برا حال تھا۔ چوری چکاری تو ایک الگ چیز تھی۔ کسی کے خون سے پہلی بار ہاتھ رنگے تھے۔ ذہنی طور پر وہ بالکل ہی مفلوج ہوگیا تھا۔ اس کے استفسار پر گلو کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے غضب ناک لہجے میں جواباً کہا۔ ''ارے شنو بھائی! کیا بالکل ہی دماغ چل گیا ہے۔ اس ڈیڈ باڈی کو یا تو دریا برد کرنا ہوگا یا کہیں تدفین کرکے اس کی فاتحہ پڑھنی ہوگی۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کا......''

درمیان میں ہی شنو نے جملہ اچک لیا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' اور زور زور سے اثبات میں گردن ہلا کر لاش اٹھانے میں گلو کی مدد کرنے لگا۔ دونوں کے نصیب اچھے تھے کہ باڑے کا چوکیدار آج چھٹی پر تھا۔ دونوں نے لاش کو عقبی سیٹ پر لٹا کر چادر ڈال دی۔ گلو ہمت سے کام لے رہا تھا۔ گاڑی کا انجن پہلے تو غراتا رہا، اس کے بعد چند ہچکیاں لیں اور اسٹارٹ ہوگیا۔ ایک دھچکے سے گاڑی چل پڑی۔ سڑک طویل اور سنسان تھی۔ لوگوں کی آمد و رفت ادھر بہت کم ہی تھی۔ اس وقت شنو ہاتھوں کی لکیروں میں الجھا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ شاہ بابا کی پیش گوئی کتنی سچی ثابت ہوئی تھی۔ حقیقت میں اس کے ہاتھ میں قتل کی لکیر تھی اور آج وہ واقعی ایک قتل کرچکا تھا۔

سارا راستہ بخیر و خوبی طے پاگیا۔ گلو نے سڑک کے کنارے کچے میں گاڑی روک دی۔ مقتول کی لاش دونوں نے سنبھال کر اتاری اور زمین پر لٹا دی۔ دونوں نے اطمینان کی سانس لی اور پھر گلو نے سکوت توڑا اور کہا۔ ''شنو بھائی! اس لاش کو ٹھکانے لگانے سے پہلے میں آپ سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

شنو جو کہ وحشت کے مارے خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہل رہا تھا، اس نے تھوک نگلتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔ ''گلو! میں تیری ایک نہیں ایک ہزار باتیں سن لوں گا لیکن سب سے پہلے اس مصیبت سے میری جان چھڑا۔ ورنہ یقین کر میں یہیں دم چھوڑ دوں گا اور تجھے ایک نہیں دو لاشوں کا کریا کرم کرنا پڑے گا۔''

گلو نے اس کی بات پر کھل کر قہقہہ لگایا۔ اس کی یہ ہنسی اتنی زندہ اور جاندار تھی کہ ایسا بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے مقتول دوست کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے آیا ہوا ہے۔ دکھ، غم اور پریشانی کا ہلکا سا شائبہ بھی اس کے چہرے پر نہیں تھا۔ جس جگہ دونوں کھڑے تھے، وہاں حد سے زیادہ تاریکی تھی اس لیے گلو نے اپنی جیب سے ٹارچ نکال کر روشنی کا متحرک دائرہ ادھر ادھر پھینکا اور مدھم آواز میں کہا۔

''شنو بھائی! چادر میں لپیٹ کر اسے لیے چلتے ہیں۔ ذرا مضبوطی سے پکڑنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' شنو نے جواب دیا۔ یہ سارا علاقہ گھنی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ راستہ حد درجہ دشوار گزار تھا۔ اچانک دور کہیں کتے کے بھونکنے کی آواز بلند ہوئی اور شنو کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑگئی۔ اس نے گھبرا کر لاش زمین پر رکھ دی۔

گلو نے پھر اپنی جیبی ٹارچ کا سہارا لیا اور اپنی عقابی نظروں سے اطراف کا معائنہ کیا اور کہا۔ ''میرے خیال میں تدفین کے لیے یہ جگہ مناسب ہے۔ برسوں کوئی ادھر جھانکے گا بھی نہیں۔ اگر کبھی کسی کھدائی میں ہڈیاں نکلتی بھی ہیں تو کون پہچانے گا کہ کس کی باقیات ہیں۔ کیوں صحیح کہہ رہا ہوں نا میں؟''

یہ کہہ کر جب اس نے شنو کی طرف نظر ڈالی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے شنو کا خون نچوڑ لیا ہو۔ گلو نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں شنو بھائی۔ آپ کا ایک دوست مرا ہے لیکن دوسرا زندہ ہے۔ آپ ایسا کریں واپس جا کر آرام کریں۔ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں، میں سب کرلوں گا۔''

گلو کی بات سنتے ہی شنو نے ایک پرسکون سانس خارج کی۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آرہی تھی۔ اس نے اظہارِ تشکر کے طور پر زور سے گلو کا ہاتھ دبایا اور کہا۔ ''تم صحیح کہہ رہے ہو، اس وقت میری حالت بالکل غیر ہورہی ہے۔ اگر یہ سارا اجنجال تم نمٹا دو تو میں زندگی کی آخری سانس تک تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔''

گلو نے ایک سنگدلانہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی اور سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ ''میں کوئی احسان نہیں کررہا ہوں، احسان کرنا، نیکی کرنا یہ اپنی فطرت میں نہیں۔ اپنا تو اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والا معاملہ ہے۔ آپ کے ساتھ کھرا اور صاف ستھرا سودا کرتا ہے۔ اس سارے معاملے کو نمٹانے کا معاوضہ یہ ہوگا کہ آج کا سارا مال اپن کا۔ آپ کو ایک پائی بھی نہیں ملے گی اور میں زندگی بھر ہونٹوں کو قفل لگا کر رکھوں گا لیکن آپ کو ہر مہینے اس کی پیمنٹ کرنی ہوگی۔ اگر آپ اس معاہدے پر کار بند رہتے ہیں تو اپن بھی یاروں کے یار ہیں ورنہ پھر آپ کو معلوم ہے

کہ اپن کیا چیز ہے۔''
شنو گو مگو کے عالم میں کھڑا گلو کی باتیں سن رہا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ گلو کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اگر روشنی ہوتی تو اسے نظر آ جاتا کہ گلو کی آنکھوں میں شیطانیت اور ہوس ناچ رہی ہے۔ تمام حالات چونکہ شنو کے خلاف جا رہے تھے اور خوف و دہشت نے اس کی عقل سلب کر لی تھی، اس لیے وقت کی نزاکت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس نے دل پر پتھر رکھ کر ہامی بھر لی۔
جیسے ہی اس کے منہ سے ہاں نکلی، گلو کے دل کی مراد پوری ہوگئی۔ اس نے مسرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''بس اب آپ کی چھٹی...... آپ جا کر خوابِ خرگوش کے مزے لیں۔ یہ ساری ذمے داری اب میری ہے۔ بس رقم کا بیگ مجھے تھماتے جایئے گا۔''
شنو کو جیسے ہی گلو کی طرف سے اجازت ملی، وہ ایسے بھاگا کہ عقب میں پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور اس کی غراہٹ سنائی دی پھر آواز بتدریج کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی۔ گلو سمجھ گیا کہ شنو اس علاقے سے نکل چکا ہے۔ اس نے گہری سانس لی اور اپنے کوٹ کی جیب سے پانی کی بوتل نکال کر دو گھونٹ پیے اور باقی کا سارا پانی کفیل کے چہرے پر انڈیل دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں کفیل نے ایک جھرجھری لی اور آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو ایک لمبی سانس کے ساتھ اس نے بہت سی آکسیجن اپنے پھیپھڑوں میں بھری اور پھر دونوں نے ''ہرّے'' کا نعرہ لگایا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ان کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ کفیل نے آہستہ سے گلو کے کان میں سرگوشی کی۔ ''گلو! اپنی چال کامیاب ہو جائے گی نا؟''
گلو بولا۔ ''ہو جائے گی کا کیا مطلب، چال کامیاب ہو چکی ہے۔ ویسے میرے یار تو نے یہ سانس روک کر دم سادھے رکھنے کا فن کس سے سیکھا ہے؟''
کفیل نے جواباً کہا۔ ''اپنے ابا سے سیکھا ہے۔ وہ ہندو جوگیوں اور سادھو سنتو میں بہت اٹھتے بیٹھتے تھے اور میری اماں انہیں ہمیشہ روکتی تھی لیکن ابا کبھی کسی کی بھی نہیں سنتے تھے۔ جب ابا مجھے سانس روکنے کی مشق کرواتے تو ان کا اور اماں کا زبردست جھگڑا ہوتا۔ اس لیے میں اسے مکمل طور پر سیکھ نہیں پایا۔ بلکہ یہ سمجھو میں بالکل کچا اور اناڑی ہوں۔ جبکہ میرے ابا اس فن کے ماہر تھے۔''
گلو نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ ''ویسے دوست! تیرے ابا نے بھلے ہی ورثے میں تیرے لیے کچھ نہ چھوڑا ہو لیکن تجھے ایسا انمول ہنر سکھا کر گئے ہیں کہ ہم ساری زندگی اب چین کی بانسری بجائیں گے۔ لیکن تیرے پاس جو یہ ہنر ہے، اس کے بارے میں کسی اور کو تو علم نہیں؟''
اس کی بات سن کر کفیل کے چہرے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ وہ دماغ پر زور ڈال کر سوچنے لگا پھر پُرخیال انداز میں گلو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میری اماں اور چھوٹی بہن کو اس بات کا علم ہے کہ ابا یہ ہنر مجھ میں منتقل کر کے گئے ہیں۔''
گلو نے جھلا کر ترش روئی کے ساتھ کہا۔ ''ابے میں تیری اماں یا تیرے خاندان کی بات نہیں کر رہا بلکہ اپنے گینگ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ اگر بھی کسی نے شنو کے کان میں سور پھونک دیا تو ہمارا سارا ڈراما فیل ہو جائے گا۔ پھر ہم دونوں کو شنو پھانسی پر لٹکائے بغیر نہیں مانے گا۔''
کفیل نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ''نہیں، نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تیرے علاوہ ہمارے گروہ میں کسی کو بھی میری اس صلاحیت کا پتا نہیں۔ حالانکہ اپنے ساتھیوں میں سے کتنوں نے مجھ سے یہ سوال بارہا کیا کہ میں نشہ کیوں نہیں کرتا۔ میں نے کسی کو تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ میرے ابا نے مجھے پہلا سبق یہی دیا تھا کہ اگر میں کسی بھی قسم کے نشے کو ہاتھ لگاؤں گا تو پھر اپنی سانسوں پر قابو نہیں رکھ سکوں گا۔ اسی لیے میں سگریٹ اور شراب سے دور رہتا ہوں۔''
گلو نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔ اسی لیے تو ان چیزوں کو چھوتا بھی نہیں ہے۔ ورنہ ہمارے دن و رات تو شراب اور شباب کے بغیر نامکمل ہیں۔ اس دلدل میں اترنے کے بعد تو پیر دھنستے ہی جاتے ہیں۔''
کفیل نے اچانک اس سے سوال کیا۔ ''گلو! کبھی تو نے اپنے بارے میں نہیں بتایا کون ہے اور کہاں سے تعلق ہے؟''
گلو نے ایک زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''معلوم ہوتا تو بتاتا نا۔ مجھے تو آسمان نے پھینکا اور زمین نے جھیلا۔ بس میرے علم میں اتنی بات ہے۔ چل اب چلتے ہیں، سردی کے مارے ہڈیوں کا گودا بھی جم گیا ہے۔'' دونوں شانہ بشانہ چلتے ہوئے جھاڑیوں سے نکل کر سڑک کے کنارے کچی زمین پر نکل آئے جہاں ان کی کھٹارا کار آ کر رکی تھی۔ گلو نے روشنی کے دائرے میں زمین کو غور سے دیکھا اور کہا۔
''میں نے اس چھکڑے کو یہیں روکا تھا۔'' کفیل نے بھی ٹائر کے نشانات دیکھتے ہوئے کہا۔
''آج اس چھکڑے نے ہمیں مروا ہی دیا تھا۔ یہ شنو ہے بھی بلا کا ذہین، تم صحیح کہتے ہو اسے اگر ذرا سی بھی سن گن مل گئی تو ہم دونوں کو چھوڑے گا نہیں۔''

دونوں کافی دور تک پیدل چلتے رہے، اس کے بعد گلو نے استفسار کیا۔

”کفیل! میرے ساتھ میرے گھر چلو گے یا......“

کفیل نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اب بھی تمہارے ساتھ یا گروہ کے کسی آدمی کے ساتھ نظر آنے کی حماقت نہیں کرسکتا۔ میں تم لوگوں کے لیے مفرور اور شنو کے لیے مردہ ہوں۔ بس اب معاہدے کے مطابق میرا آدھا حصہ میرے بتائے ہوئے پتے پر میرے حوالے کرجانا۔ اگر بے ایمانی کی تو سیدھا شنو کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

گلو ہنسنے لگا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں نہیں، اطمینان رکھو۔ ہم کام ضرور بے ایمانی کا کرتے ہیں لیکن ایمانداری کے ساتھ کرتے ہیں۔“ ایک چوراہے پر آکر دونوں دوستوں کے راستے علیحدہ علیحدہ ہوگئے۔ دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔

☆☆☆

شنو تھکے دل اور ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کمرے میں پہنچا۔ وہ جاتے ہی جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔ بار بار اس کے ذہن میں یہ بات آرہی تھی کہ اس نے کفیل پر بالکل ہلکا ہاتھ اٹھایا تھا، کوئی کاری ضرب نہیں لگائی پھر اچانک اس کی موت کیسے واقع ہوگئی؟ سوچتے سوچتے جب دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں تو وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ بری طرح پچھتاوے کا شکار تھا۔ بالآخر تھک ہار کر اس نے اپنے سیل فون پر گلو کا نمبر ڈائل کیا۔ گلو کو کافی راستہ طے کرنے کے بعد ٹیکسی نصیب ہوئی تھی اور ابھی ابھی وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچا ہی تھا کہ اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ نیند کا خمار سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ موبائل پر نمبر دیکھ کر اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں اس نے ”ہیلو“ کہا۔

نہایت مدھم اور آہستہ آواز میں شنو نے استفسار کیا۔ ”گلو! کام ہوگیا؟“

”کونسا کام؟“ گلو کا جواب تھا۔ اس کا غیر دانشمندانہ جواب سن کر شنو اس فکر و پریشانی میں بھی بے ساختہ ہنس پڑا اور پھر موبائل آف کردیا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوچکی تھی لیکن شنو کے بیڈ کی چادر اس بات کی غمازی کررہی تھی کہ وہ رات بھر سویا نہیں ہے۔ کمرے میں اب بھی قبرستان کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

گلو اپنی کہی ہوئی بات پر سختی سے عمل پیرا تھا۔ وہ ہر مہینے جاکر شنو کے سر پر سوار ہوجاتا اور شنو اس کے ہاتھ میں ایک پھولا ہوا لفافہ تھما دیتا۔ گلو ایک عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنا بھتا وصول کرتا اور ”اچھا اگلے مہینے ملاقات ہوگی شنو بھائی۔“ کہتا ہوا رخصت ہوجاتا اور شنو خون کے گھونٹ پی کر اسے جاتا ہوا دیکھتا رہتا۔ گلو وہاں سے نکل کر ٹھکانے پر آتا اور وہاں پہنچ کر لفافے کو اچھا خاصا ہلکا کرنے کے بعد کفیل کے ٹھکانے پر پہنچتا اور کفیل کے ہاتھ میں لفافہ رکھ کر کہتا۔ ”جو رقم ملی تھی، وہ میں نے ففٹی ففٹی بانٹ لی ہے۔ یہ تمہارا حصہ۔“ اور کفیل خوشی سے پھولے نہ سماتا کہ بغیر محنت مشقت کے ایک بڑی رقم خود چل کر اس کے پاس آرہی تھی۔ کفیل مکمل پردہ پوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔

☆☆☆

شنو اب پہلے والا شنو نہیں رہا تھا۔ جب سے اس کے ہاتھوں کفیل کا ”قتل“ ہوا تھا، اس نے اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کو یکدم ترک کردیا تھا۔ اگر کچھ کرنا بھی چاہتا تو اچانک وہ وحشت ناک رات اسے یاد آجاتی اور دل بیٹھنے لگتا۔ آہستہ آہستہ خیالات نے کروٹ لی اور وہ سوچنے لگا کہ اس راہ میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ لاکھ دولت کے انبار ہوں گے لیکن خوف و دہشت کی تلوار سر پر لٹکی ہوگی۔ آخری ٹھکانا جیل کی چار دیواری اور پھانسی کا تختہ ہوگا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے زمینوں کی خرید و فروخت اور بلڈنگ کنسٹرکشن میں اپنا سرمایہ لگایا۔ اپنی جمع پونجی جب اس نے اس کام میں لگائی تو وہ بری طرح ہراساں تھا لیکن غلاظت کے اس جوہڑ میں واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پوری محنت اور دلجمعی کے ساتھ کام کرتا رہا اور پھر اتنے مثبت نتائج سامنے آئے کہ وہ خود حیران رہ گیا۔ پیسا پیسے کو کھینچتا ہے۔ بہت تیزی سے اس نے اس فیلڈ میں اپنی جگہ بنالی۔ اس نے اپنا اسٹینڈرڈ تبدیل کیا۔ کرائے کا چھوٹا سا کمرا چھوڑ کر متوسط پسماندہ علاقے میں ایک فلیٹ خریدا اور کھٹارا کار ہمیشہ کے لیے گلو کو بخش دی اور خود اس نے مناسب داموں میں ایک سیکنڈ ہینڈ کار خریدلی جو کافی بہتر حالت میں تھی۔ فلیٹ کا پتا بھی اس نے گلو کو نہیں بتایا۔ رقم کا لین دین کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں ہوتا تھا۔ شنو کے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں اور وہ کیا کررہا ہے، اس کی خبر نہ صرف گلو کو رہتی بلکہ در پردہ رہنے والے کفیل کو بھی اس کا علم ہوتا۔ شنو کا پھلتا پھولتا کاروبار دیکھ کر دونوں کے منہ میں پانی آرہا تھا۔ دونوں اپنی ڈیمانڈ بڑھانا چاہ رہے تھے لیکن گلو مناسب موقع کی تلاش میں تھا اور پھر ایک دن گلو نے باتوں ہی باتوں میں اس بات کا اظہار کرہی دیا کہ راز کو راز رکھنے کی قیمت بڑھائی جائے۔ شنو نے بڑی خوبصورتی سے اسے ٹال کر اپنا دامن بچالیا۔

☆☆☆

جون کی چلچلاتی دھوپ آگ برسا رہی تھی۔ لُو کے تھپیڑے ایسے چل رہے تھے جیسے برچھیاں اور خنجر۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ شنو کو اپنے کام کے سلسلے میں اس گرم موسم میں باہر نکلنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ بھی اس وقت اپنے فلیٹ میں اے سی کی ٹھنڈک میں آرام کر رہا ہوتا۔ اس وقت وہ ایسی سڑک سے گزر رہا تھا جہاں ہمیشہ گہما گہمی اور چہل پہل ہوتی تھی لیکن آج نسبتاً درجۂ حرارت کچھ زیادہ تھا اس لیے دور تک سناٹا تھا۔ اچانک شنو کی نظر ایک برقع پوش خاتون پر پڑی جو اسے لفٹ کے لیے ہاتھ دے رہی تھی۔ شنو کسی کو لفٹ دینے کے سخت خلاف تھا۔ اس وقت اس نے گاڑی کی رفتار مدھم ضرور کر دی لیکن گاڑی روکی نہیں۔ برقع پوش خاتون اتنی تیز رفتاری سے گاڑی کے قریب آئی کہ شنو سمجھا کہ وہ گاڑی سے ٹکرا نہ جائے۔ گھبرا کر جلدی سے اس نے بریک لگائے اور سخت لہجے میں کہا۔ ''محترمہ! کیا خودکشی کے لیے میری ہی گاڑی ملی تھی؟''

برقع پوش خاتون نے فوراً اپنے چہرے کا نقاب ہٹا دیا۔ شنو کی نظریں جیسے ہی اس کے چہرے سے ٹکرائیں، نظریں وہیں جم کے رہ گئیں۔ برقع میں ملبوس وہ ایک نوعمر لڑکی تھی۔ چہرہ حد درجہ جاذب نگاہ، دودھیا رنگ میں ڈھلے سبک اور حسین نقوش۔ اتنا صبیح چہرہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ ابھی حسن کے اس شاہکار کو دیکھ ہی رہا تھا کہ لڑکی کی مترنم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''سر! بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے اپنی گاڑی میں لفٹ دے دیں تو...... دراصل میری والدہ کی طبیعت بہت خراب ہے اور انہیں فوراً طبی امداد کی ضرورت ہے۔'' لڑکی کا حسین سراپا، دلکش انداز گفتگو۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر لڑکی پھر گھگھیائی۔ ''دراصل یہاں اس وقت کوئی رکشا یا ٹیکسی نظر نہیں آ رہی ہے ورنہ میں آپ کو بالکل زحمت نہیں دیتی۔''

اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور دبنگ آواز میں کہا۔ ''محترمہ! میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی، سارے شہر میں آپ لوگوں نے لوٹ مار مچا رکھی ہے۔'' لڑکی بھونچکی سی اسے تک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ شنو نے اپنی گاڑی کی رفتار تیز کی اور یہ جا وہ جا۔ لڑکی حسرت بھری نظروں سے غبار اڑاتی گاڑی کو جاتا دیکھتی رہی۔

اپنے فلیٹ پر پہنچ کر سب سے پہلے شفقت نے شاور لیا اور گرمی اور پسینے سے نجات حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے کھانا گرم کر کے میز پر رکھا ہی تھا کہ قریب کے فلیٹ سے رونے دھونے اور بین کرنے کی آواز آئی۔ کھانا یونہی چھوڑ کر وہ فلیٹ کا دروازہ کھول کر تیز تیز قدموں سے راہداری میں آیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے قریب ترین فلیٹ کے سامنے عورتوں اور بچوں کا جمگھٹا لگا ہوا ہے۔ پڑوسی ہونے کے ناتے اس کا پوچھنا بھی فرض تھا۔ مجمعے کے قریب آ کر اس نے ایک معمر خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا ہوا آنٹی...... یہاں اتنی بھیڑ کیوں لگی ہوئی ہے؟''

خاتون نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''ارے بیٹا! کیا بتائیں، بیچاری معصومہ کی والدہ کی حالت بہت خراب ہے۔ فوراً اسپتال نہیں لے گئے تو اللہ نہ کرے کچھ ہو نہ جائے۔ میں نے اپنے نواسے کو بھیجا ہے ٹیکسی لانے، وہ بھی بہت دیر سے گیا ہوا ہے۔ معصومہ کا تڑپنا نہیں دیکھا جا رہا ہے۔ وہ دیکھو غریب کیسے بلک بلک کر رو رہی ہے۔''

اور جب اس بھیڑ کو چیرتے ہوئے شنو کی نگاہیں معصومہ پر جا کر ٹھہریں تو وہ پتھر بن گیا کیونکہ یہ وہی لڑکی تھی جو اس سے تھوڑی دیر پہلے لفٹ کے لیے گڑگڑا رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ لڑکی کوئی گینگ استعمال کر رہا ہے۔ وہ ابھی گن پوائنٹ پر اس کی جیب پر ہاتھ صاف کرے گی اور پھر اس سے گاڑی کی چابی طلب کرے گی۔ چونکہ ماضی میں اس کا تعلق بھی ایسے ہی لوگوں سے رہا تھا جو حسین و جمیل لڑکیوں کو ٹریپ کر کے لوٹ مار کا بازار گرم رکھتے تھے۔ اپنے کہے ہوئے جملے اسے یاد آئے تو وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ کفیل کے قتل کے بعد یہ دوسرا گھناؤنا عمل تھا جب اسے اپنے آپ سے کراہیت محسوس ہوئی۔ اس نے اسی خاتون کو پھر مخاطب کیا۔

''آنٹی! اگر کسی کو اعتراض نہ ہو تو مریضہ کو میں اپنی گاڑی میں اسپتال لے جاؤں؟'' معمر خاتون نے خوش ہو کر پل ہی پل میں اسے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں اور جلدی سے فلیٹ میں گھس کر معصومہ سے سرگوشیانہ انداز میں کچھ کہا اور پھر دونوں مریضہ کو سہارا دے کر باہر لائیں۔

معصومہ بری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ نحیف و نزار خاتون کو سہارا دینے کی کوشش کر رہی تھی لیکن خود بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ شنو آگے بڑھا اور کہا۔ ''آپ ہٹ جائیے۔'' یہ کہہ کر اس نے بوڑھی خاتون کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔

اب معصومہ نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں حیرت اور استعجاب کا رنگ تھا۔ ہلکی سی آواز میں اس نے تھرتھراتے لبوں سے کہا۔ ''آپ......؟''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



شفو اتنی دیر میں کار تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے معصومہ سے کہا۔ ''آپ دروازہ کھولیے۔'' معصومہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا، اس نے معصومہ کی والدہ کو پچھلی سیٹ پر لٹا کر کہا۔ ''آپ اپنی والدہ کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر اپنی گود میں لے لیجیے۔'' اور پھر ساتھ آنے والی معمر خاتون سے کہا۔ ''آنٹی! آپ میرے ساتھ بیٹھ جائیے۔''

ان لوگوں کو بٹھا کر وہ دوڑتا ہوا گیا اور اپنے فلیٹ کو تالا لگا کر فوراً لوٹ آیا۔ آتے ہی اس نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اسپتال کی پارکنگ میں کار روک کر اس نے فوراً اسٹریچر کا انتظام کروایا۔ مریضہ کو فوراً ایمرجنسی میں پہنچایا گیا کیونکہ ان کی سانسیں بے ترتیب چل رہی تھیں۔ معصومہ شدید پریشانی اور اضطراب کا شکار تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ پہلا اور ہلکا سا ہارٹ اٹیک ہے۔ اگر غفلت برتی گئی تو معاملہ سیریس بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے ٹریٹمنٹ کرنے کے بعد مناسب دوائیں تجویز کیں اور کچھ گھنٹے روک کے رکھا۔ کافی دیر بعد ڈاکٹر نے امید افزا خبر سنائی تو معصومہ پھول کی طرح کھل اٹھی۔ ساتھ آنے والی خاتون کے گلے لگ کر اس نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر شفو کو ممنون نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور ان حسین آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ کر شفو کا دل چاہا کہ ان میں ڈوب جائے۔

شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا جب اسپتال سے ان لوگوں کی واپسی ہوئی۔ معصومہ کی والدہ کی حالت کافی بہتر تھی۔ شفو نے گاڑی روک کر میڈیکل اسٹور سے دوائیں خریدیں اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھا تو کانوں میں پھر کسی نے شہد ٹپکایا۔ ''آپ کے اسپتال میں جو اخراجات ہوئے اس کے بھی مجھ سے پیسے نہیں لیے اور اب آپ دوائیں بھی لے آئے ہیں۔ گھر چل کر مجھے بل دے دیجیے گا۔'' شفو نے ''جی بہتر'' کہہ کر اثباتی انداز میں سر کو جنبش دی اور کار اسٹارٹ کر دی۔

معصومہ کی والدہ کی حالت بتدریج بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ شفو وقتاً فوقتاً جا کر ان کی خیریت دریافت کرتا رہتا تھا۔ اسی بہانے معصومہ کے رخِ روشن کا دیدار بھی ہو جاتا تھا۔ معصومہ چونکہ ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھی، اس لیے وہ ان اوقات میں وہاں جاتا ہی نہیں تھا جب معصومہ گھر میں نہیں ہوتی۔ اس کے خوابوں خیالوں کا مرکز اب معصومہ تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ معصومہ کی والدہ سے بات کر کے اسے اپنی دلہن بنا کر اس ویران فلیٹ میں لے آئے لیکن شیشہ دیکھ کر اسے اس سنگین حقیقت کا احساس ہوتا کہ اس کا اور معصومہ کا کوئی جوڑ نہیں۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔

آج صبح کافی دیر سے آنکھ کھلی۔ دیکھا تو سورج چڑھ آیا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھا کیونکہ آج اسے کئی کام نمٹانے تھے۔ ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنا ناشتا تیار کیا۔ اس دوران اس کے لبوں پر ایک گیت مچل رہا تھا۔ معاً اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھیں تو اسے ایسا لگا خواب میں آنے والی کلی مجسم بہار بن کر دروازے میں کھڑی ہے۔ معصومہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ دروازے میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبا تھا۔

شفو بری طرح بوکھلا گیا۔ گرم گرم چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس کا منہ جل گیا۔ اس نے گڑبڑا کر کہا۔ ''جی مجھ سے کوئی کام ہے؟ اماں کی طبیعت تو بہتر ہے؟''

معصومہ نے اس کی بوکھلاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ ''جی اللہ کا شکر ہے، اماں بخیر و عافیت ہیں بلکہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں نے دراصل ان کی صحت یابی کی خوشی میں نیاز دلوائی تھی۔ سب جگہ تو مٹھائی تقسیم کر دی لیکن آپ کا دروازہ صبح سے بند ہی نظر آ رہا تھا اس لیے اب لے کر آئی ہوں۔''

شفو کی گھبراہٹ میں کافی کمی آ گئی تھی۔ اس نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ ''جی دراصل میں رات دیر تک جاگا ہوں۔''

معصومہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

شفو کا دل چاہا کہ اسے چیخ چیخ کر بتا دے کہ میرے رت جگے کی وجہ تم ہو، تم مجھے سونے دیتی ہو نہ کوئی کام کرنے دیتی ہو۔ یہ سب کچھ وہ صرف سوچ کر رہ گیا۔ معصومہ کی ''کیوں'' کا اس نے جو جواب دیا وہ یہ تھا۔ ''جی رات ایک ضروری اور اہم کاروباری میٹنگ تھی اس لیے سونے میں کافی دیر ہو گئی۔''

معصومہ نے مٹھائی کا ڈبا جھک کر اس کی ناشتے کی میز پر رکھا اور کہا۔ ''اچھا میں چلتی ہوں۔''

شفو کا دل مچل اٹھا، اس کا جی چاہا کہ بڑھ کر معصومہ کو روک لے مگر وہ ایسا کر نہ سکا۔ گلابی بہار کا جھونکا آیا بھی اور اس کے پاس سے گزر بھی گیا۔ وہ اس دروازے کو گھورتا رہا جس سے گزر کر ابھی ابھی معصومہ باہر گئی تھی۔

معصومہ جیسے ہی شفو کے فلیٹ سے باہر نکلی تو اسے

محسوس ہوا کہ اسے مختلف دروازوں اور کھڑکیوں سے کئی آنکھیں تک رہی ہیں۔ خواتین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ آپس میں جو اشارے بازیاں کر رہی تھیں، وہ بہت اچھی طرح معصومہ کی سمجھ میں آ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے بھرے بازار میں اس کے سر سے دوپٹا کھینچ لیا ہو۔ بجلی کی سی رفتار سے چلتی ہوئی وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوئی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ ماں اسے دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی۔ بے چین ہو کر استفسار کیا۔

''کیا ہوا، اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو، کسی نے کچھ کہا کیا؟''

معصومہ نے مغموم نگاہوں سے ماں کو دیکھا اور آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے کہا۔ ''کسی کی زبان نے تو کچھ نہیں کہا اماں لیکن آنکھوں نے بہت کچھ کہہ دیا ہے۔''

ماں نے اپنا جھریوں بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر کہا۔ ''میں کچھ سمجھی نہیں۔'' اس نے ایک سرد آہ بھری اور ایک جھٹکے کے ساتھ کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ ماں نے بھی اس کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے زیادہ باز پرس نہیں کی۔ پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ ماں کی آواز پر ہی اس نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں۔ آنکھوں کے سرخ ڈورے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ سوتے جاگتے روتی بھی رہی ہے۔ ماں نے بغیر کوئی استفسار کیے کھانے کی طرف اشارہ کیا جو وہ چارپائی کے قریب ایک سال خوردہ ٹیبل پر لگا چکی تھی۔ معصومہ نے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے دو چار چھپکے مارے اور چارپائی پر ٹک گئی۔

ماں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سکوت توڑا۔ ''تمہاری پسندیدہ ڈش بنائی ہے میں نے لیکن تم ایسی گہری نیند سو رہی تھیں کہ ساری بریانی ٹھنڈی ہو گئی۔ بہرحال دوبارہ گرم کی ہے۔ تم کھالو اس کے بعد تھوڑی سی بریانی شفقت کو بھی دے آنا۔''

ماں کی زبان سے یہ سب کچھ سننے کے بعد معصومہ بری طرح بھنا گئی۔ ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ پلیٹ اس نے ایک طرف سرکا دی اور نہایت غصیلے اور کڑوے لہجے میں اس نے ماں کو مخاطب کیا اور کہا۔ ''اماں! آئندہ نہ میں شفقت صاحب کے یہاں جاؤں گی اور نہ آپ کو جانے دوں گی اور اگر وہ بھی بار بار ہمارے یہاں آتے ہیں تو انہیں سختی سے منع کر دیجیے۔''

ماں نے حیران و پریشان نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''معصومہ! شفقت ہمارا محسن ہے، اس کا بہت بڑا احسان ہے ہم پر...... اگر ہم نے اس کے لیے کچھ کر دیا تو اس میں کیا قباحت ہے۔ ویسے شفقت نے تم سے ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ تم نے اس کے خلاف محاذ تیار کر لیا۔''

معصومہ نے ماں کے کندھے پر سر رکھ کر آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔ ''اماں محاذ میں نے نہیں اس معاشرے نے ہمارے خلاف تیار کر لیا، کیونکہ انسانوں کی اس بھیڑ میں ہم دونوں ماں بیٹی بغیر کسی مرد کے سہارے جی رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں بہت محتاط رہ کر گزارہ کرنا ہوگا۔ ورنہ یہ کرائے کی چھت بھی ہم سے چھین لی جائے گی۔ سب کی نظریں ظاہر پر جاتی ہیں، باطن کی پاکیزگی کو کون دیکھتا ہے۔''

معصومہ کی ماں جہاندیدہ خاتون تھیں۔ فوراً بات سمجھ میں آ گئی کہ آج معصومہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ پرخیال انداز میں بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شفقت آئے گا تو اس سے بات کروں گی۔''

دونوں ماں بیٹی جیسے ہی مغرب کی نماز سے فارغ ہوئیں دروازے پر دستک ہوئی۔ ماں نے جیسے ہی جانے کے لیے قدم بڑھائے معصومہ فوراً اٹھ کر ماں کو روکتے ہوئے خود دروازے کے قریب آ کر پردے کی اوٹ سے مستفسر ہوئی۔ ''کون؟''

''جی میں شفقت ہوں۔ اماں کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔''

معصومہ نے قدرے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ''اماں بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں...... اور آپ سے میری ایک گزارش ہے کہ آپ بار بار ہمارے دروازے پر نہ آیا کریں۔ آس پاس رہنے والے اس بات کو اچھا سمجھتے ہیں اور نہ مجھے اور میری والدہ کو یہ باتیں پسند ہیں۔''

شفقت پر جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ تو آج بے شمار امیدیں اور خواب لے کر آیا تھا کہ معصومہ کی والدہ کے قدموں میں بیٹھ کر ان سے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگے گا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔ وہ کھسیانا سا ہو گیا۔ شفقت نے بھی تیز اور تلخ لہجے میں کہا۔ ''جی بہتر......'' اور فوراً واپسی کے لیے پلٹا لیکن اسی اثنا میں معصومہ کی والدہ نے دروازے پر پہنچ کر کہا۔

''شفقت بیٹا! اس کی باتوں کا خیال مت کرو، میں اس کی طرف سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لیے گھر میں آ جاؤ۔ مجھے تم

سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"
شفقت کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر معصومہ کی والدہ کو دیکھتا رہا۔ چہرے پر اداسی کی پرچھائیاں رقصاں تھیں، بمشکل مایوس لہجے میں گویا ہوا۔
"اماں! آپ کی صاحبزادی مجھے دروازے پر آنے کے لیے منع کر رہی ہیں اور آپ مجھے گھر میں بلا رہی ہیں۔ میں کس کی بات مانوں؟"
معصومہ کی والدہ نے مربیانہ تبسم کے ساتھ کہا۔
"میری بات ماننی ہوگی تمہیں کیونکہ میں بڑی ہوں اور بیٹی تو پرایا دھن ہے، یہ گھر اس کا نہیں میرا ہے۔" پھر انہوں نے تحکمانہ لہجے میں بیٹی سے کہا۔ "معصومہ! تم اندر جاؤ۔"
شفقت نے جاتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنی اور جب آواز معدوم ہو گئی تو وہ پردہ اٹھا کر ہچکچاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ معصومہ کی والدہ نے ایک کرسی کھینچ کر شفقت کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر خود بھی اس کے مقابل ایک ٹوٹے پھوٹے اسٹول پر ٹک گئیں۔ ان کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ گفتگو کا آغاز کرنا چاہتی ہیں لیکن اس کے لیے انہیں مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہوں۔ کافی دیر بعد انہوں نے گلا صاف کرتے ہوئے شفقت کو مخاطب کیا۔ "بیٹا! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اپنا مدعا کس طرح تمہارے گوش گزار کروں۔ میں بس یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہمارے معاشرے میں مرد وزن کی ملاقات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ نہ ہمارا مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے اور ماشاء اللہ....."
اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کرتی، شفقت نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ سے کسی نے کچھ کہا ہے کیا۔ اگر کسی نے ایک لفظ بھی کہا ہوگا تو میں اس کی زبان گدی سے کھینچ کر اس کے ہاتھ میں رکھ دوں گا۔"
شفقت کے اندر کا پرانا شفو جاگ اٹھا تھا۔ لہجہ بھی تیز و تند اور کرخت تھا۔ معصومہ کی والدہ اس کے لب و لہجے سے گھبرا کر فوراً بولیں۔ "ارے نہیں بیٹا، کسی نے کچھ نہیں کہا۔ میرے دل کا شک مجھے ہی کھا رہا ہے۔ ماشاء اللہ تم دونوں جوان جہان ہو اس لیے قانون اور شرع نے جو راستہ ہمیں دیا ہے، کیوں نہ اس پر چل کر لوگوں کے منہ بند کر دیے جائیں۔ تم دونوں پھر ساتھ ساتھ بھی نظر آؤ گے تو کوئی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا۔"
اپنا جملہ مکمل کر کے وہ ٹٹولنے والی نظروں سے شفقت کی طرف دیکھنے لگیں۔ اور شفقت..... شفقت تو گویا ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ اسے لگا یہ بھی کوئی سنہرا خواب ہے۔ آنکھ کھلے گی اور یاسیت اور اداسی کا صحرا ہوگا اور اس کی ذات ہوگی لیکن معصومہ کی والدہ نے پھر اپنی بات دہرا کر اس کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی خوشی کو دباتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔
"اماں! آپ کے خاندان میں شامل ہو کر میں یہ سمجھوں گا کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں لیکن اس سلسلے میں آپ اپنی بیٹی سے ضرور بات کریں۔ میری صورت، شکل، تعلیم کچھ بھی آپ کی بیٹی کے ہم پلہ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ شادی کے بعد آپ لوگ پچھتائیں۔ آپ معصومہ پر کوئی زور زبردستی نہ کریں بلکہ پوری آزادی سے اسے فیصلہ کرنے دیجیے!"
معصومہ کی والدہ نے طمانیت بھری سانس لی اور کہا۔
"بالکل بالکل، مجھے کونسی جلدی ہے۔ اس کی رضامندی سے ہی سب کچھ ہوگا۔" کچھ لمحے توقف کرنے کے بعد پھر کہا۔
"ویسے بیٹا تم اپنے بارے میں، اپنے والدین کے بارے میں اور اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ویسے تو تم مجھے نہایت شریف اور نیک لگتے ہو۔"
شفقت کے گلے میں ایک گولا سا اٹک گیا۔ تذبذب کے عالم میں وہ آنکھیں پھاڑے معصومہ کی والدہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ فن گفتگو میں ماہر تھا۔ اس لیے اس خوبی سے اپنی ہسٹری بیان کی کہ وہ سیاہ باب پورا کا پورا حذف کر گیا جو اس کی زندگی کا حصہ تھا۔ انہوں نے سب کچھ سننے کے بعد پرسکون لہجے میں کہا۔ "بس بیٹا تم کلمہ گو ہو، شریف ہو اور ایک اچھے انسان ہو اور ہمیں کیا چاہیے۔ میری بچی بھی تمہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دے گی۔" شفقت کا دل خوشیوں اور مسرتوں کے ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔ معصومہ کی والدہ سے اجازت لے کر وہ اپنے فلیٹ میں چلا آیا اور کافی دیر تک اپنی سوچوں اور خیالات سے الجھتا رہا۔ رات کے آخری پہر اسے گہری نیند آ گئی۔

☆☆☆

شفقت جیسے ہی فلیٹ سے باہر نکلا معصومہ نے کمرے سے نکل کر ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا اور ماں کی طرف مڑتے ہوئے شدید طیش کے عالم میں کہا۔ "یہ کیا بکواس کر رہی تھیں آپ؟ اتنا بڑا فیصلہ مجھ سے پوچھے بغیر کر دیا؟"
ماں نے اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "بہت عقل مند اور سمجھدار لڑکا ہے۔ فیصلہ اس نے تم پر چھوڑا ہے۔ رات بھر اچھی طرح سوچ لو اور صبح مجھے

تمہارا جواب چاہیے۔ اقرار یا انکار لیکن ایک کڑوی حقیقت میں تمہیں بتادوں کہ آج یہ رشتہ مل رہا ہے، کل یہ بھی نہیں ملے گا۔ نہ ہمارے پاس دولت کی چمک دمک ہے اور نہ کسی مرد کا سہارا۔ باپ کے سائے سے پہلے ہی محروم ہو چکی ہو۔ لے دے کر ایک بھائی ہے، وہ بھی اپنی دنیا میں مگن ہے۔ کبھی پلٹ کر ہماری خبر نہیں لیتا۔ میری حالت دیکھ رہی ہو۔ چراغ سحر ہوں۔ جانے کب بجھ جائے۔"

حقیقت سے باخبر کرنے کے بعد ماں نے اپنا بستر سنبھالا اور نیند کی آغوش میں چلی گئیں۔ جبکہ معصومہ کے لیے یہ بڑی اور فیصلہ کن رات تھی۔ خوابوں خیالوں میں شفقت تھا تو دماغ میں ماں کی کہی ہوئی باتیں گونج رہی تھیں۔ بالآخر جب نیند آنکھوں میں اترنے لگی تو وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اماں بھی کچھ غلط نہیں کہہ رہی ہیں اور شفقت بھی معمولی شکل صورت کا ضرور ہے لیکن خوش اخلاق، خوش مزاج اور انسان دوست آدمی ہے۔ اور سب سے بڑی بات کہ ایک مستحکم اور بڑے بزنس کا مالک ہے۔ سونے سے پہلے وہ شفقت کے حق میں اپنے جملہ حقوق محفوظ کر چکی تھی۔ دوسری صبح ماں نے جب اس سے جواب مانگا تو اس نے اثباتی انداز میں سر کو جنبش دی اور ناشتا بنانے میں مصروف ہوگئی۔ چہرہ خوشی اور شرم سے گلنار ہو رہا تھا۔

شفقت مجسم انتظار بنا دروازے کو تک رہا تھا۔ ہر آہٹ پر اسے لگتا کہ معصومہ کی والدہ شادی کی نوید لے کر دروازے پر کھڑی ہیں۔ جب انتظار شدید ہو گیا تو وہ کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ دل امید وبیم کی کیفیت سے دوچار تھا۔ اسی وقت معصومہ کی والدہ اس کے فلیٹ میں داخل ہوئیں اور جب انہوں نے بتایا کہ ان کی بیٹی اس شادی کے لیے تیار ہے تو اس کی آنکھوں سے تشکر کے موتی چمکنے لگے۔

شفقت اور معصومہ کی شادی تو انتہائی سادگی سے انجام پائی لیکن شفقت نے دعوت ولیمہ نہایت شاندار طریقے سے کی اور اس تقریب میں اس نے اپنے تمام دوستوں اور سنگی ساتھیوں کو مدعو کیا۔ گلو بھی جب دلہا دلہن کے اسٹیج کے قریب پہنچا تو شفقت نے نہ صرف اس کا استقبال کیا بلکہ معصومہ کو مخاطب کر کے اس کا تعارف بھی کروایا اور جیسے ہی گلو نے قریب سے معصومہ کو دیکھا، وہ بری طرح چونکا۔ اپنے ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں سکیڑتے ہوئے اس نے گہری سانس خارج کی اور پھر مبارکباد دے کر اسٹیج سے اتر آیا۔ اس کے چہرے پر ہیجان کی سی کیفیت تھی اور آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اپنی پلیٹ میں روسٹڈ چکن کا پیس اتار کر اس نے دانتوں سے ادھیڑتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

"شفو بھائی! بس اسی طرح تمہیں بھی ادھیڑنا ہے کیونکہ میری مانگ اور تمہاری کنجوسی بڑھ رہی ہے۔ تم نے اس لڑکی سے شادی کر کے سارا گیم میرے ہاتھ میں دے دیا ہے۔" کھانا کھاتے ہوئے وہ ایک عجیب سے خلجان میں مبتلا رہا۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ اس کے دماغ کی بند گھڑیاں چل پڑی ہیں۔ وہ بار بار معصومہ کی طرف دیکھ رہا تھا جو عروسی جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھی۔

موسم بہار میں جب پھولوں پر شبنم گرتی ہے تو ان کا نکھار مزید بڑھ جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کا معاملہ شفقت اور معصومہ کے ساتھ بھی ہوا۔ جیون کی ڈور میں بندھنے کے بعد خوشیوں اور مسرتوں کی بہار ایسی ٹوٹ کر برسی کہ دونوں اس میں شرابور ہو گئے۔ دونوں اماں کے احسان مند تھے جن کی کوششوں سے وہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے تھے۔ شادی کے فوراً بعد شفقت نے وہ علاقہ چھوڑ کر کراچی کے پوش اور بارونق علاقے میں لگژری فلیٹ خرید کر بیوی کو منہ دکھائی میں گفٹ کیا تھا۔ معصومہ نے جب فلیٹ دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین آ رہا تھا اور نہ اپنی قسمت پر۔ دونوں نے اماں کو بھی ساتھ ہی رکھا تھا۔ بیٹی، داماد کی خوشیاں دیکھ کر وہ بھی نہال ہو جاتیں۔ دونوں میاں بیوی نے اپنے فلیٹ کو قیمتی فرنیچر اور نفیس ساز وسامان سے آراستہ کیا تھا۔ دونوں کا ہر دن خوشگوار اور ہر لمحہ پرمسرت تھا۔ معصومہ اپنے ہاتھوں سے شفقت کے لیے پرتکلف ناشتا اور کھانا تیار کر کے سراپا انتظار بنی رہتی۔ جب تک شفقت گھر نہیں آتا معصومہ بھی بھوکی پیاسی بیٹھی رہتی۔ معصومہ کے سنگ رہتے ہوئے شفقت کی بری عادتوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اب وہ بھرپور نیند لینے کے بعد وقت پر بیدار ہو کر ہشاش بشاش اپنے کام پر روانہ ہوتا تھا۔ پہلے جلد بازی اور گرم مزاجی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن اب وہ کافی صبر وسکون اور تحمل سے کام لیتا۔ اپنا خوفناک اور تکلیف دہ ماضی بھی اسے اس وقت یاد آتا جب گلو کشکول لیے اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ پہلے حرام کمائی سے گلو کا حصہ نکالتے وقت دل میں درد نہیں ہوتا تھا لیکن چونکہ اب خون پسینا ایک کر کے محنت سے کما رہا تھا اس لیے جب بھی گلو آتا، اس کا دل چاہتا کہ اسے چیر پھاڑ کر رکھ دے۔ گلو کی صورت بھی اسے زہر لگنے لگی تھی لیکن مجبور تھا۔ گلو بھی پرانا پاپی تھا۔ شفقت کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہی وہ بھانپ گیا کہ یہ گاڑی اب مزید نہیں چلنے والی۔

ادھر کفیل بھی اب قید و بند سے گھبرا گیا تھا اور آزادی کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ وہ کھلی فضاؤں میں اڑنا چاہتا تھا۔

وہ لمحہ شفقت کے لیے ناقابل فراموش تھا جب لیڈی ڈاکٹر نے اسے یہ خوشخبری سنائی کہ عنقریب وہ باپ بننے والا ہے۔ دونوں بے انتہا خوش تھے اور یہ خبر سننے کے بعد دونوں میں گرم جوشی، وارفتگی اور خود سپردگی اور بڑھ گئی تھی۔ اماں تو ہر طرح سے بیٹی کا خیال رکھتی تھیں لیکن بذاتِ خود شفقت بھی ہر وقت اس کے آرام اور خوراک کا خیال رکھتا تھا اور جب معصومہ نے دو جڑواں بچیوں کو جنم دیا تو اس کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ رہا۔ بیٹیوں کے نام بھی اس نے خود ہی تجویز کیے۔ ایک کا نام ''شاداں'' اور دوسری کا ''فرحاں'' رکھا۔ کیونکہ اس کی زندگی بھی اب مکمل طور پر شاداں و فرحاں تھی۔ دونوں بیٹیاں صورت شباہت، ناک نقوش سارا اماں کا لے کر آئی تھیں اس لیے ہر دیکھنے والے کو وہ بہت پیاری لگتیں اور جو بھی دیکھتا، وہ اپنی بانہیں پھیلا کر انہیں اپنی گود میں لینے کی کوشش کرتا۔

دونوں بیٹیاں شفقت کی آنکھوں کا تارا بنی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی بچیوں کی یاد اسے اس قدر بے چین کر دیتی کہ وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر چلا آتا۔ معصومہ اس کی اس عادت سے سخت نالاں تھی۔ وہ اسے منع کرتی لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتا۔ ''میری بیٹیاں مجھ سے ایک پل کے لیے بھی جدا ہوتی ہیں تو میں بے قرار ہو جاتا ہوں۔''

ایک دن بھری دوپہر میں وہ گاڑی دوڑاتے ہوئے اپنے فلیٹ پر پہنچا تو دیکھا کہ گھر میں نہ اماں ہیں اور نہ معصومہ۔ دونوں بچیاں گہوارے میں پڑی نیند کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ کچن میں ملازمہ تھی جو سنک پر برتن دھونے میں مصروف تھی۔ اس نے سارے گھر کا راؤنڈ لیا اور پھر ملازمہ سے سوال کیا۔ ''اماں اور معصومہ کہاں گئی ہیں کیا؟''

ملازمہ نے منہ بگاڑ کر کھردرے لہجے میں کہا۔ ''ارے صاحب جی! اب تو بی بی جی ہر دو دن کے بعد ہم سے کہتی ہیں کہ نورین دونوں لڑکیوں کا خیال رکھنا، میں ذرا کام سے جا رہی ہوں۔ صاحب جی! جب آپ لوگوں نے ہمیں کام پر رکھا تھا تو کہا تھا کہ بس گھر کے کام کرنے ہیں مگر اب تو دونوں بے بی لوگ کو بھی سنبھالنا ہوتا ہے۔ دونوں کو بڑی مشکل سے ابھی ابھی سلایا ہے۔ اس کے پیسے آپ کو تنخواہ کے علاوہ دینے ہوں گے۔''

نوکرانی کی تقریر شفقت نے نہایت صبر و تحمل کے ساتھ سنی اور پھر دوسرا سوال داغ دیا۔ ''یہ کب سے کر رہی ہیں؟'' بیوی کے جھوٹ سے شک کے بیج کی آبیاری ہوئی اور اس

نوکرانی نے...... جیسے ہی دیکھا کہ شفقت اس کی باتوں میں دلچسپی لے رہا ہے تو اس نے ہمت کر کے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔ ''پچھلے کئی ہفتوں سے ہم آپ کی دونوں بیٹیوں کو سنبھال رہے ہیں کیونکہ گھر میں نہ اماں ہوتی ہیں اور نہ بی بی جی۔ میں تو صاحب پہلی تاریخ کو ہزار روپے زیادہ لوں گی۔''

شفقت نے ہنستا کر کہا۔ ''اچھا لے لینا۔ اب بکواس بند کرو۔'' یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا فلیٹ سے باہر نکل گیا۔ موڈ سخت خراب تھا۔ گاڑی بھی انتہائی غصیلے انداز میں اسٹارٹ کی۔ دل و دماغ میں شکوک و شبہات اور شیطانی وسوسے سانپ بن کر سرسرا رہے تھے۔ نوکرانی نے جو انکشاف کیا تھا وہ اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ پردۂ ذہن پر جیسے ہی معصومہ کا چہرہ ابھرتا وہ سوچتا میری معصومہ تو حقیقت میں معصوم، باحیا اور پاک و صاف ہے۔ کسی کام سے ادھر ادھر گئی ہوگی۔ ملازمہ ضرور پیسے کھینچنے کے چکر میں الٹا سیدھا ہانک رہی ہے۔ یہ سوچ کر اس کا دل کچھ ہلکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی کی رفتار بھی ہلکی کر دی۔

جب وہ دفتر پہنچا تو کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ شفقت جیسے ہی فلیٹ سے نکلا، ملازمہ نے فوراً اپنا سیل فون نکالا اور کسی کے نمبر ملائے اور پھر آواز دبا کر کہا۔ ''صاحب! جو کام آپ نے کہا تھا ہم نے کر دیا۔ اب ہمارا محنتانہ کب ملے گا؟'' جو جواب اسے ملا وہ یقیناً اتنا خوش کن تھا کہ نورین کا چہرہ لال گلال ہو گیا۔ اب وہ دھلے ہوئے برتن ریک میں جماتے ہوئے زور زور سے کوئی گیت گنگنا رہی تھی۔

رات جب شفقت اپنے بستر پر سونے کے لیے گیا تو معصومہ اس کے سرہانے بیٹھ کر اپنی مخروطی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھا کرنے لگی۔ وہ بڑی مسحور کن اور محبت بھری نظروں سے شوہر کو تک رہی تھی۔ شفقت نے اس کے ہاتھوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا آج تم کہیں گئی تھیں؟''

معصومہ نے ایک سادہ اور دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ارے جناب! اب تو ہم قیامت تک کے لیے آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کو چھوڑ کر قبر میں ہی جائیں گے اور بھلا کہاں جا سکتے ہیں۔''

شوہر کی بات وہ مذاق میں لے اڑی جبکہ شفقت پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ آج وہ اور اماں دونوں بچیوں کو ملازمہ کے بھروسے چھوڑ کر گھر سے غائب تھیں۔

روز تو وہ تناور درخت بن گیا جب اپنے تمام کام چھوڑ کر وہ اچانک گھر آدھمکا۔ اس روز بھی نورین دونوں بچیوں کی دودھ کی بوتلیں تیار کرنے میں معروف تھی۔ فرحاں تو سو رہی تھی لیکن شاداں نے رو رو کر گھر سر پہ اٹھالیا تھا۔ شاید اسے بھوک لگی تھی۔ یہ سب دیکھ کر شفقت کا پارہ چڑھ گیا۔ شاداں کی بوتل لے کر اس نے اپنے ہاتھ سے فیڈ کروایا اور جھنجلاتا ہوا گھر سے نکلا۔ ابھی وہ گاڑی اسٹارٹ ہی کر رہا تھا کہ سیل فون بول اٹھا۔ سارا غصہ فون کرنے والے پر اتارا۔ وہ زور سے دہاڑا۔ ''ہیلو!''

دوسری جانب سے آواز آئی۔ ''کیوں کیا ہوا، بیگم صاحبہ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ چلو ہم بتادیتے ہیں کہ آپ کی بیگم صاحبہ آپ کو کہاں ملیں گی۔ ہوٹل سٹی ویو میں چلے جایئے۔''

شفقت نے دانت پیستے ہوئے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''پہلے یہ تو بتا کہ تو کون ہے؟'' ایک زوردار قہقہے کی آواز آئی اور فون بند ہوگیا۔ شفقت ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔ ہوٹل سٹی ویو اس کے گھر سے کافی فاصلے پر تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو روک نہیں سکا۔ وہ بے پناہ ذہنی انتشار کے ساتھ گاڑی چلا رہا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ معصومہ اور اس کی ماں وہ نہیں ہیں جو نظر آتی ہیں۔ یقیناً دونوں کا تعلق کسی خطرناک گروہ سے ہے اور اس وقت اس کا شک اور بھی پختہ ہوگیا جب دونوں ماں بیٹی کو اس نے اپنی آنکھوں سے ہوٹل سے نکلتے ہوئے دیکھا۔

اس نے رات کو گھر آتے ہی انتہائی سرد اور تلخ لہجے میں باز پرس شروع کردی۔ پہلے تو معصومہ کچھ سمجھ نہیں پائی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں اس کے ہر سوال کا جواب ہنستے مسکراتے دیتی رہی لیکن جب دیکھا کہ نہ صرف اس کا موڈ آف ہے بلکہ خونخوار نظروں سے اسے گھور رہا ہے تو اس کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کردیا۔ اچھی خاصی مہابھارت چھڑ گئی۔ معصومہ نے کمرے سے نکلتے ہوئے انتہائی شدید غصے میں کہا۔ ''شفقت! مجھ پر اعتماد رکھنا۔ کبھی میرے بارے میں کچھ غلط مت سوچنا ورنہ پچھتاؤ گے۔''

بیوی سے لڑ جھگڑ کر اس کا دل نہیں بھرا۔ وہ تنتناتا ہوا ساس کے پاس آدھمکا۔ ابھی تک اماں اماں کہتے ہوئے اس کی زبان خشک ہوتی تھی لیکن اس نے نہ ان کے بڑھاپے کا خیال کیا اور نہ رشتے کا۔ اس دن کی بحث و تکرار اور لڑائی جھگڑے کے بعد دونوں ماں بیٹی نے اپنے پیر روک لیے تھے۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ وہ نہ معصومہ سے بات کر رہا تھا اور نہ ساس سے۔ گھر میں ایک سوگوار فضا چھائی ہوئی تھی۔ اب معصومہ اس کے من پسند کھانے بنا کر گھنٹوں اس کا انتظار کرتی لیکن اس کا صرف ایک جواب ہوتا۔ ''میں نے کھانا باہر کھالیا ہے۔'' دونوں ماں بیٹی معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتیں اور پھر ایک تکلیف دہ سناٹا چھا جاتا۔

محرومی اور یاسیت جس سے عرصہ ہوا شفقت کو چھٹکارا مل چکا تھا وہ پھر سے عود کر آئی تھیں۔ تحمل مزاجی رخصت ہوچکی تھی اور صبر کا بند ٹوٹ چکا تھا۔ آج اس نے اٹل فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ معصومہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زہر دے کر سلا دے گا۔ جب ایک قتل کر چکا ہے تو دوسرے سے کیا ڈرنا اور اس کے لیے اس نے اپنے ایک دوست علیم سے بھی بات کرلی تھی جو کسی کیمسٹ کی ماتحتی میں کام کر رہا تھا۔ ایک خطیر رقم کے عوض اس نے ایسا زہر لاکر دیا جو بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ تھا۔ کسی بھی جاندار کے معدے میں پہنچنے کے بعد وہ چند منٹوں میں اپنا کام دکھاتا اور کچھ گھنٹوں بعد معدہ اس طرح صاف ہوجاتا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کسی زہر خورانی کا تذکرہ بھی نہیں ہوتا۔

جس روز سے یہ جادوئی زہر اس کے ہاتھ میں آیا تھا، وہ کئی بار معصومہ کو دینے کی کوشش کر چکا تھا لیکن قدرت اسے ہر بار بچا لیتی تھی۔ وہ سوچتا شاہ بابا نے ایک قتل کی پیش گوئی کی تھی اور چونکہ وہ قتل کر چکا ہے اس لیے معصومہ ابھی تک محفوظ ہے لیکن اس زہر کی حفاظت وہ جان سے زیادہ کر رہا تھا کہ پتا نہیں کب ضرورت پڑ جائے۔

آج ضروری میٹنگ سے فارغ ہو کر باہر نکل رہا تھا کہ موبائل نے بیل دی اور دوسری طرف وہی شخص تھا جو اسے پاگل بنا رہا تھا۔ اس کی غلیظ اور خوفناک آواز سے اس کے کان اچھی طرح آشنا تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''مسٹر شفقت! ابھی تک آپ اپنے آپ کو سو سو تسلیاں دے کر بہلاتے رہے ہیں لیکن عزت نفس اور انا بھی کوئی چیز ہے۔ انسان کا اپنا بھی کوئی مقام ہوتا ہے۔ بہرحال اب آپ اپنی بیوی کے مطلوب اور محبوب نہیں بلکہ ایک ناکارہ......''

''چپ رہ کمینے!'' شفقت حلق کے بل چیخا۔ اس کے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔

دوسری جانب سے ایک کریہہ ہنسی کی آواز آئی اور پھر بولنے والا بھی بدتمیزی پر اتر آیا۔ اس نے بھی دانت کچکچا کر کہا۔ ''ابے ہوٹل کے نام کے ساتھ کمرا نمبر بھی بتا رہا ہوں۔ دیکھ لے جا کر تیری بیوی کس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے اور تیری ساس دونوں کی رکھوالی کر رہی ہے۔''

وہ سخت اشتعال اور طیش کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اسے خود سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ گاڑی کا رخ اس کے اپنے گھر کی جانب تھا۔ وہ جارحانہ انداز میں گھر میں داخل ہوا۔ معصومہ اور اماں آج بھی گھر پر نہیں تھیں۔ نورین کچن میں تھی اور دونوں بچیاں جھولے میں پڑی تھیں۔ باپ کو دیکھ کر دونوں خوشی سے غوں غاں کرنے لگیں اور دونوں نے ہمک ہمک کر باپ کی طرف ہاتھ بڑھائے لیکن آج شفقت نے انہیں پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ دماغ میں تیز و تند طوفانی جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے کمرے میں جا کر اپنا پستول تلاش کرنے لگا لیکن چونکہ ان چیزوں سے عرصہ ہوا اس کا رشتہ اور تعلق ختم ہو چکا تھا اس لیے کافی تلاشِ بسیار کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اچانک اسے گلو کا خیال آیا جو آج بھی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ وہ بہت تیزی سے فلیٹ سے نکلا اور گاڑی پھر دوبارہ برق رفتاری سے دوڑنے لگی۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کے دونوں ہاتھ پسینے سے چپچپا رہے تھے مگر اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ جب وہ گلو کے گھر پہنچا تو وہ انگور کی بیٹی سے دل بہلا رہا تھا۔ فوراً ایک گلاس بھرا اور شفقت کو دیتے ہوئے کہا۔

''ارے شفو بھائی! آپ نے بہت دنوں سے اسے منہ نہیں لگایا لیکن آج تو تھوڑی سی چکھ لو۔''

شفقت نے مایوس، اداس اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نہیں گلو...... ابھی نہیں...... میں جس کام سے جا رہا ہوں وہ ہو گیا تو آج رات ہم دل بھر کر پئیں گے۔''

گلو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے، یہ آپ کے لیے بنا کر رکھ رہا ہوں۔ آپ ہی کو آ کر پینا ہوگا۔''

شفقت نے بھنا کر کہا۔ ''ہاں ہاں، میں ہی آ کر خالی کروں گا۔ تو فکر نہ کر جیسے ہی میرا کام ختم ہوگا، میں یہیں لوٹ کر آؤں گا۔ اب تم جلدی سے مجھے اپنا کوئی ریوالور یا پستول دو، بہت سخت ضرورت ہے۔''

گلو چند لمحے کچھ سوچتا رہا اور پھر کمرے سے ملحقہ اسٹور میں جا کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ شفقت بہت زیادہ مضطرب اور بے چین تھا۔ وہ بار بار شراب کے بھرے ہوئے گلاس کی جانب جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر واقعی اس نے چند گھونٹ لے لیے تو وہ آسانی سے معصومہ کو قتل کر سکے گا لیکن پھر خیال آتا کہ نشے میں کہیں نشانہ خطا نہ ہو جائے اور وہ ناکام واپس آئے پھر اس صورت میں وہ کیا کرے گا؟ دماغ نے فیصلہ صادر کیا کہ اگر ناکام واپس آتا ہے تو جو زہر معصومہ کے لیے رکھا ہے وہی پی لے گا۔ اس سوچ کے ساتھ اچانک اس کا ہاتھ جیب میں گیا اور وہ سریع الاثر زہر نکال کر اس نے گلاس میں ڈال دیا۔ شراب کی رنگت میں کوئی فرق نہیں آیا جبکہ زہر پوری طرح اس میں حل ہو چکا تھا۔

چند لمحوں کے بعد گلو اسٹور روم سے برآمد ہوا اور بھرا ہوا ایک پستول اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''شفو بھائی! کفیل کے بعد کس کی باری ہے؟''

''خاموش رہ!'' شفقت غرایا اور شراب سے بھرے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری امانت ہے، اسے ہاتھ مت لگانا۔ اس کے ایک ایک قطرے پر میرا نام لکھا ہے۔''

گلو نے ایک خبیثانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ جایئے آپ اپنا کام کریں۔ ہم اپنا کام کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے پھر بوتل سے منہ لگا لیا۔ شفقت پستول لے کر بجلی کی طرح وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆

شفقت کے سارے جسم میں چنگاریاں بھر گئی تھیں۔ رگ و پے میں زہر ابل رہا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر وہ ڈائننگ ہال میں ایک کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اس وقت سوچوں کی کشتی بھنور میں پھنسی ہوئی تھی۔ معصومہ کی بے وفائی کا ابھی تک یقین نہیں تھا لیکن جو انجان کالز اسے موصول ہو رہی تھیں، اس کی تصدیق ضروری تھی۔ جو نمبر اسے بتایا گیا تھا، وہ بالائی منزل پر تھا۔ وہ تیزی سے لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا زینہ چڑھتا چلا گیا۔ کوریڈور سنسان تھا۔ کئی کمرے خالی تھے اس لیے ان پر تالے لگے ہوئے تھے۔ اپنے مطلوبہ نمبر کے کمرے پر پہنچ کر اس نے کان دروازے کی جھری سے لگا دیے۔ اندر سے معصومہ کی آواز آرہی تھی۔ اس کے بعد زور سے کسی مرد کے ہنسنے کی آواز آئی۔ شفقت کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس نے جنونی انداز میں بند دروازہ کھولا اور اس کی انگلی نے پستول کی لبلبی دبا دی۔ معصومہ زور سے چیخی۔

''شفقت! یہ میرا سگا بھائی ہے کفیل۔'' جست لگا کر وہ بھائی کے سامنے ڈھال بن گئی۔ شفقت کے پستول سے نکلی ہوئی گولی معصومہ کے سینے میں اتر چکی تھی اور تیزی سے بہنے والا خون کمرے کے قالین کو سرخ کر چکا تھا۔ شفقت حیران پریشان کبھی کفیل کو دیکھتا اور کبھی معصومہ کی لاش کو تکتا۔ اماں دیوار سے لگی کھڑی کانپ رہی تھیں۔

اماں نے ہانپتے ہوئے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان شفقت سے کہا۔ ''ارے یہ تو نے کیا کر دیا ہوتا۔ آج

میری بیٹی تجھے سب کچھ بتانے والی تھی۔ میرا بیٹا غلط راستے پر چل نکلا تھا اس لیے ہم دونوں کسی کو بتائے بغیر خاموشی سے اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ میری بیٹی تم سے یہ راز پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی کہ اس کا بھائی ایک مجرم اور جعلساز ہے لیکن آج ہم دونوں نے سوچ لیا تھا کہ اب سارا راز آشکار کردیا جائے۔ یہی سب کچھ سمجھانے کے لیے ہم دونوں کفیل کے پاس آئے تھے کہ اپنی مجرمانہ سرگرمیاں چھوڑ کر سیدھا سچا راستہ اختیار کرے۔ مگر شفقت تو نے سب کچھ تہس نہس کردیا۔ تیری سوچ اتنی اوچھی اور گھٹیا ہوگی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک بار میری بچی سے بات تو کرلی ہوتی۔"

اماں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر تھا۔ معصومہ کی لہولہان لاش ان کے درمیان پڑی تھی۔ اتنے اذیت ناک اور کربناک لمحے تھے کہ نہ کچھ کہنے کے لیے تھا اور نہ سننے کے لیے۔ سب اپنی اپنی جگہ منجمد اور ساکت کھڑے تھے۔ شفقت ہوش و حواس سے بیگانہ پتھرائی ہوئی نظروں سے معصومہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سارا وجود لرز رہا تھا۔ سارا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ اسی کیفیت سے کفیل بھی دوچار تھا۔ دکھ اور پچھتاوے کی دھند نے دونوں کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ شفقت نے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچا۔ درحقیقت شاہ بابا کی پیش گوئی آج پوری ہوئی۔

کفیل نے بدقت تمام اپنے بند ہونٹ کھولے اور کہا، آواز میں اس قدر لرزش تھی کہ الفاظ بھی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ دیوار سے اپنا سر لگا کر لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ "یہ کیا...... شفو بھائی! میری ساری خطاؤں کی سزا میری بہن کو دے ڈالی۔ آپ کے پستول سے نکلی ہوئی گولی کے لیے میرا سینہ حاضر تھا۔ میری بہن یہاں بھی مجھ پر بازی لے گئی۔ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے مجھے اپنی ہی نظروں میں گرادیا۔ میں اس کے لیے کچھ نہ کرسکا اور وہ......" اتنا کہنے کے بعد وہ باقاعدہ ہچکیاں لینے لگا۔

شفقت نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کفیل کہ تو زندہ و سلامت ہے۔ میں تو ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ تیری لاش کو تو حشرات الارض کب کا چاٹ چکے ہوں گے۔"

کفیل نے ایک گہری لمبی سانس لی اور کہا۔ "میرے قتل کا سارا ڈراما میرا اور گلو کا رچایا ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی زد میں میرا سارا خاندان آجائے گا۔ میری بہن جو ہمیشہ آپ کے نام کا کلمہ پڑھتی تھی اس کی سانسوں میں، اس کی آنکھوں میں آپ ہی آپ تھے۔ آپ کے خلاف وہ کچھ سننا پسند ہی نہیں کرتی تھی۔ آج بھی وہ اور اماں مجھے یہی سمجھانے آئے تھے کہ میں آپ سے ملاقات کروں اور مجرمانہ زندگی چھوڑ کر شرافت کی زندگی بسر کروں لیکن میں آپ کے سامنے آنے سے کترا رہا تھا۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ معصومہ نے آپ سے شادی کی ہے اس لیے میں اماں اور معصومہ سے دور جانا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی جلد بازی میں آپ نے میری ماں کی گود اجاڑ دی اور اپنی بیٹیوں کے سر سے ماں کا سایہ چھین لیا۔"

فرطِ غم سے شفقت کا چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے زاروقطار آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ اپنے اشکوں کو آستین سے صاف کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "گلو نے شطرنج کی بساط پر جتنے مہرے فٹ کیے تھے، وہ سب مجھے شکست دے گئے اور وہ خود اتنی چابکدستی سے کھیلا کہ ساری بازی اس کے ہاتھ میں رہی۔ شکست اور ہار میرا نصیب بنی۔ میں نے اپنا گھر اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ دیا۔ میری ساری خوشیوں اور مسرتوں کو وہ اس طرح نگل گیا جیسے کوئی خونخوار بھیڑیا اپنے شکار کو نگلتا ہے۔ میرا اور اس کا انصاف یہاں کی عدالت نہیں بلکہ منصفِ حقیقی کرے گا اور بہت جلد کرے گا۔ میری معصومہ کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔"

پولیس کی بھاری نفری نے ہوٹل کو گھیر لیا۔ معصومہ کی لاش کو پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

جب شفقت کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی گئیں تب اس نے آنسو بھری آواز میں کفیل سے کہا۔ "کفیل! میری بگیا کی دو کلیاں ہیں، انہیں مرجھانے مت دینا۔ سن بلوغت پر پہنچ کر انہیں وہ سب مل جائے گا جو میں نے ان کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ بس اس سے پہلے ان کی پرورش کی ذمے داری تیری ہے۔ اتنا خیال رکھنا کہ کبھی حرام نوالہ ان کے پیٹ میں نہ جائے۔"

اماں اور کفیل کی آہوں اور سسکیوں میں اور اضافہ ہوگیا تھا۔ دونوں کو اچھی طرح علم تھا کہ شفقت معصومہ کا قاتل ہے اس کے باوجود نہ انہیں شفقت سے نفرت کا احساس ہو رہا تھا اور نہ ناراضگی اور غصے کا۔ بلکہ اس کی بے بسی دیکھ کر دونوں ماں بیٹا نوحہ کناں تھے۔ اس کی گرفتاری پر دونوں کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے۔ پولیس اہلکار نے جب شفقت کو اپنی طرف گھسیٹا تو وہ ایک جھٹکے سے ساس کے قدموں میں جھکا اور اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ ان کے قدموں میں رکھ کر سسکتے ہوئے کہا،

"اماں! مجھے معاف کر دینا، میں آپ کی فرشتہ صفت بیٹی کی حفاظت کر سکا اور نہ ہی قدر کر سکا۔"

اماں نے ایک دلخراش چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئیں۔

☆☆☆

گلو جب دل بھر کر پی چکا تو اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ منتخب کر کے جلانا ہی چاہا تھا کہ اس کا خاص کارندہ جمن خان ... کمرے میں داخل ہوا۔ گلو نے ایک خوفناک ہنسی ہنستے ہوئے استفسار کیا۔

"جمن خان ...... کیا ہوا۔ کچھ ہمیں بھی تو سناؤ؟"

جمن خان نے شراب کے بھرے ہوئے گلاس کو ندیدی نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "ہونا کیا تھا گلو استاد...... جو آپ نے سوچا تھا وہی ہوا۔ شنو کی ساری زندگی جیل کی کال کوٹھری کی نذر ہو جائے گی۔ کفیل اور اس کی ماں ساری زندگی معصومہ کے لیے بلبلاتے رہیں گے۔ دونوں لڑکیوں کے پالن ہار اب ماموں اور نانی ہی ہیں۔" کچھ لمحے کے بعد جمن خان مستفسر ہوا۔ "استاد جی! ایک بات تو بتایئے۔ آپ کو کیسے علم ہوا کہ شفقت کی بیوی کفیل کی بہن ہے؟"

گلو نے لائٹر سے سگریٹ کو شعلہ دکھایا اور دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے ایک عیار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کفیل پرلے درجے کا احمق تو تھا ہی، اس نے ایک بار اپنی ماں اور بہن کی تصویر دکھائی تھی۔ وہ کبھی کبھی ان سے ملنے جاتا رہتا تھا۔ اس کی بہن کی تصویر دیکھ کر اپنا دل آ گیا تھا اس پر لیکن اتفاق سے وہ ٹکرائی شنو سے۔ شنو کو شاید علم ہوتا تو وہ کبھی بھی مجھے اپنے ولیمے میں مدعو نہ کرتا لیکن بس اس کی شامت آ گئی تھی۔ روکڑا دینے میں بھی آنا کانی کرنے لگا تھا۔ ادھر اس کا سالا کفیل ساری بندشیں توڑنے پر تلا ہوا تھا۔ بتاؤ پھر میں کیا کرتا اگر دونوں آمنے سامنے یا مدمقابل آ جاتے تو یقیناً معصومہ انہیں نئی رشتے داری کا واسطہ دے کر سارے گلے شکوے ختم کروا دیتی۔ دونوں کے درمیان جو نفرت جو دشمنی تھی، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتی کیونکہ دونوں معصومہ کی بات کبھی نہ ٹالتے۔ معصومہ اگر کفیل کی چہیتی بہن تھی تو شنو کی محبوب بیوی۔ کفیل اور شنو اگر ایک ہو جاتے تو سارے الجھے دھاگے سلجھ جاتے اور پھر دونوں میرا قیمہ بنا کر چیل کوؤں کو کھلا دیتے۔ لیکن اس سے پہلے میں نے شنو کی ایک کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ شنو کی سنگت میں مجھے علم تھا کہ اس کو شدید اشتعال، غصہ اور طیش دلایا جائے تو اس کی عقل سلب ہو جاتی ہے۔ اس لیے تو کے آڑے میں جو ٹانک کھیلا تب بھی اسے اچھی طرح تپایا اور معصومہ کے قتل میں بھی یہی حکمت عملی اختیار کی۔ تمہارے ذریعے شنو کو گمنام کالز کروائیں۔ کفیل کو میں نے خود اکسایا کہ تیری ماں بیمار رہنے لگی ہے اس لیے ماں بہن سے ملاقات کر لے۔ نورین کو آلۂ کار بنا کر معصومہ اور اس کی ماں کو کفیل سے گاہے بگاہے ملوایا اور پھر آج تینوں کو ایک ہوٹل میں اکٹھا کر کے شنو کے غصے کا ٹمپریچر اتنا تیز کیا کہ اسے معصومہ کی بدکاری اور بے وفائی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس یہ سمجھو جمن خان بغیر ہاتھ پیر ہلائے سارا کام انجام پا گیا۔ کیوں کیسی رہی؟ اب بتاؤ شنو زیادہ ذہین اور ہوشیار تھا یا میں۔"

جمن نے خوشامدانہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "استاد جی! بھلا آپ کا بھی کوئی ثانی ہے۔" اس کی تعریف سن کر گلو پھول کر کپا ہو گیا اور شراب کا گلاس ہاتھ میں تھامتے ہوئے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"چچ چچ ...... کہتا تھا اس پر میرا نام لکھا ہے، میری امانت ہے، ہر گھونٹ میرا ہے۔ میں آ کر خالی کروں گا۔ آہ بے چارہ...... تشنہ لب۔"

یہ کہہ کر اس نے شراب اپنے لبوں سے لگائی ہی تھی کہ جمن خان نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "استاد جی آج میں نے آپ کے لیے بڑی دوڑ بھاگ کی ہے۔ بوٹی بوٹی درد کر رہی ہے۔ آج یہ چھلکتا ہوا گلاس مجھے دے دو۔"

گلو نے استہزائیہ قہقہہ لگایا اور حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "ابے جمن! گلو نے کبھی اپنے ہاتھ کی چیز کسی کو دی ہے جو تجھے دے گا۔ اس پر دراصل میرا نام لکھا ہے۔"

یہ کہہ کر غٹا غٹ ایک ہی سانس میں پورا گلاس چڑھا گیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہاں گلو کی اکڑی ہوئی لاش پڑی ہوئی تھی اور جمن خان لاش پر بین کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ہائے استاد جی! ابھی تو آپ ٹھیک ٹھاک تھے۔ یہ ابھی کے ابھی کیا ہو گیا۔ کہیں آپ میرے ساتھ بھی کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہے ہو کیونکہ جھوٹ اور مکر و فریب کے کھیل کھیلنا آپ کی پرانی عادت ہے۔" وہ رو بھی رہا تھا اور گلو کی قیمتی گھڑی، سونے کی انگوٹھیاں، سونے کی زنجیر اور جیبوں سے رقم نکال کر اپنی جیبوں میں بھر رہا تھا۔

شاہ بابا کی برسوں کہی ہوئی بات پوری تو ہوئی لیکن شاہ بابا بھی شاید غلط کہہ گئے تھے۔ شنو کے ہاتھ میں قتل کی ایک لکیر نہیں بلکہ دو لکیریں تھیں کیونکہ گلو بھی شنو کے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا تھا۔



محفلِ شعر و سخن

❊ محمد خواجہ......کورنگی، کراچی

دیکھی ہے بے رخی کی آج ہم نے انتہا
ہم پہ نظر پڑی تو وہ محفل سے اٹھ گئے

❊ خواجہ رمیز......لاڑکانہ

نیند آواز دیے جاتی ہے
اور ہم شہر کی گلیوں میں بلائیں خود کو
ایک مدت سے یہی کام کیے جاتے ہیں
اپنی تکمیل کریں اور مٹائیں خود کو

❊ دانش عمیر......گلستان جوہر کراچی

کیسے سنبھال رکھی ہے تو نے یہ کائنات
ہم سے تو ایک دل بھی سنبھالا نہ جا سکا

❊ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال

یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا
کانٹوں میں گھرے پھول کو چوم تو آئے گی لیکن
تتلی کے پروں کو کبھی چھلتے نہیں دیکھا

❊ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان......ڈاہرا نوالہ

آگئیں بازار میں بکنے خدا کی عظمتیں
جی اٹھی ہیں خواہشیں اور مرگیا ہے آدمی

❊ وزیر محمد خان......بٹل ہزارہ

میری آنکھوں میں ایک مدت سے
قافلے رت جگوں کے ٹھہرے ہیں

❊ عبدالجبار رومی انصاری......چوہنگ، لاہور

آشنا ملتا نہیں نا آشنا سے مل چلو
بے تقاضائے وفا اک بے وفا سے مل چلو

❊ ظفر اقبال ظفر......کامرہ شرقی

چھو کر ہی آئیں منزلِ امید ہاتھ سے
کیا راستے سے لوٹنا؟ جب پاؤں چھل چکا
اس وقت بھی خاموش رہی چشم پوش رات
جب آخری رفیق بھی دشمن سے مل چکا

❊ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......خانیوال

لوٹ کر آیا تو سارا شہر ویراں تھا
سب وہی چہرے تھے بس اپنے یار کی صورت نہ تھی

❊ ریاض بٹ......حسن ابدال

اس کے پیچھے نہ چلو اس کی تمنا نہ کرو
چاند تو ہرجائی ہے ہر گھر میں اتر آتا ہے

❊ عبدالجبار......فیصل آباد

سر اٹھاتی ہے خواہش تعمیر
جب بھی گرتے مکاں کو دیکھتا ہوں
اک تمنا کے سادہ خاکے میں
رنگ بھرتے خزاں کو دیکھتا ہوں

❊ محمد امجد ریاض......اقبال نگر، چیچہ وطنی

تم ہمسفر ہوئے تو ہوئی زندگی عزیز
ورنہ تو زندگی کا کوئی حوصلہ نہ تھا

❁ اویس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

❁ ناہید اعوان......میانوالی
خواب اور پھول اسے دے آنا
اس سے محفل اگر آئندہ رہے
اپنی تصویر سے باتیں کرکے
اپنے ماحول میں ہم زندہ رہے

❁ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
برآمدے میں کھڑا رہوں گا
میں آج اس سے نہیں ملوں گا
میں خود کو دیکھوں گا آئینے میں
کہ دل کے سارے گلے سنوں گا

❁ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
ایک دنیا ہمیں خراب ملی
ایک دنیا کو ہم خراب ملے

❁ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
جس کی طلب میں اس قدر آگے نکل گئے
دنیا، ارے یہ دنیا تو برباد ہووے گی
جب اک ہجوم دل میں سمیٹے ہوئے ہو تم
پھر اس کی یاد کس طرح آباد ہووے گی

❁ اشرف علی......لاہور
دھند میں ڈوبی ساری فضا تھی اس کے بال بھی گیلے تھے
جس کی آنکھیں جھیلوں جیسی جس کے ہونٹ رسیلے تھے
جس کو کھو کر خاک ہوئے ہم، آج اسے بھی دیکھا تو
ہنستی آنکھیں افسردہ تھیں، ہونٹ بھی نیلے نیلے تھے

❁ جاوید اختر رانا......پاکپتن شریف
ہم سے اگر بچھڑو تو سن لو
ہم جیسا ملے تو پھر نہ گنوانا

❁ فرخندہ ادریس......اسلام آباد
ہم بھی کیسا عجیب موسم تھے
اپنے ہی آپ پر گزرتے رہے

❁ مہوش خان......سیالکوٹ
خوشبو سا بدن پھر کوئی مجھ سے نہیں لپٹا
جھونکے تو ہواؤں کے سکتے ہیں ابھی تک

❁ مدحت......کراچی
کتنی صدیوں میں ہوا یہ احساس
کوئی مجھ سے نہیں بہتر میرا
یہ زمانہ تو برا کیا ہوگا
کاش ہوجائے برا گھر میرا

❁ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
کہیں ہوجائے اب یہ راستہ تبدیل ممکن ہے
ادھورے خواب کی اس طرح بھی تکمیل ممکن ہے
لہو میں سرسراتی آہٹوں کے پھول کھلتے ہیں
یہ لگتا ہے نئی دنیا کی اب تشکیل ممکن ہے

❁ سرفراز احمد......گجرانوالہ
اس سے آسان نہ تھی رسم تعارف بھی مگر
بات کو آگے بڑھانے میں بہت دیر لگی
دیکھ کر آج اسے حال ہوا کچھ ایسا
دل کو معمول پہ آنے میں بہت دیر لگی

❁ نعمان علی......سرگودھا
زندگی رقص کبھی کرتی تھی
اب تو چپ چاپ پڑی ہے مجھ میں

❁ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
خود اپنے ہونے کا ہر اک نشاں مٹا ڈالا
شناس پھر کہیں موضوعِ گفتگو ہوئے ہم

❁ امتیاز احمد......منڈی بہاؤالدین
صدیوں کی ریت ڈھانپ کر آسودہ ہوگئے
سر کو ہمارے تن سے کٹے دیر ہوگئی

❁ وردا، آریز ملک......کراچی
مجھے نہ سوچ، کہ میں ہوں بکھرتا بنتا خواب
مجھے نہ دیکھ، کہ اک نقشِ رائگاں ہوں میں
مجھے نہ ڈھونڈ، کہ میں ہوں گزرتا اک لمحہ
ابھی تو "ہوتے نہ ہونے" کے درمیاں ہوں میں

❁ نوشین نصیر......سکھر
بتاؤ نا تمہیں کیسے بھلاؤں
تم تو واقف ہو اس ہنر سے

❁ ایم عمران قاسم......تحصیل کلرسیداں
ہم جو تیرے بغیر زندہ ہیں
سب دکھاوا ہے، دنیاداری ہے

❁ شہزاد احمد......بہاولپور

یہ جو دل میں قیام کرتے ہیں
یہی جینا حرام کرتے ہیں

❁ محمد اقبال......کورنگی، کراچی

اب کوئی پھول کبھی ایسا نہیں کھل سکتا
ترے جیسی کوئی صورت نہیں ہونے والی

❁ نازیہ خالد......سکھر

ناامیدی ہے ویدنی اس کی
جس کو اپنا بھی انتظار نہ ہو

❁ رشید خان......کوئٹہ

راستے کب سے ہیں اپنے منتظر
ہو چکی ہے شام چلنا چاہیے

❁ اسلم حیات......فیصل آباد

ستارے شام سے اب آنکھیں موند لیتے ہیں
عجب سکوت سا دیوار و در میں رہتا ہے

❁ ثاقب کمال......نواب شاہ

نہ جانے کون سی افتاد آ پڑی غم پر
ہم ایسے ہجر نصیبوں کے گھر چلا آیا

❁ اویس احمد......کوہاٹ

ہم نے کتنے ہی چاند چھوڑ دیے
دل کے بس ایک داغ کی خاطر

❁ رمضان خان......پشاور

نہ جانے آئی ہے کیسی یہ مجھ میں تبدیلی
کہ بات کرنے کو مجھ سے مچل رہا ہے کوئی

❁ شاکر علی......مری

کبھی کبھی تو یقیں سے بھی کوئی بات کرو
ہر اک مقام پہ کرتے نہیں ہیں اندازہ

❁ محمود اختر......سیالکوٹ

فضا میں اڑتے پرندو، ہماری بات سنو!
زمیں پہ آگ لگی ہے اڑان میں رہنا

❁ حمیرا رشید......ٹنڈو اللہ یار

دنیا یہ رنگ اپنے اتارے نہیں گئے
ہم زندگی سے گزرے، گزارے نہیں گئے

❁ کفیل احمد......ملتان

شریکِ بزم بہت سے حسین لوگ بھی تھے
نہ جانے کیوں ہمیں چہرہ ترا پسند آیا

❁ پرویز خان......لاہور

اُن کے نرم ہاتھوں سے پھسل جاتی ہیں اکثر چیزیں
میری زندگی لگی ہے ہاتھ اُن کے خدا خیر کرے

❁ صبا سحر......کراچی

وہ اکثر مجھے کہیں رکھ کے بھول جاتا ہے
کبھی لوگوں میں، کبھی الجھنوں میں

❁ مہتاب احمد......حیدرآباد

کانٹے تو آنے تھے ہمارے نصیب میں
ہم نے یار جو گلاب جیسا چنا تھا

❁ اکرم کمال......حیدرآباد

وہ جو اک شخص ہی نہیں ملتا
لے کے ہم ساری کائنات کیا کریں گے

❁ اطہر حسین......کراچی

یہ بھی ممکن ہے تجھے عشق ولایت دے دے
یہ بھی ممکن ہے تیرے ہوش ٹھکانے آجائیں

❁ ناہید یوسف......اسلام آباد

وجود پتھر کا ہو تو شیشوں سے محبت نہیں کرتے
احساسِ چاہت نہ ملے تو پتھر بھی ٹوٹ جاتے ہیں

❁ شاہین تبسم......ملتان

بہت پختہ مزاج ہو تم
یاد رکھتے ہو کہ یاد نہیں کرتا

❁ سہیل احمد......لاڑکانہ

محبت میں خود کو ہمیشہ بادشاہ سمجھا
احساس تب ہوا جب کسی کو مانگا فقیروں کی طرح

کوپن برائے شمارہ مارچ 2017

محفلِ شعر و سخن

نام: ....

پتا: ....



فنگرپرنٹ

سلیم انور

قانون سے کھیلنے والوں کے لیے ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب قانون اسی مجرم سے آنکھ مچولی کھیلنے لگتا ہے... اوراس کی بوکھلاہٹوں پر مسکرا کر اس کے گرد شکنجہ کس لیتا ہے۔ وہ بھی خوش فہمی کا شکار تھا جو ڈراما کھیلتے کھیلتے اچانک ایک لائن پر ایسا پھنسا کہ ساری پرفارمنس دھری کی دھری رہ گئی۔

سمجھداری سے چلتے چلتے اچانک نا سمجھی کے جال میں پھنسنے والے قانون شکن کا قصہ

اس لمحے جب ڈاکٹر گورڈن کی نگاہیں کمرے میں بھٹکتی ہوئی حسنِ اتفاق سے اس قرمزی انگلی کے نشان پر پڑیں تو اسے ایک شدید جھٹکا سا لگا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ایک مدت سے بیمار ہو۔

بے کلی کے اسی عالم میں اسے احساس ہوگیا کہ اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ چکی ہے اور اس کے ہاتھ بے قابو انداز میں کپکپا رہے ہیں۔ ”جیسس!“ اس نے سوچا۔

”میں لازمی طور پر انہیں یہ احساس نہ ہونے دوں کہ میں

خوفزدہ ہوں۔''

وہ بھیانک اور بظاہر کبھی نہ ختم ہونے والا انٹرویو تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ بالآخر شاید سی آئی ڈی کے یہ تمام لوگ اس قرمزی دھبے پر توجہ دیے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے لیکن یہ اس کی ایک پُرامید خواہش تھی۔ بھلا ایسا ممکن ہو سکتا تھا؟

وہ تو اس عورت کے فلیٹ کے ہر ایک انچ کا باریک بینی سے جائزہ لیتے رہیں گے تاکہ اس بات کا بھرپور یقین کر لیں کہ ان کی نگاہوں سے کوئی اہم چیز اوجھل نہ رہ جائے۔

خوش قسمتی سے بھانڈا پھوڑنے والا وہ انگلی کا نشان جو یقیناً خود اسی کا تھا...... قدرے اندھیرے میں تھا۔ ایک گلدان میں موجود گلابی کارنیشن جواب اس سنہری زلفوں والی فیشن ماڈل سینڈرا کے مانند بالکل بے جان ہو چکے تھے، کھڑکی سے آنے والی روشنی اور خونی رنگ کے انگلی کے نشان کے درمیان حائل تھے۔

''ڈاکٹر گورڈن......'' ڈیٹیکٹو انسپکٹر میتھیوز دھیرے دھیرے گھومتے ہوئے دوبارہ اس سے مخاطب ہوا۔ ''جہاں تک ہمارے علم میں ہے تم آخری فرد تھے جو سینڈرا ایک سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ یقیناً اپنی پیشہ ورانہ حیثیت میں۔''

ڈاکٹر کو یوں محسوس ہوا جیسے سراغ رساں کے لہجے میں قدرے طنز کا عنصر شامل تھا۔

''کیا اس فلیٹ میں سب کچھ من و عن ایسا ہی ہے جیسا کہ اس وقت تھا جب تم آخری مرتبہ یہاں آئے تھے......؟''

ڈاکٹر نروس زدہ انداز میں اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ ''ہاں، میرا یہی خیال ہے لیکن میں حقیقت میں یقین سے نہیں کہہ سکتا...... کیوں؟''

''ڈاکٹر! قدرتی طور پر ہم یہ ثابت کرنے کے لیے فکرمند ہیں کہ کل کوئی سینڈرا سے ملنے کے لیے تو نہیں آیا تھا لیکن اس وقت تک ہم کوئی جواب نہیں پا سکے ہیں۔''

ڈاکٹر گورڈن کو آگاہی ہو چکی تھی کہ اس کی کنپٹیوں پر پسینے کی ننھی بوندیں ابھر آئی ہیں۔ وہ بولا۔ ''ویل، ہم یہ بات تو جانتے ہیں کہ اس سے ملنے کے لیے ایک فرد یقیناً یہاں آیا تھا...... وہی جس نے اسے قتل کیا ہے...... اگر وہ کوئی مرد ہے۔''

انسپکٹر میتھیوز کمرے کے وسط میں خاموش کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں کسی خاص شے پر مرکوز نہیں تھیں۔ بھلا یہ اپنا کام ختم کر کے جاتا کیوں نہیں؟ ڈاکٹر گورڈن نے سوچا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ سی آئی ڈی کے لوگ تو کبھی بھی نہیں جاتے۔

اس نے ایک خوفزدہ اور سرسری سی نگاہ انگلی کے سرخ نشان پر ڈالی...... اس امید کے ساتھ کہ شاید وہ دھبا غائب ہو چکا ہو یا کسی نہ کسی طرح جلد غائب ہو جائے گا لیکن وہ جانتا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ یہ فنگر پرنٹ اس کے علاوہ کسی اور کا کیونکر ہو سکتا ہے؟

اور اگر ان سی آئی ڈی کے لوگوں میں سے کسی ایک کی نگاہ اتفاق سے اس پر پڑ گئی تو......؟

اوہ خدایا! اس کمرے کا ایک اور مرتبہ باریک بینی سے جائزہ لیا گیا تو یہ دھبا اس مرتبہ ان کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے گا۔ یہ دھبا اس چھوٹی سی عام میز کے کنارے پر لگا ہوا تھا۔ اگر یہ میز شاہ بلوط کی سیاہ لکڑی کی بنی ہوئی ہوتی تو پھر دھبے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ اس قدر نمایاں نہ ہوتا۔

لیکن میز کی سطح زردی مائل سفید رنگ کی تھی اور خوف زدہ ڈاکٹر کو یہ لگ رہا تھا جیسے تاریکی میں کوئی سرخ رنگ کی روشنی نمایاں طور پر جگمگا رہی ہو۔

یہ سب کچھ حقیقت میں بڑا مضحکہ خیز تھا۔ خون کے ایک ننھے سے قطرے نے اس جیسے سخت گیر طبیب کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا لیکن خون کا یہ ننھا سا دھبا جو بلاشبہ میز پر اس کی انگلیاں چھونے کے نتیجے میں وہاں اپنا نشان چھوڑ گیا تھا، اس کی زندگی اور ہر شے کا خاتمہ کر سکتا تھا۔

اگر سینڈرا اس وقت اس کی یہ کیفیت دیکھنے کے قابل ہوتی تو خوب قہقہے لگاتی۔ شاید وہ مارلن منرو کی نقل اتارنے والی آواز میں یہ کہتی۔ ''اوہ پور ڈارلنگ...... گریٹ بگ ڈاکٹر اور خون کے ننھے سے دھبے سے اس قدر خوف زدہ!''

وہ اکثر ہنستی رہتی تھی اور دیر تک ہنستی رہتی تھی۔ ڈاکٹر گورڈن سینڈرا کی اس تمسخرانہ ہنسی کو پورے صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کرتا رہا تھا لیکن پھر ایک دن اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور اس نے نہایت بے رحمی سے اپنی اس کیفیت کا سینڈرا کے روبرو اظہار کر دیا۔ اس وقت تک وہ صرف سینڈرا کے جسم سے خوفزدہ تھا کیونکہ جس انداز سے اس نے ڈاکٹر کو اپنے سحر میں جکڑا ہوا تھا اور جس طریقے سے وہ اسے مالی طور پر کمزور کر رہی تھی، وہ اس سے غافل نہیں تھا۔

اور اب وہ اچانک سینڈرا کے اتفاقی ذہن سے خوف

زدہ ہوگیا تھا۔ "تم یہ خیال بھی ذہن میں مت لانا کہ تم مجھ سے چھٹکارا حاصل کرلو گے؟ کیا تم یہ چاہتے ہو ڈارلنگ کہ میں تمہیں اپنے دل کے نہاں خانے سے خارج کردوں؟ ایک خاتون مریضہ کے ساتھ رسوا کن تعلقات اور دیگر سب کچھ؟ کیا یہ اتنا آسان ہوگا...... جبکہ تم خود بھی منشیات میں مبتلا ہو......"

اسے بھرپور یقین تو نہیں تھا لیکن اس کا خیال یہی تھا کہ سینڈرا اپنے مخصوص تمسخرانہ انداز میں مسکرائی تھی اور ساتھ ہی اس لمحے لاشعوری طور پر وہ آپے سے باہر ہوگیا تھا اور اپنی اس جنونی کیفیت پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے خنجر نما لیٹر اوپنر سے سینڈرا کے جسم پر لگاتار تین وار کیے تھے۔ اسے تب بھی یہی یقین تھا کہ مرنے کے بعد بھی سینڈرا اپنے مخصوص تمسخرانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

اس تمسخرانہ مسکراہٹ کی یاد نے اس کے مجروح ذہن کو مزید چرکے لگا دیے لیکن سی آئی ڈی کے یہ لوگ ممکنہ طور پر اس پر شبہ نہیں کرسکتے۔ ڈاکٹر گورڈن نے سوچا...... یا کرسکتے ہیں؟ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ ایک ممتاز اور عزت دار شخصیت کا حامل تھا...... ایک ایسا شخص جو کمیونٹی کے معاملات میں ہمیشہ فعال رہا تھا۔ مقامی کونسل اور یوتھ کلب کی کمیونٹی میں بھی وہ دلچسپی سے حصہ لیا کرتا تھا۔ پھر بھلا ڈاکٹر گورڈن جیسا شخص سنہری زلفوں والی ماڈل کو کیونکر خنجر گھونپ سکتا تھا۔ یہ بات قطعی طور پر اس کے کردار سے موافقت نہیں رکھتی تھی، تو پھر بھلا وہ لوگ اس پر کسی طرح کا کوئی شبہ کرسکتے تھے......؟

نہیں، ان کے پاس اس کے خلاف اور کوئی ثبوت نہیں ہوسکتا تھا، ماسوائے خون کے اس ننھے سے نشان کے جو کریم رنگ کی چھوٹی سی میز کے کنارے پر موجود تھا...... اور یہ اس کی انگلی کا نشان تھا!

وہ سینڈرا کے دردِ شقیقہ کا علاج کرتا رہا تھا اور وہ لوگ مشکل ہی سے اس کی اس بات پر یقین کریں گے۔ اگر اس نے یہ کہا کہ سینڈرا کا خون اس کے ہاتھ پر خالص پیشہ ورانہ وجوہات کی بنا پر لگ گیا تھا۔ کسی بھی صورت میں یہ بات بھی بعید از قیاس تھی کہ سینڈرا کا خون ڈاکٹر کے اپنے نایاب بلڈ گروپ سے میچ کرتا ہو۔

لہٰذا اسے کچھ اور ہی سوچنا ہوگا...... سوچو ڈاکٹر سوچو!

اچانک اسے اپنے پسینے میں بھیگے ہوئے ہاتھوں کا خیال آیا جو اس وقت اس کے کوٹ کی جیب میں تھے اور ان پر بدستور کپکپاہٹ طاری تھی۔

وہ انسپکٹر میتھیوز کی جانب دیکھتے ہوئے بے دلی سے مسکرا دیا اور بولا۔ "تمہارے پاس سگریٹ تو نہیں ہوگا، اولڈ چیپ؟"

سراغ رساں یہ سن کر حیرت سے چونک پڑا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ اس نے خاموشی سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ڈاکٹر کے سامنے کردیا۔ ڈاکٹر گورڈن نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکالا اور اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ انسپکٹر میتھیوز نے سگریٹ کا پیکٹ واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"حسبِ عادت میرے پاس لائٹر بھی نہیں ہے۔" ڈاکٹر گورڈن نے کھسیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

انسپکٹر میتھیوز نے خوش اخلاقی سے لائٹر نکالا اور ڈاکٹر گورڈن کے سگریٹ کو شعلہ دکھا دیا۔

ڈاکٹر گورڈن سگریٹ کے سلگتے ہی گھوم گیا اور تیز تیز کش لگانے لگا پھر سرسری انداز میں ٹہلتا ہوا اس چھوٹی سی میز کی جانب بڑھ گیا...... وہی چھوٹی سی کریم کلر کی میز جس کے کنارے پر سینڈرا کے گرما گرم خون کا دھبا دکھائی دے رہا تھا جو ڈاکٹر کی انگلی کے نشان سے پڑا تھا۔

اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے ڈاکٹر گویا ہوا۔ "مس سینڈرا اپنے بے شمار خطوط کونے میں موجود اس چھوٹی سی رائٹنگ ڈیسک میں رکھا کرتی تھی انسپکٹر۔ میرے خیال سے تمہیں اس کی تلاشی لینے کا خیال بھی آنا چاہیے۔"

"یہ ان پہلی جگہوں میں شامل ہے جن کی ہم تلاشی لے چکے ہیں، ڈاکٹر۔" سراغ رساں نے جواب دیا۔

"بے شک...... بے شک۔ یقیناً تلاشی لے لی ہوگی۔ میں تو سوچ رہا تھا......" یہ کہتے ہوئے اس نے جیسے بے دھیانی کے عالم میں جلتا ہوا سگریٹ اس کریم رنگ کی چھوٹی سی میز پر اس طرح رکھ دیا کہ اس کا سلگتا ہوا کنارہ عین انگلی کے نشان کے اوپر آگیا جہاں وہ خون کا دھبا پڑا ہوا تھا۔

"تم کیا سوچ رہے تھے، ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر گورڈن ٹہلتا ہوا رائٹنگ ڈیسک کے پاس چلا گیا۔ "مجھے یاد پڑ رہا ہے کہ ایک مرتبہ سینڈرا نے اس میز میں کسی خفیہ دراز کو استعمال کیا تھا لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ میرا واہمہ ہو۔ کاش مجھے صحیح یاد ہوتا......"

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے رائٹنگ ڈیسک کے سامنے کا حصہ نیچے گرا دیا اور بظاہر اس کے اندر کا جائزہ لینے لگا۔ اسے امید تھی کہ اس طرح جب وہ وقت گزاری کے کھیل میں مصروف ہوگا تو انسپکٹر کی توجہ اس کی جانب مبذول رہے گی

اور وہ اس کی حرکات و سکنات کا بغور معائنہ کر رہا ہوگا۔ میں ان لوگوں سے زیادہ ہوشیار ہوں۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اصل مقصد ان لوگوں کی توجہ کچھ دیر تک کے لیے دھبے کی جانب سے ہٹانا تھی تاکہ اس دوران جلتا ہوا سگریٹ اپنا کام دکھا دے اور انہیں پتا بھی نہ چلے۔

اس نے جلتا ہوا سگریٹ پورے دھیان اور مکمل احتیاط کے ساتھ بالکل صحیح مقام پر رکھا تھا۔

اس نے حساب لگا لیا کہ جلد ہی سگریٹ میز کے کریم رنگ کے پینٹ کے اس حصے کو جلا دے گا جہاں وہ خون میں ڈوبی انگلی کا دھبا پڑا ہوا تھا۔ بس رنگ کے جلنے کی بُو ان کی توجہ اپنی جانب مبذول نہ کرا لے...... اف خدایا...... بس ذرا سی مہلت اور مل جائے۔

اسے ان لوگوں کی توجہ اس نشان سے ہٹ کر کسی اور جانب مبذول کرائے رکھنا ہوگی۔ ان کی توجہ کسی صورت جلتے ہوئے سگریٹ کی جانب نہیں جانی چاہیے...... اس وقت تک نہیں جب تک وہ ننھی سا خون کا بیضوی دھبا جو اس کی انگلی کے نشان کا تھا، جل کر ناقابل شناخت نہیں ہو جاتا......

انسپکٹر میتھیوز اس کے پیچھے کھڑا اس کے شانوں کے اوپر سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

ڈاکٹر گورڈن نے اپنے اوپری ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے پسینے کو صاف کیا اور مایوسی سے بولا۔ ''نہیں انسپکٹر! اس میں کوئی خفیہ دراز نہیں ہے۔ یہ میرا اندازہ تھا لیکن میرے خیال سے تمہیں ڈیسک میں ہر جگہ کی مکمل جانچ کر لینی چاہیے۔ اس میں مجھے اپنا ایک بل بھی دکھائی دیا ہے۔ وہ میری پرائیویٹ مریضہ بھی تھی اور دیگر چند خطوط بھی ہیں......'' اور وہ خنجر نما لیٹر اوپنر بھی تھا جس پر سے وہ پہلے ہی ہر قسم کے نشانات رگڑ کر صاف کر چکا تھا۔

''ہاں۔ ہم وہ تمام خطوط دیکھ چکے ہیں، ڈاکٹر۔ عجیب بات ہے کہ وہ سب کے سب خواتین کی جانب سے تحریر کردہ ہیں۔ کیا سینڈرا نے کبھی یہ ظاہر کیا تھا کہ اس کا میلان ہم جنس پرستی کی جانب ہے؟''

''نہیں، کبھی نہیں!'' ڈاکٹر کے لہجے میں حیرانی تھی۔ ''میرا مطلب ہے کبھی کوئی اس قسم کی علامات دکھائی نہیں دیں۔''

سی آئی ڈی کا آدمی پریشان نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

''اس کا کوئی مرد دوست نہیں تھا؟ یہ بات قدرے خلاف معمول ہے۔ ہے نا، انسپکٹر؟ مس سینڈرا تو ایک نہایت پرکشش عورت تھی۔'' ڈاکٹر گورڈن نے کہا۔

''ہاں، نہایت پرکشش!''

''میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ مرد اس کے اطراف میں منڈلاتے رہتے ہوں گے۔'' ڈاکٹر گورڈن نے کہا۔

یقیناً وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ سینڈرا نے کبھی بھی کسی سے آزادانہ جنسی تعلقات نہیں رکھے تھے۔

بس ڈاکٹر گورڈن ہی وہ واحد مرد تھا جس کے ساتھ اس نے اپنا حقیقی تعلق جوڑا تھا۔ کسی چم چچڑ کے مانند اس سے چمٹ گئی تھی اور پھر اس کی بربادی کا سبب بن چکی تھی۔

افسوس کی بات یہ بھی کہ اس کی زندگی میں دیگر کوئی مرد شامل نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو سی آئی ڈی کے کھوجیوں کو اپنے دانت گاڑنے کے لیے دیگر شکار بھی مل جاتے...... چند ایسے ملزمان جن کی جانب ان کی توجہ مبذول ہو جاتی اور ڈاکٹر کو کچھ سکون میسر آجاتا......

اور اب ڈاکٹر کو انہیں صرف مصروف رکھنا تھا تاکہ سگریٹ انگلی کے اس سرخ نشان کو جلا کر ناقابل شناخت بنا دے۔ شاید اب مزید ایک منٹ کا وقت لگ جائے......

لیکن تب انسپکٹر میتھیوز اچانک گھوم گیا۔ اس کا رخ اس چھوٹی سی کریم رنگ کی میز کی جانب تھا۔ ڈاکٹر گورڈن شدید خوف و ہراس کے عالم میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سراغ رساں کو دیکھ رہا تھا۔

انسپکٹر میتھیوز نے میز پر سے جلتا ہوا سگریٹ اٹھا لیا۔

''تمہیں اس بارے میں زیادہ احتیاط کرنی چاہیے کہ تم اپنا جلتا ہوا سگریٹ کہاں رکھ رہے ہو، ڈاکٹر۔'' سی آئی ڈی کے آدمی نے کہا۔ ساتھ ہی جلتا ہوا سگریٹ سراغ رساں کے ہاتھ سے لے کر ایک ایش ٹرے میں رگڑ کر بجھا دیا۔ ''تمہاری وجہ سے میز میں گڑھا پڑ جاتا۔''

''میری وجہ سے؟ اوہ مائی ڈیئر...... میری بے پروائی؟'' ڈاکٹر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل اس کے سینے میں پسلیوں پر ہتھوڑے برسا رہا ہو۔ اس کی قمیص کے نیچے بہتا ہوا پسینا اس کی بنیان کو تر کر رہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم تمباکو نوشی نہیں کرتے، ڈاکٹر۔ کیا تم نے مقامی اخبارات میں سگریٹ نوشی کو نقصان دہ قرار دیتے ہوئے یوتھ کلب کے ممبروں کو تنبیہ نہیں کی تھی؟''

''ہاں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ انسپکٹر لیکن میں...... مجھے شاذ و نادر ہی اس کی طلب محسوس ہوتی ہے...... جیسے کہ اس وقت ہوئی تھی......''

''میرے خیال سے اپنے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے۔'' انسپکٹر میتھیوز نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے تیکھے

لہجے میں کہا۔ ''میں یہ نوٹ کر چکا تھا کہ تمہارے ہاتھ کس بری طرح کپکپا رہے تھے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ کیا تم اس سگریٹ کو درست مقام پر رکھنے میں کامیاب ہوسکو گے یا نہیں۔''

''درست مقام؟''

''اس فنگر پرنٹ پر، ڈاکٹر!'' سراغ رساں نے میز کے کنارے سطح پر موجود سرخ نشان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک خراب کوشش نہیں تھی۔ اس کوشش پر تمہیں پورے نمبر ملنے چاہئیں۔ ایک یا دو منٹ اور لگتے تو یہ جل کر شناخت کے قابل نہ رہتا۔ میرا خیال ہے کہ میں اس نشان کا تذکرہ اگر پہلے کر دیتا تو تمہیں یہ ساری زحمت نہ اٹھانا پڑتی......''

انسپکٹر میتھیوز نے بات مکمل کرنے کے بعد اپنی نظریں ڈاکٹر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اس کی آنکھوں میں ہمدردی اور نفرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ اسے ڈاکٹر پر تھوڑا سا ترس بھی آرہا تھا۔ وہ کبھی کسی فرد کو بکھرتے دیکھ کر لطف اندوز نہیں ہوتا تھا۔

اور ڈاکٹر گورڈن بالکل ہی ڈھے چکا تھا۔ وہ ایک کرسی پر ڈھیر ہوگیا اور اپنا چہرہ اپنی لانبی حساس انگلیوں کے پیچھے چھپالیا۔

''تمہارے خیال میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ نشان وہاں کیسے پڑا تھا، ڈاکٹر۔ تمہارا اس بارے میں کیا موقف ہے؟''

ڈاکٹر گورڈن نے بھرپور کوشش کی کہ وہ کوئی معقول جواب دے سکے لیکن اس کے ہونٹوں سے مبہم اور بے معنی الفاظ کے سوا اور کچھ نہ ادا ہوسکا۔ وہ سسکیاں لینا چاہتا تھا، رونا چاہتا تھا لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک عرصے سے بیمار ہو اور کمزوری اور ناتوانی نے اس پر غلبہ پالیا ہو۔

اس نے اپنے ذہن کے پردے پر خود کو اس چھوٹی کریم رنگ کی میز کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا۔ وہ اپنے ذہن میں مچلنے والے طوفان کی رو میں بہہ چکا تھا اور سینڈرا کو قتل کر چکا تھا...... اس پر نیم بیداری کی کیفیت طاری تھی۔ وہ سینڈرا کی مشروب کی بوتل میں سے اپنے لیے ایک جام انڈیل رہا تھا۔ شاید یہی وہ وقت تھا جب اس نے میز کے کنارے کو چھوا ہوگا......

اس نے ہر شے رگڑ کر صاف کر دی تھی۔ کوئی بھی چیز باقی نہیں چھوڑی تھی کہ جس پر اس کی انگلیوں کے نشانات پائے جاتے لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ ماسوائے اس میز کے!

اسے یہ بات بڑی عجیب سی لگ رہی تھی کہ یہ ننھی سا سرخ دھبا اسے آج ہی کیوں دکھائی دیا تھا۔ اس وقت کیوں نظر نہیں آیا تھا جب اس سے نادانستگی میں یہ نشان میز کی سطح پر پڑا تھا۔

انسپکٹر میتھیوز اور سارجنٹ ڈاؤسن اسے جلاد کی سی نظروں سے گھور رہے تھے۔ ان کی سفاک نظریں اسے اپنی روح میں کسی برمے کے مانند سوراخ کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہوسکا۔ ''میں بتاتا ہوں......'' وہ پھٹ پڑا۔ ''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔''

بالآخر جب ڈاکٹر گورڈن نے سب کچھ بیان کر دیا تو سراغ رساں میتھیوز بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر دیا، ڈاکٹر۔ یہ ہمیشہ بہتر رہتا ہے لیکن اگر تمہیں حیرانی ہے کہ میں نے اس فنگر پرنٹ کا تذکرہ تم سے پہلے کیوں نہیں کیا تھا تو بہتر ہوگا کہ میں تمہیں بتادوں کہ یہ نشان تمہاری انگلی کا نہیں ہے۔''

ڈاکٹر گورڈن نے دھیرے دھیرے سر اوپر اٹھایا اور پھر تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''میری انگلی کا نشان نہیں ہے؟''

''نہیں۔ یہ انگلی کا نشان خود سینڈرا نے چھوڑا تھا...... جب تم نے اسے قتل کیا، اس سے پہلے سے یہ نشان وہاں موجود تھا، ڈاکٹر!''

ڈاکٹر گورڈن یہ سن کر بھونچکا رہ گیا۔

''اور یہ نشان خون کا بھی نہیں ہے۔'' سراغ رساں نے انکشاف کیا۔

ڈاکٹر کی آنکھیں یہ سن کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سراغ رساں میتھیوز نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ نشان جوتوں پر لگائی جانے والی سرخ رنگ کی کریم کا ہے جو سینڈرا اپنے کسی سرخ رنگ کے جوتوں کو چمکانے کے لیے استعمال کرتی تھی۔''

ڈاکٹر گورڈن نے ایک بار پھر اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپالیا۔ اس کے حلق سے ایک ہذیانی قہقہہ بلند ہوا...... پھر قہقہوں کا یہ سلسلہ بڑھتا گیا حتیٰ کہ اس پر یک ہسٹریائی کیفیت طاری ہوگئی۔

اس ہذیانی جنون کی کیفیت میں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کہیں...... کسی جگہ سینڈرا بھی اپنے مخصوص تمسخرانہ انداز میں قہقہے لگا رہی ہے۔

ماروی

انتالیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کئی چہروں کی دھوپ، محبت کی منزلیں، رقابتوں اور سازشوں کا ایک دل ربا سلسلہ





پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی حنی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کروی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہوبہو مراد کا ہم شکل تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی، بربادکرکے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جج تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل منیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل وجان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی۔ مراد قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور رودارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ ماروی، چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے۔ مراد نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو یوبو کے ساتھ مل گیا۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر مجیکسن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ مراد نے مرینہ کو قابو کرکے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجیکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ مرینہ اور مراد میں پھر ان بن ہوگئی۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے تاہم مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہوگئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کرالیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوادیا۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہوگئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہوگئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کرلیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست بابِ النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کرلیا۔ مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگالیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کرلیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوالیا اور بشریٰ اور بلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کرلیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہوگیا۔ مراد اور نگارا میں اختلاف ہوگیا اور یہ اختلاف طلاق پر منتج ہوا۔ مراد برسرِاقتدار آگیا۔ بابا اجمیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہوگئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاد۔ دونوں جب چاہتے نادیدہ ہوجاتے۔ مراد نے نادیدہ ہو کر دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور منگی پسند آگئی۔ مراد نے اسے اپنا شریک

حیات بنالیا۔ مراد اور ہم زاد کی نادیدہ صلاحیت ختم ہوگئی اب وہ دونوں اس صورت حال پر پریشان تھے۔ ادھر ہم زاد کو اس سے زیادہ اپنی محبوبہ جیتی کے پاس نہ جانے کی پریشانی تھی، وہ اس کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ جیتی کو ریاست ارض اسلام پہنچانے کے لیے جہاز میں سوار کیا گیا مگر حادثاتی طور پر جیتی نے بچے کو جنم دیا اور خود جان کی بازی ہار گئی۔ وہ بچہ عجوبہ تھا۔ جیتی کی لاش کو جہاز کے ذریعے واپس یہودیوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ یہودی اس عجوبہ بچے (عابد علی سنگی) کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب پر چلے۔ وقت گزرتا گیا اور عابی دس برس کا ہوگیا۔ دس برس کا ہونے کے باوجود وہ نوجوان لگ رہا تھا۔ غیر معمولی طاقت کا حامل عابی کئی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا۔ عابی کو یہودیوں نے اغوا کرانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے مگر عابی نے ان کو ٹھکانے لگا دیا۔ عابی دو اغوا کاروں کے ساتھ دنیا دیکھنے خود چلا گیا۔ عابی رومانیہ آگیا۔ رومانیہ میں اسے پتا چلا کہ یہودی انسانی اعضا کی خرید و فروخت میں ملوث ہیں۔ مراد نے وہاں موجود اس عمارت کو نیست و نابود کر ڈالا۔ ماروی اچانک انتقال کر گئی۔ ادھر ہم زاد کے ہاں ایک بچی کی ولادت ہوئی جس کا نام ماروی رکھا گیا۔ وہ بچی حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک تھی۔ مراد نے ماسٹر کو بو کی مدد سے اپنا چہرہ تبدیل کرلیا اور حماد کے نام سے اپنے کاغذات تیار کرا لیے۔ عابی کو ایک پولیس افسر اپنے ساتھ لے گیا۔ تاہم پولیس افسر کو عابی سمیت اغوا کیا گیا۔ پولیس افسر مارا گیا۔ مرتے وقت اس نے اپنی بیٹی کی ذمے داری عابی کے سپرد کردی۔ عابی نے ماریہ سے نکاح پڑھالیا۔ عابی کا ایک اور دشمن میدان میں اتر چکا تھا جو لوگوں کے دماغ میں گھس کر ان کے خیالات پڑھ لیتا تھا اور انہیں قابو میں کر کے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ مگر وہ انجان دشمن عابی کے دماغ پر تسلط قائم نہیں کر پا رہا تھا۔ ادھر شادی کی پہلی رات ماریہ چل بسی۔ سب سمجھنے لگے کہ اسے ان نون نے ہلاک کیا ہے۔ ماریہ عابی کی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر اپنی جان سے گئی تھی۔ تاریک دنیا کی ایک لڑکی نیلساں دین اسلام کی طرف مائل ہو کر عابی کی مددگار بن گئی۔ وہ جب چاہتی تھی ٹرانسپیرنٹ ہو کے غائب ہو جاتی تھی۔ نیلساں نے عابی کی مدد کر کے ان نون کو پکڑوا دیا تاہم نیلساں کا باپ باروداسے عابی کے شکنجے سے نکال کر لے گیا۔ شیطان کو ماننے والی اور اس کی پرستش کرنے والی لارا نامی عورت نے پھانس کر مراد سے نکاح کرلیا تاہم نیلساں کی بدولت مراد پر اس کی اصلیت کھل گئی۔ لارا مراد کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ مراد اپنے ہونے والے بچے کو شیطان کے سائے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ نیلساں کو لارا کے متعلق آگہی ملی۔ اس نے مراد کو لارا کے پاس پہنچا دیا۔ لارا نے اپنے بچاؤ کے لیے مراد پر گولی چلائی مگر نیلساں سامنے آگئی۔ وہ جان سے گئی۔ مراد کی گولی سے لارا زخمی ہوئی مگر اس کے ہاتھ نہ آسکی۔ لارا نے ایک لڑکے کو جنم دیا اور یہودیوں کے ساتھ مل کر مراد کو کوئی دوسرا بچہ حوالے کردیا۔ دشمن عابی کو ٹریپ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ادھر بن زیان نے دو جادوگروں کے ذریعے اپنے اور لارا کے گرد حفاظتی حصار قائم کروالیا۔ عابی کو ایک لڑکی پسند آگئی اور اس نے اس سے شادی کرلی۔ ادھر لارا کی خدمات پر مامور جادوگر نے لارا کو شکنجے میں لے لیا۔ اس نے عابی اور ماروی سے مدد مانگی۔ عابی نے جادوگر کو ہلاک کردیا۔ اس نے حیرت انگیز قوتوں کی مالک چار عورتوں سے شادیاں کرلیں۔ عابی کو زہر دے کر اس کی طاقت کو ختم کیا جا رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہا تھا۔ بالآخر عابی کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ ادھر شیطان نے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو ناکارہ کردیا تھا اور اس نے لارا کو افریقا پہنچا دیا تھا۔ دانش اور ماروی اس تک پہنچ نہیں پا رہے تھے کیونکہ اس کی شخصیت بدل دی گئی تھی۔ دانش نے عذر یاد کے سامنے عزم کیا کہ وہ اپنی ماں کو وہاں سے ضرور نکال لائے گا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جب تک انسان زندہ ہے، اپنے اندر امید بھی زندہ رکھتا ہے۔ اور...... انسان موت جیسی اٹل حقیقت کو بھی بھلانے لگتا ہے۔ ضروری نہیں قضا صرف بیمار یا بوڑھے آدمی پر ہی آئے۔ اچھے بھلے چلتے پھرتے جوان، اچانک موت کے جھپٹنے پر دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں اور موت کے قریب پہنچے ہوئے صاحب فراش، بھلے چنگے ہو کر گھر کو پہنچ جاتے ہیں۔ امید کا یہی جوہر ہے...... شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ امید پہ دنیا قائم ہے۔

دانش کا الٹا ہاتھ لگنے سے پہلے ہی وہ ابلیسی چیلا...... عذر باد غائب ہو کر یہ بتا چکا تھا کہ اس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اس نے اچانک دھماکا کردیا تھا، بالکل ایسا ہی دھماکا جیسا کالی دنیا کے ابلیسی چیلوں نے عابی کی یقینی موت کے سلسلے میں کیا تھا۔ اگرچہ عابی کی موت کے سلسلے میں وہ دھماکا محاورتاً تھا جس کی حقیقت بڑی غمناک اور الم و اندوہ سے عبارت تھی مگر یہ دھماکا جو عذر باد نے مراد علی سنگی پر کیا تھا، وہ حقیقتاً تھا، جس نے مراد کو پہلے ایمبولینس اور پھر اسپتال پہنچا دیا تھا لیکن ماروی اور دانش نے بھی وہاں پہنچ کر عذر باد کا غرور خاک میں ملانے کی کوشش کی تھی جب ماسٹر کو بو کے شوٹرز اور فائٹرز وہاں مراد کی مدد کے لیے موجود تھے اور اس کے ایک اشارے کے منتظر تھے تو عذر باد نے ایک آلۂ کار کے دماغ میں پہنچ کر اسے مراد پر جب گولی چلانے پر اکسایا اور اس نے مراد کا نشانہ لے کر گولی چلائی بھی...... مگر عین وقت پر گولی عذر باد کے اپنے ہی ساتھی کو لگی، تو اسے فوراً احساس ہوگیا کہ ماروی وہاں موجود ہے۔ بعد میں وہ مراد کو دھمکیاں دیتا ہوا گیا تھا، لیکن ہوٹل پہنچتے ہی اس نے واقعی حقیقتاً دھماکا کردیا ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی جانے کتنے لوگوں کی ہلاکتیں ہوئیں اور کتنے ہی زخمی ہوئے

جس وقت مراد کو زخمی حالت میں ایمبولینس کے پچھلے حصے میں ڈال کر اسپتال لے جایا جارہا تھا تو عذرباد پھر اس کے روبرو آ گیا اور طاغوتی طاقت کے نشے میں اس سے بولا تو مراد نے اس سے مرعوب ہوئے بغیر کہا تھا۔

''تم سمجھ لو کہ میں زخموں سے چور ہوکر ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہوکر بھی اس جادونگری (کمپلی گائنا کے ٹھکانے جنوبی افریقا کی سمت) تک جاؤں گا۔''

پھر یہی وہ وقت تھا جب دانش نے بھی حاضر ہوکر کہا تھا۔

''میں بابا جانی کے سائے میں اپنی ماں کو ضرور وہاں سے لاؤں گا۔ تو دفع ہوجا۔''

اور عذرباد واقعی وہاں سے دفع ہوگیا تھا......

جب مراد کو ایمبولینس میں ڈال کر ٹرینڈا کے ایک بڑے اسپتال میں پہنچایا جارہا تھا تو اس کے اندر دانش سمیت موجود ماروی، اپنے باپ کی حالت زار کو دیکھ کر اندر سے لرز بھی رہی تھی...... مراد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے نیم بے ہوش تھا۔ وہ ابھی زندہ تھا، جس کا ثبوت ماروی اور دانش کا ہنوز اس کے اندر موجود رہنا تھا۔ لیکن یہ بھی درست تھا کہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھا۔

''آپی! بابا کی جان بچ جائے گی نا؟'' اچانک اسے اپنے بھائی دانش کی لرزیدہ سی سرگوشی سنائی دی۔ جانے کیا تھا اس سرگوشی میں کہ ماروی کانپ سی گئی بولی۔

''کیوں بھائی؟ تم نے ایسا کیوں پوچھا؟ اللہ بہت بڑا ہے، مارنے والے سے بچانے والا بڑا زبردست اور طاقت والا ہے، پھر یہ مایوسی کیوں؟''

''بھیا جانی (عابد علی منگی) کے لیے بھی پورے ارض اسلام میں ہی نہیں دنیا بھر میں دعائیں مانگی گئی تھیں مگر......''

''تمہاری یہ مایوس کن باتیں میرا دل دہلا رہی ہیں دانش بھائی! پلیز، ایسا مت کہو۔'' ماروی سسک کر بولی۔

ایمبولینس چیختی چلاتی ہوئی ٹرینڈا کے کسی قریبی اسپتال کی جانب دوڑی چلی جارہی تھی اور ماروی کا دماغ اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ وہ ماضی کے تناظر میں اپنے بھائی دانش کی اس بات کا موازنہ کرتے ہوئے سوچنے پر مجبور تھی کہ اس کے بھائی دانش نے ایسا کچھ غلط بھی تو نہیں کہا تھا، یہ حقیقت ہی تھی کہ اپنے مرد آہن خو بیٹے کے سلسلے میں خود مراد علی منگی کو بھی یہی امید تھی کہ...... اس کا پہاڑ جیسا زور آور اور فولاد جیسی طاقت رکھنے والا...... اپنی ذات میں ون مین آرمی جیسی حیثیت کا حامل جیتا جاگتا ایک دن دوبارہ اپنی سابقہ قوت اور توانائی پالے گا مگر ڈھنڈیا تو اس بات کی پڑی ہوئی تھی کہ آخر اس سلو موشن ڈیتھ پوائزننگ میں عابی جیسے پہاڑ کو کس نے اور کس طرح موت کے قریب پہنچایا تھا......؟

عابی کے صاحب فراش ہوتے پر ایک عالم میں ہلچل مچ گئی تھی۔ اب شہرت والے نے زیادہ شہرت دینے والے کے بارے میں سوالات کیے جارہے تھے۔

''آخر کس سورما نے سورماؤں کے سورما کو زیر کیا تھا؟''

''وہ لوہا کون ہے، جس نے اپنے جیسے لوہے کے ایک پہاڑ کو کاٹ ڈالا تھا......؟''

''وہ مہا شیطان کون تھا جس نے ارض اسلام کے اس گبرو سپوت کو یوں بستر علالت پر اور اس کے بعد خاک تلے پہنچ دیا تھا؟''

ابھی ان سوالوں کے جوابات کی تلاش جاری تھی، ادھر بھی ادھر بھی......

ادھر...... دوست نما دشمن، بن زیان، صیہونی تنظیم کے اہم عہدے دار کریگ ہوسٹن سمیت یہودی اکابرین، سپر پاورز، ان کے اتحادی، حتیٰ کہ تاریک دنیا کے باسی لارا، آبنوس اور طاغوتا وغیرہ جبکہ ادھر...... روشن دنیا میں ارض اسلام کے ریاستی حکمراں مراد علی منگی، زیب النساء بھی خواہ ماسٹر کو بو بو، ان سب کو ان کڑے سوالوں کے جوابات کی ضرورت تھی نہیں تھی تو فقط ماروی کو...... وہ اپنی باطنی نظروں سے تاریک دنیا میں پاتال کی ناپاک گہرائیوں کے قعر فنا میں دو افراد کو محو رقص دیکھ رہی تھی، جہاں ایک جشن عظیم کی سی شان و شوکت کا سماں طاری تھا۔

ایک لمبے جبے میں ملبوس کالا بھجنگ شیطان، جسے خود پر ابن شیطان ہونے کا دعویٰ تھا، ایک حوالے سے وہ خود کو شیطان کا مندوب بھی کہتا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ رقص و سرود میں مگن تھا۔ ان کے ساتھ جادوگروں کا ٹولہ بھی تھا۔

یہ...... بھی ایک شیطانی جادوگر تھا۔ اس ابن شیطان اور مندوب شیطان کا نام جبلیس تھا اور اس کی محبوبہ ہاسی تارا تھی۔ ہاسی تارا کو جون بدلنے کی صفت جبلیس نے دی تھی۔

ماروی اپنے بھائی دانش کے مقابلے میں زیادہ روحانی قوتوں کی مالک تھی۔ اگرچہ دونوں ہی خیال خوانی کے ماہر تھے مگر دانش کیا، ماروی تک لارا کی برین واشنگ کرنے والے کا کھوج نہیں لگا سکی تھی، بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی شیطان نے اس بار شہتیز پہلو سے منتی چال چلی

تھی جو کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کیوں اس نے اپنے چیلوں لارا، آبنوس اور طاغوتا وغیرہ کے اذہان بھی واش کر ڈالے تھے؟ تاکہ کسی کو دشمنی کا شبہ نہ ہو سکے۔

ماروی نے اپنی باطنی آنکھ پر زور دیا، نور نظر کو گہرائیوں، بلندیوں اور پستیوں سے لے کر ارض و سما کے بیچ ہولناک خلاؤں اور ویرانوں تک دوڑایا تو اسے ایک شے دکھائی دے گئی۔ وہ تھی پردہ...... یہ دو پردے تھے۔ ایک سیاہ اور دوسرا سفید......

وہ اسے ہٹانے کی کوشش کرتی، آیا پردۂ اسرار کے پیچھے ہے کیا؟ پردۂ اسرار بھی ہٹ گیا، جو منظر دکھائی دیا، اسے سمجھنے کے لیے ماروی کے دماغ کی چولیں تک ہل گئیں۔ کبھی سفید پردے کے پیچھے اسے بارِیش نورانی چہرے دکھائی دیتے اور سیاہ پردے کے عقب میں کالے بھجنگ مکروہ چہرے، پھر یکلخت سفید پردہ دوبارہ پھڑ پھڑا کے ہٹا تو اس کے پیچھے شیطانی چہرے اور بعین اسی طرح سیاہ کے پیچھے نورانی بشرے...... وحشت تیرے کی، عقل ماؤف کر دینے والے ہی تو مناظر تھے یہ...... پہلی بار جیسے روحانی قوتوں کو ایک چیلنج کا سامنا پڑ رہا ہو...... یہ تو انسانی عقل کی سوچ تھی، ورنہ تو کاتب تقدیر بھی انسانی بھلائی اور فلاح کے لیے کچھ ایسے فیصلے صادر کرتا ہے، جو بہ ظاہر کڑوے لگتے ہیں مگر ان میں بڑی حکمت ہوتی ہے، جیسے بیماری میں کڑوی گولی نگلنا۔ شیطان کو جو طاقتیں ملی ہوئی ہیں وہ اللہ ہی نے اسے دی ہیں۔ اس میں حکمت ہے۔

''میں انسان کی رگوں میں لہو بن کر دوڑوں گا۔ مجھ میں انہیں سیدھے راستے سے بھٹکانے کی طاقت ہے۔''

ماروی کو پہلی بار راہنمائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے تصور میں بابا صلاح الدین اجمیری ایک سفید لباس میں ملبوس ہو کر آئے پھر ماروی کے سامنے ایک جہان دیگر کھلتا چلا گیا......

تمام پوشیدہ گوشے ماروی کے سامنے وا ہوتے چلے گئے۔ اس پر سیاہ و سفید کی حقیقت کھلنے لگی۔ شیطان چہرے بدل بدل کے ایمان والوں پہ حملے کرتا ہے۔

عابی کے مقابلے کی پہلی شہ زور خاتون بے شک ایک دین دار اور عابی کی وفادار بیوی تھی مگر شیطان نے اس کے اندر لہو بن کر اسے بھٹکا دیا تھا۔ اس نے عابی کی یہ شرط مان کر کہ وہ ایک سے زیادہ شادیاں بھی کرے گا تو اسے (نصیبہ خاتون کو) کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

خبلیس جانتا تھا کہ ایک انگلی میں طاقت نہیں ہوتی لیکن جب پانچوں انگلیاں باہم مل جائیں تو ایک طاقت ور گھونسا بن جاتی ہیں۔ عابی اب تک ایک گھونسے کی ہی مثال تھا مگر تلے اوپر شادیوں نے اس کی طاقت کو منقسم کر دیا، یہ جسمانی طاقت نہیں بلکہ ذہنی طاقت کا شاخسانہ تھا۔ جسم ذہن کا طابع ہے، ذہن منتشر ہو تو طاقت بھی منتشر ہو جاتی ہے۔ یہی عابی کے ساتھ ہوا۔ بہر حال جو کچھ ہوا وہ روپ بہروپ میں ہوا۔ نصیبہ خاتون کے روپ میں خبلیس نے ہامی تارا کو بھیجا، اس کا کنٹرول اپنے مقرب خاص کارپرداز چیلے عذرباد کو دیا۔

ہامی تارا یوں تو خبلیس کی رکھیل یا محبوبہ تھی مگر وہ دونوں شیطان کے ازلی اصولوں کے تحت، ایک دوسرے کے ساتھ بھی گناہ گارانہ ''تعلق'' رکھے ہوئے تھے۔

اصل تو اس کی طاقت کو سہنے والی ہامی تارا ہی تھی، اس نے بھی نصیبہ کے روپ میں وقفے وقفے سے آکر اس کی طاقت کو ذہنی انتشار کے ذریعے منتشر کیا تھا۔ ہامی تارا جانتی تھی کہ ماروی اور دانش خیال خوانی کے ذریعے نصیبہ خاتون کے دماغ میں آتے رہتے ہیں، وہ ہمیشہ اسی وقت آتی تھی جب نصیبہ خاتون کا دماغ خالی ہوتا۔ اس کے علاوہ عابی کی خوراک میں پہلے ہی ایسا زہر شامل کیا جا رہا تھا جس نے اسے بستر مرگ پر پہنچا دیا تھا۔ اس کا کسی کو پتا ہی نہ چل سکا اور عابی فنا ہو گیا۔

قائم رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے...... انسان تو فانی ہے، چاہے جتنا شہ زور ہو۔ اب تک ماروی کاتب تقدیر کے لکھے ہوئے کو مان کر اور اس کی مصلحت جان کر اپنے بابا جانی مراد علی منگی سے بہت کچھ چھپاتی رہی تھی مگر اب یہ حقیقت اسے بتانے کے لیے بے چین ہو گئی، وہ اپنے بابا جانی کو یہ حقیقت بتانے کے لیے تڑپ گئی تھی کہ اپنے چیلوں (لارا، آبنوس، کاہن، طاغوتا وغیرہ) کی ناکامی کے بعد اصل شیطان اب خود اپنی محبوبہ ہامی تارا اور عذرباد کے ساتھ پاتال کی منحوس گہرائیوں سے نکل کر ان کے مقابلے پر آچکا ہے اور عارضی طور پر اسی نے سب سے پہلے اپنے چیلوں کا برین واش کر کے انہیں بت جیسا بنا دیا ہے تاکہ روشن دنیا والے یہی سمجھیں کہ کوئی بڑا عامل ان کے (شیطان کے) مقابلے میں آ گیا ہے۔ یہی منافقت کا روپ ہے کہ دوست بن کر دھوکا دیا جائے اور خبلیس اور اس کی حسین محبوبہ ہامی تارا...... چیلا عذرباد، روشن دنیا والوں کو بھٹکانے خود آرہے تھے۔

ماروی کو یہ سب بہت پہلے ہی اس کی پوشیدہ روحانی

قوت نے دکھا دیا تھا مگر وہ ابھی مصلحتاً کسی سے اس کا اظہار کرنے سے قاصر تھی، بالکل اسی طرح جس طرح تھوڑے دنوں پہلے تک وہ اپنے باپ مراد کو اس کے بیٹے دانش کی حقیقت بتانے سے قاصر تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب بھی وہ دانش کے سلسلے میں اپنے باپ مراد کو کچھ بتانے کی کوشش کرتی تو وہ فقط اتنا ہی کہہ پاتی۔

''بابا جانی......''

اس کا صاف مطلب یہی ہوتا تھا کہ ابھی رکاوٹیں ویسے ہی قائم تھیں۔ ماروی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی...... کیا یہ بھی کاتب تقدیر کی کوئی مصلحت تھی یا پھر کوئی کالا جادو......؟ وہ سمجھ گئی، اسے جہاں بہت سی روحانی طاقتیں حاصل تھیں وہاں کچھ کمزوریاں بھی تھیں، کوئی انسان سو فیصد پرفیکٹ نہیں ہوتا، انیس بیس کی کمی رہ جاتی ہے۔ کہیں یہ کمی کوئی معنی نہیں رکھتی مگر کبھی یہی ایک کمی بڑی ثابت ہوتی ہے۔

ماروی کو بھی یہ کمی محسوس ہوئی تھی لیکن اس نے اس کا حل بھی ہمیشہ کی طرح خود ہی نکال لیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اسے معلوم تھا کہ اس کا بھائی دانش پیدا ہونے کے بعد تاریک دنیا میں موجود تھا مگر وہ اسے اپنی روشن دنیا میں نہیں لاسکی تھی نہ ہی اس کے بارے میں اپنے باپ مراد کو بتاسکی تھی۔ پھر بعد میں کاتب تقدیر کی طرف سے کیے گئے مقررہ وقت پر دانش کو وہاں سے نجات ملی مگر یہ الگ بات تھی کہ وہ ابھی شیطان کی پجارن ماں لارا کو بھی بھلا نہیں سکا تھا۔

مگر اب دانش کی حقیقت سب جان چکے تھے۔

اس کا باپ مراد علی منگی بھی...... یہ تب کی ہی بات تھی جب دانش کو ایک طالب علم کی حیثیت سے اسلامک یونیورسٹی لایا گیا تھا۔ وہ اپنی بہن ماروی کے ساتھ ارض اسلام کی یونیورسٹی اور جم خانے میں بھی آگیا تھا۔ مراد سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی اور مراد نے اسے دیکھ کر اپنے اندر ایک عجیب سی خونی کشش محسوس کر کے گلے لگا کر اسے بیٹا کہا تھا۔

ماروی نے فیصلہ کیا، ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی، وہ خود خبلیس، اس کے چیلے عذرباد اور اس کی محبوبہ ہاسیتی تارا پر نگاہ رکھے گی۔ ان کے شیطانی منصوبے ناکام بناتی رہے گی اور جہاں تک ممکن ہو سکا وہ اپنی غیر معمولی روحانی طاقتوں کے بل بوتے پر انہیں شکست سے دوچار بھی کرتی رہے گی۔ یوں اب باطنی آنکھ سے یہ تماشا دیکھنے لگی۔

اللہ نے شیطان اور اس کے پجاریوں کو بھی ایک خاص وقت تک کے لیے ڈھیل دے رکھی ہے۔ دنیا کا نظام ایسے ہی چل رہا ہے۔ خیر و شر کی جنگ ازل سے اسی طرح جاری ہے۔ اللہ نے کسی کو بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔ زمین پر رینگنے والے ایک کیڑے کا بھی اس دنیا میں آنے کا ایک مقصد رکھا ہے۔

لارا، آبنوس اور طاغوتا کسی کو پہچاننے سے قاصر تھے۔ بن زیان، لاما کیشورا کا کے جادوئی حفاظتی حصار میں خود کو محفوظ دماموں سمجھ رہا تھا۔ ماروی نے وہاں شعلہ بھڑکا کر اسے جزیرے میں دوڑانے پر مجبور کر دیا تھا اور اسے دھمکی دی تھی کہ وہ بہت جلد اسے لاما کیشورا کا کے جادوئی حصار سے باہر نکال کر رہے گی۔ ماروی کی کرامات دیکھ کر بن زیان نے لاما کیشورا کا سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے ساری صورت حال سے آگاہی دی اور بولا۔

''وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ چکی ہے کیونکہ وہ جان گئی ہے کہ میں ان کے باپ اور بھائیوں کا دشمن نمبر ایک ہوں۔''

''وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔'' لاما کیشورا کا نے اسے تسلی دی اور آگے بولا۔

''وہ بے بس ہو کر تمہیں محض گیدڑ بھبکیاں دے رہی ہے۔''

''مگر اس کا بھائی عابی اپنی بہن ماروی کی مدد سے زدمیں گاتا کو شکست دے چکا ہے۔'' بن زیان نے یاد دلانے والے انداز میں کہا۔

''بے شک! لیکن ان کا بھی تو انجام دیکھو کیا ہوا، خاک سے خاکستر ہو کر منوں مٹی تلے چلا گیا۔'' لاما کیشورا کا معنی خیز لہجے میں بولا۔

''تت...... تو کیا تم نے عابی کو اس حال تک پہنچایا ہے؟'' بن زیان کی آنکھیں حیرت و خوشی سے پھیلنے لگی تھیں۔

''نہیں مگر میں یہ حقیقت جانتا ہوں۔''

''کون ہے وہ؟''

''بس! ایک حد تک سوالات ٹھیک ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ ہی منقطع کر دیا۔

بن زیان نے اپنے ذرائع سے تسلی کی خاطر ایک بار پھر پتا چلایا۔ صورت حال ابھی تک وہی تھی۔

''کاش! وہ شیطان اس ننھی آفت کی پرکالہ ماروی کا بھی کچھ کر لے۔''

☆☆☆

ماروی خیالات سے اس وقت چونکی جب دانش نے اسے خیال خوانی میں ٹہوکا دیا۔

"آپی! بابا کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ ہم شاید زیادہ دیر ان کے اندر موجود نہیں رہ سکتے۔" بھائی کی بات سن کر ماروی کو بھی یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اسے اب اپنے باپ کے اندر رہنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ دونوں حاضر ہو گئے۔ دونوں فکرمند اور تشویش زدہ نظر آ رہے تھے۔ دانش کے مقابلے میں ماروی کو بہت سی پیش آمدہ اور پیش آئندہ باتوں کا ادراک تھا۔ اس نے خیال خوانی کرتے ہوئے بابا صلاح الدین اجمیری کا تصور کیا اور تب ہی اس کی سماعتوں میں غیبی آواز ابھری۔ وہ اسے بہت غور سے سنتی رہی۔ اس کے بعد وہ پس منظر سے "پیش منظر" میں حاضر ہوتے ہوئے، دانش سے بڑے عجیب لہجے میں بولی۔

"ہمیں بابا کو اسی حالت میں یہاں سے لے کر جانا ہوگا......!"

☆☆☆

لاما کیشوراکا...... جس وقت بن زیان سے باتیں کر رہا تھا، تبت کی ایک خانقاہ میں لاتعداد معتقدین اس کی دستیابی سے فیض حاصل کرنے کے لیے اس گنبد نما حجرے میں جمع تھے۔

تبت برفباری کی شدید لپیٹ میں تھا۔ کڑکڑاتی سردی میں بھی اس کے ماننے والے آبادی سے میلوں دور یہاں برفیلی بلندی میں اس کا درس سننے آتے تھے۔ وہ ان کا روحانی پیشوا بن کر یہاں انہیں مختلف اچھی و بری پیش گوئیوں سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔

ان سے فارغ ہو کر وہ اپنے دو خاص خادموں کے ذریعے گنبد کے سب سے اوپر بنے کمرے میں آ گیا۔ وسط میں ایک چھوٹی سی چوکور میز تھی اور اس پر ایک ڈیڑھ فٹ قطر کا کرسٹل بال رکھا ہوا تھا۔ خادم دروازے کے باہر پہرے پر کھڑے ہو گئے تھے اور وہ اکیلا اندر تھا۔

اس نے کرسٹل بال کے قریب آ کر زیر لب کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ماری اور دوسرے ہی لمحے کرسٹل بال اپنے اسٹینڈ میں دھیرے دھیرے گول گول گھومنے لگا۔ اس کا رنگ پہلے برف جیسا سفید تھا، پھر سرخ ہوا اور اس کے بعد گہرا عنابی ہو گیا۔ وہ اب تیزی سے گھوم رہا تھا۔ لاما کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ کرسٹل بال میں ایک چہرہ متحرک ہونے لگا۔ وہ کسی بوڑھی عورت کا چہرہ تھا۔ چہرے پر منحوسیت کے ڈونگرے برس رہے تھے آنکھیں بند تھیں، بند کیا تھیں، ایک لکیری کھنچی ہوئی تھی، بغیر پلکوں کی۔

''گریٹ مدر، ماتورا ما...... تیری مہربانی کہ تو نے مجھے مہاشیطان کے پاتال سے باہر نکل آنے کی خبر دی، پر اب تک تو نے یہ نہیں بتایا کہ یہ مجھ سے کب رابطہ کرنے والا ہے؟'' کیشورا کا نے پوچھا۔

دفعتاً اس بڑھیا کی لکیر جیسی بند آنکھوں میں جنبش پیدا ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں پتلیوں سے عاری تھیں، فقط سفیدی تھی۔ باہر چلنے والی کاٹ دار برفیلی ہواؤں کا شور بلند چھت کے گول رخنوں سے اندر تک سنائی دے رہا تھا۔ یہ آواز ایسی ہی تھی جیسے لاتعداد، خونی اور شیطانی چنگاڑیں چیخ رہی ہوں۔

گھومتے ہوئے کرسٹل بال سے چلاتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

''جلدی نہ کر فرزند کیشورا کا...... وہ دن دور نہیں جب تو اور جلبیس اس کی محبوبہ ہامیی تارا، اس کا چیلا عذر باد پوری دنیا میں اپنی طاقت اور شہرت کا ڈنکا بجانے والے ہیں۔ انتظار کر......''

اس کے ساتھ ہی اس مکروہ آنکھوں اور منحوس چہرے والی بڑھیا کی آنکھوں کی جگہ دوبارہ باریک لکیروں نے لے لی۔ کرسٹل بال بھی گھومتے گھومتے رک گیا۔ رکنے کے دوران بھی اس کا رنگ اسی طرح بدلتا ہوا، دوبارہ سفید برف جیسا ہوگیا۔

لاما کیشورا کا فطرتاً گھمنڈی تھا۔ بن زیان نے جب اس سے مدد مانگی تھی اور اسے اپنے دشمنوں (مراد اور عالی وغیرہ) کے بارے میں بتایا تھا تو لاما کیشورا کا نے اسے تسلی دیتے ہوئے چٹکی میں اس کے دشمنوں کو اڑانے کا دعویٰ کیا تھا، پھر جب اس نے زومبی گانتا کا عالی کے ہاتھوں حشر دیکھا تو وہ ذرا دبکا مگر پھر اس نے اسے ایک مغرور قہقہے میں اڑا دیا۔ غرور بھی ایک بھوت کی طرح انسان کے سر پر سوار ہوتا ہے، یہ لاتوں کا بھوت ہوتا ہے۔ لاما کیشورا کا کو بھی ایسی ہی ایک لات لگنے والی تھی، کب؟ یہ صرف قدرت کو معلوم تھا۔

لاما کیشورا کا کو اس کی ماں ماتورا ما نے ہی یہ پیش گوئی کر کے بتایا تھا کہ ...... اس کے ساتھ پاتال کی منحوس گہرائیوں کا ایک مہاشیطان جلبیس عنقریب اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے والا ہے۔ اس پر وہ بے حد خوش ہوا تھا۔ خوشی حد سے بڑھ جائے تو بہت سے اندیشناک واہموں کو بھی جنم دیتی ہے، اسے بھی یہ وہم سا ہونے لگا تھا کہ کیا واقعی اس کی شہرت اور دبدبے کا ڈنکا بجت کی برف پوش پہاڑیوں سے نکل کر چہار دانگ بجنے والا تھا؟ لیکن اس میں وہ شیطان کی حصے داری کو نامناسب خیال کر رہا تھا۔

لاما اپنی فطرت کے مطابق بلاشرکت غیرے اور پوری دنیا میں اپنے تقدس اور اپنے مذہب کے پرچار میں دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی جنونی واقع ہوئے ہیں۔ اس نے ماتورا ما سے یہ سوال کیا تھا، جواب اسے ملا تھا۔

''طاقت اسی کی ہوگی، جو ہر تیرا ہوگا۔ وہ کسی کو دکھائی دے گا نہ اس کا پرچار کر سکے گا۔ دنیا والے صرف تجھے دیکھیں گے۔''

وہ اپنی ماں کی بات سمجھ گیا۔ واقعی شیطان اسی کو تو کہتے ہیں کہ وہ خود نظر نہیں آتا مگر اپنے کرتوتوں سے جانا جاتا ہے۔ گویا کرتوت اس جلبیس کے ہوں گے اور عمل اس کا کہلائے گا۔

کچھ دنوں بعد اسے ماتورا ما کی طرف سے اشارہ ملا کہ وہ ارض اسلام کے مراد علی منگی کو مقابلے کا کھلا چیلنج دے ڈالے۔ پہلے تو وہ گھبرایا۔ زومبی گانتا کا انجام اسے یاد آنے لگا۔

اسے پھر اشارہ ملا۔

''بے وقوف...... اروشن دنیا کے لوگوں کو چیلنج دینے سے ہی تو تاریک دنیا کے جلبیس کی نظروں میں تو اہم ٹھہرے گا...... اسے ہر وقت کسی نہ کسی چیلے کی ضرورت پڑتی ہے۔ فوراً عمل کر میری پیش گوئی پر......'' ماں نے ڈپٹا۔ اس نے فوراً ماں کی نصیحت پر عمل کر ڈالا۔

☆☆☆

جیسا کہ مذکور ہوا...... ماروی کو اپنی مخفی صلاحیتوں سے کچھ ایسے اشارے ملنا شروع ہو گئے تھے کہ کوئی بڑی کالی طاقت ان کے مقابلے میں آنے والی تھی مگر وہ ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے بھائی دانش سے اس سلسلے میں بات کی پھر دونوں نے خیال خوانی سے اپنے چیدہ دشمنوں کے دماغ تک رسائی حاصل کی ماسوائے بن زیان کے، چور خیالات سے اور کہیں سے بھی پتا نہ چل سکا کہ وہ آندھی جیسی کالی طاقت کون تھی اور اس کا نزول کس خطے سے ہونے والا تھا؟ اگرچہ تاریک دنیا کی طرف سے ان کا اندازہ تھا۔

''میرا خیال ہے، بن زیان کے علم میں سب ہوگا۔ اگر کسی طرح اس کے دماغ تک رسائی حاصل کر لی جائے تو......'' دانش نے کہا، حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ لاما کیشورا کا کے جادوئی حصار میں تھا۔

''ہمیں بن زیان کے دماغ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔''

''میں دو بار کوشش کر چکی ہوں، اب تیسری بار کرتی ہوں۔'' ماروی نے بھائی سے کہا اور خیال خوانی کے ذریعے وہ اس جزیرے تک جا پہنچی...... اس نے اپنی مخفی روحانی طاقت سے پھر وہی شعلہ بھڑکایا جس سے بن زیان بدکنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

شعلہ رقص کرتا ہوا بن زیان کی طرف لپکا اور وہ اس سے بچنے کے لیے اٹھ کر بھاگا اس نے بھی شعلے سے بچنے کا توڑ یہی نکال رکھا تھا کہ وہ پورے جزیرے کا بھاگ بھاگ کر طواف کرے، اس نے یہی کیا۔ بالآخر ہانپتا ہوا دوبارہ اپنے پیلس میں بے دم ہو کر آ گرا۔ شعلہ غائب ہو چکا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس بار شعلہ اس کی جانب لپکا تو وہ نہیں بچ سکے گا۔ ایسا زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ اس نے فوراً کریگ ہوسٹن سے رابطہ کیا۔

''وہ آفت کی پرکالہ ماروی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ چکی ہے۔ اس کا سدباب کرنا ہوگا۔ اس نے میرا بنگلا جلا کر خاکستر کر ڈالا، میری فوج کو فنا کر دیا۔''

''تم لاما کیشوراکا سے کیوں نہیں رابطہ کرتے؟'' کریگ ہوسٹن نے کہا۔

''وہ یہی کہتا ہے کہ بہت جلد ارض اسلام پر ایک بڑی شیطانی قوت حملہ آور ہونے والی ہے۔ پرنس عالی کو بھی اسی کالی طاقت نے ڈھیر کیا اور اب مراد بھی ٹرینڈا کے ایک اسپتال میں اپنی زندگی کے دن گن رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے اس پیش گوئی کا۔'' بن زیان ہانپتے ہوئے بولا۔

''تو پھر انتظار کرو روشن دنیا والوں کی بربادی کا۔'' کریگ ہوسٹن نے کہا۔

''لیکن تب تک ماروی میرا بھرکس نکال دے گی...... اوہو...... وہ پھر آ رہی ہے۔'' بن زیان چلایا اور شعلے کی جھلک دیکھتے ہی اٹھ کر دوڑا۔ حتیٰ کہ جزیرے کے ساحل کی ریت پر بے دم ہو کر گر پڑا۔ تب اس نے ماروی سے سودے بازی کرنے کے لیے اسے اپنے دماغ میں آنے کی اجازت دے ڈالی۔

''میں نے کہا تھا نا کہ تم بچ نہ سکو گے۔'' ماروی کی باریک آواز اس کے دماغ میں ابھری۔

''مجھے مار کے تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا ننھی آفت!'' وہ ہذیانی لہجے میں بولا۔ ''نہ ہی تم اس بربادی کو روک سکو گی

تحفہ

بہت دن گزرے دوستوں کی محفل میں ایک صاحب نے یہ قصہ سنایا تھا جو آپ کے گوش گزار ہے۔ تو صاحبو! قصہ کچھ یوں ہے کہ تقسیم ہند سے قبل اکثر لوگ پاپیادہ سفر کرتے تھے۔ ایک جاٹ کو سفر درپیش تھا۔ وہ صبح سویرے پاپیادہ چل پڑا۔ دوپہر کا وقت جون کی آگ برساتی دھوپ میں اس کا پیاس کے مارے برا حال تھا۔ اس کا گزر ایک پسماندہ سے گاؤں سے ہوا۔ گاؤں میں سب سے پہلا گھر سردار گرنام سنگھ کا تھا۔ جاٹ نے دروازے پر دستک دی تو سردار کی سیدھی سادی بیوی دروازے پر آئی۔ اس وقت وہ گھر میں اکیلی تھی۔ جاٹ نے پانی مانگا تو اس عورت نے پانی دینے کے بجائے اس سے سوال کیا۔ کہاں سے آ رہے ہو۔ پیاس کی وجہ سے جاٹ کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اس نے جل کر کہا، جہنم سے آ رہا ہوں۔ عورت نے ہائے کہہ کر سینے پر ہاتھ مارا اور پوچھا وہاں میری اجیت کور تو نہیں تھی؟ (اجیت کور جوانی میں فوت ہو گئی تھی) جاٹ کو اپنی پیاس بھول گئی۔ بولا، میں تو تمہارا ہی گھر ڈھونڈ رہا تھا۔ اجیت کور کا تو وہاں بہت برا حال ہے۔ فرشتوں نے بے چاری کو کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں پھینک رکھا ہے۔ میں چھٹی پر گھر جا رہا تھا تو اجیت کور نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میری ماں سے کہنا کہ میرا سارا زیور تمہارے ہاتھ مجھے بھجوا دے تاکہ میں وہ فرشتوں کو دے کر اس عذاب سے چھٹکارا پا سکوں۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ سردارنی زاروقطار روتی جاتی تھی اور بچی کے لیے بے شمار صدقے دیتی جاتی تھی۔ اس نے بچی کے زیور کے علاوہ اپنا سارا زیور بھی پوٹلی میں باندھ کر جاٹ کے حوالے کیا۔ جاٹ اپنی پیاس بھول گیا اور اسے تسلی دے کر تیزی سے واپس اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گرنام سنگھ گھر آیا تو سردارنی نے اسے سارا قصہ کہہ سنایا۔ سردار کو سخت غصہ آیا۔ بولا تم سے تو میں آ کر پوچھتا ہوں۔ پہلے میں اس ٹھگ کو پکڑ لوں اور گھوڑی پر بیٹھ کر اسی سمت روانہ ہو گیا۔ جنگل میں اسے جاٹ جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے جاٹ کو للکارا۔ جاٹ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور جلدی سے بیری کے درخت پر چڑھ گیا۔ سردار نے گھوڑی درخت کے نیچے کھڑی کی اور درخت پر چڑھنے لگا۔ جب وہ آدھے درخت پر چڑھ گیا تو جاٹ نے نیچے چھلانگ لگا دی اور گھوڑی پر بیٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ سردار بے بسی سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ جب کچھ سمجھ نہ آیا تو زور سے آواز دے کر کہنے لگا۔

اوئے جٹا! اجیت کور نوں میرے ولوں پیار دیئیں تے نالے آکھیں دھیے زیور تیری ماں ولوں تے اے گھوڑی بابل ولوں تحفہ قبول کرلویں۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

جو عنقریب تم سب کا مقدر بننے والی ہے۔'' اس نے آخر میں دھمکایا بھی۔ ماروی بولی۔

''یہ وقت بتائے گا کہ کون اور کس کی بربادی کرے گا۔ تم نے لاما کیشوراکا سے ساز باز کر کے ہمارے خلاف کھلی دشمنی کا اعتراف کرلیا ہے۔ موت سے بچنا چاہتے ہو تو مجھے بتاؤ کہ لاما کیشوراکا کو اس کالی طاقت کی طرف سے کیا اشارے ملے ہیں؟''

''ہا...... ہا......'' بن زیان نے ایک ہذیانی قہقہہ لگایا۔ وہ مکار سمجھ چکا تھا کہ اس کے دماغ میں گھسنے کے باوجود وہ اس کے ان خیالات کو پڑھنے سے قاصر ہے جو اس کے اور لاما کیشوراکا کے مابین تھے۔ حقیقت بھی یہی تھی۔

جب بن زیان نے سمندر میں ڈوب مرنے سے بچنے کے لیے ماروی کو اپنے دماغ میں آنے کی اجازت دی تھی تو ماروی نے بلاتاخیر اس کے ان خیالات کو پڑھنے کی کوشش کی تھی جو اس کے اور لاما کیشوراکا سے متعلق تھے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکی تھی۔

''لاما کیشوراکا ہی تم سب کی بربادی کا سامان بننے والا ہے۔ جاؤ...... اس سے جا کر مقابلہ کرو۔''

ماروی نے طیش میں آکر اس کے دماغ کو جھٹکا دیا، وہ حلق کے بل چیخا۔ اس نے سانس روک کر ماروی کو بھگا دیا۔ ماروی نے دوبارہ شعلہ دکھایا۔ وہ اٹھ کر دوڑا اور سمندر میں کود گیا۔ ابھی وہ اتھلے پانی سے دور تھا۔ غوطے کھانے لگا۔ ماروی نے اسے چھوڑ دیا اور دوبارہ اپنے بھائی دانش کے پاس آکر اس سے بولی۔

''بن زیان نے مجھے یہی اشارہ دیا ہے کہ لاما کیشوراکا ہی ہماری سرزمین پر ہلا بولنے کی تیاری کیے بیٹھا ہے۔''

''آؤ بہنا! ہم دونوں لاما کیشوراکا کے دماغ تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔'' دانش نے کہا اور دونوں بہن بھائی نے لاما کیشوراکا کے دماغ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر انہیں ناکامی ہوئی۔

☆☆☆

مراد اور عابی (مرحوم) کے دوست نما دشمنوں کو جب اس پراسرار کالی طاقت کے بارے میں علم ہوا کہ وہ عنقریب ارض اسلام پر ہلا بولنے والی ہے تو ان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ انہیں کریگ ہوسٹن کے ذریعے معلوم ہوا تھا۔

''آخر پتا تو چلے کہ یہ پراسرار کالی طاقت ہے کون اور اس میں کتنا دم ہے؟'' سپر پاور کے ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔

''کہیں یہ رگھوناتھ جیسا ثابت نہ ہو، اس نے بھی مراد اور عابی کو ختم کرنے کا ایسا ہی دعویٰ کیا تھا مگر اس کا حشر کیا ہوا، یہ ہمارے سامنے ہے۔'' ایک یہودی اکابر نے بھی کچھ ایسے ہی خدشے کا اظہار کیا تو صیہونی تنظیم کے ایک اعلیٰ عہدے دار نے کچھ خوش فہمی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں اور اتحادیوں کو امید دلانے کے انداز میں کہا۔

''اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ کچھ ایسا اشارہ ملتا ہے کہ وہ کالی طاقت پاتال کے ایک بڑے مہاشیطان کی صورت ظاہر ہونے والی ہے۔ رگھوناتھ جیسے اس کے چیلے رہے ہیں، کیا یہ ثبوت کافی نہیں کہ ارض اسلام کے فرماں روا عابد علی منگی کو کس حال پر پہنچا دیا۔ مراد کا کیا حشر کر کے رکھ دیا......''

یہ حقیقت تھی، سب نے اتفاق کیا۔ ایک اعلیٰ حاکم جوشِ مسرت سے بولا۔

''اگر ایسا ہے تو ہمیں بھی حملہ کرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ یہی موقع ہوگا کہ جب ہم بھی اپنے دل میں چھپی برسوں کی بھڑاس نکالیں۔ مراد علی منگی بھی بستر علالت پر پڑا ہے۔''

''لیکن زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم اس مہاشیطان سے رابطہ کریں اور اس سلسلے میں اس سے بھی مدد چاہیں کہ ہم اس کے ہم خیال اور اتحادی بننے کو تیار ہیں۔''

بہت کوشش کی گئی کہ کسی طرح اس پراسرار مہاشیطان سے رابطہ ہوسکے مگر تاحال اس میں کامیابی ہوتی نظر نہیں آرہی تھی۔

لارا، آبنوس اور طاغوتا وغیرہ کی اچانک برین واشنگ کے بعد ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے مہاشیطان (خبلیس) ان کی جگہ اپنے کچھ نئے مہرے میدان میں لانے والا تھا۔

اللہ نے انسان کو عقل کے ساتھ عقلِ سلیم بھی دے رکھی ہے۔ جس کے ذریعے وہ کسی بھی رونما ہونے والے واقعے کی پہلے ہی سے تصویر کشی کر ڈالتا ہے اور اسی کے مطابق عملی قدم اٹھاتا ہے۔ یہ عقل زیادہ تر قیاس آرائی اور محتاط اندازوں کے بل پر ہوتی ہے۔

خیالات اور عقل کے گھوڑے دوڑائے گئے تو اندازہ ہوا کہ اس ان نون پراسرار کالی طاقت کا تعلق کسی ماورائی دنیا سے ہی تھا جو پہلے چھپ کر یہ سارا تماشا اور اپنے چیلوں کی ناکامی کا کھیل دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

ارض اسلام میں افسردگی کی فضا قائم تھی۔ ابھی عابی کی دائمی جدائی کا غم ہلکا نہیں ہوا تھا کہ ترینتا سے مراد کی

شدید علالت کی خبر آگئی تھی۔ اگرچہ ماروی نے انہیں باباصلاح الدین اجمیری کے حوالے سے تسلی تو دی تھی، تاہم اس عمل کی باریابی اور بہ خیر اختتام میں ابھی وقت تھا، لہٰذا سب ہی مراد علی منگی کی علالت پر تشویش میں مبتلا تھے۔ ہمزاد متفکر تھا اور زیب النساء ہراساں۔ اس کی دن بہ دن بگڑتی حالت پر ریاست ملول تھی۔

''مراد پر کسی کالے جادو یا شیطانی قوتوں کا اثر غالب آتا محسوس ہو رہا ہے۔ ورنہ آج تک کسی نے ان کا بال بھی بیکا نہ کیا ہے۔'' ہمزاد نے خیال ظاہر کیا۔ ''ہمیں انہیں خود باباصلاح الدین اجمیری کے حجرے میں لے جانا چاہیے۔'' زیب النساء کو ہمزاد کا یہ مشورہ اچھا لگا۔ تاہم وہ قدرے فکرمندی سے بولی۔

''لیکن انہیں ریاست سے باہر ہندوستان کیسے لے جایا جائے؟ کیا خبر جس شیطانی قوت کا یہ شاخسانہ ہے وہ بھی یہی چاہتی ہو کہ پرنس کو ریاست سے نکالا جائے اور خدانخواستہ اسے نقصان پہنچانے کا موقع حاصل ہو جائے۔''

بات غلط بھی نہیں تھی۔ وہ پراسرار شیطانی قوت ہی کیا، اب تو سبھی کھل کر دشمنی پر اتر آئے تھے مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہوئے، مراد کو موت کے منہ میں جاتا دیکھا جائے چنانچہ فوراً ماسٹر کوبو بو سے ٹیلی فونک رابطہ کیا اور مشورہ طلب کیا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ مراد کو بیک وقت بہت سے دشمنوں سے خطرات لاحق ہیں۔'' وہ بولا۔ ''بیرونی دشمنوں سے نمٹنے کے لیے تو میں بھی مدد میں شامل رہوں گا اور وی ماسٹرز سنڈیکیٹ اور ریڈ الرٹ بھی آپ کے ساتھ ہیں ہمیں۔ مراد کو ہندوستان علاج کے لیے باباصلاح الدین اجمیری کے ہاں لے جانا ہی ہوگا۔''

''لیکن ماسٹر! ماروی اور دانش نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تو ہے اور ہمیں ماروی کی روحانی طاقتوں پر بھروسا بھی ہے مگر موجودہ حالات بتا رہے ہیں کہ شیطانی قوتیں پینترے بدل کر اپنی طاقتوں کو ہمارے خلاف بارآور کرنے کے لیے ہر طرح سے کوشاں ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی اسی طرح ان کا جواب دینا چاہیے اور صرف ایک سورس پر تکیہ نہیں کرنا چاہیے۔''

اس کے مشورے کو سب نے تسلیم کیا۔ لہٰذا اسی وقت انڈین اعلیٰ حکام سے رابطہ کر کے اپنی آمد کے بارے میں آگاہ کیا گیا اور غایت بتائی۔ انہیں ایک دن انتظار کرنے کو کہا گیا۔ ریاست میں ایک بار پھر ایک میٹنگ کال کی گئی۔

''تاریک دنیا کے بارے میں ہمیں پتا چلانا ہوگا کہ وہاں اب کس کے ہاتھ میں کمان ہے؟''

وہ نہیں جانتے تھے کہ ماروی کو سب معلوم ہے مگر وہ بعض مجبوریوں کے باعث ابھی انہیں یہ بتانے سے قاصر تھی کہ وہاں اصل مہا شیطان ''خبلیس''...... جو خود کو مندوب شیطان کہتا ہے، وہی نمایاں ہے۔

ہمزاد بولا۔ ''وہاں تین ہی اہم شخصیات تھیں، لارا، آبنوس اور طاغوتا مگر ان کے برین واش کر دیے گئے ہیں، وہ کسی اور کو تو کیا، خود کو بھی پہچاننے سے قاصر ہیں۔ عذر بادہی

منظر عام پر آیا ہوا ہے جبکہ لارا ہنوز غائب ہے۔"

"ہماری ننھی ماروی...... ارض اسلام کی وہ واحد ہستی ہے جو تاریک دنیا میں آجا سکتی ہے۔" زیب النساء بولی۔

"لیکن پتا نہیں کیوں وہ کچھ بتانے سے قاصر رہتی ہے۔"

"تمہیں کیسے یہ بات معلوم ہوئی؟" ہمزاد نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے چونک کر پوچھا۔

"مجھے اپنے اندازوں سے کچھ ایسے اشارے ملے ہیں۔ چونکہ ہماری ننھی ماروی بھی اپنے بھائی عابی کی طرح ایک عجوبہ ہے، رگھوناتھ کالیا اور زویبی گوپتا کا حشر ہمارے سامنے ہے۔"

ماروی کو فوراً طلب کیا گیا۔ ہمزاد نے بڑی محبت اور شفقت سے اس کے سامنے یہ باتیں دہرا دیں۔ ماروی کی آنکھیں بھیگ گئیں، وہ اب فرفر ساری حقیقتیں بیان کرتی چلی گئی، جو پہلے باوجود کوشش کے نہ اگلی جا سکی تھیں۔

یہ سچ ہی تو ہے کہ اللہ نے ہر ہونی انہونی کا ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ کوئی بھی ہونے والی چیز اپنے وقت سے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ اب بھی یہی ہوا۔

اس نے بتایا کہ جلیس نامی ایک مہاشیطان اور اس کی محبوبہ ہاسی تارا اور عذربا ہی تاریک دنیا کی نئی ابھرنے والی وہ کالی طاقتیں ہیں جو عنقریب ارض اسلام پر حملہ کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں کیشورا کا ان کا زبردست اتحادی بننے والا ہے۔

ماروی کی زبانی یہ ساری حقیقتیں جان کر وہ سب متفکر ہو گئے، ریاست ارض اسلام کے خلاف شیطانی عزائم عروج پر تھے۔ عابی دنیا میں نہیں رہا تھا، مراد بستر علالت پر تھا۔

ہمزاد نے بہی خواہوں کے مشورے کے بعد مراد کے ساتھ خود جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

"بابا! میں اور دانش بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔"

ماروی نے کہا تو ہمزاد نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں بیٹی...! ان حالات میں تم دونوں کا ابھی ریاست میں ہونا ضروری ہے۔"

ہمزاد کی بات پر دونوں بہن بھائی خاموش ہو گئے مگر وہ جانتے تھے کہ وہ ساتھ جائیں نہ جائیں لیکن ان کے بہت قریب رہیں گے وہ دونوں......

وہ ہندوستان جانے کے لیے اپنی فوج اور دیگر سیکیورٹی اہلکاروں کی پلٹن تیار کرنے لگا ہمزاد گھاگھرا پلٹن سے بھی رابطے میں تھا کہ اسی رات ماروی کے علاوہ ہمزاد کو خواب میں بابا صلاح الدین اجمیری کی زیارت ہوگئی۔

وہ ایک سفید باریش ہالے کی صورت میں ہمزاد کو دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اس سے مخاطب تھے۔ ان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کچھ کہتے چلے گئے اور ہمزاد خاموشی سے سنتا رہا۔ صبح بیدار ہوا تو وہ عجیب و غریب کیفیات سے دوچار تھا۔

☆☆☆

تاریک دنیا کے لارا، آبنوس اور طاغوتا خالی الذہنی کے عالم میں تھے۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ وہ بت بنا دیے گئے ہیں۔ لارا کو البتہ فعال کیا گیا تھا مگر اس طرح کہ اس کی صرف یادداشت ختم کر دی گئی تھی۔ صرف اس کے بیٹے دانش کو رکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خیال خوانی کرنا تک بھول گئی تھی اور اس وقت راجر ہارڈی کی بیوی بن کر اس کے زیر تصرف تھی۔ البتہ شیطان نے کاہن کو بھی آبنوس اور طاغوتا جیسا بنا دیا تھا کیونکہ اس کے علم میں آیا تھا کہ وہ بھی ٹیلی پیتھی جانتا ہے اور اس...... کے کام آسکتا ہے۔ اس وقت وہ تینوں پاتال کی منحوس گہرائیوں کے ساتویں غار میں جلیس کے سامنے تھے اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔ جلیس اپنے لمبے سے چغے کا ایک دامن ہاتھ میں تھامے ہوئے آہستہ آہستہ ان کے سامنے لہرا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہاسی تارا کھڑی تھی۔ جلیس اپنے ان تینوں چیلوں پر کوئی عمل کر رہا تھا، اس کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں اور وہ بدہیئت ہونٹوں تلے دھیرے دھیرے کچھ بدبدانے میں بھی مصروف تھا۔

جیسے ہی جلیس نے اپنا یہ سارا عمل بند کیا اسی وقت تینوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"مہاشیطان جلیس نے تم تینوں کو ایک خاص وقت تک بے عمل رہنے کے بعد کچھ نئی شکتیوں کے ساتھ دوبارہ سدھ عطا کی ہے، تم تینوں پر لازم ہے کہ اس مہربانی پر جلیس کا شکر بجالاؤ......" ہاسی تارا نے کاہن آبنوس اور طاغوتا کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہمیں دوبارہ نئی شکتیوں کے ساتھ بیدار کرنے پر معظم جلیس کا ہم دل کی گہرائیوں سے شکر بجالاتے ہیں۔" تینوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"تم تینوں اسی وقت ہمارے ایلچی بن کر تبت کے لاما کیشورا کا کے پاس پہنچو اور اسے بتاؤ کہ ہمارا اتحادی بننے کے لیے مشترکہ دشمن کے خلاف جنگ میں ہمارا وہ کس حد تک ساتھ دینا پسند کرے گا؟" جلیس نے کہا۔

تینوں چیلے خیال خوانی کے ذریعے فوراً لاما کیشورا کا

کے دماغ میں جا پہنچے۔ یہ دیکھ کر ان تینوں کو ایک مسرت انگیز حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ اس سے پہلے کسی بڑی طاقت والے اجنبی کے دماغ میں گھسنے سے پہلے انہیں اس کی اجازت طلب کرنا پڑتی تھی مگر اس بار ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ گویا معظم جبلیس نے ان کی ٹیلی پیتھی کی قوت کو دو چند کر دیا تھا۔

لاما کیشورا کا کو خود بھی ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ اس وقت اپنی ماں ماتوراما کے ساتھ صلاح و مشورے کر کے فارغ ہوا تھا کہ اسے لگا جیسے کوئی اس کے دماغ میں گھس آیا ہو، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ یہاں اسے پہلی بار اپنی طاقت کی کمی کا جھٹکا لگا۔ اس نے بھاری اور رعب داب والی آواز میں پوچھا۔

''کون ہو تم لوگ؟ اور اس طرح زبردستی میرے دماغ میں کیوں اور کس طرح گھسے چلے آئے ہو......؟''

''ہم معظم جبلیس کا سلام لے کر تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں۔ قبول ہے تو ٹھیک، ورنہ ادھر سے ہی واپس چلے جاتے ہیں۔'' طاغوتا نے جواب دیا۔

جبلیس کا نام سنتے ہی لاما کیشورا کا کو خوشی محسوس ہوئی مگر باوجود اس کے وہ پریشانی کا شکار تھا کہ جبلیس کا یہ پیغام قبل از وقت تھا، کیوں؟ جبکہ اس کی ماں ماتوراما...... کے مطابق، جب تک وہ یعنی کیشورا کا ارض اسلام پر حملہ کرنے کا بگل نہیں بجاتا، جبلیس اس سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ جبلیس نے اس طرح زبردستی اپنے ان چیلوں کو اس کے دماغ میں گھسا کر اپنی طاقت دکھانا چاہی ہو......؟'' اس نے سوچا پھر اسے فراموش کر گیا اور تینوں چیلوں سے پہلے شکایتی لہجے میں بولا۔

''دوست تھے تو دوست بن کر تمہیں آنا چاہیے تھا، مجھ سے پہلے اجازت طلب کی جاتی۔''

''معظم جبلیس کو کسی سے اجازت کی ضرورت نہیں، ویسے بھی انہوں نے خیر سگالی اور دوستی کا پیغام بھیجا ہے آپ کو۔'' طاغوتا بولا۔ ''ہم نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔''

لاما کیشورا کا نے جو کہنا تھا کہہ دیا تھا۔ وہ اب مقصد کی بات پر آتے ہوئے ان سے خیر مقدمی انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں معظم جبلیس کا شکر بجا لاتا ہوں...... تم اس کا میرے پاس کیا پیغام لائے ہو؟''

''معظم جبلیس عنقریب ارض اسلام پر حملہ آور ہونے والے ہیں، انہیں اگرچہ کسی کے اتحاد کی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ خیر سگالی کے طور پر ایسا چاہتے ہیں کہ ارض اسلام

سگار

شوہر سفر سے اچانک گھر پہنچا تو دیکھا کہ میز پر رکھی ایش ٹرے میں سلگا ہوا سگار رکھا تھا۔ وہ بیوی پر برس پڑا۔ بہت دیر تک شوہر اور بیوی میں زبردست لڑائی ہوتی رہی۔ شوہر نے چلاتے ہوئے کہا۔

''سچ سچ بتاؤ، یہ سگار کہاں سے آیا؟'' کپڑوں کی الماری سے ایک لرزتی کانپتی ہوئی آواز آئی۔

''بنگلور سے!''

پر حملہ کرنے میں صرف ان کا ہی نام نہ آئے بلکہ اتحادیوں کا نام آنا بھی ضروری ہے، اسی لیے وہ آپ کے بعد فوراً یہودی اکابرین، سپر پاورز وغیرہ سے بھی اس سلسلے میں رابطہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' کابن نے کیشورا کا سے کہا۔

''ارض اسلام پر فتح اور مراد علی منگی کی شکست فاش کا کریڈٹ وہ آپ سمیت ان کے دشمنوں کو دینا چاہتے ہیں۔ یہ ان کا بڑا پن سمجھ لو۔'' آہنوس نے کہا۔

لاما کیشورا کا نے فوراً اس کی ہامی بھرلی۔ وہ تینوں اس کے دماغ سے چلے گئے۔

یہاں سے جبلیس کا آگے پیغام پہنچانے کے لیے یہ تینوں بٹ گئے۔ آہنوس نے کریگ ہوسٹن کی راہ لی، طاغوتا نے یہودی اعلیٰ حاکم کا رخ کیا، جبکہ کابن بن زیان کے دماغ میں جا پہنچا۔

''تم بھی ٹیلی پیتھی جانتے ہو؟ اس سے پہلے تو تم کبھی خیال خوانی کے ذریعے میرے پاس نہیں آئے، خیر...... فی الحال سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ اس آفت کی پرکالہ ماروی نے میرا جینا حرام کر ڈالا ہے، بڑی مشکلوں سے میں نے اس سے اپنی جان چھڑائی ہے۔ لارا ابھی اتنے دنوں سے نہیں نظر آ رہی ہے۔'' اس کو اپنے دماغ میں محسوس کرتے ہی اس نے کہا۔ اگرچہ اس نے مراد وغیرہ کی دشمنی سے بچنے کے لیے لارا کو اپنے اندر آنے سے منع کیا تھا مگر وہ اب اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔

دیگر چیلوں کی طرح کابن کو بھی ماروی کی کارستانیوں کا علم تھا۔ بن زیان کے حفاظتی حصار میں ہونے کے باوجود ماروی نے تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ بن زیان ٹیلی پیتھی جاننے والوں کی راہنمائی کیا کرتا تھا اور اس حوالے سے لارا وغیرہ کو بھی اس کی راہنمائی کی ضرورت پڑتی رہتی تھی مگر جب سے مہاشیطان جبلیس نے ان تینوں کا برین واش کرنے کے بعد ایک طرح سے ''اپ گریڈ'' کیا تھا اب انہیں کسی کی راہنمائی

کی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔
''فکر مت کرو...... عنقریب اسلامی ریاست ارض اسلام پر حملہ ہونے والا ہے۔ میں تمہیں یہی خوش خبری سنانے آیا تھا تاکہ تم بھی ہمارے اتحادی بن کر اس جنگ میں شریک ہو جاؤ۔ ان اتحادیوں میں دنیا کے ایک بڑے شیطانی ادارے ''دی کیچر'' کے سربراہ مسٹر راجر بارڈی بھی ہمارے ساتھ ہیں۔''

بن زیان کو کاہن کی بات پر کوئی حیرت نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ دشمن مراد اور عابی کے خلاف عرصے سے برسرِ پیکار تھے اور ارضِ اسلام پر دھاوا بولنے کی پلاننگ کرتے ہی رہتے تھے مگر اس بار اسے کاہن کا لہجہ بدلا ہوا ہی نہیں بلکہ کچھ حاکمانہ سا محسوس ہوا۔ اس نے بھی گہری سنجیدگی کے ساتھ اپنا سوال دہرا دیا۔

کاہن وغیرہ کو جہلیس کی طرف سے اس بات کی ممانعت تھی کہ وہ تینوں ماسوائے لاما کیشورا کا کے کسی اتحادی اکابر کو جہلیس کے بارے میں نہ بتائیں۔ اسی لیے کاہن نے بھی بن زیان کو گول سول سا ہی جواب دیا۔ وہ سابقہ لہجے میں بولا۔

''تمہیں آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے، ہماری تاریک دنیا کی طاقتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں مگر گھٹنے کا مطلب یہ ہرگز نہ لیا جائے کہ وہ کم ہوتی ہیں، بلکہ پہلے سے زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ہمیں بھی زیادہ کالی شکتیاں حاصل کرنے کے لیے عارضی طور پر گھٹا دیا گیا تھا۔''

''اب تم لوگوں کو ایسی کون سی بڑی شکتیاں حاصل ہو گئی ہیں؟ ذرا میں بھی تو سنوں؟'' بن زیان کے لہجے میں طنز تھا۔ جسے محسوس کر کے کاہن نے بدستور سپاٹ لہجے میں کہا۔

''میں نے تم سے جو کہنا تھا کہہ دیا، میں جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جانے لگا تو اچانک بن زیان کو خیال آیا کہ وہ غلطی کر رہا ہے۔ تاریک دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے، اسے واقعی کاہن کی نصیحت کے مطابق آم کھانے سے مطلب رکھنا چاہیے۔ وہ فوراً بولا۔

''رکو...... رکو...... پلیز......''

وہ ٹھہر گیا۔ وہ کچھ ملتجی لہجے میں اس سے بولا۔

''اگر تمہیں اور طاغوتا وغیرہ کو واقعی ایسی بڑی کالی شکتیاں حاصل ہو ہی گئی ہیں تو پلیز، میری کسی طرح سے ماروی سے تو جان چھڑا دو۔''

''عنقریب ان سب سے ہماری جان چھوٹنے والی ہے، بائے......'' وہ یہ کہہ کر اس کے دماغ سے چلا گیا۔

''کتے کا بچہ......!'' بن زیان غصے سے بڑبڑایا۔

ادھر آبنوس اور طاغوتا نے بھی جہلیس کا یہ خفیہ پیغام یہودی تنظیموں اور سپر پاورز سمیت مراد اور عابی کے دشمنوں تک پہنچا دیا تو وہاں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ وہ سمجھ گئے کہ یہی وہ مہاشکتی ہے جس نے عابی جیسے فولادی اور ناقابلِ تسخیر انسان کو دھول مٹی میں بدل دیا۔ گویا حملے سے پہلے ارض اسلام والوں کو ایک چتاؤنی دی ہے کہ اس بار ان کے مقابلے میں ایک بڑی طاقت ہے۔ لہٰذا انہوں نے بھی فوراً ہامی بھرلی تھی۔ وہ اب کھل کر مراد وغیرہ کے خلاف دشمنی پر اتر آئے تھے۔

☆☆☆

ماروی نے لاما کیشورا کا کے دماغ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تو ہوا بن کر دورانِ پرواز ہی اچانک اس کا سامنا ایک باریش بزرگ سے ہو گیا اور وہ ان کی جھلک پہچان کر ہی مودب ہو گئی۔

''واپس لوٹ جاؤ بیٹی! ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اپنے باپ کے پاس جاؤ۔'' ماروی اسی وقت آدھے راستے سے واپس ہو گئی۔ وہ ان کا اشارہ سمجھ گئی تھی کہ ضرور اس کے بابا مراد کے بارے میں کوئی خبر ہے...... لہٰذا وہ جب وہاں پہنچی تو اسے حقیقت کا علم ہو گیا۔

مراد بدستور بے ہوش تھا۔ ڈاکٹری اصطلاح کے مطابق وہ کوما میں تھا مگر ماروی کو باپ کے پاس پہنچتے ہی پردۂ غیب سے معلوم ہو گیا کہ مراد کو ہندوستان لے جانے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اس کے بیمار وجود کی شفا تبت کے ایک برفیلے غار ''گالان'' میں رکھ دی گئی ہے......

ریاست کے سربراہ کی شفایابی کی راہ پاتے ہی پورے ارض اسلام میں امید و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ماروی اور دانش کو بھی ان کے ساتھ جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

حفاظتی دستہ، ناسٹر کو بوبو کے ساتھی اور دیگر اتحادی ان کے ہمراہ ہو گئے۔ ایک بڑا سا جہاز چارٹرڈ کروایا گیا۔

ہمزاد نے مراد بن کر تبت کے دارالحکومت لہاسا میں اعلیٰ تبتی افسران سے رابطہ کر کے اپنی آمد کے بارے میں مطلع کیا۔ اسے فوراً اجازت نامہ مل گیا۔ چارٹرڈ جہاز اور دیگر ضروری انفارمیشن کے تبادلے کے بعد تمام تیاریاں مکمل کر لی گئیں اور بالآخر روانگی کا وقت آ پہنچا۔ ہمزاد نے بااعتماد وزیر کو ریاست کے معاملات سونپے۔

مراد کو ایک اسٹریچر پر ڈال کر جہاز میں سوار کرایا گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ لاغر اور ہوش سے

بیگانہ وجود بھی ایک ناقابلِ تسخیر قوتوں کا مالک تھا، ایک عالم جس سے لرزتا تھا۔ دشمن اس سے خوف زدہ ہو کر دشمنی بھول کر دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ آج وہی مراد علی منگی .... اس حالت میں تھا کہ ... دشمن خوش ہو رہے تھے ..... اپنے تو اسے دیکھ کر پورے جی جان سے کڑھ کر رہ جاتے تھے۔

امید اور تسلی کا بھی یہ کس قدر خوبصورت وتیرہ ہے کہ مایوسیوں کے اندھیاروں میں ایک ذرا سی ٹمٹماتی لو بھی زندگی کی لہر سی دوڑا دیتی ہے۔ اسی ایک لہر کے سہارے مراد کو ہزاروں میل دور تبت کے برفاب ویرانوں میں بھی یہ بغرض علاج کے لیے جایا جا رہا تھا۔

ادھر جلبیس نے فوراً اپنی محبوبہ ہاسی تارا کو ہدایت کر ڈالی۔ جو دراصل اس کی چیلی بھی تھی۔ ”فوراً لاما کیشور اکا کے پاس جاؤ اور اسے مطلع کرو کہ ہمارے دشمن نمبر ایک ...... اس وقت تبت کا سفر کیے ہوئے ہیں۔ خبردار! مراد کو گالان کے اس غار کے قریب بھی نہ پہنچنے دے، جہاں ہماری کالی شکتیاں بھی بیکار ہو جاتی ہیں۔“

جلبیس نے ہاسی تارا اور عذریاد کو الگ الگ کام سونپے ہوئے تھے۔

ہاسی تارا نے اسی وقت خیال خوانی کی پرواز کی اور لاما کیشور اکا کے دماغ پر خیال خوانی کی دستک دی۔ اپنا تعارف کرایا تو لاما کیشور اکا نے اسے اپنے دماغ میں آنے کی اجازت دے دی۔

جلبیس کا پیغام ہاسی تارا نے لاما کیشور اکا کو سنا دیا۔ جلبیس کا پیغام سن کر وہ ہاسی تارا سے بولا۔

”معظم جلبیس تو بے پناہ کالی شکتیوں کا مالک ہے، حیرت ہے وہ گالان کے اس پہاڑی غار کو تباہ نہیں کر سکتا......؟“

”ہمیں یہ اعتراف ہے کہ بعض روحانی قوتوں کے سامنے ہم بھی بے بس ہیں، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بالکل ہی کچھ نہیں کر سکتے۔ عالی کتنا طاقت ور بنتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کو انجام تک معظم جلبیس نے ہی پہنچایا، بس! ہماری کالی شکتیاں بھی ایک خاص حالات و مواقع سے متعلق ہوتی ہیں مگر اپنے علم سے جلبیس معظم نے اتنا تو پتا لگا لیا ہے کہ تم ان دونوں بہن بھائیوں کا راستہ روک سکتے ہو......“

”ٹھیک ہے، یہ خوشی کی بات ہے۔ میں ابھی کچھ کرتا ہوں۔“ لاما کیشور اکا نے جواب دیا۔

ہاسی تارا رخصت ہو گئی۔ لاما کیشور اکا سوچنے لگا۔

یہ اس کے لیے ایک بڑی خبر تھی۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ اتنی بڑی بات اس سے چھپی کیسے رہی تھی؟ مگر چھپی کہاں تھی؟ یہ تو ظاہر ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا یہ دوست کے دشمن سے جنگ کرنے کا سنہری موقع ہے۔ اس کا اپنے بھی خواہوں میں بڑا نام ہو جائے گا۔ سپر پاور زادران کی اعلیٰ قیادت اس کی احسان مند ہو جائے گی، جس طرح مراد کی ایک دنیا میں عزت، نام اور شہرت تھی، اس کی جگہ اب اس کی ہو جائے گی۔ وہ جہاں جائے گا، اپنے تبلیغی مشن کو بہ آسانی پورا کر سکے گا۔ تمام ممالک اس کی اپنے وطن آمد کو خوش نصیبی خیال کریں گے اور جھک جھک کر اس سے ملیں گے۔

وہ اسی قسم کے سہانے خواب بننے لگا اور اسی وقت اپنی خصوصی سواری پر گالان کی پہاڑی کی طرف روانہ ہونے کا ارادہ باندھنے لگا کہ اچانک اسے اپنی ماں ماتو راما کا خیال آ گیا۔

”بھلا اس معاملے میں ماں سے مشورہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ اس نے سوچا۔

”یہ تو میں خود بھی فیصلہ کر کے نمٹا سکتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد جب شام کے سائے برف زاروں میں جھکنے لگے تو اس نے اپنی سواری نکالی، جس .... میں چار موٹے تازے ”یاک“ جتے ہوئے تھے۔ اس ”یاک گاڑی“ میں ایک بڑا سا چوبی کیبن فٹ تھا، اس کے تین حصے تھے۔ ایک حصے میں خادم، دوسرے میں لاما کیشور اکا کے سونے کا انتظام تھا، جبکہ تیسرے میں بیٹھنے کی کشادہ جگہ تھی۔ یہ لاما کیشور اکا کی پر تعیش سواری تھی۔ دیکھنے میں قدیم طرز کی اس یاک گاڑی میں جدید سہولتیں موجود تھیں۔ ہیڈ لائٹس کے طور پر دو تیز بیم لائٹس نصب کی گئی تھیں۔ یاک گاڑی کو ایک بوڑھا کوچبان، خاصی تیز رفتاری سے دوڑاتا ہوا گالان کی پہاڑیوں کی طرف لیے جا رہا تھا۔

گالان کی پہاڑیوں کے قریب پہنچتے ہی اس غار کی تلاش شروع کر دی گئی۔ لاما کیشور اکا کو خود بھی اس بات کا تجسس تھا کہ آخر یہاں ایسا کون سا تارک الدنیا حکیم یا وید موجود تھا، جو مراد کا علاج کرنا چاہتا تھا۔ اگر یہ اپنے علاج میں کامیاب ہو گیا تو اس کی شہرت چہار دانگ پھیل جائے گی کیونکہ مراد کوئی معمولی شخصیت نہ تھا۔

پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو اس غار کی تلاش شروع کر دی گئی۔ پتا چلا یہاں تو ایسے برفیلے غاروں کی کمی نہ تھی۔ گویا ایک ڈھونڈو، ہزار ملتے کے مصداق، یہاں ان کی بہتات تھی۔

لاما کیشوراکا جھلا کر اپنی نشست گاہ والے حصے سے اٹھ کر دوسرے حصے میں آگیا۔ یہاں اس کا کرسٹل بال موجود تھا، وہ اسے ہر وقت اپنے قریب رکھتا تھا۔ اس نے فوراً یہ دریافت کرنے کے لیے اپنی ماں کو طلب کیا۔

''بے وقوف! تو منہ پھاڑ پنچے جھاڑ یہاں چلا آیا۔ مجھ سے پوچھا تو ہوتا۔'' بڑھیا ماتورا ما نے اسے جھڑکا۔ ''وہ غار تجھے اس طرح کبھی نہیں مل سکے گا۔ پہلے ان دونوں بہن بھائیوں (ماروی اور دانش) کو آنے دے اور یہاں وہ جس غار میں فروکش ہوں، وہی غار گالان کا ہوگا۔''

''گریٹ مدر! میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر اس غار میں ایسا کیا ہے، جس میں مراد کی شفا رکھی گئی ہے؟'' لاما کیشوراکا نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''بس! جو کہا ہے ابھی وہ کرو، اس کے بعد مجھے بتانا۔'' اس نے کہا اور چلی گئی۔

لاما کیشوراکا نے اپنے مختصر قافلے کو واپسی کا حکم دے ڈالا، البتہ اس نے کچھ جاسوس پہاڑیوں میں چھوڑ دیے کہ جیسے ہی وہ دونوں بہن بھائی یہاں پہنچیں اور جس غار میں ٹھہریں، اسے فوراً مطلع کردیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ ایسے وقت وہ دونوں نادیدہ نہیں رہیں گے۔

مگر کیشوراکا کو پھر بھی قرار نہ ملا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان دونوں کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی کچھ ایسے جنگی نوعیت کے انتظامات کرلے کہ وہ دوبارہ یہاں سے جا ہی نہ سکیں۔

ادھر دیگر دشمن طاقتیں بہ شمول شیطانی ادارے دی کپچر کا راجر ہارڈی اور جیلیس سمیت اس کے چیلے عذربادا اور ہاسٹی تارا بھی ماروی اور دانش کی راہ کا کانٹا بننے کی تیاری میں تھے۔ کریگ ہوسٹن اور بن زیان نے اپنے خفیہ لڑاکا گروپ تشکیل دے دیے تھے اور انہیں تبت روانہ کردیا گیا تھا۔ بہ ظاہر یہ لوگ سیکیورٹی کے لیے انتظامات کا ڈھونگ رچائے ہوئے تھے اور خیرسگالی کے جذبات کا بھی اظہار کررہے تھے کہ ہز ہائی نس مراد کو گالان کی پہاڑیوں میں شفا مل جائے۔

روشن دنیا والے آستین کے سانپوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ماروی اور دانش کو بھی پورا احساس تھا ان خدشات کا، جو ان کو اور ان کے بابا جانی کو لاحق تھے۔ ادھر ماسٹر کو یوبو نے بھی اپنے جاسوس چھوڑ رکھے تھے، ماسٹر... سٹریکٹ اور ریڈ الرٹ بھی ان کی ایک ہی کال پر ماروی اور دانش کی حفاظت کے لیے دوڑی چلی آئی تھیں، دنیا کے جس علاقے میں مراد وغیرہ کو ان کی ضرورت پڑتی، یہ دوڑی چلی آتی تھیں۔ یہی نہیں ان سے پہلے وہاں ان کی افواج، جاں نثاروں کے ہتھیار بدست ٹولے پہنچا دیے جاتے تھے۔

تبت کی طرف ایک پوشیدہ سی ہلچل مچ گئی تھی۔ سپر پاورز اور یہودی تنظیموں کے اکابرین درپردہ تبت کی حکومت کو ان لوگوں کی آمد کو... اپنے ملک میں خطرہ قرار دیتے ہوئے خوف زدہ کرنے کی کوشش کررہے تھے کہ ان کی آمد سے ان کے ملک کی سلامتی کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ جبکہ تبتی حکمران اعلیٰ ان... کی آمد کو اپنے وطن اور عوام کے لیے باعث فخر سمجھ رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر ریاست ارض اسلام کے حکمران مراد علی ہنگی کو ان کی سرزمین تبت سے شفا مل جاتی ہے تو یہ کم شہرت والی بات نہ ہوگی۔ تبتی حکمران خود بھی ارض اسلام کے ساتھ دوستانہ روابط رکھنا چاہتے تھے، کیونکہ انہیں ہمیشہ سے ہی بھارتی جارحیت کا خطرہ رہتا تھا اور ارض اسلام کے بھارت کے پڑوسی ملک پاکستان کے ساتھ بڑے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔

انہوں نے نہ صرف کھلے دل سے اجازت دے دی بلکہ ہر طرح سے مدد پہنچانے کا بھی عندیہ دے ڈالا۔

ہمزاد، ماروی اور دانش مراد کے ہمراہ لہاسا کے ائرپورٹ پر اترے تو وہاں ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا اور ان کی رہائش کا تو پہلے ہی بندوبست کردیا گیا تھا۔ وہ ایک سرکاری مہمان خانے کا گیسٹ ہاؤس تھا اور جس مقام پر تھا وہاں سے تھوڑی دور ایک کاٹیج تھا، جو اسنو کاٹیج کے نام سے موسوم تھا۔ وہ اکثر خالی رہتا تھا مگر اب وہاں پچھلے تین دنوں سے چار افراد نے قبضہ جما رکھا تھا۔ ان میں دو عورتیں اور دو مرد تھے، خود کو انہوں نے نیا نویلا شادی شدہ جوڑا ظاہر کیا تھا، جو ہنی مون منانے کے لیے ٹورسٹ کی حیثیت سے آیا ہوا تھا لیکن درحقیقت یہ کریگ ہوسٹن کے بھیجے ہوئے شوٹرز تھے۔ انہوں نے مراد کو نشانہ بنانا تھا۔

کریگ ہوسٹن نے بن زیان کے ذریعے ان چاروں کے دماغ لاک کروا لیے تھے، لہٰذا ان چاروں کی حیثیت اب روبوٹ سے زیادہ نہیں تھی، جن میں یہ پروگرام فیڈ کردیا گیا تھا کہ مراد کو نشانہ بنانا ہے۔

ادھر ماروی اور دانش بھی اپنے چھپے ہوئے دشمنوں کی خفیہ سازشوں سے بے خبر نہیں تھے۔ ماروی کو معلوم ہوچکا تھا کہ جہاں مدد ان کے ہمراہ تھی، وہیں دشمن اور شیطانی طاقتیں بھی ان کے جلو میں آستین کا سانپ بن کر کنڈلی مارے ہوئے تھیں، لہٰذا گیسٹ ہاؤس میں فروکش ہوتے ہی سب سے پہلے، ماروی اور دانش نے گیسٹ ہاؤس کے آس

پاس کی عمارتوں کا جائزہ لیا تو انہیں تھوڑی دور واقع وہ ’’اسنو کاٹیج‘‘ دکھائی دے گیا۔ جہاں وہ چاروں شوٹرز نئے شادی شدہ جوڑوں کی صورت میں فروکش تھے۔

اس سرکاری گیسٹ ہاؤس کے دور قریب جتنے بھی لوگ رہائش پذیر تھے، دونوں بہن بھائیوں نے باری باری ان کے دماغوں میں جاکر یہ تسلی کرلی تھی کہ ان میں کوئی ان کے باباجانی کا دشمن نہ تھا لیکن جب ماروی اور دانش نے اسنو کاٹیج کے ان چاروں مکینوں (شوٹرز) کے دماغوں میں گھسنے کی کوشش کی تو انہیں ناکامی ہوئی۔

دونوں بہن بھائی ٹھٹک گئے۔ انہیں اس بات کا یقینی حد تک شبہ ہوگیا کہ یہ چاروں ان کے باباجانی کے دشمن ہی ہوسکتے ہیں اور ان کے دماغوں کو لاکڈ کردیا گیا ہے۔

’’ان دونوں کو فوراً سے پیشتر موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے۔‘‘ دانش نے بہن کو مشورہ دیا، وہ نفی میں سرہلاتے ہوئے بولی۔

’’نہیں بھائی! یہ دونوں تو بے چارے حکم کے غلام ہیں، انہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ کس کو اور کیوں ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ کسی کو بے گناہ جان سے مارنے کے میں حق میں نہیں ہوں۔‘‘

’’مگر آپی! ان چاروں نے باباجانی کو مارنے کا ناپاک عزم کررکھا ہے۔‘‘ دانش بولا۔

’’ٹھیک ہے، ہم دونوں ان کا راستہ کھوٹا تو کرسکتے ہیں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے ماروی اسے سمجھانے لگی اور دانش مطمئن ہو کے اپنے سر کو اثباتی جنبش دینے لگا۔ ماروی نے ... ماسٹر کو بوبوا اور اپنے دیگر حفاظتی دستوں کو خطرات سے باخبر کردیا۔ ماسٹر کے شوٹرز اور دیگر بہی خواہ فوراً حرکت میں آگئے تھے۔

☆☆☆

وہ سب اس وقت گالان کی طرف سفر کی تیاری باندھ رہے تھے۔ تبت کے برف زاروں میں گالان کی پہاڑیوں کے اس دشوار گزار سفر کو پاٹنے کے لیے خصوصی سواری کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ ایک پانچ ہزار ہارس پاور کی چوڑے اور مخصوص اونچے ٹائروں والی ٹربو پاور جیپ تھی، جسے خاص برف پر چلنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس میں پانچ افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی...... دو سیٹیں تو آگے تھیں، جبکہ درمیان میں لیٹنے کے لیے ایک برتھ نما اسٹریچر رکھنے کی جگہ بنائی گئی تھی، جس طرح ایمبولینس میں ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد تین افراد کے بیٹھنے کے لیے سیٹیں نصب کی گئی تھیں۔

یہ جیپ باہر بالکل تیار کھڑی تھی۔ جیپ کے ساتھ دو کاریں بھی تھیں، جس میں مسلح افراد کا ٹولا مستعدی کے ساتھ موجود تھا۔ ماسٹر سنڈیکیٹ اور ریڈ الرٹ کی پوری فوج بھی اپنی چار عدد اسپیشل گاڑیوں میں موجود تھی۔

یہ قافلہ گالان کی پہاڑیوں کی طرف سفر کی تیاری میں تھا۔ دانش اور ماروی، مراد کو لے کر سرکاری گیسٹ ہاؤس سے نکلے تو ادھر اسنو کاٹیج میں کریگ ہوسٹن کے بھیجے ہوئے شوٹرز بھی فوراً حرکت میں آگئے۔ وہ نے لپک کر اس کھڑکی کے قریب آکر پوزیشن سنبھال لی تھی، جدھر سرکاری گیسٹ ہاؤس کا گیٹ تھا اور وہاں سے یہ دونوں بہن بھائی کچھ ہی دیر میں مراد کو لے کر باہر آنے والے تھے، جبکہ باقی اسنائپر بہ دست شوٹرز اوپری منزل سے اس احاطے کو کور کرنے لگے تھے، جدھر سے ان کو گزر کر مراد سمیت اپنی جیپ میں سوار ہونا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کسی وجہ سے مراد پہلے دو شوٹرز کی گولیوں سے بچ جاتا تو دوسری کھڑکی کی طرف پوزیشنیں سنبھالے ہوئے وہ شوٹرز ان کا کام تمام کرڈالتے۔ اگرچہ اس کے امکانات کم ہی تھے، تاہم احتیاطی طور پر یہ تدبیر کی گئی تھی۔

پہلے دو شوٹرز نے اپنی آنکھیں اسنائپرز کی ٹیلی اسکوپ کے ساتھ لگادی تھیں۔ کراس پیش کرنے والے گول عدسے میں گیسٹ ہاؤس کا دروازہ نظر آرہا تھا، جو بند تھا۔ جب کھلا تو اس کے اندر سے مراد برآمد ہوا، جو اسٹریچر پر لیٹا ہوا تھا۔ دانش ہمراہ تھا مگر بہن غائب تھی، انہیں اچنبھا تو ہوا مگر انہوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی کہ ممکن ہے وہ کسی وجہ سے بعد میں برآمد ہو اور ابھی اس سنہری موقعے کو ضائع تو نہیں کرنا چاہیے مگر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے دانش بھی غائب ہوچکا تھا۔ اب صرف دیگر بہی خواہ اسٹریچر کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے۔

مذکورہ دونوں شوٹرز نے اپنی سانسیں تک روک کر انگلیاں لبلبی پر رکھ دیں اور ٹھیک اسی وقت جب وہ مراد کے سر کا نشانہ لے کر لبلبی پر اپنی انگلی کو متحرک کرنے لگے تھے، ایک زوردار ہوا کا جھونکا کھڑکی سے اندر آیا اور ان کو ہلادیا۔ وہ چونکے، ابھی کچھ سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ اچانک ایک جھٹکے .... سے دونوں دروازے اس قدر زوردار آواز میں بج کر بند ہوئے کہ دونوں شوٹرز کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ وہ الٹے قدموں پلٹ کر لڑکھڑا گئے اور اپنا توازن بھی برقرار نہ رکھ سکے۔ گنز ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر اس طرح گر کر ان کے سینے پر آن لگی

تھیں کہ ان کی نالوں کا رخ ان کے چہروں کی طرف ہو گیا تھا۔ ان دونوں کی خوف سے گھگی بندھ گئی۔ وہ حلق کے بل چیخنے لگے۔ یہ شاخسانہ ماروی کا تھا، جوان کے لاکڈ دماغ میں تو داخل نہیں ہوسکی تھی البتہ اپنے یقین کی حد تک شبہے کے بل بوتے پر وہ ان کی نگرانی ضرور کررہی تھی پھر ان کے عزائم کا پتا چلتے ہی اس نے ہوا کا ایک غضب ناک جھونکا بن کران کے ہوش اڑادیے اور فرش بوس کرڈالا تھا۔

وہ انہیں اسی طرح نظر آئے بغیر باتھ روم تک لے گئی اور وہاں لے جاکر باہر سے دروازہ بند کردیا۔ دوسری کھڑکی کے پاس پوزیشنیں سنبھالے کھڑے باقی دو شوٹرز نے بھی اس شور شرابے کی آواز سن لی تھی' وہ چونک کر اپنے ساتھیوں کی خبر لینے کو لپکے تو وہاں دانش ان کی ''خبر'' لینے کو تیار بیٹھا تھا۔ اس نے اس کمرے کا دروازہ دھڑ سے بند کردیا۔ ماروی ان کو نظر نہیں آرہی تھی مگر دانش کی وہ جھلک دیکھ چکے تھے جو انہیں ایک نوعمر شرارتی بچے کی صورت میں دکھائی دیا تھا۔ وہ دونوں چیخ مار کر اس کی طرف دوڑے، وہ یہی سمجھے تھے کہ یہ کوئی شیطان بچہ تھا جو نہ جانے کیسے ان کے کاٹیج میں گھس آیا تھا۔ ان دونوں نے جوش میں آکر دروازے کو دھکا دینا چاہا۔ وہ یہی سمجھے تھے کہ دروازہ ضرور باہر سے بند کردیا گیا ہوگا، ان کے زوردار دھکے سے کھل جائے گا مگر وہ تو باہر سے پہلے ہی کھلا ہوا تھا، دونوں ہی اپنی جھونک میں دروازے سے ٹکرا کر باہر فرش پر آن گرے۔ گنیں ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں' پاس چھپے کھڑے دانش نے فوراً پھرتی سے لپک کر گنیں اٹھالیں۔ ایک تو اس نے پرے پھینک دی جبکہ دوسری اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام کر اس کی نال کا رخ ان دونوں کی طرف کردیا۔

''خبردار...... اگر تم نے ذرا سی بھی حرکت کی تو میں بے دریغ گولی چلادوں گا۔'' دانش نے ان کو للکارا۔ دونوں متحیر ہوئے پھر پریشان۔ وہ اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ بچہ جان بوجھ کر ان کے ساتھ کوئی شرارت کررہا ہے۔ لہٰذا ساتھی شوٹر لڑکی نے اس کی طرف جارحانہ انداز میں قدم بڑھائے۔

''ٹھائیں......'' گولی چلی اور شوٹر لڑکی کے حلق سے چیخ بلند ہوئی۔ وہ اپنا گھٹنا پکڑ کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی اور مارے تکلیف کے کراہنے لگی۔ اس کا مرد ساتھی ہکا بکا رہ گیا۔ دانش جیسے نوعمر لڑکے کی یہ کارستانی دیکھ کر اسے شبہ ہونے لگا کہ یہ کوئی معمولی لڑکا نہیں اور مزید یہ کہ اس کا یہاں آنے کا کوئی مقصد ہے۔ وہ محتاط ہوگیا۔

''کون ہو تم اور میری ساتھی کو کیوں زخمی کیا ہے تم نے؟'' اس نے کڑک کے کہا تو دانش نے اپنی گن سے ایک اور فائر کردیا۔ شوٹر مرد بھی حلق کے بل چیخ کر گرا۔ اس کی بھی ایک ٹانگ گولی لگنے سے زخمی ہوگئی تھی۔ دانش پھر نہیں رکا۔ دروازہ کھول کر اس کمرے میں آگیا جہاں اس کی بہن ماروی کھڑکی سے باہر ذرا دور گیسٹ ہاؤس کی طرف تکتے جارہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب اطمینان تھا۔ وہ ہولے سے زیرلب بڑبڑائی۔

''میرے پیارے بابا جانی! اللہ آپ کو جلد شفا عطا فرمائے...... آمین۔''

''آمین۔'' قریب کھڑے دانش کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا۔ ماروی اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی...... اس کے بعد دونوں وہاں سے غائب ہوکر اسٹریچر کے قریب حاضر ہوگئے۔

ادھر مراد کو نہیں معلوم تھا کہ اس پر کیا قیامت ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی تھی۔ اگرچہ اسے خود اپنا ہی ہوش نہ تھا۔ دانش اور ماروی اسے جیپ میں سوار کروا کے روانہ ہوگئے۔ باقی گاڑیاں بھی ساتھ روانہ ہوگئیں۔

تبتی حکومت نے اپنی طرف سے بھی ان کی سیکیورٹی کا بندوبست کررکھا تھا۔ سفر کئی گھنٹے جاری رہنے کے بعد ''لہاسا'' کے نواح میں اس مقام پر پہنچا جہاں سے گالان کی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ وہاں سے یہ قافلہ دوسری سمت کو بڑھا اور دو ڈھائی گھنٹوں کے دشوار گزار سفر کے بعد گالان کے دامن میں اس مقام پر پہنچ کر رک گیا جہاں وہ غار تھا جو بابا صلاح الدین اجمیری نے ماروی کو خواب میں دکھایا تھا۔ ماروی نے اس غار کا جائزہ لیا۔ دن کی روشنی میں بھی وہ غار اندر سے تاریک نظر آتا تھا۔

مراد کا اسٹریچر ابھی جیپ سے نہیں اتارا گیا تھا۔ پہلے ماروی خود اندر جاکر' اس کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہتی تھی۔ اگرچہ اسے اطمینان تھا کہ اس کے اندر بابا جانی کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا کیونکہ بابا صلاح الدین صاحب کا دکھایا ہوا غار تھا لیکن پھر بھی ماروی پہلے خود اندر جاکر دیکھنا چاہتی تھی۔

ماروی کے ساتھ تین چابک دست خادم تیز لائٹیں لے کر اندر داخل ہوگئے مگر تینوں خادموں نے ابھی غار کے اندر پاؤں رکھا ہی تھا کہ وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئے، انہیں یوں لگا جیسے ان کے جسم میں اچانک آگ بھڑک اٹھی ہو جبکہ ماروی بڑے آرام سے اندر داخل ہوگئی تھی۔ خادموں کی اس حالت پر ماروی کو تو نہیں البتہ دیگر سب کو حیرت ہوئی

تھی۔ سمجھ لیا گیا کہ اس کے اندر صرف ماروی اور مراد ہی جاسکتے تھے۔ حتیٰ کہ دانش نے بھی باپ کے ساتھ اندر داخل ہونے کی کوشش چاہی، تو اس کا پاؤں بھی جلنے کے قریب ہو گیا تھا۔ وہ یک دم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ بہرکیف...... ماروی ہاتھ میں ایک طاقت ور بیٹری ٹارچ لیے اندر چلی گئی۔

غار سیدھا نہیں تھا، بل کھاتا ہوا تھا۔ اس کی چھت بھی خاصی نیچی تھی۔ اس کی دیواروں اور محراب نما چھت سے برف، سورج کی روشنی میں پگھل کر بہتی ہوئی، جم کریوں تاثر پیش کرنے لگی تھی جیسے تیز دھار نیزے اور بھالے نوک کے بل جھول رہے ہوں۔ ماروی ان سے بچتی بچاتی مختلف تنگ سے موڑ کاٹتی، تقریباً بیس پچیس قدم چلنے کے بعد رک گئی۔ یہاں غار ختم ہوتا تھا۔ سامنے برف کی دیوار تھی۔ غار کا فرش بھی گویا برف کی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ ماروی کو وہاں بہ ظاہر کوئی خاص قابلِ ذکر بات نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ کھڑی سوچنے لگی کہ بھلا یہاں باباجانی کے لیے کون سی شفا رکھی گئی تھی؟ جبکہ یہاں تو کوئی موجود بھی نہیں ہے۔

بہرکیف...... وہ پلٹی اور غار سے باہر آگئی۔ اس نے خادموں کو حکم دیا کہ جیپ سے باباجانی کا اسٹریچر اتارا جائے۔

ایک بار پھر خدام ڈرتے ڈرتے اسٹریچر اٹھا کر غار سے اندر لے جانے لگے تو ان کی دوبارہ وہی حالت ہوئی۔ اب پریشانی ہوگئی کہ کیا ماروی کو اکیلے ہی اپنے باباجانی کا اسٹریچر اٹھا کر اندر لے جانا پڑے گا؟ یہی کرنا پڑتا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بالآخر ماروی نے اکیلے ہی باپ کا اسٹریچر سنبھال لیا اور اسے گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی۔ یہاں تک کہ وہ ہانپ گئی اور غار کے انتہائی سرے پر پہنچ کر رک گئی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ آیا ادھر ہی ڈیرا ڈال کر باپ کے پاس غار میں تارک الدنیا ہو کر بیٹھ رہے؟ ماروی ابھی اسی کشمکش و پیچ کا شکار تھی کہ اچانک غار میں ایک شناسا سی پُرجلالی آواز ابھری۔

''واپس پلٹ جاؤ......''

باباصلاح الدین کی آواز پہچان کر ماروی مطمئن ہو کر پلٹی اور جب غار کے دہانے سے باہر نکلی تو بری طرح ٹھٹک کر رک گئی......

☆☆☆

لاما کیشورا کا کی ہدایت پر اس کے جاسوسوں نے فوراً عمل کیا تھا۔ وہ دور سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہے

سنہری باتیں

☆ دعا کبھی بھی بیکار نہیں جاتی البتہ قبول ہونے کی صورتیں مختلف ہیں۔

☆ آپ جنہیں بے وقوف سمجھ رہے ہیں، دراصل وہ آپ کی حرکتیں نظرانداز کر رہے ہوتے ہیں۔

☆ جہاں جاؤ خوشیاں چھوڑ آؤ تاکہ لوگ تمہیں یاد رکھیں۔

☆ اہم ہونا خوب صورت ہے، خوب صورت ہونا اہم نہیں۔

☆ جس طرح کئی بادلوں میں پانی نہیں ہوتا اسی طرح بعض خوب صورت لوگوں میں خوب صورتی نہیں ہوتی۔

☆ ہر مشکل میں صبر اور نماز کا سہارا پکڑو۔

☆ زبان ایک ایسا درندہ ہے کہ اگر اس کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو عجب نہیں کہ تمہیں بھی پھاڑ کھائے۔

☆ انسان کی زبان دل کی ترجمان ہے اور چہرہ دل کا آئینہ ہے۔

☆ جس چیز کا علم نہیں اسے زبان سے مت کہو۔ جس چیز کی ضرورت نہیں اس کی جستجو مت کرو۔ جو راستہ معلوم نہ ہو اس پر سفر مت کرو۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بفل ہزارہ

مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں ایک زمانے میں مجلس قانون ساز کے رکن تھے۔ اسمبلی کا اجلاس شملا میں ہو رہا تھا۔ مولانا اس میں شرکت کی غرض سے شملا گئے تو خان بہادر پیرزادہ ذکاء اللہ خان کی کوٹھی میں قیام پذیر ہوئے۔ ایک دن پیرزادہ صاحب نے مولانا سے فرمائش کی کہ ان کی تعریف میں بھی کچھ لکھ دیا جائے۔ مولانا نے فی البدیہہ ایک رباعی لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کر دی۔

بجو جمال سادہ ہوں سرشار بادہ ہوں
دونوں پہ حق میرا ہے کہ میں پیرزادہ ہوں
تہذیب مغربی کہ نہ ڈاڑھی ہے نہ مونچھ
صورت بتا رہی ہے کہ نر ہوں نہ مادہ ہوں

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، چونگ، لاہور

تھے۔ ایک مختصر قافلہ جو بڑی بڑی بھاری گاڑیوں پر مشتمل تھا، آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ محدود فاصلے سے ان کا تعاقب کرتے ہوئے گالان کے مطلوبہ غار تک پہنچے تھے۔ گویا اب لاما کیشوراکا کے جاسوسوں نے مراد کے قافلے کا تعاقب کرکے اپنا مقصد پالیا تھا۔

دونوں جاسوسوں نے لاما کیشوراکا کے کانوں تک جیسے ہی یہ بات پہنچائی، وہ ایک بار اسی شان سے اپنی یاک گاڑی لیے روانہ ہوگیا۔ اس غار کی نشاندہی کرنے کے لیے دونوں جاسوس بھی ساتھ تھے جو اوپر والے حصے میں ایک بڑے سے چوبی تختے پر بوڑھے تمی کوچبان کے ساتھ بیٹھے تھے۔

یاک گاڑی کے مخصوص پہیے برف پر پھسلے جارہے تھے اور وہ دوڑ رہی تھی۔ لاما کیشوراکا اپنی نشست گاہ والے حصے میں براجمان تھا اور کھڑکی سے باہر دور تک پھیلے ویران برف زاروں کا نظارہ کرنے میں محو تھا۔ اس کے چہرے سے جوش مترشح تھا۔

جلد ہی یاک گاڑی ان دونوں جاسوسوں کی نشاندہی پر اس مقام کے قریب جا پہنچی جہاں وہ غار تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں نظر آرہا تھا، یہ سب گاڑی سے نیچے اترے اور پھٹی پھٹی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ وہ غار انہیں دکھائی نہیں دیا۔ لاما کیشوراکا نے غصے سے ان دونوں جاسوسوں کی طرف دیکھا اور قہر بار لہجے میں ان سے بولا۔

''بدبختو! ادھر تو مجھے کوئی غار دکھائی نہیں دے رہا ہے۔''

دونوں جاسوس بری طرح پریشان اور شپٹائے ہوئے تھے۔ وہ حواس باختہ سے انداز میں گردوپیش پر نظر ڈالنے لگے مگر انہیں وہاں کوئی غار نظر نہیں آیا۔ انہوں نے اچھی طرح آس پاس گھوم پھر کر بھی دیکھ لیا مگر وہ غار نہیں ملا۔

''کہیں تم دونوں کو کوئی مغالطہ تو نہیں ہوا ہے؟'' لاما کیشوراکا نے ان دونوں جاسوسوں کی طرف گھور کر پوچھا۔

دونوں نفی میں اپنا سر ہلا کر جواباً بولے۔

''ہرگز نہیں، ہم دھوکا کھا سکتے ہیں نہ ہی کوئی غلطی کرسکتے ہیں، وہ غار اسی مقام پر تھا۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے ماروی کو اپنے باپ کا اسٹریچر اندر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

دونوں جاسوسوں کے یقین بھرے لہجے نے لاما کیشوراکا کو کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ وہ ان دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ اپنے کام میں ماہر تھے اور آج تک انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ تیزی سے یاک گاڑی میں سوار ہوا اور کرسٹل بال کے سامنے آبیٹھا۔ زیرلب کچھ بڑبڑا کر بال پر پھونکا اور تب ہی وہاں ماتو زاما کا چہرہ متحرک نظر آنے لگا۔

''گریٹ مدر! وہ غار مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ حالانکہ میں ٹھیک اسی مقام پر اس وقت موجود ہوں۔ کیا اس میں کوئی روشن دنیا والوں کی کرامت ہے؟'' اس نے ماں سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں پہلی بار بے بسی کی جھلک ہویدا تھی۔

''تو ٹھیک سمجھا ہے فرزند!'' بالآخر ماتو زاما نے جواب دیا۔ ''وہ غار دشمنوں کی نظروں سے اوجھل کردیا گیا ہے۔ وہ اب کسی کو نظر نہیں آسکتا۔''

اس کی بات پر کیشوراکا پریشان ہوگیا۔ اسی لہجے میں بولا۔

''لیکن گریٹ مدر! میں پھر کس طرح ان دونوں آفت کے پرکالے بہن بھائیوں کا یہ منصوبہ ناکامی سے دوچار کرسکتا ہوں؟''

''جبلیس سے رابطہ کرو۔ اس کے پاس اس کا ضرور کوئی حل موجود ہوگا۔''

جبلیس سے رابطے کے لیے لاما کیشوراکا کو پہلے کاہن سے بات کرنا پڑتی تھی۔ اگرچہ اس کی جبلیس سے براہ راست پہلی بار گفتگو ہونے والی تھی۔ ٹیلی فون پر وہ ہامبی تارا سے بولا۔

''مجھے اسی وقت معظم جبلیس سے بات کرنی ہے۔''

''کس سلسلے میں؟'' ہامبی تارا نے پوچھا۔ لاما کیشوراکا کو اس کا انداز پسند نہ آیا۔ وہ بھی خود کو کم نہیں سمجھتا تھا اس لیے دانت پیس کر بولا۔

''میں نے ان سے اسی سلسلے میں بات کرنی ہے، جس کے لیے معظم جبلیس نے تمہیں میری طرف بھیجا تھا۔''

ہامبی تارا نے بھی ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ ''کوئی مسئلہ ہوا ہے تو مجھے کہہ دو، میں ان سے بات کرکے تمہیں بتادوں گی۔ وہ براہ راست ابھی باہر کی دنیا کے کسی فرد سے بات نہیں کرتے۔''

لاما کیشوراکا کو جبلیس کی اس سرچڑھی ہامبی تارا کا یہ جواب انتہائی ناگوار گزرا۔ اس نے مزید کچھ کہے بغیر غصے کے اظہار کے طور پر رابطہ ہی منقطع کردیا اور غصے سے بھناتا ہوا ساتھیوں کو واپس معبد کی طرف چلنے کا کہا۔

☆☆☆


Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !
i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.
All Done
Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

ماروی سامنے کا منظر دیکھ کر چونک گئی تھی۔

یہ غار کے باہر کا وہ منظر ہرگز نہیں لگتا تھا، جہاں ان کے ساتھی اور جاں نثار گاڑیوں میں موجود تھے، بلکہ یہاں تو کوئی ذی نفس تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تب ہی اچانک ماروی کی آنکھوں نے ایک اور منظر دیکھا۔ یہ بالکل ویسا ہی منظر تھا جو اسے خاص مواقع پر مگر کبھی کبھی صرف اسے ہی نظر آتا تھا۔ وہ بابا صلاح الدین اجمیری کی درگاہ کا منظر تھا۔ اس نے دیکھا کہ باباصاحب کے آستانے کے بالکل سامنے ایک اسٹریچر رکھا ہوا ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی اسٹریچر تھا جس پر اس کے باباجانی کو لٹایا گیا تھا مگر ایک بات تشویش کی حد تک چونکا دینے والی تھی کہ وہ اسٹریچر خالی تھا۔ وہاں اس کے باباجانی کا لاغر وجود نظر نہیں آتا تھا۔ وہ حیران و پریشان سی ہو گئی۔

''کیا ہوا آپی.....! تم رک کیوں گئیں؟ آؤ نا، گاڑی میں بیٹھتے ہیں، ہماری واپسی کا انتظار ہو رہا ہے۔'' دانش نے ماروی کو اس طرح رکتے پا کر بڑی محبت سے کہا۔

''شاید ہمارے باباجانی کی شفا انہی ویران برف زاروں میں لکھی گئی ہے اور..... ہمیں یہاں سے چلے جانے کا حکم ملا ہے۔'' دانش کا لہجہ غمگین اور افسردہ خاطر ہو رہا تھا۔

ماروی کی باطنی آنکھیں جو منظر دیکھ رہی تھیں، وہ ابھی اس کا بھائی دانش دیکھنے سے قاصر تھا وہ بہت دھیرے سے بھائی سے بولی۔

''بھائی.....! تم چلو، مجھے ادھر ہی رکنے کا حکم ملا ہے۔''

بہن کے میکانکی اندازِ گفتگو نے دانش کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ اس نے بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھا، بہن کی نگاہیں اسے کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز محسوس ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھا اور جیپ میں سوار ہو گیا۔ ماروی اب کسی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

کریگ ہوسٹن اور بن زیان بڑی بے چینی کے ساتھ اس خبر کے منتظر تھے جو انہیں مراد کی ہلاکت اور اس کے صاحبِ فراش حالت میں بے خانماں و بربادی سے متعلق ملنے والی تھی۔ وہ خود ایک دوسرے سے بار بار ٹیلی فونک رابطوں کے ذریعے اس سلسلے میں پوچھ رہے تھے۔

کریگ ہوسٹن تو کسی حد تک مطمئن تھا مگر بن زیان خاصا فکر مند تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر مراد نہیں مرا اور بھلا چنگا ہو گیا تو اس کی اپنی شامت بھی دور نہیں۔

سپر پاور اور یہودی تنظیموں نے اس خبر کے انتظار میں اپنے سیکرٹ ایجنٹ چھوڑ رکھے تھے مگر ابھی تک کوئی ایسی خبر ان تک نہیں پہنچی تھی جس پر یہ لوگ مل کر جشن مناتے۔

''فکر مت کرو بن زیان! اچھی خبر جلد ہی سننے کو ملے گی۔'' کریگ ہوسٹن نے بن زیان سے ازراہِ تشفی کہا۔ ''تاریک دنیا والوں نے ارضِ اسلام کے اس حکمران کی موت کا تبت کے ان ویران برف زاروں میں پکا بندوبست کر رکھا ہے۔''

''لیکن مجھے تو لگتا ہے کہ وہ لوگ اپنے کسی روحانی پیش رو کے اشارے پر وہاں گئے ہیں۔'' بن زیان نے کہا۔

''تاریک دنیا والے روشن چہروں کے ساتھ ہی دھوکا دیتے ہیں! عالی کی مثال کیوں بھول رہے ہو تم؟ شیطانی طاقتوں نے اسے دھول کر ڈالا!'' کریگ ہوسٹن نے یاد دلایا۔ وہ کچھ زیادہ ہی خوش فہمی میں جتا نظر آتا تھا۔ آگے بولا۔ ''تم دیکھتے جاؤ آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ کالی دنیا کی ناپاک گہرائیوں سے ابھرنے والے اس مہاشیطان خبلیس نے لگتا ہے باپ سمیت اس کی بیٹی ماروی کو بھی فنا کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اور وہ لامحدود مہا کالی شکتیوں کا مالک ہے۔''

بن زیان کی پھر بھی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

کریگ ہوسٹن فتح سے پہلے، فتح کے جشن سے چور ہو رہا تھا اور پینے پلانے میں مگن تھا کہ اچانک ملنے والی اطلاع نے اس کا سارا نشہ ہرن کر دیا۔ وہ اطلاع اس کے بھیجے ہوئے ماہر اور انتہائی تربیت یافتہ شوٹرز کی بری طرح ناکامی کی تھی۔ اسے اول تو اس خبر پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح خود کلامیہ انداز میں چیخ کر بولا۔

''ناممکن..... ی..... ی..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مراد..... ان حالات میں آسان شکار ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ سب اس وقت مراد کی بیماری میں الجھے ہوئے تھے۔ میں ابھی پتا کرتا ہوں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

وہ پاگل پن کی حد تک پریشان ہو گیا تھا۔ اسے اپنے ان چاروں ماہر شوٹرز پر پورا اعتماد تھا۔ اس نے ٹیلی پیتھی جاننے والوں کے ذریعے پتا چلا لیا کہ یہ کارستانی ماروی کے سوا اور کسی کی نہیں تھی۔

تاہم اس نے اسی وقت مختلف بھیس میں، تبت روانہ کیے ہوئے اپنے کچھ سیکرٹ ایجنٹوں سے رابطہ کیا اور مراد وغیرہ سے متعلق تازہ ترین معلومات حاصل کیں تو اسے پتا چلا کہ مراد کو گالان کے اس مطلوبہ پہاڑی غار تک لے جانے کا منصوبہ کامیاب ہو چکا ہے اور اب صرف وہاں سے

دانش واپس سرکاری گیسٹ ہاؤس میں لوٹ آیا ہے۔ تاہم وہ خاصا افسردہ دکھائی دیتا ہے مگر مایوس نہیں ہے۔

کریگ ہوسٹن کو کچھ تسلی ہوئی، اس لیے نہیں کہ مراد کا بیٹا دانش اسے بہ غرضِ شفا گالان کے غار تک پہنچانے میں کامیاب ہوچکا تھا بلکہ اس بات پر وہ قدرے مطمئن اور... خوش نظر آرہا تھا کہ وہ جلیس کی چال میں آچکا تھا۔

کریگ ہوسٹن کی اس خوش فہمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ روشن دنیا والوں کے روحانی پیش رو بابا صلاح الدین اجمیری کا آستانہ ہندوستان میں تھا اور اس کے مطابق مراد کو شفایابی کے سلسلے میں سب سے پہلے وہیں پر لے جانا چاہیے تھا مگر دور دراز تبت جیسے خطۂ برفاب میں مراد کو لے جانے میں اُسے مراد کے دشمنوں ہی کی کارستانی لگتی تھی اور وہ اب خاموشی سے کسی ''خوش خبری'' جیسی اطلاع کا منتظر تھا مگر اپنے تربیت یافتہ شوٹرز کا انجام دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا تھا اور اسے اب بن زیان کی یہ بات درست محسوس ہونے لگی تھی کہ مراد کو یقیناً اپنے روحانی پیش رو کے اشارے پر ہی تبت لے جایا گیا ہوگا اور اب وہ دن شاید دور نہیں جب مراد بھی اپنے بیٹے عابی کی طرح دوبارہ ''ون مین آرمی'' بن کر ابھرے گا اور ان سب کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دے گا کیونکہ یہ کہا جارہا تھا کہ اس بار مراد کی شفایابی، اس کی روحانی قوتوں اور امدادِ غیبی کی تفویضات کا ثمر ہوگی ورنہ مراد کی بیماری اور گالان کے اس دور دراز غار میں اسے لانے کا کیا بہانہ اور کیا راز تھا......؟

وہ یہ سوچ کر بری طرح خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے پورا ایک کمانڈو گروپ تشکیل دیا۔ یہ سات انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز کا گروپ تھا جو یہودی آرمی ''ریڈ پاور'' سے تعلق رکھتا تھا۔ ان میں دو ٹیلی پیتھی جاننے والوں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ یہ موسی گا اور رونڈا تھے۔ ان دونوں کو خصوصی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ماروی کو ٹارگٹ کریں۔

مذکورہ اقدامات اٹھانے کے بعد وہ کچھ مطمئن ہوا تھا۔

☆☆☆

تاریک دنیا کی منحوس گہرائیوں میں محبوس جلیس...... خاصا جھلایا ہوا تھا۔ لاما کیشورا کا اس کے لیے بے کار ثابت ہوا تھا۔ خود وہ کھل کے ابھی سامنے نہیں آنا چاہ رہا تھا پاتال میں بیٹھا ڈوری ہلا رہا تھا۔ اس کی محبوبہ ہاسی تارا نے اسے بتایا تھا کہ لاما کیشورا کا نے اسے فون کیا تھا، وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا، ایک ہی درخواست تھی اس کی کہ وہ مدد کا خواہاں تھا، میں سمجھ گئی تھی کہ وہ اپنے مشن میں بری طرح ناکام ہوگیا ہے۔ اس نے بھی غصے سے رابطہ منقطع کردیا تھا۔

''ناکامی کی صورت میں وہ اور کر بھی کیا سکتا ہے۔'' جلیس نے متکبرانہ انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ بالکل بے کار نہیں ہوا ہے۔ روشن دنیا کے جتنے بھی دشمن ہیں وہ سب ہمارے دوست ہیں۔ تم اسی وقت اس کے معبد خانے میں جاکر اسے مناؤ اور اسے میرا ایک راہنما پیغام بھی پہنچاؤ۔''

یہ کہتے ہوئے جلیس نے اسے کچھ بتایا اور ہاسی تارا اسی وقت لاما کیشورا کا کے معبد خانے میں ایک خوب صورت داسی بن کر جا پہنچی۔ اس بار وہ اس کے دماغ کے ذریعے داخل نہیں ہوئی تھی۔ اس میں بھی ظاہر ہے کہ جلیس کی ہی ہدایات کا دخل تھا۔

لاما کیشورا کا سے اس نے اپنا تعارف کروایا تو وہ پہلے تو بھڑک اٹھا مگر پھر کچھ سمجھ کر دھیما پڑ گیا۔ اس کی طرف دیکھ کر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

''تمہارا معظم جلیس کیسا دوست ہے ہمارا؟ ہم سے بات تک کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اور جب خود ہم سے اس نے بات کرنا ہو تو بڑے دھڑلے سے تمہیں زبردستی ہمارے دماغ میں پہنچا دیتا ہے تو کبھی داسی کے روپ میں سیدھا ہمارے معبد خانے میں بھیج دیتا ہے۔''

ہاسی تارا..... جیسا کہ مذکور ہوا جلیس نے روپ بدلنے کی صلاحیت دے رکھی تھی اور وہ اس وقت اپنے اصل روپ کے بجائے ایک خوبصورت تبتی پہاڑی دوشیزہ کے روپ میں وہاں آئی ہوئی تھی۔ ایک دلنشیں مسکراہٹ سے بولی۔

''جلیس معظم کا یہی طریقہ کار ہے مگر وہ اپنے دوستوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ ہاں اگر تم واقعی ناراض ہو تو پھر میں واپس چلی جاتی ہوں۔'' ہاسی تارا نے آخر میں مکاری سے کہا تو کیشورا کا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ مجھے درحقیقت جلیس معظم سے مراد وغیرہ کے سلسلے میں ایک مدد لینا تھی۔ میرے جاسوسوں نے ان کا ٹھکانا ڈھونڈ نکالا تھا مگر عین وقت پر وہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئے تھے۔ لگتا تو یہی ہے کہ ہمارے مقابلے میں روشن دنیا والوں کا علم زیادہ طاقت ور ہے۔'' اس نے آخر میں جلیس کی محبوبہ کو جوش دلایا تو وہ بولی۔

''ایسی بات ہرگز نہیں ہے، جنگ میں کبھی جیت تو کبھی

مات ہوتی رہتی ہے۔ میں تمہاری مدد کو ہی آئی ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ روشن دنیا والوں کی ایک بڑی روحانی طاقت مدد کررہی ہے مگر ہمیں بھی دھوکا فریب دینے کی پوری صلاحیت حاصل ہے۔ میں ابھی جارہی ہوں۔ تم میرا انتظار کرو اور کسی جلد بازی کا مظاہرہ مت کرنا ورنہ مارے ..... جاؤ گے۔" وہ یہ کہہ کر لوٹ گئی۔

بات واضح تھی جو لاما کیشوراکا کی سمجھ میں آتی تھی، اسی لیے وہ خوش اور مطمئن تھا کہ خبلیس اس کی مدد میں پیش پیش تھا۔

کالی دنیا والے اس مختص و مقدس کیے گئے غار کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے تھے، جس میں مراد کے بیمار وجود کو ایک خاص عرصے کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ لاما کیشوراکا اور دیگر دشمن غار کے اندر داخل ہو سکتے تھے مگر اسے تلاش کرنا ان کے بس کی تو کیا سردست کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

ہابی تارا دانش کے پاس سرکاری گیسٹ ہاؤس جا پہنچی۔ وہ اس وقت رات کو سونے کی تیاری کررہا تھا۔ ماحول میں خواب ناکی کا اثر غالب تھا۔ باہر تیز بارش ہورہی تھی اور موسم خاصا سرد ہورہا تھا۔

ہابی تارا نے پہلے ایک خادمہ کے روپ میں کھانے کے دوران اسے کوئی نشہ آور شے پلادی اور پھر جب وہ اپنے نرم گرم آرام دہ بستر پر جاکر لیٹا تو اسے بے چینی سی نیند محسوس ہونے لگی۔ بے چینی اس لیے کہ وہ گہری نیند نہیں سو پارہا تھا، بس نیم غنودہ سا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا اور باقی اندھیرے کا راج تھا۔

ہابی تارا نے اس کی ماں لارا کا بہروپ بدلا اور پھر اس کے بیڈ کے بالکل قریب آگئی۔ یہی نہیں وہ اس کے بیڈ پر، اس کے بالکل پاس بیٹھ گئی پھر اس پر جھکی اور دھیرے دھیرے دانش کی پیشانی اور اس کے سر کے بال سہلانے لگی، پھر اپنا نرم و نازک ہاتھ اور مخروطی انگلیاں اس کے سینے پر پھیرنے لگی۔ یہی وہ وقت تھا جب دانش نے اپنی نیم باز سی نیند سے بوجھل آنکھیں وا کیں اور اسے اپنے سامنے ماں کا مہربان چہرہ دکھائی دیا۔ پہلے تو وہ غیر یقینی انداز میں اپنی آنکھیں بار بار جھپکانے لگا۔ اس کے بعد بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"مام! کک...... کیا یہ واقعی تم ہی ہو یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟"

تب ہابی تارا نے اس کی ماں لارا کے روپ اور آواز میں نہایت ہی ملائمت آمیزی اور ممتا بھرے لہجے میں کہا۔

"میرے بچے! کیا تم چاہتے ہو کہ یہ خواب ٹوٹ جائے؟"

"نہیں مام! میں چاہتا ہوں تم اسی طرح میرے پاس...... میرے قریب بیٹھی رہو...... مگر......" وہ اٹکنے لگا تو ہابی تارا مکاری سے بولی۔

"تو پھر بس! اسی طرح لیٹے رہو اور مجھ سے باتیں کرتے رہو۔" ہابی تارا نے اسی محبت سے کہا جو دانش اپنے وجود میں بھی اس کے لیے محسوس کررہا تھا۔

"آپ شیطان کی پوجا چھوڑ دیں نا...... مام! تاکہ ہمارے بیچ، ایک ماں بیٹے کے بیچ...... بار بار اس طویل جدائی کا خاتمہ ہوسکے۔" دانش نے رسانیت سے کہا، وہ کچھ ممتا کے جذبات کی پیاس اور کچھ دوا کے زیر اثر نیم غنودہ سی آواز میں بولا۔

"شیطان اور اس کے چیلوں کو فنا ہے، مگر اللہ جل شانہ واحد ہستی ہے جو سدا قائم رہنے والی ذات ہے۔ صرف اسی وحدہ لاشریک کی بندگی میں پناہ ہے۔"

ہابی تارا کو دانش کی یہ بات بری طرح کھلی تھی مگر اس نے لارا جیسا ممتا بھرا برتاؤ اپنائے رکھنا تھا، بولی۔

"میرے بچے! کتنی بار تجھ سے کہا ہے، ایسا میرے لیے ممکن نہیں۔ تو ہی نہیں تیری بہن ماروی بھی مجھے کئی بار یہ سب کہہ چکی ہے۔ میں شیطان معظم اور کالی طاقتوں کی پوجا نہیں چھوڑ سکتی۔ بس ایک وعدہ کرو اگر تم چاہتے ہو یہ سلسلہ چلتا رہے، اسے راز میں رکھنا کہ میں تم سے ملنے آتی ہوں، ورنہ یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔" مکار اور چلتر باز ہابی تارا نے ماں (لارا) کے روپ میں دانش کو جذباتی بلیک میل کیا، کیونکہ وہ اس کی بہن ماروی سے خائف تھی۔

دانش نے وعدہ کیا مگر یہ بھی کہا۔ "مام! میں آپی کو نہ بھی بتاؤں کہ تم مجھ سے ملنے آئی تھیں، تو پھر بھی اسے پتا چل جائے گا کہ کچھ ہوا ہے۔"

اس کی بات سن کر ہابی تارا اپنی نصف کامیابی پر نہال ہوگئی کہ دانش اب اس نہج پر سوچنے لگا ہے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے دل میں اپنی ماں کے لیے اب بھی کس قدر محبت تھی، اسی سبب تو لارا اب تک نورانی طاقتوں کے عذاب سے بچی ہوئی تھی، ورنہ کب کی فنا کے گھاٹ اتاری جاچکی ہوتی۔ یہ دانش ہی تھا، جس کی وجہ سے نیک دنیا

والوں نے لارا کو ڈھیل دے رکھی تھی، اس امید پر بھی کہ شاید وہ راہ راست پر آجائے۔ بیٹے کی محبت سے مجبور ہوکر ہی سہی..... مگر یہاں کالی طاقتیں، دانش کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش میں تھیں۔

ہاسی تارا ممتا بھرے انداز میں دانش کی ایک بار پھر پیشانی چوم کر محبت سے بولی۔

''تم اجازت دو تو میں تمہارے دماغ کو ماروی کی طرف سے لاکڈ کر ڈالوں؟ پھر وہ تمہارے اور میرے بیچ ان ملاقاتوں کا کبھی سراغ نہیں لگا سکے گی۔'' اس کی بات پر دانش سوچ میں پڑ گیا۔ دوا کے زیر اثر وہ زیادہ گہرائی سے نہ سوچ پایا اور فوراً سر ہلا کر اثباتی جنبش دی اور اپنی آنکھیں موند کر ذہن اور دماغ کو خالی چھوڑ دیا۔ دانش کے جس خانائے نہاں میں ہاسی تارا ہمیشہ کے لیے قبضہ جمانا چاہتی تھی، وہ اسے حاصل ہو گیا تھا۔

دانش اس کے قبضہ گرفت میں آچکا تھا۔ وہ اپنی اس بڑی کامیابی پر مسرور تھی، اسی وقت اپنی تاریک دنیا کی شیطانی عبادت گاہ میں پہنچی اور خبلیس کے سامنے بڑے تفاخر کے ساتھ دوزانو ہوئی۔

''اے پاتال کی منحوس گہرائیوں اور ارض وسما کے درمیان بھٹکے ہوئے ہولناک خلاؤں کے شہنشاہ مندوب شیطان، معظم خبلیس..... ! تمہاری یہ ادنیٰ کنڈل داسی نے آج ایک بہت بڑا معرکہ سر کیا ہے میں نیک دنیا کے ایک اہم باسی اور فرماں روا ارض اسلام دانش پر پوری طرح قابض ہو چکی ہوں۔''

شیطانی مجسمے کے اندر حرکت پیدا ہوئی اور پھر جیسے کسی ہمزاد کی طرح ایک اور مجسمہ تحلیلی انداز میں نکل کر پہلے والے مجسمے کے ساتھ استادہ ہو گیا اور تب ہی اس کی دہشت کردہ شکل دصورت بن گئی۔

خبلیس..... اب اپنی اصل شکل میں تھا۔ اس کے موٹے اور بھدے ہونٹوں پہ بدہیبت سی مسکراہٹ تھی۔ وہ توصیفی لہجے میں اپنی محبوبہ نما چیلی سے بولا۔

''تم نے واقعی ایک ایسے وقت میں اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، جب ریاست ارض اسلام ایک انتہائی نازک وقت سے گزر رہا ہے۔ ابھی نیک دنیا کے باسی اپنے فرماں روا عابی کی موت کا غم نہیں بھولے تھے کہ ان کے حکمراں کی علالت ناگہانی کا انہیں زخم سہنا پڑا، ایسے میں اب ان کے آخری فرماں روا..... دانش کو بھی تم نے اپنے شیطانی سحر میں جکڑ کر دشمنوں کو تہری چوٹ دی ہے۔ بولو..... کیا انعام چاہیے تمہیں.....؟''

ہاسی تارا اپنی تعریف پر نہال ہو گئی۔ رقص کے انداز کا ایک اسٹیپ دکھا کر خبلیس سے اک ادا کے ساتھ بولی۔

''معظم خبلیس! اس کنڈل داسی کے لیے آپ کی تعریف ہی انعام ہے، بس! مجھے آپ خود سے دور مت کیجیے گا، آپ کا دل لبھاتے رہنا ہی میری خوشی ہے اور یوں بھی یہ ساری شیطانی عقل وخرد آپ ہی کی تو دین ہے۔''

''ہم نے تو اپنے دوستوں کو آج تک خود سے دور نہیں کیا ہے تو پھر بھلا تمہیں کیوں دور کریں گے۔ تم ہمارے معبد کی خاص الخاص مکینوں میں سے ہو لیکن، ہم نے تمہارے دل میں ابھرنے والی خفیہ خواہش کو پڑھ لیا ہے۔ آج سے تم عذرباد کے لیے اور وہ تمہارے لیے آزاد ہے اس کے ساتھ رہو اور مجھ سے تم دونوں جو مانگتے رہو وہ تمہیں بلا تاخیر ملتا رہے گا۔ جاؤ..... دونوں مل کر دشمنوں کی تباہی کا جشن مناؤ۔''

ہاسی تارا فوراً عذرباد کے پاس حاضر ہوئی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا مگر ہاسی تارا کی نشاط انگیز قربت کے سمندر میں وہ بھی ڈوب گیا، جب طوفانِ بدتمیزی تھما تو ہاسی تارا نے اپنے نئے ''چلتر'' کی کامیابی اور خبلیس کی ''عنایت'' سے اسے آگاہ کر دیا۔

ہاسی تارا کا خیال تھا کہ عذرباد یہ سن کر اسے ایک بار پھر اپنے ساتھ لپٹا لے گا مگر ہوا اس کے بالکل برعکس۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ ہاسی تارا کے گال پر جڑ دیا۔ وہ ہک بک سی، اسے تکتی رہ گئی..... منہ سے کچھ برآمد ہی نہ ہو سکا۔ غیر متوقع صورت حال میں بھی انسان کو اس طرح کا سکتہ ہو جایا کرتا ہے۔ وہ اپنے ہوش وحواس میں رہتا ہے مگر گنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔

''یہ تم نے کیا بے وقوفی کر ڈالی ہے، نادان عورت؟'' عذرباد غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ہاسی تارا کے حسن وشباب کا سارا نشہ ہرن ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ آگے بولا۔

''تم نے میری ساری پلاننگ برباد کر دی، مجھ سے مشورہ تو کر لیا ہوتا یہ کرنے سے پہلے..... بس! معظم خبلیس کے سامنے تم ہر وقت تمبر بنانے کے چکروں میں رہتی ہو۔''

''لل..... لیکن معظم خبلیس..... نے تو مجھے اس کام پر انعام.....''

''شٹ اپ۔'' عذرباد چیخا۔

''تم نہیں جانتی ہو کہ میں نے ریاست ارض اسلام کے قلعے کی مضبوطی کو توڑنے کے لیے راجر ہارڈی کے ساتھ

کیسا جامع اور گہرا منصوبہ بنایا تھا اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا اور مزید یہ کہ لارا اب میرے ایک شیطانی عمل کے زیرِ اثر ہے۔''

پھر اس نے اپنے منصوبے کی صراحت سے ہامبی تارا کو آگاہ کرتے ہوئے بتادیا کہ وہ کس طرح کملی گانتا کی خفیہ رہائش گاہ پہنچا تھا، جہاں لارا، زومبی گانتا کی لاش والے کمرے میں ایک زندہ لاش کی شکل قید تھی اور راجر ہارڈی کی خواہش کے بدلے میں اس نے ایک معاہدہ طے کیا تھا کہ لارا مسز ہارڈی بنادی جائے گی...... مگر اس کی ٹیلی پیتھی کی صلاحیتوں کو وہ خود استعمال میں لائے گا، نیز لارا کو اپنا تابع بنا کر وہ اسے اس کے بیٹے دانش کو بلف کرنے کی سعی چاہے گا۔ وہ بیٹے سے یہی کہے گی کہ شیطان سے تائب ہو کر اب نیک زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ یوں دانش اسے (لارا کو) ارضِ اسلام کی عظیم یونیورسٹی میں لے جاتا اور لارا کے اندر رہتے ہوئے، عذرباد ارضِ اسلام میں گھسنے کی کوشش کرے گا کیونکہ وہ خود سے اندر جانے سے قاصر ہے۔

''مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ دانش کیونکر ماں کی اس بات پر اعتبار کر لے گا؟ اور پھر ماروی بھی تو ہے؟''

ہامبی تارا نے اس کے بہ ظاہر بے داغ منصوبے میں سقم نکالنے کی کوشش چاہی تو اس پر وہ پھر دانت پیس کر بولا۔

''دل کرتا ہے اب ایک تھپڑ اور رسید کروں تمہیں...... تم یہ بتاؤ، تم جب اس کی ماں لارا کے بھیس میں دانش کے پاس گئی تھیں تو اس نے تم پر کیسے اتنی جلدی بھروسا کر لیا تھا؟ بے وقوف! دانش کا ماں کے لیے اور ماں کا اپنے بیٹے کے لیے دل دھڑکتا ہے یہی وجہ ہے کہ لارا اب تک مراد اور ماروی سمیت اپنے طاقت ور دشمنوں سے بچی ہوئی ہے، ورنہ کب کی ختم کی جاچکی ہوتی...... اور میں ماروی کو نہیں بھولا ہوا ہوں، اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم نے دوا کے ذریعے دانش کے ساتھ جو گل کھلانے کی کوشش کی ہے، وہ بھی بے کار ثابت ہوئی، اس لیے کہ ماروی کو شبہ ہو جائے گا کہ دانش کے پاس اس کی اصل ماں نہیں، بلکہ ایک ''ڈمی مدر'' بھیجی گئی تھی۔ یوں دانش اور بھی محتاط ہو جائے گا۔ جبکہ میرے منصوبے میں کوئی سقم نہ تھا۔ لارا، اصل میں ہی لارا بن کے دانش کے پاس جائے گی، تاکہ ماروی بھی اسے دانش کی اصل ماں کی حیثیت سے اچھی طرح پہچان لے اور اس کی باتوں میں وہ بھی آجائے گی کہ لارا یہی کہے گی کہ وہ اب تائب ہو چکی ہے۔''

ہامبی تارا نے جب اپنے محبوب نمبر دو کی یہ بات سنی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تاہم وہ ایک موہوم سے احساس تلے کمزور سی آواز میں بولی۔

''لیکن میں نے دانش ہی سے اجازت لے کر اس کا دماغ اس کی بہن ماروی کی طرف سے لاکڈ کر دیا ہے، تاکہ وہ میرے بارے میں ماروی کو کوئی معلومات نہ دے سکے اور نہ ہی ماروی اس سے میرے متعلق کچھ جان سکے...... یوں بھی اگر...... میں غلطی پر تھی تو پھر معظم جھلیس نے مجھے انعام......''

''یہ انعام کا پہاڑا بھول جاؤ اب بے وقوف عورت!'' عذرباد اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''جھلیس کے لیے ہمیشہ وہ سب باتیں حوصلہ افزا ہوتی ہیں، جن سے اس کے چیلے نیک انسانوں کو بھٹکاتے رہے ہیں، اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم نے شیطان کے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے ہی یہ سب کیا ہے۔ اس لیے وہ تمہاری حوصلہ افزائی کیسے نہیں کرے گا۔''

یہ سب سننے کے بعد ہامبی تارا نے عذرباد کے پاؤں پکڑ لیے۔

''میرے محبوب! مجھ سے واقعی غلطی ہوئی ہے۔ اب میں تمہارے مشورے اور تمہیں بتائے بغیر کوئی عمل نہیں کروں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔'' مگر عذرباد بری طرح بھنایا ہوا تھا، تب ہی جھلیس نے اس کے اندر آکر کہا۔

''ہامبی تارا کو معاف کر دو...... یہ غلطی پر ضرور تھی مگر اس نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ ہماری روش یہ چلی تھی، اس سے روگرداں تو نہیں ہوئی۔'' یہ کہہ کر جھلیس چلا گیا۔

عذرباد نے ایک گہری ہمکاری لی، وہ شیطان اور مندوب شیطان جھلیس کی ان منطقوں سے واقف تھا۔ اس نے جھک کر ہامبی تارا کو تھام لیا اور اس کا ایک بھرپور بوسہ لے کر اسے معاف کر دیا اور ساتھ ہی مزید ہدایات دینے لگا۔

☆☆☆

شیطانی ادارے کا سربراہ...... ہارڈی، لارا کو پا کر بہت مسرور تھا۔ وہ تھی بھی اسی قدر حسین مگر اصل میں وہ اس کے شیطانی منصوبوں کی ایک پٹڑی تھی جس پر اس نے سفر کرنا تھا۔ اب اسے ایک ٹکٹ میں دو مزے مل رہے تھے۔ لارا کے پُرشباب بدن کی رعنائی اور اپنے شیطانی منصوبوں کی سہل پائی۔

عذرباد کے ساتھ اس نے جو معاہدہ کیا تھا، وہ اس پر

آئندہ بھی کاربند رہنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے اسی کے مطابق لارا کو عذر یاد کے حوالے کیا اور اس نے اسے خیال خوانی کے ذریعے اپنا تابع بنا کر دانش کے پاس بھیج دیا۔

اب پتا نہیں لارا کی یہ اپنی ہی بدقسمتی تھی یا پھر خوش قسمتی کہ وہ اپنی ہی شیطانی قوتوں کے بیچ نہ صرف سینڈوچ بن چکی تھی، بلکہ کھلونا بھی......

جس وقت وہ اپنے بیٹے دانش کے پاس بھیجی جانے والی تھی، اس سے کچھ دیر پہلے ماروی تبت کے یخ بستہ ویرانے میں گالان کے غار کے اندر اپنے سامنے ایک مرگ چھالا سے بستر پر اپنے باپ مراد کو لیٹا دیکھ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کب تک یہاں بیٹھے رہنا تھا مگر اسے حکم تھا کہ وہ ادھر ہی رہے گی اور غار کے اندر قدم رکھنے اور رکنے کی صلاحتیں صرف اسی کو تفویض کی گئی تھیں، اس کے علاوہ اور کوئی یہاں نہیں رہ سکتا تھا، اگرچہ دانش کی بھی ازحد خواہش یہی تھی کہ وہ بھی یہاں باپ اور بہن کے ساتھ اس وقت تک موجود رہے جب تک ان کی زیارت شرمسار نہیں ہو جاتی اور ان کے باپ کو شفا نہیں مل جاتی لیکن دانش کو اس کی ممانعت تھی اسی لیے وہ .... لہاسا کے گیسٹ ہاؤس میں واپس جانے پر مجبور تھا۔

ماروی کو اپنی روحانی طاقتوں کے بل بوتے پر اس بات کا علم تھا کہ یہاں برقاب ویرانے میں ان کا ایک طاقت ور دشمن لاما کیشورا کا موجود تھا اور وہ زبردست شیطانی قوتوں کا ہی مالک نہ تھا۔ بلکہ اسے ابلیس کی آشیرباد بھی حاصل تھی۔ یہی نہیں عنقریب اور بھی دشمن یہاں کا رخ کرنے والے تھے، گویا اس کے باپ کی زندگی ہر طرف سے خطرے سے دوچار تھی۔ یہ تسلی اپنی جگہ کہ کالی طاقتوں والے اور ٹیلی پیتھی کے کوئی بھی ماہر دشمن اس غار تک نہیں پہنچ سکتے تھے لیکن باوصف اس کے جانے کیوں اس کا دل گھبرانے لگا۔ حالانکہ وہ ایک بہادر لڑکی تھی اور آج تک کبھی دشمنوں سے خوف زدہ نہیں ہوئی تھی لیکن جانے کیا بات تھی کہ جب سے اپنے مرد آہن بھائی عابی کو مرتے دیکھا تھا، وہ اندر سے کچھ ٹوٹ چکی تھی، اگرچہ اپنے بھائی کی موت سے پہلے ہی اسے اپنی روحانی قوتوں سے کچھ ایسے اشارے ملے تھے کہ اب اس کا بھائی ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والا ہے۔ مشیت ایزدی اسی میں تھی، وہ کیا کرتے؟ اب مشیت ایزدی کیا کہنے والی تھی، وہ نہیں جانتی تھی مگر اس نے غار میں رہتے ہوئے دن رات اللہ کے حضور عبادتیں

کی تھیں اور کر رہی تھی کہ اس کے بابا کی جان بچ جائے اور وہ دستِ قضا سے ہی نہیں، اپنے دشمنوں سے بھی محفوظ رہیں۔ ایک امید تو قوی تھی جب اسے روحانی اشارہ ملا تھا کہ مراد کو گالان کے برف پوش علاقے میں لے جانا ہے، کیونکہ وہیں اس کی شفا رکھی ہوئی ہے مگر وہیں ایک مصلحت ایزدی بھی ہے، دنیا کو دکھانا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنے کسی پیارے کی جان بچانے کی خاطر کس طرح دور دراز کا سفر کرتا ہے مگر قضا وہاں بھی پہنچ جاتی ہے۔

''اے اللہ! ہمیں اور میرے بابا کو اس آزمائش سے بچانا.....'' ماروی گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگی اور تب ہی اس نے بابا صلاح الدین اجمیری کا تصور کیا تو اچانک خودبخود اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، شاید اسے کوئی خواب دکھایا جانے والا تھا اور وہ جب عالم خواب میں پہنچی تو اس نے دیکھا دو انسانی ہیولے جو بے ڈھنگے سے تھے، ہاتھوں میں خطرناک اسلحہ لیے دندناتے ہوئے غار کے اندر داخل ... ہوئے اور پھر انہوں نے اندھا دھند دونوں باپ بیٹی پر فائرنگ کر دی، تب ہی ماروی چیخ مار کر بیدار ہو گئی۔

اس نے اپنے اس خواب پر غور کیا۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ کوئی ایسا دشمن ہے جو اس غار کے اندر داخل ہونے کی سکت رکھتا ہے۔ وہ اس سے آگے زیادہ نہ سوچ سکی تھی کہ ایسا کیوں تھا؟ جبکہ کسی بھی دشمن کو گالان کے اس غار تک پہنچنے کی قدرت حاصل نہ تھی تو پھر ایسا کیوں تھا؟ اس لیے کہ وہ مشیتِ ایزدی اور قدرتی حکمتوں کا ادراک کرنے لگی تھی۔ اس نے فوراً اس دشمن کے تدارک کا سوچنا شروع کر دیا اور اسی وقت غار سے باہر نکل آئی۔ جانتی تھی کہ وہ دو دشمن کہیں آس پاس قریب ہی تھے۔

اس وقت گالان غار کے باہر یخ بستہ ویرانوں میں ٹھٹھرتی ہوئی شام اترنے لگی تھی۔ یہاں سے دور جنوب مشرقی سمت پر ایک اونچے برفیلے پہاڑی چبوترے پر واقع کیشورا کا کی خانقاہ کا مخروطی مینار کسی داچ ٹاور کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اندر اپنے خاص کمرے میں وہ کرسٹل بال کے سامنے بیٹھا اپنی گریٹ مدر ماتو راما کے ساتھ محو گفتگو تھا۔

''گریٹ مام! یہ تیرے بیٹے کی کیسی بے بسی ہے کہ اس کا ایک بڑا دشمن یہاں موجود، موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے اور میں بے بس ہوں۔ کیا میری طاقتوں میں، میری عبادتوں میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟ کیا میں نے ہمالیہ اور افریقا کے گھنے جنگلوں میں عظیم یوگا ماں کی عبادتوں میں کوئی کمی کر دی ہے، جس کا ہمارا خاندان برسوں سے پجاری رہ چکا ہے؟ بتا گریٹ

ماما! میں کیا کروں؟ کیسے اپنی ناک کے نیچے موجود دشمن اور اس کی بیٹی کو موت و فنا کے گھاٹ اتاروں؟''

کرسٹل بال کے اندر اسی مکروہ صورت بڑھیا کا طوطے کی چونچ والے ناک کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ آنکھوں کی لکیریں واضح تھیں۔ پھر اس کے پتلے پتلے بدہیئت ہونٹ متحرک ہوئے اور ماتوراما کی خباثت سے بھرپور آواز ابھری۔

''فرزند ارجمند! اس میں سارا تیرا قصور بھی نہیں ہے اور نہ ہی صرف تو ہی بے بس ہے۔ اس روئے زمین پر موجود ان روشن دنیا والوں کے سارے ہی دشمن بے بس ہیں، حتیٰ کہ تاریک دنیا کی کالی طاقتیں بھی مگر یہ سب عارضی بے بسی ہے اور وہ سب جانتے ہیں۔ حیرت ہے تجھے ابھی تک اس کا ادراک کیوں نہ ہوسکا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے شیطانی دنیا کے خبلیس کے ساتھ وہ خاطر خواہ رویہ اختیار نہیں کیا جس کا میں تجھے بار بار مشورہ بھی دیتی رہی تھی۔''

''خبلیس میرے سلسلے میں بہت مغروری برتتا چلا آرہا ہے گریٹ مدر!'' لاما کیشورا کا نے شکایتی لہجے میں جواب دیا۔ ''حتیٰ کہ اس کے چیلے بھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔''

''وہ حق بجانب ہیں میرے فرزند کیشو!......'' ماں نے کپکپاتے لہجے میں اعتراف کیا۔ ''اس لیے کہ اس کے جو بھی کرتوت ہوں گے ان کا فائدہ تمہیں ہی ہوگا۔ تم اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتے، میرے بچے! تمہیں خبلیس کے سامنے ہی نہیں بلکہ اس کے قریبی چیلوں کے سامنے بھی دو زانو رہنا ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو گریٹ مدر؟'' لاما کیشورا کا کو اپنی ماں کی بات بری لگی اور وہ پُرغرور لہجے میں بولا۔

''ہم عظیم یوگوگاما کے نام لیوا اور پجاری ہیں جس کے سامنے افریقا کی ایک دنیا جھکتی ہے۔''

''مگر شیطان کے سامنے یوگوگاما کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے میرے ناداں بچے! افسوس کہ تم بھی اپنے باپ کی طرح ضدی اور مغرور ہو۔ مجھے ڈر ہے کہیں تم بھی اس کی طرح مارے نہ جاؤ۔'' اس کے لہجے میں خوف سما گیا۔

لاما کیشورا کا نے ایک منتر پڑھا اور کرسٹل بال پر پھونک ماردی۔ گریٹ مدر کا چہرہ غائب ہوگیا۔ وہ اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر سنگی دریچے کے پاس آیا اور اسے نیچے پھینک دیا۔ کرسٹل بال بلندی سے گرا اور کرچی کرچی ہوگیا۔

''ہونہہ! باپ بھی کہتا تھا کہ تمہاری ماں کی بزدلانہ باتیں بے حوصلگی کا باعث بنتی ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اس کی کوئی بات سنی ہی نہ جائے۔'' لاما کیشورا کا خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔ ''اب میں خبلیس کے ساتھ برابری کی سطح پر بات کروں گا۔''

اسی وقت مخروطی چھت والے اس معبد خانے میں کالے رنگ کے دھوئیں کا... بادل گردش کرنے لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سر اٹھائے اس دھوئیں کو دیکھنے لگا جو اب ایک عجیب شبیہہ کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ یوں کہ سر گنجا، جسم موٹا بھدا، ناک موٹی اور آنکھوں کے بڑے بڑے ڈیلے باہر کو ابلے پڑے ہوئے۔ جسم پیٹ کے نیچے ٹانگوں سے عاری اور اس کی جگہ ایک دم تھی وہ کسی پھولے ہوئے ہیلیم گیس کے غبارے کی طرح اِدھر اُدھر دیواروں سے سر پٹختا رہا۔ اس کے بعد وہ پرواز کرتا ہوا نیچے آیا اور لاما کیشورا کا کے چہرے کے بالکل سامنے آکر معلق ہوگیا۔

''پہچان لے مجھے میں خبلیس ہوں...... بول! کیا مرضی ہے تیری؟ میرا کہا مانے گا یا اپنی روش پہ قائم رہے گا۔'' لاما کیشورا کا پہلے تو ڈرا لیکن پھر من ہی من میں کچھ بدبدانے کے بعد جرأت کرکے بولا۔

''میں برابری کی سطح پر اور ایک ہم پلہ دوست کی حیثیت سے تمہاری ماننے اور اپنی بات منوانے کے لیے تیار ہوں۔''

''ہم تمہارے ہی نہیں اپنے تمام دوستوں کے ساتھ برابری ہی کی سطح پر بات کرتے ہیں۔ تم دوست ہو اور رہو گے۔'' خبلیس نے مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے کہا تو لاما کیشورا کا کا سینہ ایک بار پھر غرور سے پھول گیا۔

''روشن دنیا کا پیروکار اور ارض اسلام کا حکمراں...... مراد علی منگی اس وقت اپنی بیٹی ماروی کے ساتھ گالان کے غار میں موجود ہے، مگر افسوس تم ابھی وہاں تک کوئی رسائی بھی حاصل نہیں کر پائے ہو۔ ہم نے دیکھو اسے بیمار اور لاغر کرکے آدھی موت کے قریب پہنچا دیا۔''

''تم صحیح کہتے ہو......'' لاما کیشورا کا اعترافی لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں مایوس نہیں ہوں، اسی کوشش میں ہوں کہ کسی طرح مجھے وہ غار نظر آجائے۔''

''وہ غار کسی کو دکھائی نہیں دے گا اور ہمارا دشمن نمبر ایک وہاں شفا پاتا رہے گا اور ایک دن دوبارہ طاقت پکڑ کے ہمارے بخیے ادھیڑ دے گا۔ عابی کی موت کے بعد بھی اس کی طاقت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے، اگرچہ بیٹے کی دائمی جدائی کا غم اسے اپنی جگہ ہے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''ہم نے اس مشکل کا حل نکال لیا ہے کہ اس غار میں کوئی شیطانی طاقت یا ٹیلی پیتھی جاننے والا داخل ہو سکتا ہے نہ ہی اسے یہ نظر آ سکتا ہے۔'' جبلیس نے کہا۔

''تو پھر......؟'' لاما کیشوراکا نے کچھ امید بھری نظروں سے جبلیس کی طرف دیکھا۔

''اتنی سی بات تھی اور اتنی سی بات ہی بسا اوقات بڑے سے بڑے عامل کی سمجھ میں نہیں آتی کہ لفظوں پر ہم غور نہیں کرتے، تو غور کرو۔ اس مقدس غار میں کوئی شیطانی طاقت یا ٹیلی پیتھی جاننے والے کا داخلہ ممنوعہ ہی نہیں اس کی آنکھوں سے بھی اوجھل رکھا گیا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوا؟ صاف سی بات ہے، وہاں کوئی عام آدمی ہی داخل ہو سکتا ہے اور اسے ہی وہ غار نظر آ سکتا ہے۔''

''بڑی ہی عجیب بات ہے، اس سے زیادہ آسان بھی مگر یہ کیسے ممکن ہے؟'' لاما کیشوراکا کے لہجے میں حیرتیں امڈ رہی تھیں۔ ''عام آدمی سے اتنا بڑا دشمن ڈھیر ہو جائے گا؟ وہ بھی بُری سمیت۔ جو خود بھی پراسرار طاقتوں کی مالکہ ہے؟''

''روشن دنیا کی مصلحتیں سب کی سمجھ سے بالاتر ہوتی رہی ہیں۔'' جبلیس گہرے لہجے میں بولا۔ ''وہیں شیطانی طاقتیں انہی مصلحتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ مراد کیا ہے۔ محض ایک عام سا آدمی، اس کی حقیقت جانو گے تو تمہیں اور بھی حیرت ہوگی کہ وہ ماضی میں ایک گدھا گاڑی چلانے والا غریب نوجوان تھا۔ اپنی ذات میں وہ اب بھی ویسا ہی ہے لیکن اس کے گرد ایسے ہی خواہوں کا ٹولا جمع ہو چکا ہے، جس کی وجہ سے وہ آج اس مقام پر ہے۔''

''تم آدمی کا ذکر کر رہے تھے، وہ کہاں سے دستیاب ہوں گے؟'' لاما کیشوراکا اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''وہ آدمی عنقریب یہاں پہنچنے والے ہیں۔ تمہیں ان کے ٹھکانے اور ان کی ہر ممکن مدد کرنا ہوگی۔ وہ لہاسا سے اس برف زار میں داخل ہو چکے ہیں مگر موسم کی سختی ان کی برداشت سے باہر ہے، لہٰذا آپس کا غصہ چھوڑو اور اسی وقت انہیں یہاں لانے اور آگے کی حکمت عملی کا بندوبست کرو...... چلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی جبلیس اسی کالے دھوئیں کی صورت دریچے سے باہر پرواز کر گیا۔

لاما کیشوراکا کو جبلیس کی کچھ باتیں سمجھ آئیں، کچھ نہیں اور جتنی سمجھ آئیں اس کے تحت اس نے فوراً قدم اٹھایا۔ اسی وقت خصوصی طور پر اپنی ''یاک گاڑی'' ان دونوں عام آدمیوں کی طرف بھجوا دی اور خود ان کا بے چینی سے منتظر ہو کر بیٹھ رہا۔

وہ دو آدمی یہودی تنظیم کے دو ٹاپ ایجنٹ موسی گا اور رونڈا تھے، جنہیں خاص لہاسا کے راستے ماروی کو ٹارگٹ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مکار یہودی جانتے تھے کہ ان کے بڑے اور دشمن نمبر ایک مراد علی منگی کی اصل طاقت عالی، ماروی اور دانش ہیں، نیز اس کے بہی خواہ بھی۔ عالی کو ایک گہری اور گھناؤنی سازش کے تحت ختم کرا دیا گیا تھا۔ اب یہودیوں کا ٹارگٹ ماروی تھی۔

یخ بستہ سردی میں اس سرد جہنم کی خوراک بننے کے لیے ان دونوں ایجنٹوں نے ابھی اس برف زار کی سرحد پار کی ہی تھی کہ لاما کیشوراکا کی یاک گاڑی انہیں لینے وہاں پہنچ گئی۔ یہ دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ گاڑی کا اندرونی ماحول گرم محسوس کرتے ہی، موسی گا اور رونڈا کی جان میں جان آئی تو ان کے ہوش بھی ٹھکانے آئے۔

''یہ کس کی مدد پہنچی ہے؟ کیا تم واقف ہو؟'' موسی گا نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ جواباً رونڈا نے اپنے سر کونفی میں حرکت دی اور اپنی گرم جیکٹ کی زپ کھولی تا کہ یاک گاڑی کے اندر کی غیر معمولی گرمی سے کاٹ دار ٹھنڈک کا اثر زائل کر سکے۔

''حیرت ہے...... اس سلسلے میں ہمیں کوئی بریفنگ نہیں دی گئی۔ ٹھہرو...... میں ابھی لاسلکی رابطہ کر کے پوچھتا ہوں۔''

یہ کہہ کر موسی گا نے اپنی گرم موٹی جیکٹ کے اندر سے ایک بڑا سا فونک ڈیوائس نکالا اور اپنے چیف کریگ ہوسٹن سے رابطہ کرنا چاہا مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ شاید موسم کی خرابی اس کا سبب تھا یا پھر کوئی اور وجہ، تاہم اس نے رونڈا کو بتا دیا کہ کسی سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ لہٰذا اب کیا کیا جائے؟

''خاموشی سے جو ہو رہا ہے ہونے دو...... یقیناً اس سواری کا بندوبست پہلے ہی سے ہمارے لیے کیا گیا ہوگا۔'' رونڈا نے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے لگتا تھا کہ وہ اس مہم سے کچھ بیزار بیزار سا ہو رہا تھا۔ تاہم اس کے مقابلے میں موسی گا خاصا پرجوش اور پرامید نظر آتا تھا۔ تاہم وہ اپنے ساتھی ایجنٹ کے اس خیال سے متفق ہی تھا کہ یہاں اس دشوار گزار علاقے میں ان کی آسانیوں کا بندوبست کرنے والا انہی کا کوئی اپنا ساتھی گینگ ہو سکتا تھا۔

''گاڑی تو بھوتنی شاندار ہے، یہ کوئی خاص ایجنٹ

ساتھی لگتا ہے ہمارا.....'' رونڈا بولا۔ موسی گا نے ہونٹ سکوڑتے مسکرا کر محض اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا اور یاک گاڑی کے ایک تنگ سے چوبارے سے باہر اس طرف جھانکا جدھر کوچبان بیٹھتا تھا۔ وہاں چوبی تختے پر اسے ایک بوڑھا تبتی بیٹھا نظر آیا جس کے ہاتھ میں چابک تھا۔ اس نے سمور کا گرم لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے پر سفید گھنی ڈاڑھی تھی اور مونچھیں اور بھووں کی بھی یہی حالت تھی، اس کا لباس بھی سرخ تھا۔

''اس یاک گاڑی کو سانتا کلاز ٹائپ کا کوئی بوڑھا چلا رہا ہے۔'' موسی گا نے مسکرا کر کہا تو رونڈا بولا۔

''ذرا اس سے پوچھنا تو یہ ہے کون اور اسے کس نے ہماری مدد کے لیے بھیجا ہے؟''

''ہے..... کون ہو تم؟ مہربان سانتا کلاز..... ! تمہیں ہمارے کس مہربان ساتھی نے بھیجا ہے؟''

مگر موسم کی خرابی اور شور کی وجہ سے آواز اس تک شاید نہیں پہنچی تھی۔ تاہم دونوں خاموش ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ادھر ماروی نے خیال خوانی کی پرواز کے ذریعے پتا چلا لیا تھا کہ اس مقدس غار میں جو دو دشمن داخل ہو کر ان باپ بیٹی پر حملہ کرنے کی سکت رکھتے تھے، وہ درحقیقت جیوش ریڈ آرمی کے شوٹرز تھے اور ایک یاک گاڑی میں لاما کیشورا کا کی میزبانی حاصل کرنے اس کے معبد خانے کی طرف گامزن تھے۔

اس نے فوراً اس کوچبان کے اندر قبضہ جمایا جس کا حلیہ سانتا کلاز جیسا تھا اور اسے یاک گاڑی..... لاما کیشورا کا کے معبد خانے کے بجائے اس کا رخ کسی اور جگہ موڑنے کا حکم دیا۔

لہاسا کے برف زار ویرانے کا یہ وہ علاقہ تھا جہاں بھوکے اور خونخوار برفانی بھیڑیوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ وہاں پہنچ کر برفانی بھیڑیوں کے غول کے غول ان کی یاک گاڑی کے پیچھے چیختے غراتے دوڑ پڑے۔ یاک بری طرح بدکے اور بے قابو ہو کر دوڑ پڑے۔ یاک گاڑی کو زبردست جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔ اس صورت حال پر اندر بیٹھے موسی گا اور رونڈا چونک پڑے..... انہوں نے جو سر باہر نکال کر جھانکا تو دہل گئے۔ بھوکے، خونخوار بھیڑیوں کے ایک نہیں بلکہ غول کے غول چیختے غراتے ہوئے ان کے تعاقب میں دوڑے چلے آ رہے تھے۔

کوچبان کے روپ میں ماروی نے ایک اور چال اس وقت چلی جب موسی گا نے چیخ کر اس سے کہا۔

''اوئے پاگل بڈھے! یہ تو ہمیں کدھر بھیڑیوں کے علاقے میں لے آیا ہے؟''

''ہا..... ہا..... یہ لاما کیشورا کا کا حکم تھا کہ تم دونوں کو یہاں ان بھوکے اور خونخوار بھیڑیوں کی خوراک بنا دیا جائے۔''

''سن آف بچ! تمہیں پتا نہیں اس طرح تم خود بھی جان سے جاؤ گے؟ ہمارے پاس تو ہتھیار ہیں۔'' موسی گا نے اسے گالی دے کر کہا اور اسی وقت گاڑی کا ایک پہیا ٹوٹا اور وہ الٹ گئی، موسی گا اور رونڈا منہ کے بل برف پر گرے۔ انہوں نے بھیڑیوں کے غول پر اپنا جدید اسلحہ استعمال کیا مگر کب تک، کتنے بھیڑیے مرتے۔ یہاں تو ایک کے بعد ایک برفانی گپھا سے برآمد ہو رہا تھا، وہ بھی غول کی صورت میں..... رونڈا نے جب اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ساتھی موسی گا پر خونخوار بھیڑیوں کا ایک پورا غول جھپٹتے اور پل کے پل..... اسے چیرتے پھاڑتے دیکھا تو اس نے فوراً ایک ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ایک میسیج ڈیوائس کے ذریعے ہیڈ کوارٹر میسیج کر دیا کہ ان کے ساتھ دوستی کی آڑ میں لاما کیشورا کا نے کیسا بھیانک دھوکا کیا تھا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جس وقت خونخوار بھیڑیوں کا ایک بھوکا غول اسے چیرنے پھاڑنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہا تھا، اس نے بوڑھے کوچبان کو ایک یاک پر فرار ہوتے دیکھا۔

یہودی تنظیم ریڈ آرمی کے ''وار روم'' میں جب رونڈا کا یہ میسیج پہنچا تو وہاں زبردست کھلبلی مچ گئی۔ ان کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ جسے وہ اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھتے تھے، اس نے ہی ان کے عظیم دشمن سے خفیہ ساز باز کر رکھی تھی۔ رہی سہی کسر ماروی نے خیال خوانی کے ذریعے ان افواہوں کو پھیلا کر پوری کر دی کہ لاما کیشورا کا نے ماروی اور مراد کو اپنے علاقے میں پورا تحفظ دے رکھا ہے اور دوسری طرف اس بات کا جھوٹ موٹ رونا رو رہا ہے کہ وہ اس غار (گالان) اور ان دونوں باپ بیٹی تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام ہو رہا ہے، وغیرہ۔

اسی وقت لاما کیشورا کا کے خلاف مشترکہ طور پر ایک جنگی محاذ بنا لیا گیا اور اسے ختم کرنے اور اس کے معبد خانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ اتحادیوں کی ایک پوری فوج کو شکاریوں کے ایک بڑے ٹولے کی صورت، جو بہ ظاہر برفانی لومڑیوں اور بھیڑیوں کا شکار کرنا چاہتے تھے، لہاسا کے اس دور افتادہ برف زار روانہ کر دیا گیا۔

ان میں صرف جھلیس وہ واحد ہستی تھا جو ماروی کی اس چال کو سمجھ چکا تھا مگر وہ کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ شیطان کے منہ کو ایک حد تک ہی کھلنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یوں بھی وہ جانتا تھا کہ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہونا تھا، وہ خود بھی لاما کیشورا کا کی مغرور صفت اور ہٹ دھرمی سے تنگ آچکا تھا اور اب تک اس نے ماروی اور مراد کے سلسلے میں کوئی خاطر خواہ کارنامہ بھی انجام نہیں دیا تھا۔

جھلیس...... لاما کیشورا کا اور اس کے اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں عنقریب ہونے والے عبرت ناک انجام سے مایوس ہونے کے بعد کوئی اور چال چلنا چاہتا تھا۔ اس نے عذرباد سے رابطہ کیا اور اسے چند خاص ہدایات دیں۔ وہ پہلے ہی ایک دوسرے ٹاسک پر مصروف کار تھا جس کے مطابق اس نے لارا کے ذریعے ریاست ارض اسلام میں داخل ہونا تھا۔ لارا کو اپنے تابع کرنے کے بعد اس کا کام فقط اتنا رہ گیا تھا کہ اس نے لارا کو اپنی اصل حالت میں دانش کے قریب لانا تھا لیکن جھلیس کا یہ نیا مشن سامنے آنے پر اسے کچھ جھلاہٹ سی ہوئی تھی۔ تاہم اس نے اس کے لیے ہاسی تارا کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا اور اسے اپنے روبرو حاضر کرنے کے بعد بولا۔

''تبت کا مشن بری طرح ناکامی سے دوچار ہو رہا ہے اور اس کی وجہ وہی آفت کی پرکالہ ماروی ہے...... تم اسی وقت لہاسا کے اس برف زار علاقے میں جاؤ اور ان کا ٹھکانا معلوم کر کے مراد اور ماروی کو ہلاک کرنے کی کوشش کرو......''

ہاسی تارا جانتی تھی کہ یہ مشن آسان نہ تھا، اول تو گالان کے غار کو ابھی تک کوئی بھی نہیں تلاش کر سکا تھا، مراد اور ماروی کو ختم کرنا تو دور کی بات تھی مگر دانش کی صورت میں ایک امید تھی گالان غار تک پہنچنے کی...... مگر دانش کے سلسلے میں وہ عذرباد سے ایک عدد تھپڑ کھا چکی تھی، اس لیے وہ اس کے پاس دوبارہ جانے سے ذرا گھبرا رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے بولی۔

''تمہیں معلوم ہے کہ یہ مشن کتنا مشکل ہے مگر میرے پاس اسے حل کرنے کے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دانش......''

''تم دانش کے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہو؟'' عذرباد نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''میں دانش کو ماں بن کر دھوکا دیتی رہوں گی، تاوقتیکہ میں اپنے تبت والے مشن میں کامیاب نہیں ہو جاتی۔''

''نہیں، تم دانش کے قریب بھی نہیں جاؤ گی۔'' عذرباد نے سختی سے انکار کیا۔ ''وہ میرا شکار ہے اور میں اس کے ذریعے بڑا شکار کرنا چاہتا ہوں۔''

''تمہارے خیال میں بڑا شکار مراد اور ماروی کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے؟'' اس بار ہاسی تارا نے قدرے طنزیہ انداز میں پوچھا، کیونکہ اس کے خیال کے مطابق بڑے شکار لہاسا کے اس برف زار ویرانے میں موجود تھے مگر عذرباد اس کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے یا پھر نہ سمجھتے ہوئے جواباً بولا۔

''میرا بڑا شکار ریاست ارض اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنا اور اس کی تباہی ہے۔ لارا جب تک وہاں رہے گی میں بھی اس کے اندر موجود رہتے ہوئے وہاں رہوں گا۔ مراد اور ماروی اگر لہاسا کے برف زاروں سے زندہ واپس آ بھی گئے تو ان کے گھر میں ہی، میں ان کی قبریں بھی تیار رکھوں گا تم اب جاؤ اور اپنا مشن پورا کرنے کی کوشش کرو......'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ہامبی تارا اپنے ہونٹ بھینچے کچھ دیر سوچتی رہی۔ عذرباد اسے مسلسل مایوس کیے جا رہا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مگن تھا اور ہامبی تارا کو مشن سے زیادہ اس کی...... قربت کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے اپنے ہر مشن میں ساتھ رکھے۔ یہی سبب تھا کہ اس نے اپنے تئیں ایک معرکہ سر کیا اور جبلیس نے اسے عذرباد کے ساتھ ہمیشہ کے لیے رہنے کی اجازت بہ طور انعام کے طور پر دی تھی مگر...... عذرباد نے اسے سخت مایوس کیا تھا، اسے اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ عذرباد کی نظروں میں بھی محض ایک کنڈلی داسی کے سوائے کچھ نہیں، جبکہ وہ اس کی محبوبہ کی حیثیت سے رہنا چاہتی تھی مگر وہ اسے ایک ماتحت کی طرح ڈیل کر رہا تھا، اس پر حکم چلا رہا تھا۔ وہ جبلیس کا سچا پیروکار اور جانشین بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ہامبی تارا نے سوچا کہ اگر داسی بننا ہے تو جبلیس سے بہتر اور کون اس لائق تھا جس کی وہ داسی بن کر رہتی، جبکہ عذرباد بھی یہی چاہتا تھا۔

بات کچھ بھی سہی...... مگر یہ ایک حقیقت تھی کہ عذرباد کی طرف سے ہامبی تارا کے دل میں ایک بال سا آ گیا تھا۔

اگرچہ وہ اب بھی خود کو جبلیس کی چیلی ہی سمجھتی تھی، مگر جانتی تھی کہ وہ کسی کو بھی اپنے ساتھ منسلک کر کے زیادہ دیر نہیں رکھتا، اس کا کہنا تھا کہ اس کے شیطانی خیالات اپنائے رکھو، سمجھو میرے ساتھ ہو۔ لہٰذا ہامبی تارا نے سوچا کہ اگر اسے شیطانی معبد خانے میں اپنی ساکھ اور اہمیت قائم رکھنا تھی تو اسے خود کو عذرباد کے برابر والی سطح پر لانا تھا، ورنہ ایک عام چیلی کی حیثیت سے اگر زیادہ دن رہی تو پھر اس کا حشر بھی انہی سابقہ چیلوں جیسا ہو جائے گا، جیسا جبلیس نے عذرباد کے ذریعے سے کاہن، لارا، طاغوتا اور آبنوس کا کیا تھا۔ یعنی انہیں ناکارہ بنا کر چارے کے طور پر دشمنوں کے آگے ڈال دیا گیا تھا اور عذرباد جب چاہتا چٹکی بجا کر ویک اپ (جاگو) کہتا، وہ اس کے ''معمول'' بن جاتے جبکہ ہامبی تارا نہیں چاہتی تھی کہ ایسا کچھ ہو......

لہٰذا وہ سوچنے لگی کہ یہی موقع ہے کارنامہ دکھانے کا۔ کسی طرح وہ لہاسا کے برف زار جا کر مراد اور ماروی کو موت کے گھاٹ اتار دے اور اس کا بہترین ذریعہ دانش سے بڑھ کر کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ عذرباد کی پروا کیے بغیر وہ اپنا مشن جاری رکھے گی اگرچہ اسے عذرباد کا تھپڑ بھی یاد تھا، اس نے سوچا کہ عذرباد اپنے مشن کی راہ ہموار کرنے کی خاطر اس کی چال کو خراب قرار اسی لیے دے رہا ہے کہ وہ خود اپنے مشن کے لیے دانش کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔

''ہرگز نہیں، دانش میرا شکار ہے اور عذرباد کو اپنے مشن کے لیے کوئی اور ذریعہ تلاش کرنا ہوگا۔'' ساری بات سمجھنے کے بعد ہامبی تارا غصے سے خود کلامیہ بڑبڑائی تھی۔

''میرا مشن اس سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ وہ ارض اسلام میں داخل ہو کر اس کی جڑیں کھوکھلی تب ہی کر سکتا ہے جب مراد اور ماروی زندہ نہ رہیں۔'' اس نے دانش کی ماں بن کر اسے ''ٹریپ'' کرنے کا مشن جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا، اس ارادے کے ساتھ کہ اگر عذرباد بھی اس کے سامنے آیا تو وہ اس سے ذرا بھی خائف نہیں ہوگی۔

یہاں یہ سب وہ سوچ رہی تھی اور مستقبل کے ارادے باندھ رہی تھی، ادھر تاریک دنیا کے شیطانی معبد خانے میں جبلیس بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ وہ انسانوں کو ہی نہیں بلکہ اپنے چیلوں کو بھی آپس میں لڑوا کر خوش ہوتا تھا، اسی طرح وہ دنیا میں برائی پھیلاتا اور برائی کو برائی سے جنم دیتا تھا۔

یہی سبب تھا کہ جب ہامبی تارا دانش کو اس کی ماں کا جھانسا کامیابی کے ساتھ دے آئی تھی تو وہ خوش ہوا تھا اور عذرباد نے اس کے کام میں سقم نکالا تھا تو تب بھی اس نے غیر اطمینانی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

جبلیس انسانوں اور چیلوں کے درمیان تفرقہ چاہتا تھا تاکہ مقابلہ بازی کی فضا پیدا ہو اور اس کے چیلے زیادہ تن دہی کے ساتھ اپنے ''کام'' کی انجام دہی میں پوری طرح ''فعال'' رہیں۔

اب وہ اپنے مقرب خاص کارپرداز چیلے عذرباد اور اپنی محبوبہ نما داسی کے درمیان مقابلے کی اس سطح کو پیدا کر کے دیکھنا چاہتا تھا کہ کون کیسا کام کامیابی کے ساتھ سرانجام دیتا ہے؟

☆☆☆

دانش اور لارا...... ماں بیٹے کی اس معصومیت کے پیچھے جو شیطانی ادارے کام کر رہے تھے اور اس معصومیت سے روشن دنیا کے خلاف کوئی شیطانی گل کھلانے کی مذموم سازش میں مصروف کار تھے، ان میں ایک شیطانی ادارہ...... ''دی کچر'' سرفہرست تھا۔ اس کے سربراہ راجر ہارڈی کے بھی مراد وغیرہ کے خلاف وہی جذبات تھے جو جبلیس اور عذرباد کے تھے۔ اسی سبب عذرباد اور ہارڈی کا آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ قائم ہو چکا تھا۔ یہ شیطانی ادارے، کئی

ملکوں میں مراد کا جینا حرام کر سکتے تھے۔ جیسا کہ مذکور ہوا انہی میں سے ایک ادارے کا نام ''دی کیچر'' تھا۔ اس کا سربراہ راجر ہارڈی بہت ہی مکار اور شاطر تھا۔ اس نے عذر باد سے کہا تھا......

''لارا جب بن زیان کے زیر اثر رہتی تھی تب ہی سے وہ میری نظروں میں ہے۔ اب میں اس کی ٹیلی پیتھی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ پلیز اسے میری طرف مائل کردو۔''

جواب میں عذر باد نے کہا تھا۔

''تمہیں بہت رازداری سے مراد کے مقابلے پر رہنا ہے۔ نہ اپنی صورت دکھانی ہے نہ اپنی آواز اور لب ولہجہ سنانا ہے۔ ہم لارا اور دانش کے ذریعے بہت بڑا گیم کھیل رہے ہیں۔ ایسے وقت ماروی اپنی صلاحیتوں سے معلوم کرلے گی کہ لارا در پردہ تم سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم اس سلسلے میں بہت محتاط رہنا چاہتے ہیں۔''

''بے شک محتاط رہو۔ لارا پر ایسا تنویمی عمل کرو کہ میرا نام میری شخصیت اس کے ذہن سے مٹی رہے۔ وہ میرے اندر آکر خیال خوانی کرنا بھول جائے۔ صرف میری ضرورت کے مطابق دوسروں کے دماغوں میں جایا کرے۔''

وہ قائل ہوکر بولا۔ ''تم لارا کی خیال خوانی سے بہت فائدہ اٹھا سکو گے۔ میں اسے تمہاری طرف مائل کر رہا ہوں۔ محتاط رہنا۔''

اس کا حل طریقہ یہی نکالا گیا تھا کہ راجر کی اصلیت کو عذر باد نے اپنے شیطانی عمل سے منظر عام سے ہٹا دیا اور اس کی جگہ عموی آدمیوں کو ''یوزٹو'' کرتا تھا۔

یہی سبب تھا کہ راجر ہارڈی کی بھی ڈھنڈیا پڑی ہوئی تھی مگر جیلیس کے اس شیطانی چیلے نے اسے اپنے طاغوتی عمل کے ذریعے منظر عام سے ہٹا رکھا تھا۔

لہٰذا ایک باہمی گٹھ جوڑ کی پیش آئندہ سازش کے مطابق...... لارا کو مسز ہارڈی بنا دیا گیا تھا۔ اسے مرد کی ضرورت تھی اور وہ ''مرد'' اسے فراہم کیا جا چکا تھا، وہ اب ایک طرف ہارڈی کی بیوی بن کر تو دوسری طرف عذر باد کی معمول بن کر ان دونوں ہی کی تابع بن چکی تھی، بلکہ یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا کہ وہ...... کھلونا بن چکی تھی، اب نہ وہ اپنی ہوش مندی میں شیطان کی چیلی تھی نہ ہی روشن دنیا کی دشمن...... گویا نہ تین میں تھی نہ تیرہ میں۔

راجر ہارڈی درحقیقت اپنی محل نما رہائش گاہ آئر لینڈ کے ''وائٹ پیلس'' میں مقیم تھا۔

☆☆☆

لاما کیشورا کا...... کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ماروی نے اس کے خلاف کس قدر خطرناک چال چلی تھی۔ وہ اپنے شیطانی معبد خانے میں بیٹھا ان دونوں ''عام'' افراد (موسی گا اور رونڈا) کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ کافی دیر ہوگئی، تو اس کی یاک گاڑی لوٹی۔ وہ خوش ہوگیا کہ ''مہمان'' آگئے لیکن جب بوڑھے کوچبان نے اسے حقیقت بتائی کہ ان پر راستے میں خونخوار بھیڑیوں کے غول کے غول حملہ آور ہوگئے تھے تو اس کی بھویں پُرسکون انداز میں سکڑ گئیں۔

''تمہارے راستے میں تو کوئی ایسا علاقہ نہیں آتا، جہاں ان خونی بھیڑیوں کی اس قدر تعداد میں موجودگی ہو؟''

بوڑھا کیا جواب دیتا۔ وہ تو اس وقت ماروی کے تنویمی حکم کے زیر اثر تھا۔ اب وہ اپنی جون میں آیا تو اسے خود بھی اس بات پر شدید حیرت ہونے لگی کہ یہ ہوا کیا تھا؟ لہٰذا بڑے گومگو سے لہجے میں بولا۔ ''میں خود حیران ہوں جناب! میں تو اچھا بھلا اپنی یاک گاڑی میں ان دونوں مہمانوں کو ساتھ لا رہا تھا کہ جانے کہاں اور کدھر سے بھیڑیوں کے غول کے غول امڈ آئے۔ اگرچہ ان دونوں مہمانوں کے پاس اسلحہ بھی تھا، بڑا جدید قسم کا...... اور انہوں نے خونخوار بھیڑیوں پر اپنی طاقت ور گنوں سے گولیاں بھی برسائیں لیکن...... وہ زیادہ دیر ان شکاری بھیڑیوں کے آگے نہیں ٹک سکے اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑیوں نے ان دونوں کو چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔ میں خود پتا نہیں کس طرح خالی یاک گاڑی دوڑاتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔''

''کیا ان بھیڑیوں نے اتنی بڑی یاک گاڑی الٹ دی تھی؟'' لاما کیشورا کا نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی......

''بھیڑیوں نے یاک گاڑی نہیں الٹی تھی بلکہ وہ...... وہ......''

یہاں وہ کچھ بتانے سے قاصر تھا، کیونکہ اس کا دماغ اس وقت ماروی کے تابع تھا، تاہم اندازے کی بنیاد پر بھی اس نے صحیح بات کہی، آگے بولا......

''بھیڑیوں کے چیختے اور غراتے غول در غول سے گاڑی میں جتے دونوں یاک بری طرح بدحواس ہوگئے تھے۔ وہ بھوکے، خونخوار اور دوڑتے بھیڑیئے شاید ان دونوں انسانوں کے ساتھ ان موٹے تازے یاکوں کو بھی ہڑپ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، خود میں بھی شاید...... بوکھلا گیا تھا۔ یاک سرپٹ دوڑ پڑے اور پھر یاک گاڑی کا پہیا تھا شاید کسی ٹھوس برفیلے چھوٹے سے پر پڑا اور گاڑی

الٹ گئی۔"

"ذرا ٹھہرو..... یہ تم اپنی ہر بات میں بار بار شاید..... کا لفظ کیوں استعمال کر رہے ہو؟ کیا تمہیں اس حادثے کا یقین نہیں ہے؟" لاما کیشورا کا ــــ نے چونک کر اس سے پوچھا اور اپنی بھویں سکیڑ کر بہ غور اس ــــ کے چہرے کا جائزہ بھی لیا۔ شاید وہ کچھ "اخذ" کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بوڑھا کوچان جواباً اسی لہجے میں بولا۔

"ہاں..... میں خود حیران ہوں، مجھے ابھی تک اتنے بڑے حادثے کا یقین نہیں ہو رہا ہے کہ یہ ہو کیسے گیا؟"

لاما کیشورا کا مخمصے کا شکار ہو گیا۔

"کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔" وہ اپنے طور پر کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی سعی کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ پلٹا اور اس میز کی طرف آیا جہاں کرسٹل بال پڑا ہوتا تھا۔ وہ اپنی ماں ماتو راما..... سے اس سلسلے میں کچھ پوچھنا اور صلاح و مشورہ کرنا چاہتا تھا مگر ٹیبل کے قریب آیا تو چونک پڑا۔ وہاں کرسٹل بال موجود ہی نہ تھا۔

"وحت تیرے کی....." اس نے جھلا کر اپنی تنگ پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"میں نے تو غصے میں آ کر گریٹ مدر کا وہ کرسٹل بال ہی نیچے پھینک کر توڑ ڈالا ہے، میں بھلا اب اپنی گریٹ مام سے کیونکر رابطہ کر سکتا ہوں؟" اسے اپنی اس غصیلی حرکت پر خود ہی غصہ آنے لگا۔ وہ مارے بے بسی کے بری طرح تلملانے لگا، کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔

"جبلیس ٹھیک ہی تو کہتا ہے کہ وہ دونوں دشمن میری ناک کے نیچے موجود ہیں اور میں ان کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر ہوں..... ان دو مہمانوں (موی گا اور رونڈا) کی وساطت سے کامیابی کے قریب پہنچنے کی کوئی سبیل پیدا ہوئی تو یہ حادثہ رونما ہو گیا، پتا نہیں یہ واقعی اتفاقی حادثہ تھا یا پھر دانستہ کسی کی شرارت تھی؟ کون تھا وہ پھر؟ ماروی تو اپنے ادھ مرے باپ کی زندہ قبر پر بیٹھی ہے اور تیسرا کوئی دشمن یہاں موجود نہیں۔ مجھے جبلیس سے مدد لینی چاہیے۔ اونہہ..... بھلا جبلیس کے ساتھ میرا کیا مقابلہ؟ وہ تو خود بے بس اور میرا محتاج ہے۔"

ایک دن اور بیت گیا، وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا مگر ریڈ آری اور اس کے اتحادیوں کی فوج ضرور اس تک پہنچ گئی۔ اسے حیرت و تشویش کا ایک بار پھر ملا جلا جھٹکا لگا مگر تب تک وقت بیت چکا تھا۔ اس کے محل خانے پر چڑھائی کر دی گئی۔ جدید اسلحہ، خطرناک گولہ بارود اور پوری فوج کی بٹالین کے اچانک دھاوا بولنے پر لاما کیشورا کا، جو اپنی ماں سے لے کر جبلیس تک کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، جواد سجانی کی طرح غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنے ہی بہی خواہوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

کہتے ہیں مرتے ہوئے انسان کو عین آخری لمحات میں اپنی موت، ملک الموت سمیت نظر آجاتی ہے۔ لاما کیشورا کا کو اپنے عین انجام کے وقت پر یقین کی حد تک یہ احساس ہو چلا تھا کہ وہ بالآخر اپنی خود نمائی، ضد اور متکبرانہ صفت کی ہٹ دھرمی کے باعث اپنے کسی دشمن کی سازش کا شکار ہو چکا ہے، جو اس پر موت بن کر اچانک ہی جھپٹی تھی۔

☆☆☆

اعلیٰ حکام اور دیگر مسلم دشمن قوتوں کے اکابرین نے ایک اعلیٰ سطح کی بین الجماعتی میٹنگ میں کریگ ہوسٹن اور بن زیان کی اس بات پر صاد کیا تھا کہ ارض اسلام اس وقت اپنے کمزور ترین دور سے گزر رہا ہے۔ عالی کو ختم کر دیا گیا، مراد قریب المرگ ہو کر لہاسا کے برف زار پہنچا دیا گیا اور ماروی بھی منظر سے غائب ہے، لہٰذا اس وقت ریاست ارض اسلام پر دھاوا بولنا ہی سب سے اہم اور فیصلہ کن قدم ہو گا۔

میٹنگ برخاست ہو گئی۔ اس نتیجے پر کہ ریڈ آری اور دیگر اتحادیوں کی افواج ریاست ارض اسلام پر جنگ کا بگل بجا کر رہے گی۔

اللہ تعالیٰ..... اپنے نیک بندوں کو ہی آزمائشوں میں ڈالتا ہے تاکہ ایک طرف اس کی ایمانی قوتوں کو جلا ملتی رہے اور دوسری جانب حیات انسانی کا یہ مدوجذر بھی قائم رہے.....

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دشمنوں نے بہت بروقت و برمحل ریاست ارض اسلام پر لشکر کشی اور دھاوا بولنے کا اپنے تئیں بالکل صحیح وقت چنا تھا.....

عابد علی منگی جیسے مرد آہن کی موت اور مراد کی قریب المرگ ہیت کذائی کے بعد روشن دنیا کے باسیوں کو ایک بار پھر اپنے دشمنوں کی طرف سے کڑی آزمائش کا وقت آن پڑا تھا.....

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور محبت کی فریب کاریوں کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

میں اپنے گھر کے پورچ میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی جب ڈاکیا ڈاک لے کر آیا۔ اس میں کچھ بل، ایک مقامی بار کا پمفلٹ اور کیپ مے میں ہونے والی ایک تقریب کا دعوت نامہ تھا۔ اس کہانی کا آغاز اسی دعوت نامے سے ہوتا ہے۔ اگر میں لوئیسا مے ایلکوٹ کو نہ پڑھ رہی ہوتی تو مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ یہ دعوت نامہ کس نے بھیجا ہے۔ اس وقت میں اس کا شہرۂ آفاق ناول لٹل ویمن، نہیں پڑھ رہی تھی۔ یہ بات نہیں کہ مجھے یہ شاندار ناول پسند نہیں۔ میں اسے ہر دو سال بعد پڑھتی ہوں لیکن اس برس اس ناول کی باری نہیں تھی بلکہ میں اس کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ پڑھ رہی تھی۔

وہ ایک بہت ہی خوب صورت دن تھا۔ بارش کے قطرے پورچ کی چھت سے ٹکرا کر جلترنگ جیسی آواز پیدا کر رہے تھے۔ میرے اپارٹمنٹ کے بائیں جانب واقع چرچ کی نیلے اور سرخ شیشوں والی کھڑکیاں اس ابر آلود موسم میں تاریک نظر آرہی تھیں۔ میں نے بلوں اور پمفلٹ پر سرسری

نایاب سودا

ثمر عباس

مغربی دنیا بھی عجیب دنیا ہے... جہاں کی نہ صرف برائیاں بلکہ اچھائیاں بھی الگ ہیں بلکہ الگ انداز میں کی جاتی ہیں... اگرچہ اس کا بھی براہِ راست کوئی واسطہ نہ تھا مگر وہ پھر بھی ان معاملات میں کود پڑی جو کسی بھی قوم کے لیے باعثِ افتخار ہوتے ہیں اور وہ بھی اسے اپنی میراث سمجھتے ہوئے ان معاملات میں اپنے حصے کا حق ادا کرنے نکل پڑی تھی۔ اس کے نزدیک یہ بہت نایاب سودا تھا جسے وہ گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

لمحہ بہ لمحہ سنسنی خیز حالات پر مشتمل ایک دلچسپ تحریر



نظر ڈالی اور انہیں میز پر رکھ دیا پھر دعوت نامے کو دیکھنے لگی۔
میرا دل چاہا کہ اسے کھول کر دیکھوں لیکن مطالعہ جاری رکھنے کی خواہش اس پر غالب آگئی کیونکہ کہانی ایک سنسنی خیز موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ کہانی کا مرکزی کردار سیسل اپنی نوجوان کزن کے محل میں داخل ہوتا ہے جس کی وہاں موجودگی سے وہ اپنے چچا کی جائداد سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ اس کی خوب صورتی اور کشش سے متاثر ہو گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس پر اعتبار کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

اس نازک موڑ پر پہنچ کر مجھے وقفہ لینا پڑ گیا کیونکہ پیزا گرم کرنا اور سلاد بنانا تھی۔ اس کام کے بعد بھی کہانی کا بقیہ حصہ پڑھ سکتی تھی۔ میں یہ کہانی پہلے بھی پڑھ چکی تھی لیکن یہ تین سال پرانی بات تھی۔ میں دوبارہ کسی کہانی کو پڑھتے میں جان بوجھ کر وقفہ دیتی ہوں جس سے اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ لوئیسا نے پیسے کمانے کے لیے درجنوں کے حساب سے ڈراؤنی اور پر اسرار کہانیاں لکھی تھیں تاکہ اپنے گھر والوں کی مدد کر سکے۔

میں نے پیزا اوون میں رکھا اور دعوت نامے کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کو پڑھتے ہی میری دلچسپی بڑھ گئی۔ مجھے کسی عام تقریب میں نہیں لوئیسا۔ مے ایلکوٹ ایوننگ میں مدعو کیا گیا تھا۔ یہ تقریب صرف چار دن بعد اتوار کی شام منعقد ہونے والی تھی۔ منتظمین نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میرا کوئی دوست، بوائے فرینڈ یا سماجی زندگی نہیں اور اتوار کو میری کوئی مصروفیت نہیں ہوتی، حالانکہ اس روز میں فارغ تھی لیکن میں نے اسے اپنی بے عزتی محسوس کیا۔

پھر میں نے دیکھا کہ اس تقریب میں ایک اسکالر، ایلکوٹ کے مسودوں، ان کی اشاعت اور ان کے حوالوں کے بارے میں لیکچر دے گا اور اس نے جو وقت کیپ مے میں گزارا، اس کے بارے میں بتائے گا۔ میں بھی یہی جاننا چاہتی تھی کیونکہ میں خود بھی ایلکوٹ پر ایک کتاب لکھنا چاہ رہی تھی۔ مجھے اس میں اپنی علمیت نہیں بگھارنا تھی بلکہ صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ دو سو سال گزر جانے کے باوجود اب بھی عورتیں اس سے کیوں محبت کرتی ہیں۔ یہ تقریب ایلکوٹ ہوٹل کے نزدیک واقع ایک گھر میں منعقد ہونا تھی جہاں لوئیسا اپنے گھر والوں کے ہمراہ قیام کیا کرتی تھی۔

میں نے اس تقریب میں شرکت کی فیس پڑھی تو چونک اٹھی۔ میں ابھی اس اپارٹمنٹ کی مرمت کے اخراجات ادا کر رہی تھی جو آنٹی میرے لیے چھوڑ گئی تھیں۔ مجھے ایک نیا چولہا اور فریج خریدنے کے علاوہ ایسوسی ایشن کو اپنے حصے کی رقم بھی ادا کرنا تھی جو اس ایک سو ساٹھ سالہ عمارت پر نئی چھت ڈالنے کے لیے جمع کی جا رہی تھی۔ ان اخراجات سے تنگ آ کر ایک مرحلے پر تو میں اس اپارٹمنٹ کو بیچنے کے بارے میں سوچنے لگی لیکن اس کے محلِ وقوع کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ عمارت اندرونِ شہر سے صرف تین بلاک کے فاصلے پر تھی اور ساحل بھی یہاں سے تقریباً اتنے ہی فاصلے پر تھا۔ اس کے علاوہ لوئیسا بھی کیپ مے ہی میں چھٹیاں گزارا کرتی تھی لہٰذا میں نے اس تقریب میں شرکت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے اوون سے پیزا نکالا اور اسے کاٹنے کے لیے چھری تلاش کر رہی تھی کہ میری نظر کچن کی کھڑکی سے باہر گئی۔ جنگل کے مانند پھیلے ہوئے میدان میں تعمیراتی مزدور ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ میں نے اپنا پیزا اور لوئیسا کی کہانیوں والی کتاب اٹھائی اور پورچ کی طرف چل دی جہاں ہتھوڑوں کی آواز سے میرے کھانے اور پڑھنے میں کوئی خلل نہ پڑتا۔

مجھے ان آوازوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ میرے اپارٹمنٹ کے عقب میں واقع یہ مکان انیسویں صدی کے اوائل میں تعمیر کیا گیا تھا۔ شروع میں یہاں ایک دولت مند خاندان رہا کرتا تھا پھر اسے کسی اور نے خرید لیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ مکان ایک بار پھر فروخت ہو گیا۔ جب میں نے سنا کہ کسی باذوق شخص نے یہ مکان خرید لیا ہے اور اسے اصلی شکل میں بحال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ آہستہ آہستہ اسے پرانی شکل میں واپس لایا جا رہا تھا۔ کئی مرتبہ ویکس اور پالش لگانے کے بعد اس کے وکٹورین فرش کی چمک لوٹ آئی تھی۔ میں تھوڑا بہت جانتی تھی کہ وکٹورین ہاؤس کتنے خوب صورت ہوتے ہیں۔

لہٰذا میں نے پیزا ختم کیا اور کتاب پڑھنے لگی۔

سیسل نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی کزن کی تصویر بنائے گا جس کی طرف وہ تیزی سے جھک رہا تھا۔ کزن نے تصویر بنوانے کے لیے بزرگوں کا لباس پہننے پر اصرار کیا جس کے نچلے حصے پر جھالر اور جوتوں میں چاندی کے بکل لگے ہوتے تھے۔ وہ ایک طوفانی رات میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے ایک پرانے چھپر کی طرف چلا گیا جہاں اس نے ایک بوڑھی عورت ایلزبتھ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ سیسلیا کی اصل حقیقت ظاہر کر دے گی اگر اس نے اسے جائداد کی آمدنی میں سے حصہ نہیں دیا۔

میں نے ایک بار پھر دعوت نامے کو غور سے دیکھا اور

لفافے میں ایک چیک رکھ کر اس پر ٹکٹ لگا دیا پھر پیدل چلتی ہوئی قریبی پوسٹ آفس تک گئی اور وہ لفافہ ڈاک کے سپرد کر دیا۔ دہاں سے واپس آکر میں نے اپنی پلیٹ اور گلاس اٹھایا اور انہیں دھونے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا اور مزدور کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ سوائے ان کے سپروائزر کے جو ہمیشہ آخر میں جایا کرتا تھا۔

میں نے برتن دھو کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ مجھے زیر تعمیر مکان کی اوپری منزل والی کھڑکی سے روشنی باہر آتی نظر آئی پھر غائب ہو گئی۔ ایک لمحے بعد وہ نچلی منزل کی کھڑکی سے دوبارہ نظر آئی۔ میں نے بے اختیار سیل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ شاید مجھے پولیس کو فون کرنے کی ضرورت پیش آجائے پھر مکان کا عقبی دروازہ کھلا اور میں نے اس میں سے سپروائزر کو باہر آتے دیکھا۔ اس نے دروازہ مقفل کیا اور دہاں سے چلا گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ کوئی چور نہیں تھا۔ مجھے پہلے ہی دیکھ لینا چاہیے تھا کہ اس مکان میں ابھی بجلی کا کنکشن بحال نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ واقعہ میرے ذہن سے نکل گیا جب تک ایلکوٹ کی تقریب منعقد نہیں ہوئی۔ وہ شام میری توقع سے زیادہ کامیاب رہی۔ لوئیسا کے روپ میں سیسلیا ایڈورڈ نے اس کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور حاضرین کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ اس نے رالف والڈو ایمرسن کا ذکر کیا جو اسے بچپن میں پڑھانے آیا کرتا تھا اور وہ اس پر مہربان تھی پھر اس نے اپنی نوجوانی کے دنوں میں بتایا جب خاندان کی کفالت کے لیے اس نے گورنس کے طور پر ملازمت بھی کی۔ اس نے چارلوٹ برونٹی کے بارے میں بھی بتایا جو اسی کی طرح اپنے گھر والوں کی کفالت کے لیے محنت کر رہا تھا۔ سیسلیا نے اس موڑ پر اپنا بیان روک دیا جب لوئیسا نے خانہ جنگی کے دوران واشنگٹن ڈی سی میں نرس کے طور پر کام کیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں مزید تقریبات کا انعقاد کرے گی جس میں لوئیسا کے تخلیق کردہ کرداروں کو پیش کیا جائے گا۔ اس طرح اس نے بڑی ہوشیاری سے ہمیں اگلی دو تقریبات میں شرکت کرنے پر آمادہ کر لیا۔

اس کے بعد ایلکوٹ کے اسکالر کلائیڈ لوریل کی باری تھی۔ اس نے لوئیسا کی آخری مختصر کہانیوں کے بارے میں گفتگو کی جو بہت سے حاضرین کے لیے باعث تعجب تھی لیکن مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ میں پہلے سے ان کہانیوں کے بارے میں جانتی تھی۔ البتہ اس وقت میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی جب اس نے کیپ مے میں لوئیسا کے گزارے ہوئے ایام کا ذکر کیا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ ایک ہوٹل میں قیام کیا جو اب ایلکوٹ ہوٹل کہلاتا ہے بلکہ اس کی ریسرچ کے مطابق وہ ایک دوست کے مکان میں بھی ٹھہری تھی۔ اس نے اس مکان کا محلِ وقوع بتاتے ہوئے کہا کہ اسے حال ہی میں خرید ا گیا ہے اور اب اس کی مرمت ہو رہی ہے۔

میری نبض بتدریج تیز ہونے لگی اور میں تصورات کی دنیا میں پہنچ گئی۔ لوئیسا میرے عقب میں واقع مکان میں ٹھہری تھی۔ ممکن ہے کہ میں نے سپروائزر اور اس کی ٹارچ نہ دیکھی ہو اور لوئیسا کو ایک موم بتی لیے کام ختم کرنے کے بعد اپنے بستر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہو۔ ممکن ہے کہ وہ پڑوسیوں سے ملنے آئی ہو اور میرے پورچ کے سامنے ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہو۔ ایسے کئی تصورات میرے ذہن میں آرہے تھے جنہیں میں دماغ سے جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

حاضرین میں مسٹر پال اینڈریوز بھی تھے جنہوں نے اپنا تعارف ایلکوٹ کی یادگار تصانیف کو جمع کرنے والے کے طور پر کروایا۔ ان کے پاس پبلشرز کی مرتب کردہ اس کی مختصر کہانیوں کی فہرست تھی اور ان کا خیال تھا کہ اس مکان میں لوئیسا کی کچھ یادگار تصانیف کی موجودگی کا امکان ہو سکتا ہے۔

''مجھے اس بارے میں ٹھوس معلومات نہیں ہیں لیکن بہرحال کئی سالوں سے یہ افواہ گردش کر رہی ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''اور وہ یہ کہ اس مکان میں مصنفہ کے کسی نایاب مسودے کی موجودگی کا امکان ہے۔ جب سے اس مکان میں تعمیراتی کام دوبارہ شروع ہوا ہے، اس افواہ میں بھی شدت آگئی ہے...... ممکن ہے کہ یہ محض افواہ ہی ہو لیکن لوئیسا اپنے دوستوں کو خطوط اور مختلف تحریریں بھی بھیجا کرتی تھی اور وہ انہیں اس کی نشانی کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھا کرتے تھے۔ بہرحال وہ ایک مصنفہ کی حیثیت سے اپنا نام بنا رہی تھی۔ ہزاروں مسودوں میں اس طرح کی تحریر یا خط کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی لیکن بہرحال اسے ایک دریافت ضرور سمجھا جائے گا۔ یہاں سے جاتے وقت اس گھر کے مکینوں نے ایسے خطوط ضائع کر دیے ہوں گے یا اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ وہ خاندان پھر کبھی اس مکان میں واپس نہیں آیا۔'' یہ کہہ کر وہ لوریل کی طرف مڑا اور پوچھنے لگا۔ ''کیا وہ اس مکان کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔''

لوریل کچھ ناراض نظر آنے لگا جیسے کسی نے لوئیسا کے حوالے سے اس کی معلومات کو چیلنج کیا ہو۔ وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی خاطر بولا۔ ''بالکل مسٹر اینڈریوز! کچھ بھی ممکن ہے

لیکن مجھے اس بارے میں شبہ ہے کہ لوئیسا کا کوئی خط یا تحریر اس مکان میں رہ گئی ہو۔''

اینڈریوز اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ ''اس مکان کی تلاشی لینی چاہیے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''اس کے لیے مالکِ مکان کی اجازت درکار ہوگی۔ ابھی تک اس نے کسی کو یہ مسودے تلاش کرنے کی اجازت نہیں دی۔ کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔'' اس نے لوریل کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''شاید وہ واپس آکر خود یہ کام کرنا چاہتا ہے۔''

مجھے اس سپروائزر کا خیال آیا جو ہاتھ میں ٹارچ لیے مکان میں گھوم رہا تھا۔ یقیناً اس نے بھی یہ افواہ سنی ہوگی۔ جب وہ گیا تو اس کے ہاتھ خالی تھے لیکن وہ اپنی جیبوں میں بھی کچھ رکھ سکتا تھا۔

میں نے مقررین سے پوچھا کہ کیا ان میں سے کبھی کسی نے اس مکان میں یہ مسودے تلاش کرنے کی کوشش کی؟ ڈاکٹر لوریل کا کہنا تھا کہ اس کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ مسٹر اینڈریوز نے اس سے اتفاق کیا اور بولے کہ اگر ایسی کوئی چیز دریافت ہوئی تو وہ موجودہ مالکان کی ملکیت ہوگی۔ ممکن ہے کہ وہ اسے فروخت کرنا چاہ رہے ہوں۔

میرے عقب میں بیٹھی ہوئی ایک لمبے قد کی عمر رسیدہ عورت اچانک ہی میری کرسی سے ٹکرائی۔ اس نے مجھے مڑ کر دیکھا اور پلکیں جھپکانے لگی۔ وہ انتہائی خباثت سے لوریل اور اینڈریوز کو گھور رہی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ آگے کی طرف جھکی اور میرے برابر والی کرسی کی پشت مضبوطی سے پکڑ لی۔ مجھے جھرجھری آگئی۔ اس کی انگلیوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے جوڑوں پر کھال لپیٹ دی گئی ہو۔ میں نے گھبرا کر اس پر سے نظریں ہٹالیں۔

تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔ لوگ ایک ایک کر کے جانا شروع ہوگئے۔ میں کچھ دیر اپنے تصورات میں گم بیٹھی رہی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ لوئیسا ہی بذاتِ خود میرے پورچ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے مکان میں بھی گئی ہو اور پڑوسیوں کے ساتھ چائے پیتے ہوئے آنے والی خانہ جنگی پر تبادلہ خیال کیا ہو۔

پھر میں اپنی جگہ سے اٹھی اور عقبی دروازے کی طرف مڑ گئی۔ میرے عقب میں بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت اب دروازے کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ دراز قد اور دبلی پتلی عورت تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی اور سیاہ تھیں۔ کبھی وہ بہت خوب صورت ہوگی لیکن اب ایک کھنڈر نما عمارت نظر آرہی تھی تاہم اب بھی اس کا انداز تمکنانہ تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس سے گزری۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہے اور کس کا انتظار کر رہی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ابھی تک اس کی آنکھوں سے خباثت کیوں جھلک رہی تھی۔

دوسرے روز میں کئی مرتبہ اس مکان کے سامنے سے گزری جسے اب میں ایلکوٹ ہاؤس سمجھ رہی تھی۔ میں نے اپنے تصورات کو کھلا چھوڑ دیا۔ میں نے دیکھا کہ لوئیسا پورچ میں بیٹھی اور باغ میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو مزید نہ روک سکی۔ میں جاننا چاہ رہی تھی کہ لوئیسا کو ایلکوٹ ہاؤس کے عقبی باغ سے میرا مکان کس طرح نظر آتا ہوگا۔ لہٰذا میں نے زیرِ تعمیر مکان کے گرد لگی ہوئی رسی پھلانگی اور ڈرائیو وے میں چلی گئی۔ کئی مزدور اپنا کام چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک میری طرف اشارہ کر کے چلایا۔ میں ہسپانوی زبان نہیں بولتی لیکن اس کی بات کا مفہوم میری سمجھ میں آگیا، وہ کہہ رہا تھا۔ ''باہر جاؤ۔ یہاں کام ہو رہا ہے۔''

''یہاں کوئی ہے جو انگریزی بول سکتا ہو؟'' میں نے پوچھا۔

انہوں نے آپس میں مشورہ کیا پھر ان میں سے ایک دوسری منزل کی جانب منہ کر کے چلایا۔ ''رامحن!''

ایک خوش شکل شخص جس کی صورت کلارک گیبل سے مل رہی تھی، کھڑکی میں نمودار ہوا۔ اس نے جھانک کر نیچے دیکھا اور مجھ پر نظریں جماتے ہوئے غصے سے بولا۔ ''تم مداخلت نہیں کر سکتیں۔''

''میں اس مکان کے عقب میں رہتی ہوں اور اسے صرف ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''ایک منٹ۔'' وہ چلاتے ہوئے بولا اور چند لمحوں میں وہ نیچے اتر کر میرے سامنے آگیا۔ اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور ٹیڑھی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم جیسی خوب صورت خاتون کے لیے میں اپنے اصولوں میں رعایت کر سکتا ہوں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ اپنا ارادہ تبدیل نہ کر دے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا نام کیا ہے چھوٹی لڑکی؟''

مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی کیونکہ میں چالیس کی ہو چکی ہوں اور کوئی مجھے اس طرح کا لقب دے کر بے وقوف نہیں بنا سکتا لیکن یہ بھی عورت کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ اپنے آپ کو کم عمر کہلوانا پسند کرتی ہے۔ اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کچھ ناراض نظر آنے لگا اور اس نے مجھے

خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔ میں نے صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''اسکارلیٹ اوہارا۔''

وہ حیران نظر آنے لگا۔ میں عقبی باغ کی طرف بڑھی۔ میں نے دیکھا کہ لوئیسا کبھی یہاں بیٹھا کرتی ہوگی اور یہاں سے اسے میرے کچن کی کھڑکی بالکل صاف نظر آتی ہوگی۔ میں مڑی اور مکان کے عقبی حصے کی جانب دیکھنے لگی۔

''وہ بڑی کھڑکیاں......'' میں نے دوسری منزل کی کھڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سپروائزر سے کہا۔ ''کیا انہیں جدید بنایا گیا ہے یا یہ اپنی اصلی حالت میں ہیں؟''

''تم یہ کیوں جاننا چاہتی ہو چھوٹی لڑکی؟''

''کیونکہ اس مکان کے عقب میں صرف میرا اپارٹمنٹ ہی نہیں بلکہ میں کیپ سے ہوم اونرز ایسوسی ایشن کے لیے بھی کام کرتی ہوں۔'' میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''ہم پہلے ہی نقشہ منظور کروا چکے ہیں پھر تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟''

''صرف اپنا اطمینان کرنے کے لیے۔ یہی میرا کام ہے۔ صرف میرے سوال کا جواب دے دو اور میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ کیا یہ کھڑکیاں اوپر والے بیڈ روم میں کھلتی ہیں؟''

''ہاں۔'' سپروائزر نے کہا۔ ''تم وہ تمام کاغذات دیکھ سکتی ہو جو ہم نے جمع کروائے ہیں...... اور کچھ پوچھنا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا اور سڑک کی طرف واپس چل دی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی نظریں میری کمر میں سوراخ کر رہی تھیں لیکن مجھے وہ معلوم ہو گیا جو میں جاننا چاہ رہی تھی۔ اگر لوئیسا نے اس گھر میں قیام کے دوران کچھ لکھا ہوگا تو وہ انہی کمروں میں سے کسی ایک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کام کرتی ہوگی جہاں سے اسے میرا مکان بھی نظر آتا ہوگا۔ اس تصور سے ہی میرے رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور میں نے کسی اچھے ریستوران میں لنچ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں کھانا کھانے میں مصروف تھی کہ میں نے دو افراد کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ڈاکٹر کلائیڈ لوریل تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا سوٹ اور ہلکے نیلے رنگ کی ٹائی لگا رکھی تھی۔ بظاہر وہ کھانا کھانے کے لیے ہی تیار ہو کر آیا تھا لیکن مطمئن نظر آنے کے بجائے کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

اس کے ہمراہ ایک خوب صورت عورت تھی جس کے سیاہ بال پشت کی جانب پڑے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اس کا خوب صورت چہرہ نمایاں ہو گیا تھا۔ اسے پہچاننے میں مجھے ایک لمحہ لگا کیونکہ اس وقت اس نے ایلکوٹ کا روپ نہیں دھار رکھا تھا۔ وہ سیسلیا تھی۔

ان دونوں نے جس میز کا انتخاب کیا، وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ میں اگر ذرا سا دائیں جانب جھکتی تو اپنے نصف وجود کو ستون کے پیچھے چھپا کر انہیں بہ آسانی دیکھ سکتی تھی۔ میری دلچسپی اس لیے بھی بڑھ گئی کہ مجھے اس عورت کے بے رو چہرے اور مسکراہٹ میں کوئی مطابقت نظر نہیں آ رہی تھی۔ لوریل نے اپنے لیے کافی اور سیسلیا کے لیے مشروب منگوایا۔ وہ مشروب کی چسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ بڑی توجہ سے لوریل کی باتیں سنتی اور مسکراتی رہی۔ میں جو کچھ دیکھ رہی تھی اس پر یقین کرنا مشکل تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، یہ انداز انیس سو بیس کی فلمی اداکاراؤں جیسا تھا۔ اس نے اپنی نظریں لوریل پر جمائی ہوئی تھیں۔

اسی طرح مجھے لوریل کو دیکھ کر بھی حیرانی ہو رہی تھی۔ وہ کلارک گیبل یا فریڈ میکمورے کی طرح خوش شکل اور جاذب نظر نہیں تھا۔ البتہ اسے خوش لباس ضرور کہا جا سکتا تھا اور مجھے ایسے ہی لوگ اچھے لگتے تھے۔ اس کے باوجود مجھے شبہ تھا کہ سیسلیا کو اس کی شخصیت میں کوئی کشش محسوس ہوئی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ محض اس کے ساتھ کچھ وقت گزار کر ایلکوٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہی ہو۔ اس کے لیے میں اسے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتی تھی۔

میں دوبارہ اپنے کھانے کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ابھی میں ایک اور بیئر منگوانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ سیسلیا نے دوبارہ میری توجہ حاصل کر لی۔ وہ اچانک ہی اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی تھی، اس نے ایک نظر لوریل پر ڈالی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ریستوران سے باہر چلی گئی۔ لوریل کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر ہال کا جائزہ لیا کہ کسی نے یہ منظر دیکھا تو نہیں پھر اس کی آنکھیں مجھ سے چار ہوئیں اور میں نے اس کے چہرے پر شناسائی کی جھلک دیکھی۔

میں نے آہستہ سے سر ہلایا تو اس نے بھی جواب میں ایسا ہی کیا پھر وہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ میری بیئر ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے اٹھتے ہوئے دیکھا تو ایک بار پھر سر ہلا دیا۔ میں نے فوراً ایک فیصلہ کیا اور اس کی میز کے پاس پہنچ کر اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولی۔

''ایمنڈا مورگن۔ میں لوئیسا ایلکوٹ کی پرستار ہوں۔'' میں نے اسے بتایا کہ اس شام اس کی گفتگو سے بہت لطف اندوز ہوئی اور لوئیسا سے متعلق کسی ایسے مواد کا انتظار کر رہی ہوں جو وہ یا کوئی اور میرے عقب میں واقع مکان میں تلاش کر سکے۔

لوریل کرسی کی پشت سے لگ گیا اور مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے شبہ ہے کہ کسی کو وہاں سے کچھ مل سکے گا اور امید ہے کہ ایلکوٹ کے پرستار اور محقق محقق اینڈریوز کے اندازوں کی بنیاد پر اس کے مکان میں جانے یا اس بارے میں افواہیں پھیلانے سے گریز کریں گے۔''

''مشورے کا شکریہ۔'' میں نے جل کر کہا اور وہاں سے چل دی۔ شاید میں اسے متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی لیکن مجھ سے پہلے سیسلیا بھی ناکام ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لوریل کا مسئلہ کیا ہے؟ کیا وہ محض ایک اسکالر تھا اور اس خیال سے خوف محسوس کر رہا تھا کہ ہم جیسے ایلکوٹ کے پرستار اس کے خطوط اور مسودوں کی تلاش میں اس مکان کے چکر لگانا شروع نہ کریں جن کا کوئی وجود نہیں ہے یا وہ خود اپنے طور پر یہ مواد دریافت کرنا چاہ رہا تھا، اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ سیسلیا کے ذہن میں کیا بات ہے؟ کیا وہ لوریل کے ساتھ مل کر کام کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی مکان پر جا کر سپروائزر کو اپنے ساتھ ملا لے۔ کیوں نہ اس سے پہلے میں یہ کوشش کروں؟

میں نے گھر واپس آنے کا فیصلہ کیا لیکن وہاں پہنچتے ہی مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی کار پارکنگ ایریا میں کھڑی کر کے میں پیدل ہی گھر کی طرف چل دی۔ میں جیفرسن اسٹریٹ سے ہوتی ہوئی بائیں جانب کولمبیا اسٹریٹ پر مڑ گئی اور سڑک پار کرنے لگی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ایلکوٹ ہاؤس کے پاس سے گزرتے ہوئے میرا سامنا سپروائزر سے ہو۔

تب میں نے ایک آدمی کو سڑک کی دوسری جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھ سے بیس فٹ آگے چل رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا اور ایلکوٹ ہاؤس سے دس فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے دوبارہ چلنا شروع کیا پھر رک کر اس ڈرائیو وے کی جانب دیکھنے لگا جو مکان کے عقبی صحن کی طرف جاتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایلکوٹ ہاؤس کے سامنے سے گزر رہا تھا اور اس کا سر اوپر

کی جانب تھا جیسے مکان کی بالائی منزل کا معائنہ کر رہا ہو۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اس کے بدن پر وہی جیکٹ تھی جو اس نے تقریب میں پہن رکھی تھی۔ وہ پال اینڈریوز تھا۔

اب مجھے یقین ہو گیا کہ لوریل، اینڈریوز اور سیسلیا ضرور کوئی ایسی بات جانتے ہیں جو مجھے معلوم نہیں یا کم از کم وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں کچھ معلوم ہے۔ لیکن مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا جانتے ہیں۔ یہی کہ لوئیسا کے لکھے ہوئے خطوط اور تحریریں اس مکان میں موجود ہیں یا نہیں کیا ان میں سے کوئی ایک اس مالک کے بارے میں جانتا ہے جسے یہاں سے کچھ ملا ہو؟ نہیں، میں جانتی تھی کہ مالک یہ مکان آرکیٹکٹ کے حوالے کر کے لندن چلا گیا تھا اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔ اس بارے میں ایسوسی ایشن کے پاس مصدقہ معلومات تھیں گو کہ میں اس ایسوسی ایشن کی باقاعدہ ممبر نہیں تھی لیکن اس کی میٹنگوں میں شریک رہتی تھی۔

مجھے لگا کہ وہاں کچھ خاص ہو رہا تھا۔ میں واپس اپنے پورچ میں چلی گئی اور سوچنے لگی کہ میں ان لوگوں کی سرگرمیوں کے بارے میں کس طرح جان پاؤں گی۔ یہ ایسی بات نہیں تھی کہ میں صرف ایک فون کال کر کے ان سے کچھ معلوم کر لیتی۔ چنانچہ میں نے ایلکوٹ ہاؤس کی نگرانی کا فیصلہ کر لیا۔ خاص طور پر شام کے اوقات میں جب مزدور اپنا کام ختم کر کے چلے جاتے تھے۔ اگر اس کے بعد بھی مجھے وہاں ٹارچ کی روشنی نظر آتی تو خود جا کر دیکھ سکتی تھی۔ شاید میں اتنی بہادر نہ ہوں لیکن کم از کم اس پر نظر تو رکھ سکتی تھی۔

لہٰذا میں اوپر گئی اور الماری سے دو عدد دوربینیں نکالیں جو میں آسمان پر اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھنے کے لیے استعمال کیا کرتی تھی۔ ان میں سے ایک میں نے اپنے سونے کے کمرے میں اور دوسری نیچے کچن میں رکھ دی۔

ان تیاریوں کو دیکھ کر مجھے ایک فلم یاد آ گئی جس میں جاسوس ہی جاسوسوں کی جاسوسی کرتا ہے۔ میں نے اپنا مور چا کچن میں بنایا اور دوربین ایسی جگہ رکھ دی تا کہ فوری استعمال کے لیے میرے کام آ سکے۔ کافی پاٹ بھر کر رکھ لیا تا کہ نیند بھگا سکوں۔ کیمرے کی بیٹری بھی پوری طرح چارج کر لی۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اگر کوئی مذموم حرکت دیکھوں تو اسے کیمرے میں محفوظ کر لیا جائے۔ میں نے اپنے آپ کو احمق اور پُرجوش محسوس کیا۔ میں جو کچھ کر رہی تھی، اس کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ میں ایلکوٹ کی یادگاروں کی نگرانی کر رہی ہوں اور انہیں لوریل، اینڈریوز یا سیسلیا کے قبضے میں جانے سے بچانا چاہتی ہوں۔

اندھیرا ہونے پر میں اپنی کرسی سے اٹھی تا کہ کافی کا ایک اور پاٹ بنا لوں۔ اسی وقت میں نے ٹارچ کی روشنی دیکھی۔ میں تیزی سے اوپر والے کمرے میں گئی۔ لمحہ بھر کے لیے رک کر عقبی مکان کا جائزہ لیا۔ یوں لگا جیسے کوئی شخص کسی چیز کی تلاش میں ہے۔ وہ سپروائزر ہی ہو سکتا تھا۔ اسی کے پاس بیرونی دروازے کی چابی ہوتی تھی۔ گو کہ دوسرے دروازوں اور کھڑکیوں کی حالت بھی اتنی خستہ تھی کہ ان کے ذریعے کوئی بھی شخص بہ آسانی اندر آ سکتا تھا۔

میں نے دوربین کے ذریعے دیکھنے کی کوشش کی۔ میں اوپر کے کمرے میں روشنی کر سکتی تھی لیکن اتنی دیر میں تلاشی لینے والا کھڑکی سے ہٹ چکا تھا۔ میں نے پولیس کو فون کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اپنا ارادہ ملتوی کر دیا پھر خیال آیا کہ لوریل یا اینڈریوز کو فون کروں لیکن وہ بھی میری نظر میں مشکوک تھے۔ اس لیے میں نے انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ میں جاننا چاہ رہی تھی کہ تلاشی لینے والا اب کیا کرتا ہے۔

میں نے ایک منٹ کے لیے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور انہیں ملنے لگی پھر میں نے دوربین میں دیکھا تو میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی تھیں یا دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ایک سائے کو عقبی پورچ کی جانب بڑھتے دیکھا۔ اس نے ایک بڑی سی برساتی پہن رکھی تھی جس پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ باہر بارش شروع ہو چکی تھی اور دور کہیں سے بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ سایہ چند لمحوں تک عقبی دروازے کے ساتھ کھڑا رہا پھر اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا اور اندر آنے کے بعد اسے بند کر دیا۔

ایک بار پھر میں نے پولیس کو فون کرنے کے بارے میں سوچا۔ اوپر والی کھڑکی سے میں نے ایک سائے کو حرکت کرتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ سپروائزر ہی ہے پھر وہ مطالعے کے کمرے میں غائب ہو گیا۔ اچانک ہی اس کی ٹارچ کی روشنی ایک دائرے کی شکل میں گھومی اور غائب ہو گئی۔

دوسرے روز مجھے پولیس کو بتانے میں بہت مشکل پیش آئی کہ میں نے کیا دیکھا یا کیا سنا۔ میں حلفیہ نہیں کہہ سکتی کہ مجھے واقعہ نگاری پر عبور حاصل ہے لیکن اتنا معلوم تھا کہ روشنی غائب ہونے کے چند لمحوں بعد میں نے کیا سنا تھا۔ وہ ایک ضرب کی آواز تھی لیکن دھماکا نہیں تھا پھر ایسی کئی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے بعد گرج چمک شروع ہو گئی۔

شاید یہ آواز ضربوں سے پہلے آئی تھی۔ مجھے اس بارے میں یقین نہیں تھا۔ پھر ایک ایسی آواز سنائی دی جیسے کہیں گولی چلی ہو۔ اس نے مجھے خوفزدہ کردیا۔

میں فوراً ہی فون تک پہنچی اور پولیس کو اطلاع دی۔ ممکن ہے کہ مجھے چند لمحوں کی تاخیر ہوگئی ہو کیونکہ میں کچھ دیر کے لیے اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے پولیس کو بتایا کہ غالباً کسی کو گولی لگی ہے۔ میں نے انہیں محلِ وقوع سے بھی آگاہ کردیا۔ میرا خیال ہے کہ جب میں ان سے بات کر رہی تھی تو میں نے مزید کچھ آوازیں سنیں، جھانک کر دیکھا تو کوئی شخص سیاہ برساتی پہنے ہوئے عقبی پورچ سے نمودار ہوا اور میرے گھر کے برابر سے گزرتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ میں نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔ البتہ میرے کانوں میں دور کہیں سے سائرن بجنے کی آواز آرہی تھی۔

اس طرح کی خطرناک صورتِ حال میں ہر بات دھندلی اور غیر واضح معلوم ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ جانتی ہوں کہ پولیس میرے فون کرنے پر دوڑی چلی آئی اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں نے انہیں گولی چلنے کے بارے میں بتادیا۔ جس پولیس والے سے میری بات ہوئی، اس کا چہرہ بھی الجھا ہوا تھا، جانتی ہوں کہ ان کے کہنے پر میں کچن میں ہی ٹھہری رہی۔ میری نظریں کھڑکی سے باہر جمی ہوئی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہاں ایک ایمبولینس آئی اور اس میں سے لوگ اتر کر مکان کے اندر گئے اور کسی کو اسٹریچر پر ڈال کر باہر لے آئے۔

اب سب کچھ واضح ہوگیا تھا۔ میں اپنے گھر میں ہی موجود رہی اور پولیس کو وہ تمام تفصیلات بتادیں جو مجھے معلوم تھیں۔ میں نے انہیں اس سائے کے بارے میں بتایا اور سپروائزر کا حلیہ بھی بیان کردیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اس مکان میں کسی قیمتی چیز کی موجودگی کا امکان ہے۔ پولیس والوں نے میری بات توجہ سے سنی گو کہ میں اس وقت خود بھی تھوڑی سی مکدر تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ گولی چلنے کا کوئی ثبوت نہیں ملا اور جسے میں گولی کی آواز سمجھ رہی تھی وہ غالباً کسی ٹرانسفارمر کے پھٹنے کی آواز ہوگی۔ انہیں وہاں سے سیڑھیوں کے نیچے پڑی ہوئی ایک آدمی کی لاش بھی ملی جس کے سر پر شدید ضرب لگائی گئی تھی۔ غالباً یہ کوئی حادثہ تھا لیکن ابھی اس کا تعین نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے کام سے کام رکھوں۔

میں انہیں کیا بتاتی کہ ان دنوں لوئیسا ایلکوٹ پر ہی کام کر رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ اس موضوع پر کتاب لکھ سکوں گی کہ ہم عورتیں اس سے کیوں محبت کرتی ہیں۔ لہٰذا میں اس معاملے میں پُرعزم تھی اور میرا الوڈیل یا اینڈریوز سے مقابلہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن میں یقیناً اس گھر کی نگرانی کرنا چاہ رہی تھی۔ شام تک اس خبر کی تصدیق ہوگئی کہ مرنے والا سپروائزر راگمن پریلا ہی تھا اس سے میں نے بھی اندازہ لگایا کہ سپروائزر نے بھی اس مکان میں کسی قیمتی چیز کی موجودگی کی افواہ سنی ہوگی اور وہ اس کی تلاش میں آیا ہوگا اور وہ ’سایہ‘ بھی اسی لیے وہاں آیا ہوگا لیکن ابھی یہ معلوم کرنا باقی تھا کہ درحقیقت وہاں کیا واقعہ پیش آیا۔

رات کو اندھیرا پھیلتے ہی میں نے ایک بار پھر اپنا مورچا سنبھال لیا گو کہ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ کچھ دیکھ سکوں گی۔ کم از کم اب اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا لیکن میں اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ لہٰذا جو دماغ میں آیا وہی کیا۔ میں نے پہلی چیز جو دیکھی وہ روشنی کی چمک تھی۔ گھاس میں پڑی ہوئی کسی چیز پر چاندنی کا عکس پڑ رہا تھا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ کوئی جگنو نہ ہو لیکن فوراً ہی اسے مسترد کردیا کیونکہ جگنو عموماً اس وقت روشنی دیتے ہیں جب وہ فضا میں پرواز کر رہے ہوں۔ لہٰذا میں نے اپنی بڑی دوربین نکالی اور اس شے کا معائنہ کرنے لگی۔ یقیناً وہ کوئی جگنو یا روشنی کا کیڑا نہیں تھا اور نہ ہی میں نے گزشتہ شب ایسی کوئی چیز دیکھی تھی اور جب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کیا ہے تو میری سانس گویا رک گئی۔ پھر میں نے اپنی آنکھوں سے دوربین ہٹائی اور اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے یہی خیال آیا کہ یہ کوئی بکسوا (Buckle) ہے۔ کیونکہ میں نے حال ہی میں لوئیسا کی ایک کہانی ختم کی تھی جس کے عنوان میں بھی یہ لفظ موجود تھا۔

میں نے ایک بار پھر دوربین آنکھوں سے لگائی اور دوبارہ اس چیز کا معائنہ کرنے لگی لیکن اپنے آپ کو یقین دلانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں قریب جاکر اسے دیکھوں۔ میں نے دوربین میز پر رکھی۔ ایک ٹارچ اٹھائی اور گھر سے باہر نکل گئی۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی باڑ عبور کی اور ایلکوٹ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ جھک کر وہ چیز اٹھائی۔ وہ واقعی ایک چاندی کا بکسوا تھا اور مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ ضرور اس بڑی برساتی سے گرا ہوگا جو اس سائے نے پہن رکھی تھی۔ ایک بار پھر مجھے لوئیسا کی کہانی کا خیال آیا اور میرے دل میں مزید جاننے کی خواہش ابھری۔

میں پولیس کے لگائے ہوئے زرد فیتے کے نیچے سے

گزر کر پورچ تک پہنچی اور عقبی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ میری توقع کے مطابق وہ زیادہ دور نہیں تھا اور نہ ہی اسے مقفل کیا گیا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے ہلایا لیکن کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ دوسری بار کوشش کرنے پر وہ اپنی جگہ سے تھوڑا سا کھسک گیا۔ میں نے ایک بار پھر اسے دھکیلا، اس میں ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی اور وہ تھوڑا سا کھل گیا۔

میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ میں بیک وقت خوف، جوش اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ ان میں سے کوئی بات بھی ترتیب میں نہیں تھی۔ سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ ٹھیک ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ مجھے فیصلہ کر لینا چاہیے۔ چنانچہ میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی پھر اسے بند کر دیا۔ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی کہ میں یہ کیا کر رہی ہوں۔ چند گہری سانسیں لینے کے بعد میں نے اس کا جواز تلاش کر لیا۔ ٹارچ روشن کی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

ایک کونے میں کاٹھ کباڑ کا ڈھیر پڑا ہوا تھا جبکہ دوسرے کونے میں فرش پر اوزار بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں سے میں صرف ہتھوڑوں اور ڈرل کو ہی پہچان سکی۔ دوسرے اوزاروں کے بارے میں مجھے معلومات نہیں تھیں۔ دو تین جگہوں پر دیوار کا پلاستر اکھڑا ہوا تھا اور اینٹیں نظر آ رہی تھیں۔ لکڑی کا فرش جس پر میں کھڑی ہوئی تھی، ٹھوس اور نیا لگ رہا تھا۔ میں ایک دوسرے دروازے سے گزر کر عقبی کمرے میں چلی گئی۔ وہاں مزید کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ پھر میں سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ سپروائزر کی لاش اسی جگہ سے ملی تھی۔ میں یہ شرط لگانے کے لیے تیار تھی کہ کسی نے عقب سے اس پر لکڑی یا ہتھوڑے سے بھاری ضرب لگائی تھی اور اسے ان سیڑھیوں سے دھکا دے دیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اس شخص کو جانتی ہوں جس نے یہ قتل کیا تھا۔

میں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اس کمرے تک پہنچی جس کی کھڑکیاں میرے گھر سے نظر آتی تھیں۔ میں نے ٹارچ جلا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے ایک آتش دان نظر آیا جس کی بیرونی دیواروں پر وکٹورین طرز کے ٹائلز لگے ہوئے تھے جو جگہ جگہ سے اکھڑ گئے تھے۔ ابھی تک کام کرنے والے مزدوروں نے اس کمرے کا رخ نہیں کیا تھا۔ البتہ ایک کونے میں کچھ کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔ بے چارہ سپروائزر۔ شاید وہ اس کمرے میں ایلکوٹ کے مسودوں کی تلاش میں آیا ہو یا اس نے صرف کمرے کا معائنہ کیا ہوتا کہ مزدوروں کو کام کے بارے میں ہدایات دے سکے۔ بہرحال اس نے غلط وقت پر غلط جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

میں نے آتش دان پر نظریں جما دیں اور سوچنے لگی کہ شاید سپروائزر کو مطلوبہ چیز مل گئی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ناکامی ہوئی ہو۔ یہ امکان بھی تھا کہ جس کسی نے اس کے سر پر ضرب لگائی، اس کے پاس وہ چیز ہو۔ میں پنجوں کے بل چلتی ہوئی آتش دان تک گئی اور جھک کر ٹارچ نیچے کر دی۔ میں نے ان میں سے ایک ٹائل کو کھینچا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ میں نے لکڑی کا ایک چھوٹا ٹکڑا اٹھایا اور اس سے آہستہ آہستہ چند دوسرے ٹائلوں پر ضرب لگائی اور صحیح جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے اس کے نیچے خلا ہے۔ میں نے اسے انگلی سے اٹھانے کی کوشش کی جہاں سے سیمنٹ جھڑ چکا تھا۔ ٹائل نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا اور مزید چند ٹائل ہٹا دیے اور مجھے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی لیکن وہ چیز مجھے مل گئی تھی۔

میں نے اسے بڑی احتیاط سے باہر نکالا۔ کاغذ بوسیدہ ہو چکا تھا لیکن تحریر اب بھی واضح تھی۔ ”آسیب زدہ حویلی“

عزم

ادھیڑ عمر بیوہ پڑوس کے نوجوان سے کہہ رہی تھی۔ ”پیسا پیسا جوڑ کر میں نے دو ہزار روپے جمع کیے ہیں۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میری تدفین کے اخراجات ان ہی روپوں سے ہوں۔ وہ روپے میرے صندوق میں رکھے ہیں۔“

نوجوان نے تردد سے کہا۔ ”خالہ! نکاح کر لیتیں تو اچھا تھا۔ کوئی دکھ سکھ کا ساتھی تو ہوتا۔ کریم بخش بھی رنڈوا ہے، پریشان حال ہے۔ تم سے کوئی دس سال ہی چھوٹا ہوگا۔ کہو تو اس سے بات کروں؟“

”جیسی تمہاری مرضی بیٹے۔ تم ہی میرے خیر خواہ ہو۔“ بیوہ نے لمبی سرد آہ بھر کر کہا۔

نوجوان بولا۔ ”لیکن خالہ...... اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ تمہاری رقم نکاح پر اٹھ جائے گی جو تم نے کفن دفن کے لیے جمع کر رکھی ہے۔“

”تو کیا ہوا بیٹا۔ میں اور جمع کر لوں گی۔“ بیوہ نے ایک نئے عزم سے کہا۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

از لوئیسا بے لیلکوٹ۔

میں ابھی تک حیرانی کی وجہ سے جھکی ہوئی تھی کہ میں نے اپنے عقب میں قدموں کی آواز سنی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کون ہے۔ میں نے بڑی احتیاط اور تیزی سے وہ مسودہ اسی جگہ رکھا، کھڑی ہوئی اور مڑ کر دیکھا۔ میرے سامنے سیسلیا ایڈورڈ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا پستول اور دوسرے ہاتھ میں لکڑی کا ٹکڑا تھا۔ میں نے اپنی نظریں پستول پر جمادیں۔

''یہ مسودہ مجھے دے دو۔'' اس نے کہا۔ ''آہستہ سے اٹھاؤ اور اپنے سامنے فرش پر رکھ دو۔ پھر کھڑکی کی طرف منہ کرلو۔''

میں جانتی تھی کہ اس کے دماغ میں کیا ہے۔ اس کا پستول استعمال کرنے کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ اس نے بھی میری طرح لوئیسا کی کہانی Betrayed by a buckle پڑھ رکھی تھی۔ میرا دماغ تیزی سے کام کررہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر کھڑکی کے قریب گئی تو وہ کسی بھی طرح میری کھوپڑی پر لکڑی سے ضرب لگا کر مجھے کھڑکی سے باہر دھکا دے دے گی۔ جیسے اس نے سپر دائزر کے سر پر ضرب لگائی تھی یا لوئیسا کی کہانی کا کردار کھڑکی سے گر کر مرگیا تھا۔

''جلدی کرو۔'' وہ غرائی۔

میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن میں کچھ وقت لینا چاہ رہی تھی تاکہ کوئی ترکیب سوچ سکوں۔ میں نے آہستہ سے نیچے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت بوسیدہ حالت میں ہے۔''

میں مسودہ اٹھانے کے لیے مڑی اور نکلے ہوئے ٹائل کو دیکھنے لگی۔ شاید میں یہ سیسلیا پر پھینک دیتی۔ میں نے اپنی پشت اس طرح رکھی کہ میرے بازو نظر نہ آسکیں۔ مسودہ ٹائل پر رکھا اور آہستہ سے کھڑی ہوگئی۔ میں ایک ہاتھ سے مسودہ نہیں پکڑنا چاہ رہی تھی کیونکہ اس طرح بوسیدہ کاغذات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا لیکن میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجھے دوسرے ہاتھ سے ٹائل پکڑنا تھا۔

میں آہستہ سے مڑی اور اپنی جگہ پر منجمد ہوگئی۔ ایک سیاہ سایہ بڑی احتیاط سے سیسلیا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں سانس روکے اسے دیکھتی رہی۔ مجھے پوری امید تھی کہ سیسلیا کو پستول استعمال کرنے کی مہلت نہیں ملے گی۔ اس نے سیسلیا کو گردن سے پکڑلیا اور پستول اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ میں گھٹنوں کے بل جھک گئی پھر مجھے ایک چیخ سنائی دی۔

''پستول اٹھاؤ۔'' لوریل نے چلاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں نے احتیاط سے مسودہ نیچے رکھا اور بولی۔ ''کہاں ہے؟''

''کونے میں۔ کھڑکی کے پاس۔''

میں نے لپک کر پستول اٹھایا اور کھڑے ہوکر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ یہاں سے چھلانگ لگانے کی صورت میں مجھے شدید چوٹ لگ سکتی تھی۔ ممکن ہے کہ میں نیچے پڑے ہوئے کاٹھ کباڑ کے ڈھیر پر گرجاتی۔ ایسی صورت میں میری موت واقع ہوسکتی تھی۔ ورنہ اتنی زخمی ضرور ہوجاتی کہ سیسلیا کو مسودہ اٹھانے اور نیچے آکر میرے سر پر ضرب لگانے کا موقع مل جاتا۔ لہٰذا میں نے چھلانگ لگانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور سیسلیا کے پاس سے گزرتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

لوریل نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''تو تمہیں اس چاندی کے بکل سے یہ سراغ ملا۔ تم جانتی تھیں کہ سیسلیا نے یہ کہانی پڑھ رکھی تھی؟''

''یہ تو بالکل واضح ہے۔ اس تقریب میں اس نے کہانی کے جس مرکزی کردار کا روپ دھارا، وہ چاندی کے بکل لگے جوتے پہنتی تھی۔ لہٰذا اس نے بھی ویسے جوتے پہنے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس مکان میں لوئیسا کا کوئی مسودہ ہے تو وہ اسی جگہ چھپایا گیا ہوگا جہاں کہانی میں بوڑھی عورت مرکزی کردار کو بلیک میل کرنے کے لیے چھپاتی ہے لیکن میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ لوئیسا کو مسودہ چھپانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔'' لوریل نے کہا۔ ''میری ریسرچ کے مطابق اس نے آسیب زدہ ہوٹل کا مسودہ اس خاندان کی لڑکی کے لیے تحریر کیا تھا جن کے ساتھ وہ قیام پذیر تھی۔ اس نے وہ مسودہ اس لڑکی کو دے دیا تھا لیکن اس کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔''

''مگر اس سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ یہ مسودہ آتش دان میں کیوں چھپایا گیا؟''

''اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن جب خاندان کے سربراہ کو کاروبار میں نقصان ہونے لگا تو وہ افراتفری میں یہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا ارادہ واپس آنے کا تھا۔ لہٰذا اس لڑکی نے اس ڈر سے کہ کہیں خالی مکان میں چور نہ آجائیں، وہ مسودہ آتش دان میں چھپادیا۔ بہرحال وہ خاندان کبھی واپس نہیں آیا۔ وہ لڑکی نمونیا میں مبتلا ہوکر مرگئی اور باپ دیوالیہ ہوگیا۔''

''ہونہہ۔'' میں نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک اور سوال کرنا چاہتی ہوں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہوگیا ہے کہ اس تقریب میں میرے پیچھے بیٹھی ہوئی عورت سیسلیا کی ماں تھی۔ کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی تعلق ان لوگوں سے رہا ہو جن کے پاس لوئیسا نے قیام کیا تھا؟''

لوریل حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ میں تمہیں بتانے ہی والا تھا۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''اس سے پہلے کہ تمہیں بتاؤں، میں ایک سوال اور پوچھنا چاہوں گی۔ کیا سیسلیا کے آباؤاجداد میں سے کوئی اس خاندان کے لیے کام کیا کرتا تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ اس بوڑھی عورت کی پردادی۔'' لوریل نے کہا۔

''نہیں۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ اس چھپے ہوئے مسودے کی افواہ اسی خاندان کے کسی فرد نے پھیلائی ہوگی جو یہاں کے دوسرے رہائشیوں کی طرح سیسلیا کی ماں نے بھی سنی اور جب اس مکان کی مرمت کا کام شروع ہوا تو اس افواہ کو ایک نئی زندگی مل گئی۔''

''لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' لوریل نے پوچھا۔

''اوہ، مجھے یاد آگیا۔ اس کہانی میں، وہ بوڑھی عورت اس خاندان میں کام کرتی ہے۔ میں یہ حصہ بھول گیا تھا۔''

میں مسکرائی۔ ''لیکن تمہیں یہ یاد رہا کہ وہ مسودہ آتش دان میں چھپایا گیا تھا۔ اسی لیے تم اس رات اس گھر میں آئے۔ میں کوئی الزام نہیں لگا رہی۔ اگر تم نہ آتے تو آج کلارک کیبل میرے ساتھ ہوتا اور میں اسے کھڑکی سے اسی طرح دھکا دیتی جیسا کہ کہانی میں بتایا گیا ہے۔''

''کلارک کیبل؟''

''میں سپروائزر رالف کی بات کر رہی ہوں۔ اس کی شکل کلارک کیبل سے بہت ملتی تھی۔''

''مجھے یاد تھا کہ کہانی میں مسودہ کہاں چھپایا گیا تھا۔ میں سیسلیا سے پہلے اسے حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ لنچ کیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ مجھے اپنے ساتھ لے کر وہ اس مکان میں آئے۔''

''کیوں؟''

''میرا خیال ہے کہ اسے شک ہوگیا تھا کہ میں اس مسودے کے بارے میں جانتا ہوں۔ میرے انکار کے باوجود بھی وہ باز نہیں آئی۔''

''اگر تم اس کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ چلے جاتے تو وہ تمہیں بھی ٹھکانے لگا دیتی اور شاید تم اس مکان سے زندہ واپس نہ آتے اور تمہاری لاش بھی کلارک کیبل کے ساتھ ہی ملتی۔''

''لیکن کیا ہم جانتے ہیں کہ اسی نے سپروائزر کو قتل کیا اور کیوں؟''

''اگر تم نے آج شام کی خبریں سنی ہوں جن میں میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ جس کے مطابق سیڑھیوں سے گرنے سے پہلے ہی اس کے سر پر ضرب لگائی گئی تھی۔ شاید ہم کبھی نہ جان سکیں کہ سیسلیا نے اس کے سر پر شدید ضرب کیوں لگائی تھی۔ شاید وہ آتش دان کے بہت قریب پہنچ چکا تھا اور وہ اس گھر میں اس کی موجودگی سے پریشان ہوگئی تھی۔ وہ خود یہ مسودہ حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔''

لوریل نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا ہی ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ اس رات وہ مسودہ اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں گئی؟''

''عین اسی وقت ٹرانسفارمر پھٹ گیا اور میں نے پولیس کو فون کردیا جو فوراً ہی آگئی۔ سیسلیا کو اتنی مہلت نہ مل سکی کہ وہ مطلوبہ ٹائل کو تلاش کر کے مسودہ نکال سکے۔''

لوریل نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مکان کے مالک نے یہ مسودہ یونیورسٹی کو عطیہ کردیا ہے۔ جتنی جلدی ہم اس کے تحفظ کے لیے کام کرسکیں، بہتر ہوگا۔ البتہ تین دن کے اندر میں تمہارے ساتھ ڈنر ضرور کروں گا۔ معاف کرنا۔ اس وقت میں چائے کے لیے نہیں رک سکتا۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد ہم اسی پورچ میں بیٹھ کر چائے پئیں گے۔ اس دوران میں کچھ ضروری کام نمٹالوں۔''

''مثلاً؟'' لوریل نے پوچھا۔

''ابھی مجھے ایلکوٹ کی پانچ کہانیاں اور پڑھنا ہیں۔ کون جانے ان میں سے بھی کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے۔''

لوریل کے جانے کے بعد میں اپنے بیڈروم میں گئی۔ لوئیسا کی کہانیوں کا مجموعہ اٹھایا۔ ایک نظر ایلکوٹ ہاؤس کی کھڑکی پر ڈالی اور واپس پورچ میں آکر اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر میں نے کتاب کھولی اور اپنی محبوب مصنفہ کی اگلی کہانی پڑھنے لگی۔ اسے خراج تحسین پیش کرنے کا اس سے اچھا طریقہ کیا ہوسکتا تھا کہ میں اس کے نایاب مسودے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

جب جب انسان ربّ کائنات کے بارے میں سوچنے اور جاننے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے تجسس کی ابتدا شاید اپنی ہی ذات سے ہوتی ہے کیونکہ یہ کائنات انسان کے لیے تخلیق ہوئی اور انسان کو کائنات کی سب سے معتبر حیثیت سے نوازا گیا... لیکن تمام انسانوں میں اسے محبوب وہی بندے ہیں جو اس کے اطاعت گزار اور برگزیدہ ہیں... غوث پاک کا شمار بھی انہی خاص اور مقرب بندوں میں ہوتا ہے جن کی کوئی بات باری تعالیٰ رد نہیں کرتا۔ سبحان اللہ۔ اگرچہ ان رستوں میں شیطان قدم قدم پر رکاوٹیں ڈالتا ہے مگر بندگی کا اصل مزہ ہی ان رکاوٹوں کو عبور کرنے میں ہے۔

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی زندگی کے ایمان افروز واقعات

دوسرا اور آخری حصہ

حضرت محبوب سبحانی

غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ

ضیا تسنیم بلگرامی



ایک قاری آپ کے سامنے قرات کر رہا تھا۔ آواز کے سوز اور دلکش لحن نے حاضرین کو اپنے آپ میں نہیں رہنے دیا تھا۔ آپ بھی ایک خاص کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ جب قاری نے لمن الملک الیوم (آج ملک کس کے واسطے ہے) پڑھا تو آپ کو حال آگیا اور وجد کے عالم میں کھڑے ہو گئے اور نہایت پُرجوش لہجے میں پوچھا۔ ''من یقول الملک لی (کوئی ہے جو کہے کہ ملک میرے واسطے ہے)۔''

حاضرین سوو بانہ کھڑے ہوگئے۔ ہر کوئی دم بخود تھا۔ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو یہ کہنے کی ہمت کر سکتا کہ میں کہتا ہوں، یہ ملک میرے واسطے ہے۔

آپ نے حاضرین پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر وہی سوال کیا۔ ''کوئی ہے، جو یہ کہنے کی ہمت کرے کہ ملک میرے واسطے ہے؟''

شیخ احمد نامی ایک شخص کھڑا ہوا اور نہایت جرأت اور دلیری سے کہا۔ ''یہ میں کہتا ہوں کہ یہ ملک میرا ہے کیونکہ خدا میرا ہے اس لیے اس کا ملک بھی میرا ہے۔''

آپ نے عالمِ وجد میں نہایت پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''اے نادان انسان! جب تک تو خود اس کا نہ ہوجائے، یہ کس طرح کہہ سکتا ہے کہ وہ تیرا ہے اور جب تو اس کا نہیں تو ملک تیرا کیونکر ہوسکتا ہے؟''

اس جواب نے شیخ احمد کو پاگل کر دیا، اس کا دماغی توازن جاتا رہا اور وہ کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف نکل گیا۔

☆☆☆

شیخ مظفر بن منصور بن مبارک واسطی عین عالمِ شباب میں آپ سے ملاقات کرنے گئے۔ شیخ مظفر نہایت عالم و فاضل شخص تھے۔ انہیں علومِ روحانیہ اور فلسفے سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ ان کے پاس ایک ایسی کتاب ہر وقت رہتی تھی جس میں علومِ روحانیہ اور مسائلِ فلسفہ پر بحث کی گئی تھی۔ انہیں یہ کتاب بے حد پسند تھی چنانچہ یہ جس وقت حضرت عبدالقادر کی خدمت میں پہنچے، اس وقت مذکورہ کتاب ان کے ہاتھ میں تھی۔ آپ نے شیخ مظفر سے یہ نہیں پوچھا کہ تمہارے ہاتھ میں یہ کونسی کتاب ہے اور اس میں کن مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ آپ نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''شیخ! یہ کتاب جو تمہارے ہاتھ میں ہے، تمہاری اچھی رفیق نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس کو دھو ڈالو۔''

شیخ مظفر کو جہاں یہ کتاب بہت عزیز تھی تو وہیں آپ کی محبت اور دوستی بھی بہت عزیز تھی۔ ذرا سے غور و فکر کے بعد شیخ مظفر نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کو فی الحال کہیں چھپا دیا جائے۔ اس کتاب کے بعض مسائل انہیں ازبر ہوگئے تھے اور وہ انہیں دل و جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ وہ اس کتاب کو کہیں چھپا دینے کی نیت سے اٹھے، آپ نے شیخ مظفر کو بڑی توجہ سے دیکھا۔ ان نظروں نے غضب ہی کر دیا۔ شیخ مظفر اٹھنا چاہتے تھے مگر نہیں اٹھ سکے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے انہیں کسی نے باندھ کر ڈال دیا ہے۔

ایسی حالت میں آپ نے پوچھا۔ ''وہ کتاب کہاں ہے؟''

شیخ مظفر نے کہا۔ ''حضرت! حاضر کرتا ہوں۔''

لیکن یہ کتاب ان کے حوالے کرتے ہوئے انہیں شرم سی محسوس ہورہی تھی۔

آپ نے شیخ مظفر سے کہا۔ ''میں پوچھتا ہوں، وہ کتاب کہاں ہے؟''

شیخ مظفر نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''وہ کتاب حاضر ہے، ملاحظہ فرمائیں اور کوئی حکم ہو تو مطلع فرمائیں۔ اللہ نے چاہا تو بے ریا، مخلص اور متقی انسان ٹھہروں گا۔''

آپ نے کتاب ہاتھ میں لی اور فرمایا۔ ''اس کتاب میں جو کچھ بھی ہے، وہ مسائلِ فلسفہ پر ہے۔'' آپ نے کتاب ہاتھ میں لے کر فوراً ہی واپس کر دی اور فرمایا۔ ''یہ کتاب تو بہت اچھی ہے، اس کا کیا کہنا۔ واہ واہ سبحان اللہ۔''

شیخ مظفر نے یہ کتاب دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس کو الٹ پلٹ کر جو دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے اوراق سادہ تھے۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

شیخ مظفر نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ نے اس کتاب کو دھو ڈالا، خوب! اب یہ میرے کس کام کی؟''

آپ نے سادہ کتاب دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس پر اپنا داہنا ہاتھ پھیر کر فرمایا۔ ''شیخ! یہ کتاب تم ہی رکھ لو اپنے پاس...... بڑی عمدہ کتاب ہے۔ ابن ضریس کی فضائل القرآن۔ اس کو اپنے زمانے کے بہترین خوش نویس نے لکھا ہے۔''

آپ کچھ دیر شیخ مظفر کی صورت دیکھتے رہے پھر فرمایا۔ ''شیخ! جو بات تمہاری زبان پر نہیں، ابھی دل ہی میں ہے اور تم اس سے توبہ بھی کرنا چاہتے ہو، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

شیخ مظفر نے جواب دیا۔ ''بیشک حضرت! میں اس سے توبہ کرنا چاہتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اچھا شیخ اٹھو۔''

شیخ مظفر اٹھے اور پوچھا۔ ''فرمایئے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تم نے اپنی فلسفے والی کتاب میں جو کچھ پڑھا تھا، تھوڑا بہت تو یاد ہوگا؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''جی ہاں یاد کیوں نہیں۔ تھوڑا بہت لیا تھی، کتاب کا بیشتر حصہ یاد ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اس کا کچھ حصہ سناؤ۔''
شیخ نے کہا۔ ''بہتر ہے سناتا ہوں۔''
اس کے بعد شیخ نے بڑی کوشش کی کہ اسے جو کچھ یاد ہے، سنا دے لیکن شیخ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کو جو کچھ بھی یاد تھا، دل و دماغ پر سے حرفِ غلط کی طرح محو ہو چکا تھا۔
آپ نے فرمایا۔ ''شیخ! سوچ کیا رہے ہو، کتاب کی طرح ہر بات ذہن اور حافظے سے بھی محو ہو چکی ہے۔''
شیخ مظفر کو چکر آ گیا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گئے۔
شیخ مظفر کچھ عرصہ آپ کی صحبت میں رہے اور پھر کچھ عرصے کے لیے سیر و سیاحت کو نکل گئے۔ گھوم پھر کر جب دوبارہ آپ کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے فرمایا۔ ''شیخ! کہاں گھوم پھر آئے؟''
شیخ مظفر نے جواب دیا۔ ''حضرت! میری سیر و سیاحت کی داستان تو لمبی بھی ہے اور عجیب بھی مگر یہیں قریب ہی میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو خود کو روحانیت میں بہت پہنچا ہوا سمجھتا ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''وہ شخص خود کو بلند مرتبہ سمجھتا ہے؟ کیا کہتا ہے؟''
شیخ مظفر نے کہا۔ ''وہ شخص کہتا ہے کہ میں حضرت یونسؑ سے زیادہ بلند مرتبہ ہوں (توبہ استغفار)۔ معلوم نہیں وہ ایسا دعویٰ کیوں اور کس بنیاد پر کرتا ہے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''اس شخص کو میں ذاتی طور پر تو نہیں جانتا لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس شخص کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں اور وہ عنقریب اس دنیائے آب و گل سے پیچھا چھڑا لے گا۔''
شیخ مظفر یہ سنتے ہی اس بزرگ کی طرف بھاگ کر پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے در پر آنے والوں کا سوگوار ہجوم تھا۔ وہ لوگ رو رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ بزرگ وصال پا چکے ہیں۔

☆☆☆

آپ لہو و لعب کے خلاف تقریر فرما رہے تھے۔ مجمع کا حال بے قابو تھا۔ کسی کو بھی کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ تقریر کرتے کرتے آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد آپ نے فرمایا۔ ''میں تم لوگوں سے زیادہ نہیں صرف سو دینار مانگتا ہوں۔''
آپ کی زبان سے یہ مطالبہ نکلا ہی تھا کہ بہت سارے لوگ سو سو دینار لے کر آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ نے ان میں سے ایک سے سو دینار لے لیے اور بقیہ سے نہیں لیے۔
لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی۔ ایک صاحب سے رہا نہیں گیا۔ آگے بڑھ کر پوچھ ہی لیا، بولے۔ ''جناب! ایک بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔ جب آپ نے سو دینار طلب کیے تھے تو ایک سے سو دینار لے کر بقیہ کو واپس کر دینا عجیب سا لگتا ہے۔''
آپ نے اپنے خادم ابوالرضا کو آواز دی اور کہا۔ ''تو اسی وقت مقبرہ شونیزیہ پر چلا جا۔ وہاں ایک بوڑھا شخص بیٹھا بربط بجا رہا ہوگا۔ تو یہ سو دینار اس مستحق کو دے دے جا کر۔''
خادم ابوالرضا نے پوچھا۔ ''بس، یا کوئی اور حکم؟''
آپ نے فرمایا۔ ''تو اس بربط نواز کو میرے پاس ضرور لائے گا۔''
خادم نے عرض کیا۔ ''اور اگر اس نے میرے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تب پھر میں کیا کروں گا؟''
آپ نے فرمایا۔ ''اگر اس نے آنے سے انکار کر دیا تو جو کچھ بھی کرنا ہوگا میں کروں گا تم کیوں کرو گے؟''
خادم ابوالرضا سو دینار لے کر مقبرہ شونیزیہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ مقبرے پر پہنچا تو اس نے دیکھا، ایک بوڑھا شخص مقبرے کے قریب زمین پر بیٹھا بربط بجا رہا ہے۔ خادم ابوالرضا نے بربط نواز کو مخاطب کیا۔ ''دیکھو، ادھر آؤ میرے پاس۔ خدا نے تمہیں کئی خوبیاں دی ہیں۔ ہمارے شیخ عبدالقادر بہت ہی بلند مرتبہ شخص ہیں۔ یہ سو دینار انہوں نے آپ کو بھیجے ہیں، براہِ کرم انہیں وصول فرمائیے۔''
خادم ابوالرضا اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے عرض کیا۔ ''یا شیخ گرامی قدر! اب میں آپ کے پاس آ رہا ہوں۔''
کسی نے خادم کی یہ آواز سن لی، اس نے پوچھا۔ ''یہ شیخ گرامی قدر سے تیری کیا مراد ہے؟''

خادم نے جواب دیا۔ "شیخ گرامی قدر سے مراد ہے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔"
سوال کرنے والے نے کہا۔ "لیکن تو ان کے پاس کیوں جائے گا؟"
خادم ابوالرضا نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "ارے احمق! میں ان کا خادم ہوں۔" اس کے بعد انہوں نے بربط نواز سے کہا۔ "جناب! آپ کو ذرا زحمت تو ضرور ہوگی مگر میں کیا کروں، مجھ کو جو حکم ملا ہے میں وہ بجالاؤں گا۔"
بربط نواز کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا، بولا۔ "واللہ، میری یہ دلی خواہش تھی کہ مجھے شیخ عبدالقادر جیلانی کا دیدار اور ذرا سی دیر کے لیے صحبت میسر آجائے چنانچہ میری خواہش پوری ہو چکی۔ اب شاید میری کوئی خواہش نہیں۔"
بربط نواز نے بربط کاندھے پر رکھا اور خادم ابوالرضا کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جس وقت یہ دونوں آپ کی مجلس میں پہنچے آپ وعظ بیان فرما رہے تھے۔
آپ نے کچھ دیر کے لیے وعظ کو روک دیا اور فرمایا۔ "افسوس کہ میں آج اس بوڑھے بربط نواز کو اپنی محفل میں اس منبر پر بلا رہا ہوں جہاں آج سے پہلے کوئی معمولی حسب نسب کا انسان نہیں پہنچ سکا۔"
لوگوں نے نعرے بلند کیے اور آپ نے بربط نواز کو اپنے پاس کھڑا کر کے اس کو حکم دیا۔ "بربط نواز! ان لوگوں کو اپنی وہ داستان سنادے جس کا سو دینار سے گہرا تعلق ہے۔"
بربط نواز نے بتانا شروع کیا۔ "صاحبان! میں اپنی صغر سنی ہی سے بربط نوازی کا شوق پورا کر رہا ہوں۔" وہ کچھ دیر کے لیے رک گیا اور پھر بولنا شروع کر دیا۔ "جب میرے گانے کا اعلان ہوتا تھا تو ہر طرف سے اُمڈ اُمڈ کر لوگ آجاتے تھے لیکن جب میں کبر سنی کو پہنچا تو لوگوں کا مجھ پر دباؤ کم ہو گیا اور انہوں نے مجھ کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ میں یہ اذیت برداشت نہیں کر سکتا۔ میں یہ دکھ نہیں جھیل سکتا۔ میں نے یہ قسم کھائی کہ اب میں ان لوگوں کو گا کر نہیں سناؤں گا اور اب میرے گانوں سے کبر سن حضرات خوش ہی ہاؤں اور دل برداشتہ ہو جایا کریں گے۔ اب میری اچھی اور پیاری دھنیں صرف مُردے ہی سن سکیں گے۔"
وہ بولتا رہا۔ "اس عہد کے بعد میں شہر سے نکل گیا اور مُردوں کی بستی میں ان کا دل بہلانے لگا۔ میں مُردوں کی قبروں کے سرہانے کھڑے ہو کر آواز لگایا کرتا تھا۔ "ہے کوئی جو مجھے کام کا انسان بنادے۔"
اتنے میں ایک قبر میں سے ایک ہاتھ نکلا اور پھر سر نمودار ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "اے شخص! تو مجھ کو کہاں تک اپنے گانے سنائے گا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اب تم خدا کے بن جاؤ اور پھر دیکھو اس کی شانِ کبریائی کا مزہ۔ اے شخص! یہاں سے چلا جا اور کوشش کر کہ تو اپنا گانا خدا کو سنائے۔ اس کے بعد مجھے نیند آگئی۔ جب میں بیدار ہوا تو میری زبان پر یہ اشعار تھے۔
الٰہی قیامت کے دن کے لیے میرے پاس کوئی سامان نہیں۔
بجز اس کے کہ زبان سے تیری حمد و ثنا کرتا ہوں اور دل سے امیدِ مغفرت رکھتا ہوں۔
کیونکہ میں جانتا ہوں کہ امیدوار کل تیری درگاہ سے فائز المرام ہوں گے۔
ان حالات میں اگر میں محروم رہ جاؤں تو میں اپنی بدقسمتی پر سخت افسوس کروں گا۔
خدایا! اگر صرف نیک لوگ ہی تیری بخشش کے مستحق ہوئے
تو پھر گناہ گار کہاں جائیں گے۔ انہیں کون پناہ دے گا۔
کل قیامت کے دن میرا بڑھاپا میرا شفیع بن جائے گا۔
کیونکہ تو بڑھاپے کا خیال کر کے دوزخ سے بچالے گا۔
میں یہ اشعار پڑھ ہی رہا تھا کہ آپ کے خادم نے مجھے سو دینار دیے۔ اب میں گانے بجانے سے تائب ہو کر اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔"
اس کے بعد اس نے اپنا بربط توڑ دیا اور گانے بجانے سے تائب ہو گیا۔
گانے والا تو چپ ہو گیا مگر آپ نے لوگوں کو مخاطب کیا۔ "لوگو! اس شخص نے لہو و لعب میں راست بازی اور سچائی اختیار کی تو خدا نے بھی اس کا ساتھ دیا اور منزلِ مقصود تک بہ آسانی پہنچا دیا۔ لوگو! سوچو اور بتاؤ کہ جو شخص اپنے تمام حال و احوال میں سچائی سے کام لے، اس کا کیا حال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم بات کہو تو انصاف کی یعنی سچ بولا کرو۔"
جن لوگوں کو سو سو دینار واپس دیے گئے تھے، انہوں نے وہ دینار یکجا کر کے تائب گانے والے کو دے دیے۔

ابوالفرج ابن الہابی جب آپ کی باتیں دوسروں کی زبانی سنتے تو بعض باتیں ان کی سمجھ میں ہرگز نہ آتیں۔ سوچتے، اگر کبھی شیخ سے ملاقات ہوگئی تو بالمشافہ بات کر کے شبہات دور کریں گے۔

کچھ عرصے بعد ابوالفرج بغداد کے ایک محلہ باب الازج گئے۔ جب وہ وہاں سے واپس ہوئے تو ان کا گزر آپ کے مدرسے کے قریب سے ہوا۔ اس وقت آپ کی مسجد میں عصر کی تکبیر کہی جارہی تھی۔ ابوالفرج نے سوچا کیوں نہ عصر کی نماز اس مسجد میں ادا کرلی جائے اور یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ یہاں آپ سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور ابوالفرج انہیں سلام بھی کرسکیں گے۔

ابوالفرج مسجد میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا جماعت کھڑی ہوچکی ہے۔ ابوالفرج جماعت میں شامل ہوگئے اور نمازِ عصر ادا کی۔

نماز اور دعا سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے ابوالفرج کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ جب یہ آپ کے پاس پہنچ گئے تو آپ نے فرمایا۔ ''فرزندِ من! اگر تم میرے پاس اپنا کام لے کر آتے تو میں تمہارا کام پورا کردیتا۔ میں دیکھتا ہوں تم پر نسیان بہت غالب ہے۔ تم نے اس وقت بھولے سے بے وضو نماز پڑھ ڈالی۔''

ابوالفرج کو یاد آیا کہ واقعی ان سے یہ غلطی سرزد ہوچکی ہے، ان پر آپ کی وحشت غالب آگئی۔ ابوالفرج نے آپ سے درخواست کی۔ ''میں آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''رہو...... بشوق رہو۔''

☆☆☆

کسی نے شیخ حماد سے پوچھا۔ ''عبدالقادر کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟''

شیخ حماد نے کہا۔ ''میں نے ان کے سر پر دو جھنڈے دیکھے ہیں جو زمین سے ملکوتِ اعلیٰ تک پہنچے ہوئے ہیں اور افقِ اعلیٰ میں میں نے ان کے نام کی دھوم سنی ہے۔''

ایک دن شیخ حماد کی مجلس میں آپ تشریف لے گئے۔ شیخ حماد اپنے شاگرد کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے اور فرمایا۔ ''مرحبا یا لجبل الراسخ ولطود المنیف لا یتحرک'' (ایسے مضبوط اور بلند پہاڑ کا آنا مبارک ہو جو کسی بھی طرح جنبش نہیں کرسکتا)

استاد نے شاگرد کو اپنے دائیں طرف بٹھالیا اور پوچھا۔ ''عبدالقادر! حدیث اور کلام میں کیا فرق ہوتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''حدیث وہ ہے جس کی خواہش کی جائے جیسا کہ سوال جواب میں ہوتا ہے اور کلام وہ ہے جو دل پر چوٹ لگائے۔ دل کا بیدار ہونے کی خواہش سے بے قرار ہونا تمام اعمال سے افضل ہے۔''

شیخ حماد آپ کے جواب سے بہت خوش ہوئے، فرمایا۔ ''تم سید العارفین ہو۔ تمہارا عدل وانصاف اور رجحان مشرق سے مغرب تک پہنچے گا۔ تمہارے پاؤں تلے اولیائے زمانہ اپنی گردنیں جھکائیں گے۔ تمہارا درجہ عالی ہوگا۔ تم اپنے اقران وامثال سے فائق وممتاز ہوگے۔''

آپ نے شیخ حماد کی مجلس میں ایک لمبی اور عجیب سی تقریر کی۔ شیخ حماد اسے بغور سنتے رہے پھر فرمایا۔ ''عبدالقادر! تم عجیب تقریر کرتے ہو، کیا تمہیں یہ خوف نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری کسی بات پر تم سے مواخذہ کر بیٹھے۔''

آپ نے اپنا دایاں ہاتھ شیخ حماد کے سینے پر رکھ دیا اور کہا۔ ''حضرت! آپ نورِ قلب سے ملاحظہ فرما کر یہ بتائیں کہ میری ہتھیلی پر کیا لکھا ہے؟''

تھوڑی دیر بعد جب آپ نے اپنا ہاتھ ہٹایا تو شیخ حماد نے فرمایا۔ ''عبدالقادر! کیا عرض کروں کہ میں نے تمہاری ہتھیلی پر کیا لکھا ہوا دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہتھیلی پر لکھا ہوا ہے کہ پروردگارِ عالم نے عبدالقادر سے عہد کیا ہے کہ وہ ان سے ستر مرتبہ یہ عہد کرچکا ہے کہ وہ عبدالقادر سے مواخذہ نہیں کرے گا۔'' اس کے بعد شیخ حماد نے فرمایا۔ ''پھر تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے نوازدے کیونکہ وہ اپنے فضل وکرم کا مالک ہے۔''

ایک بار آپ دورانِ سیاحت ایک ایسے جنگل میں جا پہنچے جہاں آب ودانے کا نام ونشان تک نہ تھا۔ آپ کو پیاس نے ستانا شروع کیا۔ اچانک اوپر بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا۔ وہ آپ کے سر پر آگیا اور اس میں سے پانی کے قطرات ٹپکنے لگے۔ آپ نے اس سے اپنی پیاس بجھائی۔ اسی لمحے آسمان پر ایک منور چہرہ دکھائی دیا۔ اس منور چہرے نے آفاق کو روشن کردیا۔ آپ حیرت سے اس روشنی کو دیکھ رہے تھے کہ آواز آئی۔ ''عبدالقادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے تمام حرام باتیں تم پر حلال کردی ہیں۔''

آپ نے فوراً بآوازِ بلند کہا۔ ''اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم''

اس کے بعد آپ نے روشنی کی طرف پھونک ماری تو وہ غائب ہوگئی اور اس کی جگہ ایک دھندلے دھوئیں جیسی شکل نظر آنے لگی۔ اس دھندلی شکل نے کہا۔ ''عبدالقادر! تم اپنے علم اور اللہ کے حکم سے میرے مکر سے بچ گئے ورنہ میں! اپنے اس مکر سے ستر صاحبِ طریقت کو گمراہ کر چکا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''بے شک میرے رب کا فضل و کرم میرے شاملِ حال ہے۔''

لوگوں نے جب یہ واقعہ سنا تو کسی نے آپ سے پوچھا۔ ''عبدالقادر! تم نے شیطان کو کس طرح پہچانا؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''اس کے قول سے۔ اس نے کہا تھا عبدالقادر! میں نے تم پر تمام حرام چیزیں حلال کر دی ہیں، جبکہ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ فحش باتوں کا کسی کو بھی حکم نہیں دیتا۔''

آپ نے ایک دن رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ اس وقت آپ کسی چیز پر سوار تھے۔ رسول اللہ ﷺ بھی کسی چیز پر سوار تھے اور رسول اللہ ﷺ کے بائیں جانب حضرت موسیٰ تھے۔ رسول اللہ نے آپ سے معانقہ کیا اور ایک خلعت بھی مرحمت فرمایا اور فرمایا۔ ''عبدالقادر! میں نے تمہیں خلعتِ قطبیت عطا کر دی ہے۔''

☆☆☆

ان دنوں دجلہ طغیانی پر تھا۔ بغداد والے خوفزدہ تھے کہ کہیں یہ طغیانی ان کی آبادی میں نہ داخل ہو جائے۔ اہل بغداد آپ کی خدمت میں پہنچے اور درخواست کی۔ ''حضورِ والا! آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں، کہاں جائیں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''پریشان یا خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں دجلہ کو اس حد کا پابند کر دوں گا جہاں تک وہ بہتا ہے۔ اس سے آگے بہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔''

اس کے بعد آپ اپنا عصا لے کر دجلہ کے کنارے پہنچ گئے اور اپنا عصا ایک جگہ گاڑ دیا اور دجلہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''دجلہ! یہ تیری حد ہے۔ تو اس سے آگے نہیں بڑھے گا اور میں تجھ کو اس حد کا پابند کرتا ہوں۔''

دجلہ کی طغیانی جاتی رہی اور وہ سمٹنے لگا، یہاں تک کہ وہ اپنی حد میں بہنے لگا۔

شیخ ابوالتقی محمد صبح و شام بس یہی دعا مانگتے رہتے تھے کہ اللہ مجھے کسی رجال الغیب سے ملا دے۔

اسی دوران شیخ نے خواب میں دیکھا کہ وہ امام احمد بن حنبلؒ کے مزار کی زیارت فرما رہے ہیں۔ وہاں ایک دوسرے بزرگ بھی موجود تھے۔ انہیں شبہ ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی انہیں تلاش ہے اور یہ رجال الغیب ہے۔ اسی دوران ان کی آنکھ کھل گئی اور وہ بیدار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے دل میں خواہش کی کہ خدایا میں انہیں حالتِ بیداری میں دیکھوں۔ اس خیال اور خواہش کو لیے ہوئے یہ امام احمد بن حنبلؒ کے مزار پر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے فاتحہ پڑھی۔ فاتحہ پڑھنے کے دوران ہی ان کی نظر ایک دوسرے شخص پر پڑی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ وہی شخص تھا جس کو وہ کچھ دیر قبل حالتِ خواب میں دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ زیارت مزار سے جلد از جلد فراغت حاصل کر کے ان بزرگ کی خدمت میں حاضری دوں مگر وہ بزرگ ان سے پہلے ہی فارغ ہو گئے۔ شیخ ابوالتقی محمد ان بزرگ کے پیچھے پیچھے چلے، یہاں تک کہ دونوں دجلہ کے کنارے پہنچ گئے۔ انہوں نے یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ وہ بزرگ دجلہ کو اس طرح عبور کر گئے گویا خشکی پر چل رہے ہوں۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی اور بہ آوازِ بلند ان بزرگ کو مخاطب کیا۔ ''حضرت! میں آپ کے بارے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کا مذہب کیا ہے؟''

ان بزرگ نے جواب دیا۔ ''میں مسلمان ہوں اور امام اعظم ابوحنیفہ کا پیرو۔ میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔''

شیخ ابوالتقی محمد واپس لوٹے اور راہ میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس واقعے کا ذکر شیخ عبدالقادر جیلانی سے ضرور کریں گے۔ یہ آپ کے مدرسے کے اندر داخل ہوئے اور یہاں آپ کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ ابھی انہوں نے اپنی آمد کی خبر بھی نہیں کی تھی کہ آپ نے اندر سے بہ آوازِ بلند پکار کر انہیں مطلع کیا۔ ''ابوالتقی محمد! آج مشرق سے مغرب تک پوری روئے زمین پر ان کے سوا حنیف المذہب ولی اللہ اور کوئی نہیں۔''

شیخ ابوالتقی محمد کو آپ کے اس کشف نے لرزہ براندام کر دیا۔

☆☆☆

شیخ عبداللہ موصوف آپ کی زیارت اور ملاقات کو حاضر ہوئے تو انہوں نے یہاں مشتاقانِ دید کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتے دیکھا۔ یہ سب ایک مسافر خانے کے سائبان تلے بیٹھے ہوئے تھے اور آپ کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ کچھ دیر

بعد اچانک دروازہ کھلا اور اندر سے آپ نمودار ہوئے۔ آپ مسافر خانے کے سائبان تلے سے گزر کر ایک کھلی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے اور زور زور سے اعلان کرنے لگے۔ ''لوگو! جتنی جلدی ممکن ہو میرے پاس آ جاؤ کیونکہ تم وہ نہیں دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مسافر خانے کی چھت غائب ہے اور تم سب کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے ہو۔''

لوگوں نے آپ کو دیکھا اور یہ آواز سنی تو بھاگ کر آپ کی خدمت میں پہنچ گئے اور پھر جیسے ہی مسافر خانہ خالی ہوا، مسافر خانے کی چھت زمیں بوس ہو گئی۔

آپ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا۔ ''کیا تم لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں پاگل ہوں جو تم سب کو بے گھر کر دوں گا۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے، میں نے گھر میں بیٹھے بیٹھے اچانک ایک آواز سنی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ عبدالقادر! مسافر خانے کی چھت فوراً ہی خالی کرا دو کیونکہ اس کی عمر پوری ہو چکی ہے چنانچہ میں نے باہر نکل کر یہ اعلان کر دیا کہ مسافر خانے کی چھت غائب ہو چکی ہے اور تم سب سے مسافر خانہ خالی کرا دیا۔''

ایک دن آپ نے ایک نادار کو دیکھا جو بہت دل شکستہ اور آزردہ تھا۔ آپ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔ ''اے شخص! تیرا کیا حال ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں مگر ایک مصیبت آن پڑی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''میں جانتا ہوں۔ میں تیرے مسئلے سے واقف ہوں۔ کیا تو دجلہ کے دوسرے کنارے پر نہیں پہنچنا چاہتا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''بیشک میں دوسرے کنارے پر پہنچنا چاہتا ہوں مگر تہی دستی میں کشتی کا کرایہ ادا نہیں کر سکتا اور کشتی والے نے رقم لیے بغیر دوسری طرف پہنچانے سے انکار کر دیا ہے۔''

انہی باتوں کے دوران ایک شخص آپ کے پاس آیا اور بیس دینار دیتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! یہ آپ کی نذر ہیں۔''

آپ نے یہ بیس دینار اس نادار شخص کو دے دیے اور فرمایا۔ ''جاؤ یہ بیس دینار ملاح کو دے دو اور اس سے کہہ دو کہ آئندہ کسی نادار یا تہی دست سے کرایہ لینے کی ضرورت نہیں۔''

آپ نے مزید فرمایا۔ ''جب سب کچھ تو ملاح کو دے دے گا تو تیرے پاس کیا بچے گا؟''

وہ شخص آپ کی صورت دیکھنے لگا اور آہستہ سے کہا۔ ''آپ نے بجا فرمایا۔ میں بالکل تہی دست انسان ہوں۔''

آپ نے اپنی قمیص اتار کر اس کے حوالے کر دی اور فرمایا۔ ''تو اس قمیص کو میرے ہاتھ فروخت کر دے۔''

اس نے ایسا ہی کیا۔ قمیص آپ سے لے لی اور اس کو آپ ہی کے ہاتھ بیس دینار میں فروخت کر دیا پھر یہ شخص آپ کے پاس سے جدا ہو کر دجلہ کے کنارے پہنچا اور بیس دینار ملاح کو دے کر آپ کا فرمان اس کے گوش گزار کر دیا۔ ملاح بہت شرمندہ ہوا اور کہا۔ ''آئندہ میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔''

عباسی خلیفہ ہر ماہ آپ کی خدمت میں ایک خلعت بھیجا کرتا تھا۔ آپ اس خلعت کو ابوالفتح الطحان کے پاس بھجوا دیتے تھے کیونکہ انہی کے پاس سے مسافروں اور بے نواؤں کے لیے کھانے پینے کا سامان آیا کرتا تھا۔

آپ امراء و رؤسا اور وزراء کے پاس کبھی بھی نہ جاتے۔

ایک دن کسی نے آپ کو مطلع کیا۔ ''حضرت! آپ کی خدمت میں ایک رئیس آنے والا ہے، دوپہر تک آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''یہ رئیس میرے پاس کیوں آئے گا؟''

جواب ملا۔ ''زیارت کی خاطر...... اور چونکہ بہت ہی معزز اور رئیس شخص ہے اس لیے یہ جدھر سے بھی گزرتا ہے لوگ احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

آپ اسی وقت اٹھ کر اندر چلے گئے اور اس وقت تک باہر نہیں نکلے جب تک وہ رئیس آ نہیں گیا۔ جب اندر آپ کو مطلع کیا گیا کہ باہر رئیس آپ کی زیارت و دید کے شوق میں مجسم انتظار بنا بیٹھا ہے۔ آپ باہر تشریف لائے اور جب تک آپ بیٹھ نہیں گئے وہ شخص کھڑا ہی رہا۔

آپ نے اسے دعائیں دے کر رخصت کر دیا۔ رئیس کے چلے جانے کے بعد کسی نے ڈرتے ڈرتے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! ابھی ابھی آپ نے اس رئیس کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا، وہ ہماری سمجھ میں تو آیا نہیں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کون سا رویہ؟''

جواب ملا۔ "یہ کہ پہلے تو آپ اندر چلے گئے، اس کے بعد جب وہ رئیس آگیا تو آپ اندر سے باہر تشریف لائے اور اس سے سرسری باتیں کر کے اس کو رخصت کر دیا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ ہم اس سے کیا سمجھیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اے شخص! یہ نکتہ سمجھ لے۔ جب تو نے مجھے یہ بتایا کہ یہ رئیس نہایت محترم اور عزت والا ہے، لوگ اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں تو میں نے سوچا کہ کسی دنیادار کی میں نے اتنی عزت نہیں کی، پھر اس کی کیوں کی جائے؟ اور جب وہ رئیس میرے پاس آئے گا تو مجھ کو اس کے احترام میں اٹھنا پڑے گا چنانچہ میں اٹھ کر اندر چلا گیا کہ نہ میں یہاں ہوں گا اور نہ مجھے اس کے احترام میں اٹھنا پڑے گا۔ چنانچہ جب وہ رئیس آگیا اور مجھے اندر مطلع کیا گیا تو جب میں باہر نکلا تو وہ رئیس میرے احترام میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔"

یہی سخت رویہ آپ کا خلیفۂ وقت کے ساتھ بھی تھا۔ جب آپ خلیفہ کو کسی وجہ سے کوئی خط لکھتے تو وہ اس طرح شروع ہوتا۔ "عبدالقادر تجھے حکم دیتا ہے۔" یا پھر اس طرح کہ "تجھ پر یہ حکم نافذ کیا جاتا ہے۔ تجھ پر واجب ہے کہ اس کی اطاعت کر کیونکہ میں تیرا پیشوا ہوں اور تجھ پر حجت ہوں۔"

جب یہ نامہ خلیفۂ وقت کے پاس پہنچتا تو وہ اس کو چومتا اور آنکھوں سے لگالیتا اور کہتا۔ "شیخ نے جو کچھ بھی فرمایا، بجا فرمایا۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔"

ایک دن عباسی خلیفہ المقتفی نے اپنے وزیر سے شکایت کی، کہا۔ "ابن ہبیرہ! کیا تم کبھی شیخ عبدالقادر کے پاس گئے ہو؟"

وزیر نے جواب دیا۔ "میں وہاں کئی بار جا چکا ہوں۔"

خلیفہ نے پوچھا۔ "ان کے مہمان خانے میں کوئی کھجور کا درخت بھی لگا ہوا ہے کیا؟"

ابن ہبیرہ نے حافظے پر زور دیا اور کہا۔ "ہاں۔"

خلیفہ نے کہا۔ "کیا تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ عبدالقادر نے اس درخت کو کئی بار خلیفۂ وقت فرض کر کے ایسے کلمات ادا کیے ہیں کہ وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہیں۔ تم ان کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ میرے بھی کچھ حقوق ہیں۔"

وزیر نے پوچھا۔ "امیرالمومنین! میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی۔ اگر معاملہ کھل کر سامنے آجائے تو مجھے بات کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔"

خلیفہ نے کہا۔ "عبدالقادر کھجور کے اس درخت کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ اے کھجور کے درخت! تو سرکشی نہ کر ورنہ میں تیرا سر اڑا دوں گا۔"

وزیر نے پوچھا۔ "لیکن اس سے یہ کس طرح سمجھ لیا جائے کہ اس میں آپ کو مخاطب کر کے کچھ کہا گیا ہے؟"

خلیفہ نے جواب دیا۔ "مجھے میرے آدمیوں نے بتایا ہے کہ عبدالقادر کھجور کو نہیں، مجھ کو مخاطب کر کے ایسی بات کرتے ہیں۔ تم ان کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ میں خلیفہ ہوں، انہیں ایسی بات دوسروں کے سامنے نہیں کہنی چاہیے۔"

وزیر نے عرض کیا۔ "امیرالمومنین! عبدالقادر جلالی آدمی ہیں کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے کہنے سے وہ باز آجائیں گے؟"

خلیفہ نے کہا۔ "انہیں باز آجانا چاہیے۔ میں ایسی اہانت برداشت نہیں کر سکتا۔"

وزیر نے دبی زبان میں کہا۔ "امیرالمومنین! میرا خیال ہے وہ ایسے آدمی نہیں ہیں کہ کسی کے رعب میں آجائیں۔"

خلیفہ نے کہا۔ "تم جا کر کہو تو ان سے، میں دیکھتا ہوں کہ وہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔"

وزیر نے پوچھا۔ "میں ان سے بات کس طرح کروں؟"

خلیفہ نے جواب دیا۔ "تم جاؤ اور ان سے میری طرف سے تنہائی میں کہو کہ خلیفہ سے آپ کا تعرض کرنا مناسب نہیں ہے اور خاص کر ان حالات میں کہ آپ عالم ہیں اور آپ کو خلافت کے حقوق کا علم ہے۔"

وزیر نے کہا۔ "امیرالمومنین! میں ان کے پاس جا تو رہا ہوں مگر مجھے امید نہیں کہ میں ان باتوں سے انہیں قائل یا مرعوب کر لوں گا۔"

ابن ہبیرہ آپ کے پاس پہنچ گئے تو دیکھا وہاں بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ یہ ایک طرف بیٹھ کر خلوت و تنہائی کا انتظار کرنے لگے۔

آپ نے ابن ہبیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "بیشک میں اس کا سر اڑا دوں گا۔ میں خلافت کے حقوق سمجھتا ہوں اور فرائض بھی۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ لوگوں کے حقوق کیا ہیں۔ جس کو بھی خلیفہ سے دلچسپی ہو وہ جا کر بتا دے کہ حقوق یا

فرائض یکطرفہ نہیں ہوتے۔''

ابن ہبیرہ نے سمجھ لیا کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے، ان کے لیے کہا گیا ہے۔ اب ان کا مزید بیٹھنا فضول تھا۔ وہ سلام کر کے اٹھ کر واپس چلے آئے اور خلیفہ کے پاس جا کر سب کچھ صاف صاف بتا دیا، کہا۔''امیر المومنین! آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ شیخ کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے واضح طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ حقوق اور فرائض یکطرفہ نہیں ہوتے۔ کچھ خلیفہ کے حقوق لوگوں پر ہیں اور کچھ لوگوں کے حقوق خلیفہ پر واجب ہیں۔ اسی طرح کچھ فرائض امیر المومنین پر واجب ہیں اور کچھ فرائض لوگوں پر واجب ہیں اور شیخ نے اپنی گفتگو میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔''

خلیفہ نے کہا۔''اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

وزیر نے جواب دیا۔''میری ناچیز رائے تو یہ ہے کہ ہمیں شیخ کی خدمت میں حاضری دینا چاہیے اور ان سے معافی مانگنا چاہیے۔''

چنانچہ ان دونوں نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور دونوں مودب بیٹھ گئے۔ آپ نے خلیفہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔''خلیفہ! تیرے اعمال اور کارگزار جو کچھ کرتے ہیں ان کے مظالم اور زیادتیوں کا جوابدہ بھی تو ہے۔ تجھ کو انسانوں کا حاکم نہیں، امین بنایا گیا ہے اور اگر کوئی امین امانت میں خیانت کرنے لگے تو خود ہی جانتا ہوگا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔''

دونوں آپ کی باتیں سن کر زار و قطار رونے لگے۔ اب آپ نے ان دونوں کو نہایت نرمی اور شفقت سے سمجھانا شروع کیا۔

☆☆☆

خلیفہ المقتفی کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا مستنجد برسراقتدار آیا۔ ایک رات اندھیرے میں مستنجد نے آپ کی خدمت میں حاضری دی، اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ یہ لوگ سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد آپ نے ان لوگوں سے پوچھا۔''کہو کیسے آنا ہوا؟''

خلیفہ نے عرض کیا۔''حضرت! میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے کچھ نصیحتیں کریں۔''

آپ نے پوچھا۔''اگر میں نصیحتیں کروں گا تو تمہیں حاصل کیا ہوگا؟''

خلیفہ نے جواب دیا۔''اچھی باتیں...... نیک باتیں......''

آپ نے فرمایا۔''اللہ کے غضب سے ڈرو اور خاص کر ان حالات میں جبکہ تیرے اعمال بھی غضب کے لائق ہیں۔''

خلیفہ اپنے ساتھ اشرفیوں سے بھری ہوئی دس تھیلیاں بھی لایا تھا۔ یہ ساری تھیلیاں آپ کی خدمت میں پیش کر دی گئیں۔ آپ کو یہ تھیلیاں نہایت احترام اور عقیدت سے پیش کی گئی تھیں لیکن آپ نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا، بولے۔''میں انہیں لے کر کیا کروں گا؟ یہ میرے کس کام کی؟''

خلیفہ نے اصرار کیا۔''حضرت! یہ آپ کو قبول کرنا ہی پڑیں گی ورنہ میری دل شکنی ہوگی۔''

آپ نے دس میں سے دو تھیلیاں نکال لیں۔ ان میں سے ایک کو سیدھے ہاتھ میں لیا اور دوسری کو الٹے ہاتھ میں۔ اس کے بعد آپ نے ان تھیلیوں کو زور سے دبا کر نچوڑا۔ ان تھیلیوں میں سے تازہ تازہ خون بہنے لگا۔ آپ نے خلیفہ سے فرمایا۔

''مستنجد! تم خدا سے نہیں شرماتے، لوگوں کا خون کر کے ان کا مال تم میرے پاس لے آئے ہو۔ شرم کرو...... شرم کرو۔''

خلیفہ یہ دیکھ کر غش کھا کر گر گیا۔

آپ نے بے ہوش خلیفہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔''مستنجد! اگر تو رسول اللہ ﷺ کا ہم نسب نہ ہوتا اور مجھے یہ خاندانی حرمت عزیز نہ ہوتی، تو میں اس خون کو تیرے محلات تک بہا دیتا۔''

☆☆☆

اس عہد کے ایک مشہور صوفی شیخ عبداللہ جبائی ایک کتاب حلیۃ الاولیاء پڑھ رہے تھے۔ کتاب کا مضمون ایسا تھا کہ یہ برداشت نہ کر سکے اور زار و قطار رونے لگے۔ رونے کے دوران انہیں خیال آیا کہ مخلوق سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لینی چاہیے اور زندگی عبادت کے لیے وقف کر دینی چاہیے۔

وہ یہ سوچ کر آپ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ نے صوفی عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت فرمایا۔''کیا تم مخلوق سے قطع تعلق کرنا چاہتے ہو؟''

صوفی عبداللہ نے جواب دیا۔''ہاں، کیونکہ میں حلیۃ الاولیاء پڑھ کر دنیا سے بیزار ہو گیا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔''نہیں، ایسا نہ کرنا کیونکہ ان کا ابھی وقت نہیں آیا۔ سردست تم علم حاصل کرو۔ مشائخ طریقت کی

خدمت کرو، ان کی صحبت میں رہو۔ ان سے ادب و سلوک سیکھو۔ جب یہ سب کچھ کر چکو تو مخلوق سے قطع تعلق بھی کر لینا۔ علم حاصل کرنے سے پہلے اگر تم نے گوشہ نشینی اختیار کی تو جانتے ہو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟''

صوفی عبداللہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں نہیں جانتا اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ تو بے پر کے مرغ کی طرح رہ جائے گا۔ جب بھی تجھے دینی معاملات میں کوئی دشواری اور مشکل پیش آئے گی تو اس کا علم حاصل کرنے کے لیے تمہیں دوسروں کے پاس جانا پڑے گا۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے باہر نکلنا پڑے گا۔ گوشہ نشینی ایسے شخص کو اختیار کرنا چاہیے جو شمع کی طرح روشن ہوتا کہ لوگ اس کی روشنی سے فائدہ اٹھا سکیں۔''

☆☆☆

آپ جامع مسجد منصوری تشریف لے گئے، واپسی میں آپ نے ایک چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس چادر میں پاؤں اور چہرے کے علاوہ سارا جسم چھپا ہوا تھا۔ دوران سفر بار بار آپ کے چہرے پر ہلکا سا کرب پیدا ہوا اور جاتا رہا۔ گھر واپس آتے ہی آپ نے چادر اتار کر ایک طرف رکھ دی اور اپنی پیشانی پر سے ایک بچھو پکڑ کر زمین پر ڈال دیا۔ یہ بچھو بھاگنے لگا تو آپ نے اس سے فرمایا۔ ''موتی باذن اللہ'' (اللہ کے حکم سے مرجا) بچھو اسی وقت مر گیا۔

آپ کے ایک خادم نے پوچھا۔ ''حضرت! یہ کیا بات تھی؟ یہ بچھو کیسا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''اس بچھو نے مجھ کو جامع منصوری سے گھر تک سات بار ڈنک مارے۔ آخر کار میں نے باہر آ کے اس کو ہلاک کر دیا۔''

شیخ ابوالحسن نامی ایک صوفی آپ کی خدمت میں رہ کر تحصیل علم میں مشغول رہتے تھے۔ انہیں آپ سے اتنی زیادہ عقیدت اور محبت تھی کہ اکثر رات کو بھی آپ ہی کے پاس رہ جاتے اور جب بھی رات کو آپ کے پاس رہتے۔ رات بھر جاگتے رہتے تھے۔ صرف اس لیے کہ اگر رات کے کسی حصے میں آپ کو ان کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ پریشان نہ ہوں۔

شیخ ابوالحسن گھر کے باہر مدرسے کے ایک حصے میں پڑ رہتے تھے۔ ایک رات انہوں نے دیکھا، آپ گھر سے باہر آئے ہوئے ہیں۔ ابوالحسن آفتابہ لے کر ان کی طرف بڑھے مگر آپ نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ ابوالحسن کو جانتے ہی نہیں۔ آپ سیدھے مدرسے میں آ گئے۔ مدرسے کا باہری دروازہ اپنے آپ ہی کھل گیا۔ آپ مدرسے سے باہر نکل گئے۔ ابوالحسن نے عجلت سے کام لیا اور آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ آپ پیدل چل رہے تھے۔ ابوالحسن نے دیکھا، فوراً دیر بعد ہی بغداد کا دروازہ سامنے آ گیا اور آپ کے پہنچتے ہی یہ دروازہ بھی خود بخود کھل گیا۔ آپ اس دروازے سے بھی نکل گئے۔ ان کے ساتھ ہی ابوالحسن بھی شہر کے باہر پہنچ گئے۔ دروازہ خود بخود دوبارہ بند ہو گیا۔ ابوالحسن کا خیال تھا اب دریا۔ ئے دجلہ ان کے سامنے آ جائے گا لیکن خلاف توقع اب وہ جس شہر میں داخل ہو چکے تھے وہ بالکل نیا اور اجنبی تھا۔ ابوالحسن نے پہلے کبھی اس شہر کو نہیں دیکھا تھا۔ آپ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ آپ ایک مکان کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اس مکان کا صدر دروازہ حسب سابق خود بخود کھل گیا اور آپ اس میں داخل ہو گئے۔ ان کے بعد فوراً ہی ابوالحسن بھی اس مکان میں داخل ہو گئے۔ دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ یہ مکان آپ کے مسافر خانے سے مشابہ تھا۔ یہاں چھ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب نے آپ کو دیکھتے ہی سلام کیا۔ آپ جواب دے کر اور آگے بڑھ گئے۔ ابوالحسن کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ یہیں ایک ستون کے پاس رک کر کھڑے ہو گئے۔ یہاں کسی کے کراہنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد یہ آواز اچانک بند ہو گئی اور ایک شخص اس طرف گیا جہاں سے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کے بعد کراہنے والی آواز کی سمت ایک اور شخص گیا اور وہاں سے ایک دوسرے آدمی کو اپنے کاندھے پر اٹھا لایا۔ ان دونوں کے بعد ایک اور شخص برہنہ پا چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں ان کے پاس آ گیا۔ یہ شخص آپ کے روبرو مودب بیٹھ گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تو کلمہ پڑھ سکتا ہے؟''

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''اچھا کلمہ پڑھ۔''

آپ نے اس کو کلمہ سکھایا تین دفعہ...... اس کی بڑی بڑی مونچھیں ترشوا دیں اور اس کو ٹوپی پہنا کر فرمایا۔ ''اے شخص! اب آج سے تیرا نام محمد رکھا جاتا ہے۔'' اس کے بعد آپ نے بقیہ اشخاص سے فرمایا۔ ''مجھے حکم ملا ہے کہ اس شخص کو متوفی کا قائم مقام بنا کر یہاں سے چلا جاؤں۔''

ان لوگوں نے فرمایا۔ ''بسر و چشم۔''

آپ ان لوگوں سے فارغ ہو کر ابن مکان سے باہر نکلے۔ ابھی انہیں نکلتے اور چلتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بغداد کا دروازہ ان کے سامنے آگیا اور حسبِ سابق وہ کھل بھی گیا۔ دونوں حضرات اس میں داخل ہوئے اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد مدرسے کا دروازہ سامنے اور قریب آگیا اور حسب سابق وہ کھل بھی گیا۔ آپ اس میں داخل ہو گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ابوالحسن تھے، یہ بھی اندر داخل ہو گئے۔

ابوالحسن کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے مگر ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ صبح جب آپ کا ابوالحسن سے سامنا ہوا تو ابوالحسن نے آپ سے پوچھا۔ ''حضرت! آپ کو اپنے رب کی قسم۔ یہ کل رات کو کیا معاملہ تھا؟ یہ آپ کہاں تشریف لے گئے تھے؟''

آپ نے ابوالحسن کو حیرت سے دیکھا مگر خاموش رہے۔

ابوالحسن نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں سوچتا ہوں آپ کو کس کی قسم کھانے پر آمادہ کروں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''کل رات میں نے کچھ غور نہیں کیا لیکن یہ اندازہ ضرور تھا کہ کوئی میرے ساتھ چل رہا ہے۔'' آپ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے پھر فرمایا۔ ''اب تم قسم کھاؤ کہ جب تک میں زندہ ہوں، تم اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرو گے۔''

ابوالحسن نے فوراً قسم کھالی۔

آپ نے فرمایا۔ ''کل رات تم میرے ساتھ جس شہر میں گئے تھے، اس کا نام نہاوند ہے۔ نہاوند یہاں سے بہت دور ہے اور وہ چھ شخص جو وہاں موجود تھے، ابدال اور نجباء میں سے تھے اور ساتواں وہ شخص جس کی کراہٹ سنائی دیتی تھی، یہ بھی انہی میں سے تھا۔ یہ ساتواں شخص وفات پانے والا تھا۔ اسی سلسلے میں میں وہاں گیا تھا۔ جس شخص کو میں نے کلمہ پڑھایا تھا۔ وہ نصرانی ہے اور قسطنطنیہ اس کا وطن ہے۔ یہی شخص وفات پانے والے شخص کا قائم مقام ہوگا۔ اسی لیے وہ میرے پاس لایا گیا تھا، اس نے اسلام قبول کرلیا اور وہ شخص جو دوسرے شخص کو اپنے کاندھے پر اٹھا لایا تھا، حضرت خضر تھے۔ آپ اس کو خود سے لے کر آئے تھے۔''

ایک دن ایک شخص گرد وغبار میں اٹا ہوا آپ کے پاس آیا اور رو رو کر کہنے لگا۔ ''حضرت! میں اصفہان کا رہنے والا ہوں۔ میری بیوی آسیب زدہ ہے۔ اس پر اس کثرت سے دورے پڑتے ہیں کہ میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے اور میں کبھی کبھی اپنی موت کی دعا مانگنے لگتا ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''پھر تم کسی سے رجوع کیوں نہیں ہوئے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں نے دعا کی بھی اور دوسروں سے بھی دعا کرائی تھی مگر وہ سب اکارت گئیں اور شاید یہ آخری بار بھی اکارت ہی جائے۔ خیر، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ بیابان سراندیپ کا ایک سرکش جن معلوم ہوتا ہے۔ اس کا نام خانس ہے۔ اب جب بھی وہ آئے تو اپنی زوجہ کے کان میں کہہ دینا کہ اے خانس! عبدالقادر جو بغداد میں رہتے ہیں، انہوں نے تجھ سے کہا ہے کہ تو سرکشی نہ کر۔ آج سے اگر اب تو پھر کبھی آیا تو، تو ہلاک کر دیا جائے گا۔''

وہ شخص یہ چٹکلا لے کر اصفہان واپس گیا اور تقریباً دس سال بعد دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضری دی۔ آپ نے اس کو دیکھتے ہی ڈانٹنا شروع کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''ابھی تک تو کہاں تھا۔ میں نے تجھ کو بہت تلاش کیا تو نہیں ملا۔ یہ تو بتا تیری بیوی جو آسیب زدہ تھی، اس کا کیا حال ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ نے جو کچھ فرمایا تھا میں نے وہ سب زبانی یاد کر کے اپنی بیوی کے کان میں کہہ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ میری بیوی پر نہیں آیا۔ اب ہم نہایت خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔''

☆☆☆

آپ کی شہرت اور مقبولیت نے بہتوں کو حسد میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس مرض میں بڑے بڑے فقہا مبتلا ہو چکے تھے۔ ان سبھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ عبدالقادر کا امتحان لینا چاہیے۔

تقریباً ایک سو فقہا نے اس معاملے میں اتفاق کر لیا اور ان میں طے یہ پایا کہ ان میں کا ہر شخص...... علوم وفنون میں سے کسی ایک مسئلے پر آپ سے سوال کرے گا۔ یہ تمام فقہا آپ کی مجلس میں تشریف لے گئے۔

آپ نے ان سبھوں کو دیکھا اور مسکرا کر پوچھا۔ ''کون ہے جو میرا امتحان لے گا؟''

اس کے بعد آپ کے منہ سے ایک شعلہ سا نکلا۔ اس نورانی شعلے کو کوئی تو دیکھ سکا اور کوئی نہیں دیکھ سکا۔ یہ شعلہ باری باری تمام فقہا کے سینے پر سے گزر گیا۔ سارے فقہا حیران و پریشان چیخنے چلانے لگے۔ انہوں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سر کے بال نوچنے لگے۔ پھر باری باری آپ کے پاس گئے اور اپنا سر آپ کے قدموں میں جھکانے لگے۔ مجلس میں ایسا شور برپا تھا جس سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ پورا بغداد ہل رہا ہے۔

آپ نے ہر فقیہہ کو اٹھایا اور سینے سے لگا کر چھوڑ دیا۔ جب سب کو سینے سے لگا چکے تو ان میں سے ایک سے کہا۔

''تمہارے سوال کا یہ جواب ہے۔''

اسی طرح باری باری آپ نے ہر فقیہہ سے یہی بات کہی۔ جب ہر فقیہہ سے یہ بات کہی جا چکی تو آپ نے مجلس برخاست کر دی۔ اب جملہ فقیہہ بھی اپنے ہوش و حواس میں آ چکے تھے۔

کسی شخص نے ایک فقیہہ سے پوچھا۔ ''اس وقت آپ لوگوں کا کیا حال تھا؟''

فقیہہ نے جواب دیا۔ ''جب ہم لوگ آپ کی مجلس میں بیٹھے تو آپ کے منہ سے نکلنے والے نورانی شعلے نے ہمارے سارے علم کو سلب کر لیا تھا۔ اس وقت ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ہم لوگ جاہلِ مطلق ہو کر رہ گئے تھے لیکن جب عبدالقادر نے ہمیں اپنے سینے سے لگایا تو ہمارا علم ہمیں پھر مل گیا۔''

اس کے بعد آپ نے فقہا کے سامنے ایسی شاندار تقریر کی کہ وہ دنگ رہ گئے۔

☆☆☆

بغداد کے محلہ حلبہ میں آپ... ایک بہت بڑی مجلس سے خطاب کرنے والے تھے۔ اس مجلس میں مشائخ کرام کی بڑی تعداد موجود تھی۔ اپنے عہد کے مشہور ترین مشائخ کرام۔

آپ نہایت پرجوش تقریر فرما رہے تھے۔ تقریر کرتے کرتے آپ نے ایک دم فرمایا۔ ''قَدَمِي هٰذِهِ عَلٰى رَقَبَةِ كُلِّ وَلِيِّ اللهِ (میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے۔)''

یہ سنتے ہی مشہورِ زمانہ ولی شیخ علی بن الہیتی اٹھے اور آپ کے تخت کے پاس جا کر آپ کا قدم اپنی گردن پر رکھ لیا اور فرمایا۔ ''بے شک بے شک، آپ درست فرماتے ہیں۔''

ان کے بعد وہاں جتنے ولی موجود تھے، ہر کسی نے اپنی گردن پر آپ کے پاؤں رکھ لیے۔

کہتے ہیں اس روز روئے زمین کے تین سو تیرہ اولیائے کرام نے آپ کے ارشاد کے مطابق اپنی گردنیں جھکا دی تھیں۔

ایک شتربان مکہ جا رہا تھا۔ دورانِ حج اس کی ملاقات ایک جیلانی باشندے سے ہو گئی۔ شتربان کا نام ابوبکر التیمی تھا۔ جیلانی باشندے کی ابوبکر التیمی سے دوستی ہو گئی۔ وہ کچھ بیمار تھا۔ بیماری نے شدت اختیار کی۔ یہاں تک کہ وہ زندگی سے مایوس ہو گیا۔ اس نے ابوبکر التیمی سے کہا۔ ''دوست! مجھے ایسا لگتا ہے گویا میری سانسیں پوری ہو چکی ہیں۔ میں تمہیں ایک چادر، کچھ کپڑا اور دس دینار دیتا ہوں۔ انہیں تم عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں پہنچا دینا اور ان سے درخواست کرنا کہ وہ میرے حق میں دعا فرمائیں۔''

چند دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ ابوبکر التیمی پر حرص و ہوا نے غلبہ پایا اور ساری چیزیں یہ سوچ کر رکھ لیں کہ اس کا کسی اور کو تو علم ہے نہیں، آپ کو کیا پتا چلے گا۔ مرنے والا تو مر گیا۔

ایک دن بغداد کے ایک بازار میں آپ کا سامنا ہو گیا۔ ابوبکر التیمی نے آپ کو سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو آپ نے فرمایا۔ ''ابوبکر! تم کو خدا کا خوف نہیں آیا جو ایک عجمی کی امانت اپنے پاس رکھ لی؟''

ابوبکر التیمی کو غش آ گیا۔ جب کافی دیر بعد ہوش آیا تو انہوں نے ساری چیزیں آپ کو پہنچا دیں۔

ایک دن آپ نے عہد شکنی کرنے والوں کی یوں مذمت کی۔

''ہم نے تمہیں حق کی دعوت دی مگر تم نے اسے قبول نہیں کیا۔ ہم نے تمہیں منع کیا مگر تم باز نہیں آئے۔ ہم نے تمہیں ڈرایا مگر تم ذرا نہ شرمائے۔ ہم نے تمہیں مہلت دی اور خوش خبریاں سنائیں مگر ہم سے تمہاری نفرت ہے کہ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ تم نے ہم سے معاہدہ کر کے توڑ ڈالا۔ اگر ہم تمہیں رد کر دیں، تم سے بیزار ہو کر تمہارا کوئی عذر نہ مانیں، تمہیں اپنے پاس نہ آنے دیں تو تمہارا کیا حال ہو۔ تمہیں یاد نہیں کہ تم کیسی عاجزی اور انکساری سے ہمارے پاس آئے تھے اور اب تم ہم سے منحرف ہو گئے۔

''برادرِ من! تمہیں جو بڑا بھاری سفر درپیش ہے اس کی تیاری کر رکھو۔ اپنی عمر کی زیادتی اور مال و دولت اور جاہ و عزت کے

دھوکے میں نہ رہو۔ فرصت کو غنیمت جانو۔ یاد رکھو۔ یہ دنیا تمہیں اپنے سحر میں پھنسائے بغیر نہ رہے گی۔ تم اس غدار سے بچنے کی کوشش کرو۔ وہ تمہارے سر پر تلوار لیے کھڑی ہے۔ یہ موقع پاتے ہی تم پر بھرپور وار کردے گی کیونکہ تم جیسے بہتوں کو یہ اپنے مکر میں پھنسا چکی ہے مگر ابھی تک اس کی طمع نہیں مٹی اور نہ آئندہ مٹے گی۔ سوچو جب اس کا وار چل جائے گا اور تم قبر میں اتار دیے جاؤ گے تو پھر تم قبر میں یا میدانِ حشر میں کتنا ہی حسرت ناک واویلا کرو گے اور آنسوؤں کی جگہ خون روؤ گے تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔''

آپ نے ایک بار محتاجوں اور مہمانوں کی بابت فرمایا:

''مجھے فرائض کے بعد مہمانوں اور محتاجوں کو کھانا کھلانے اور عام و خاص کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنے کے سوا کوئی بہتر کام نہیں معلوم ہوتا۔ اگر مجھ کو ساری دنیا کی دولت مل جائے تو میں وہ ساری دولت بھوکوں اور محتاجوں پر خرچ کردوں۔''

ایک بار فرمایا۔ ''لوگو! تم اپنے دل کے دربان بن جاؤ۔ جس کے آنے کا حکم خداوندی ہے اس کو اپنے دل میں آنے دو، جس کو منع کرے اس کو روک دو۔ دلوں کی خواہشوں کو زیادہ نہ بڑھاؤ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ کسی حال اور مقام پر بھروسا کر کے یہ نہ سمجھ لینا کہ تم اس پر ہمیشہ قائم رہو گے۔ یاد رکھو، تغیر اور تبدل لازمی ہے۔''

ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔ ''کسی سے محبت یا عداوت اور نفرت کرنے میں عجلت سے کام نہ لو۔ اس کو پہلے قرآن اور حدیث کی کسوٹی پر پرکھ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نفس کی شرارت سے کسی پر خواہ مخواہ بدگمانی کر بیٹھو، یہ بدترین گناہ ہے۔''

ایک اور موقع پر فرمایا۔ ''جو خدا کو چھوڑ کر دوسروں سے مانگتا ہے اس نے خدا کے مرتبے اور درجے کو نہیں پہچانا۔ مومن کی علامت یہ ہے کہ یہ حلال روزی کی تلاش میں رہتا ہے۔ قسمت پر تکیہ کر کے بیکار نہیں بیٹھتا۔ اگر یہ تلاش میں کامیاب رہتا ہے تو اسے روزی بھی ملتی ہے اور تلاش کا ثواب بھی۔ دوسری صورت میں تلاش کا ثواب تو ضرور ہی حاصل کر لیتا ہے۔''

کسی نے پوچھا۔ ''حسنِ خلق کیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ کہ تو عرفانِ حق میں ایسا سرشار ہو کہ کسی کے ظلم اور سختی کا رنج اور اثر نہ محسوس کرے۔''

کسی طرف سے آواز آئی۔ ''یہ بقا کیا چیز ہے؟''

جواب دیا۔ ''بقا، بقائے رب ہے اور حجاب نفس کی دوری کے بغیر نہیں حاصل ہوتا اور نفس کا حجاب اس وقت تک دور نہیں ہوتا جب تک کہ باہر کی دید سے نگاہ نہ اٹھائی جائے، اپنے نفس کی دید میں مصروف رہو۔''

پیر کی بابت فرمایا۔ ''جس پیر میں یہ پانچ صفات نہ ہوں، وہ پیر نہیں دجال ہے۔ ایک تو یہ کہ پیر ظاہری شریعت کا عالم ہو، دوسرے علم حقیقت کا جاننا بہت ضروری ہے۔ تیسرے یہ کہ اپنے پاس آنے والوں سے خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے پیش آئے اور ان سے اچھا برتاؤ کرے۔ مسافروں کو کھانا کھلائے۔ چوتھے یہ کہ غربا اور بے حیثیت آدمیوں کے ساتھ قولاً وفعلاً عاجزی اور انکساری سے پیش آئے۔ پانچویں یہ کہ مریدین کی باطنی تعلیم و تربیت کی لیاقت رکھتا ہو اور خود ریا، حسد، طمع، خود بینی، غفلت اور عیش طلبی سے پاک ہو۔''

آپ کی یہی وہ تعلیمات تھیں جن سے ایک انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ ایک بار آپ کی ملاقات ایک ایسے مریض سے ہوئی جو جاں بلب اور نحیف و نزار ہو رہا تھا۔ اس نے آپ کو سلام کیا اور اپنے پاس بلا کر کہا۔ ''مجھے اٹھا کر بٹھا لو۔''

آپ سلام کا جواب دے کر اس کے پاس گئے اور اس کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ وہ اچانک صحت مند ہونے لگا۔ آپ کو اس سے کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ اس نے آپ سے پوچھا۔ ''کیا تم مجھ کو جانتے ہو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں تو۔''

اس نے کہا۔ ''میں دینِ اسلام ہوں۔''

آپ اس کو وہیں چھوڑ کر جامع مسجد تشریف لے گئے۔ وہاں ایک شخص آپ کو ملا اور آپ کو 'یا سیدی محی الدین' کہہ کر مخاطب کیا۔ پھر آپ نماز میں مشغول ہو گئے۔ اس وقت آپ اپنے گرد و پیش سے ایک ہی آواز سن رہے تھے۔ 'یا محی الدین یا محی الدین، (اے دین کے زندہ کرنے والے، اے دین کے زندہ کرنے والے)۔'

اس کے بعد محی الدین آپ کے نام کا ایک جزو بن گیا۔

ایک بار آپ نے دنیا کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔ ''دنیا کو دل سے نکال کر ہاتھ میں لے لو۔ یعنی دنیا کماؤ، دولت حاصل کرو مگر یہ دولت تمہارے ہاتھ ہی میں رہے، دل پر قبضہ نہ کرنے پائے۔''

جن لوگوں نے آپ کو دیکھا تھا انہوں نے آپ کا حلیہ یوں بتایا ہے۔

قد درمیانہ، رنگ گندم گوں، سینہ چوڑا، داڑھی گنجان اور لمبی، ابرو باہم ملے ہوئے، آواز بھاری۔ آپ جب کلام فرماتے تھے تو پوری مجلس گونج جاتی تھی۔ آپ کی آنکھوں میں سحر سا تھا جس شخص یا ہجوم کو ایک بار دیکھ لیتے، وہ آپ کا مطیع وغلام بن جاتا۔ طبیعت نفاست پسند اور مزاج از حد لطیف تھا۔

جب آپ کی عمر اکیانوے یا بانوے سال ہوگئی تو آپ نے محسوس فرمالیا کہ بہت جلد آخری سفر درپیش ہونے والا ہے۔ آپ کے صاحبزادے عبدالوہاب نے بھی یہ سمجھ لیا کہ والد بزرگوار اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے والے ہیں۔ انہوں نے... بہ چشم نم پوچھا۔ ''باواجان! کوئی وصیت فرمایئے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تقویٰ اور خدا کی اطاعت اختیار کرو۔ کسی چیز سے مت ڈرو۔ کسی غیر خدا سے کوئی توقع نہ رکھو، سوائے خدا کے کسی پر بھروسا نہ کرو۔ سوائے توحید کے کسی پر اعتماد نہ رکھو کہ توحید ہی وہ چیز ہے جس پر سب کو اتفاق ہے۔''

جب آپ کا آخری وقت آگیا تو آپ نے فرمایا۔ ''میں مدد مانگتا ہوں اس خدا سے جس کا کوئی شریک نہیں، جو زندہ ہے اور کبھی نہیں مرتا۔ نہ کسی سے ڈرتا ہے، وہ پاک ہے۔ بندوں پر موت طاری کرنے کا غلبہ اور قدرت بھی اسی کو حاصل ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ بے شک اس کے رسول ہیں۔''

ان کلمات کے بعد آپ کا وصال ہوگیا۔ تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ بعض نے ربیع الآخر کی نو، کسی نے گیارہ، کسی نے تیرہ اور کسی نے سترہ روایت کی ہے مگر سترہ پر زیادہ متفق ہیں۔ سن ہجری 561 تھا۔

آپ کے جنازے میں آنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ محلہ حلبہ کی سڑکیں بھر گئی تھیں اور دن کو رسم تجہیز و تکفین پر عمل کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ چنانچہ آپ کی تدفین رات کو عمل میں آئی۔ آپ کی آخری رسوم میں شریک ہونے والے اسی ملک کے باشندے نہیں تھے، بہت دور دور سے آئے تھے۔ آپ کو آپ ہی کے مدرسے کے سائبان تلے دفن کیا گیا۔ صبح تک مدرسے کا دروازہ بند رکھا تھا اور جب صبح کھولا گیا تو ہجوم کی یلغار نے سارا انتظام درہم برہم کر کے رکھ دیا اور لوگ جوق در جوق آتے جاتے رہے۔

آپ کی تصنیفات میں مندرجہ ذیل کتابوں کا نام لیا جاتا ہے۔

غنیۃ الطالبین: اس میں شریعت اور طریقت کے مسائل پر شاندار بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف فرقوں کے درمیان جو اختلافی مسائل پائے جاتے ہیں، ان کا بڑا پر مغز تجزیہ کیا گیا ہے۔

فتوح الغیب: یہ علم تصوف اور معرفت پر معرکتہ الآرا کتاب ہے۔ اس کے مضامین.... معارف قرآن اور اسرار طریقت سے معمور ہیں۔ اس میں اٹھتر وعظ ہیں۔ یورپ کے مشہور مستشرق پروفیسر مارگولتھ نے ان مواعظ کو نہایت پُر تاثیر لکھا ہے حالانکہ مارگولتھ یہودی تھا۔

فتح ربانی: اس کتاب کا پورا نام فتح ربانی والفیض الرحمانی۔ اس میں آپ کے تریسٹھ خطبات شامل اشاعت کیے گئے ہیں۔ پروفیسر ڈبلیو براؤن فری یونیورسٹی برلن نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کے سیدھے سادے اسلوب کو نہایت پُراثر بتایا ہے۔

مکتوبات قطب صمدانی: یہ آپ کے فارسی مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ ان خطوط میں بھی معرفت وطریقت کے اسرار و رموز نہایت لطیف طریقے سے بتائے اور سمجھائے گئے ہیں۔

قصیدہ غوثیہ: یہ چودہ قصائد کا مجموعہ ہے۔ ان کی فصاحت و بلاغت کا کوئی جواب نہیں۔ یہ قصائد آپ نے اپنے متعلق لکھے ہیں۔ آپ نے چار شادیاں کیں اور یہ سب عمر کے پچاس سال کے بعد کی گئیں۔ سیدہ بی بی مدینہ بنت سید میر محمد، سیدہ بی بی صادقہ بنت سید محمد شفیع، سیدہ بی بی مومنہ اور سیدہ بی بی محبوبہ۔

ان بیویوں سے آپ کے دس صاحبزادے پیدا ہوئے:

شیخ سیف الدین عبدالوہاب، شیخ تاج الدین عبدالرزاق، شیخ شرف الدین عیسیٰ، شیخ ابواسحاق ابراہیم، شیخ ابوبکر عبدالعزیز، شیخ ابوزکریا یحییٰ، شیخ عبدالجبار، شیخ ابونصر موسیٰ، شیخ ابوالفضل محمد۔

ماخذات

اخبار الاخیار۔ عبدالحق محدث دہلوی۔ حیات جاودانی۔ عفیف الدین حسین۔ حدیقۃ الاولیاء۔ مفتی غلام سرور لاہوری۔ مشائخ قادریہ۔ محمد دین کلیم قادری۔ انوار الاولیاء۔ رئیس احمد جعفری

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

دھوپ

علی اختر

تاریخ گواہ ہے کہ والدین کی طرف سے بچوں سے متعلق کم سنی میں کیے جانے والے فیصلوں نے کبھی اچھا نتیجہ نہ دیا۔ اسے بھی اسی سولی پر لٹکا دیا گیا تھا مگر افسوس... شعور کی منزل تک پہنچتے پہنچتے اس کے پیر لہولہان ہو چکے تھے مگر آبلہ پائی کا یہ سفر اسے ہر حال میں جاری رکھنا تھا۔

رسم و رواج کے بھیانک غار میں گرنے والوں کی دیدہ دلیری



دعائیں اگر تتلیاں ہوتیں تو وہ مستجاب ہو کر اس کے گورے چٹے کنوارے ہاتھوں کی پنکھڑیوں پر اسی لمحے آ بیٹھتیں جب اس نے سائیں سنگے شاہ کے مزار پر آکر ہاتھوں کو اٹھایا تھا۔ وہ یہاں آئی تو اسے پہلی بار یوں لگا جیسے لفظ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے ہوں۔ وہ کیا مانگنے آئی تھی۔ یہاں آکر وہ دعا بھی بھول گئی تھی۔ اس نے اپنا ماتھا مزار کی چار دیواری کے ایک طرف لگی سنگِ مرمر کی موٹی جالی کے ساتھ ٹکا دیا۔

اس کے قریب دوسری جگہ لگی جالی پر عورتوں نے اپنی منت پوری ہونے کے لیے مختلف رنگوں کے دھاگے باندھے ہوئے تھے جن کی وجہ سے یہ جالی تقریباً ڈھکی ہوئی تھی۔ لفظ اس کے حلق سے نکلتے ہوئے اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں...... کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے دعا ہی مانگنی نہ آتی ہو...... حالانکہ ان لفظوں نے اس کے اندر کہرام مچایا ہوا تھا...... وہ کتنے دنوں سے اس کے من کے اندر دھمالیں ڈال رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے سائیں تکے شاہ کے مزار پر موجود ملنگ ڈھول کی تھاپ پر دھمال ڈالتے ہیں۔

چھپا ہوا خوف...... اس کی ہرنی ایسی موٹی آنکھوں سے ہویدا تھا اور زبان پتھر ہو کر رہ گئی تھی۔

کملیے...... کچھ منگ تھن...... ایتھے اللہ سوہنڑے دیاں رحمتاں چیکدیاں پھردیاں نیں...... (کملیے کچھ مانگ لے۔ یہاں اللہ سائیں کی رحمتیں کوکتی پھرتی ہیں)

ایک عورت نے اس کے کان میں سرگوشی کی...... اس نے اپنی ڈبڈبائی نظروں سے کہنے والی کی طرف دیکھا۔ گویا پوچھ رہی ہو...... کیا مانگوں......؟

''آنپڑے پراندے دا اِک دھاگا کڈھ کے اس جالی نال بنھ دے......! فیر ویکھیں...... دعا کنج قبول ہوندی پئی اے!'' (اپنے پراندے سے ایک دھاگا نکال کر اس جالی سے باندھ دو۔ پھر دیکھنا دعا کیسے مستجاب ہوتی ہے)

اس نے فوراً اپنے لمبے بالوں کی پچھلی جانب ہاتھ پھیرا۔

پراندہ...... اب کون پہنتا ہے......! اس کا ہاتھ شرمندہ سا ہو کر پلٹ آیا۔

''بھیڑیئے...... اپنے بھوچھن نالوں لیر لاہ کے ای بنھ دے......!'' (بھیڑیئے...... اپنے دوپٹے کی کترن اتار کر ہی باندھ دے)

کہنے والی نے اسے نئی راہ سجھائی۔

تب اس نے اپنے دوپٹے کے ایک کونے سے باریک کترن اتار کر جالی کے سوراخوں میں باندھ دی اور اٹھے ہاتھوں سے منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی۔

''سائیں وڈھے...... توں تاں جان دا ہائیں...... چٹ پوشوں دا مڑ کٹھ ہور بیا بیٹھے۔'' (سائیں جی...... آپ جانتے ہیں۔ بڑے اور منصف لوگوں کی دوبارہ پنچایت ہو رہی ہے)

''یقیناً وہ سارے میرے خلاف ہی فیصلہ دیں گے...... کوئی ایسا سبب بنا دے کہ وہ یہ فیصلہ میرے حق میں کر دیں، ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔''

اس نے مشکلوں سے اپنے سارے بکھرے لفظوں کو سمیٹ کر ترتیب دی تو اس کی آنکھوں کے دریاؤں سے بڑی تیزی کے ساتھ آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔

واقعات اس قدر تیزی سے پلٹا کھا جائیں گے اس نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہ تھا۔ تھوڑا عرصہ پہلے تک اس کی سوچیں اپنے آپ دھنک رنگ ہونے لگی تھیں۔ من میں چھپے ان دیکھے چور نے اسے یہ احساس دلانا شروع کر دیا تھا کہ اب وہ بچپن کی حدوں کو پیچھے کہیں چھوڑ آئی ہے...... تبھی اس روز وہ انٹر کے امتحان کا نتیجہ سن کر کس قدر خوش خوش گھر پہنچی تھی۔

''اماں...... اماں...... میں امتحان میں بڑے اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئی ہوں۔'' اس نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

''ہوں...... چلو اچھا ہوا...... اب پڑھائی چھوڑ...... اور گھر کے کام کاج پر توجہ دے......'' اس کی والدہ نے دکھی لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن اماں! میں آگے پڑھوں گی۔'' اس نے ضد کی۔

''فضول ہے بیٹی...... وہ لوگ نہیں مانیں گے۔'' اس کی والدہ نے مایوس لہجے میں کہا۔

''وہ کون......؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''اوہ...... جنھاں کوں تکے لا تیڑی تقدیر دا مالک بنا دتا گیا سی......!'' (وہ جن کو بچپن میں تمہاری تقدیر کا مالک بنا دیا گیا تھا) اس کی والدہ نے دکھی دل سے جواب دیا۔

''لیکن وہ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے......!'' اس نے ضدی لہجے میں استفسار کیا۔

پھر اس کی والدہ نے جو بات اسے بتائی اسے سن کر اسے یک لخت یوں لگا جیسے کسی نے اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو...... اسے زندگی میں پہلی بار اپنے ہونے کا افسوس تھا...... اسے لگنے لگا تھا جیسے اسے ننگے پاؤں زندگی کے تپتے صحرا میں بھٹکنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا ہو۔ اسے بڑوں کے فیصلے کا بڑی شدت سے احساس ہونے لگا تھا...... اور اب تو یہ احساس اس کی سوچوں کے بدن سے بوٹیاں نوچنے لگا تھا۔ اسے وہ دن یاد آنے لگا...... جب وہ اکیلی ایک روز بازار سے گزر رہی تھی کہ کسی جانب سے اس پر فقرہ اچھالا گیا تھا۔

''بہوں سوہڑیں ایں......!'' (بہت خوب صورت ہو)

اس نے فقرہ اچھالنے والی آواز کی طرف دیکھا۔

وہ اسی کے محلے کا ایک آوارہ لڑکا وحید خاں تھا...... ممکن ہے وہ اس کے اس فقرے کو اہمیت دیے بغیر گزر جاتی۔ جب دوسری آواز نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

''اس نی اماں وی آنپڑے زمانے اچ بہوں سونڑی بائی!'' (اس کی والدہ بھی اپنے زمانے میں بہت خوب صورت تھی)

وحید خاں کے دوست جمال خاں نے تبصرہ کیا جو عمر میں وحید خاں سے بڑا تھا۔

وہ ان فقروں کے جال سے ابھی نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ کند فقروں کے ایک نیزے نے تو اسے بری طرح چھید ڈالا تھا۔ ''اس نا خاندان خونی بیسے...... تے ایہہ خونی دی دھی بیسے!'' (اس کا خاندان قاتل ہے اور یہ خونی کی بیٹی ہے)

''تاں ونی آکھونا......!'' (تب تو یہ ونی ہوئی نا) وحید خاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ تیزی کے ساتھ وہاں سے گزر جانا چاہتی تھی...... مگر ان لوگوں کے بے ہنگم قہقہے ابھی تک اس کا پیچھا کر رہے تھے اور اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ تندوتیز باتوں کی کٹیلی بوندوں سے چھلنی ہو کر رہ گئی ہو۔ وہ گھر آتے ہی اپنے بستر پر گر پڑی۔ جب اس کا اپنی والدہ سے سامنا ہوا تو اس کا پہلا سوال یہی تھا۔

''یہ قتل کس طرح ہوا...... اور اب اس کی حیثیت کیا ہے......؟''

اس کی والدہ پہلی بار سر نیہوڑائے کسی مجرم کی طرح اس کے سامنے شرمسار بیٹھی تھی۔

''تم اس وقت...... شاید ایک یا ڈیڑھ سال کی تھیں...... جب ایک جھگڑے میں تمہارے والد رشید خاں سے ایک قتل ہو گیا تھا...... اس قتل میں تمہارے والد کے علاوہ تین لوگ اور نامزد تھے۔ پولیس نے مقتول پارٹی کے کہنے پر پرچہ درج کر کے سارے مجرموں کو گرفتار کر لیا۔ کتنی دیر عدالتوں میں کیس چلا پھر مضبوط گواہیوں کے سبب تینوں مجرموں کو عدالت نے سزائے موت سنا دی۔''

اس کی والدہ نے روتے ہوئے بتایا اور کچھ دیر سانس لینے کو رکی۔ وہ بڑی خاموشی اور حیرانی سے یہ سب سن رہی تھی۔ تب اس نے دوبارہ اپنی بات شروع کی۔

''موت کی سزا سنائے جانے کے بعد قاتل پارٹی نے مقتول پارٹی سے صلاں (صلح) کے لیے مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالنا شروع کیا...... یوں چٹ پوشوں (منصف لوگوں) کا کٹھ (پنچایت) مخصوص جگہ کھلے عام ہوئی۔ صلح کی رو سے قاتل پارٹی نے ''بدلے دے شرم'' (بدلے میں دی جانے والی لڑکیاں) بطور ونی مقتول پارٹی کو دینے کا وعدہ کیا۔ جن کی تعداد بارہ تھی، چنانچہ سات لڑکیوں کی اسی وقت تین کپڑوں میں رخصتی کر دی گئی۔ جو آج بھی مقتول پارٹی کے خاندان میں اپنے دن گزار رہی ہیں مگر پانچ لڑکیاں...... جو اس وقت کم سن تھیں اور ان کی عمریں ایک سال سے آٹھ سال کے درمیان تھیں...... ان کے شرعی نکاح تو کر دیے گئے مگر ان کی رخصتی بالغ ہونے پر طے پائی اور تم...... تم ناہید...... ان لڑکیوں میں سے ایک ہو جن کی رخصتی بالغ ہونے پر کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا...... اس طرح تمہارے بدلے...... تمہارا والد...... اور دوسرے لوگ آزاد پھر رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز میں نے تمہیں آگے پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ تم نے اس روز مجھے اپنے کامیاب ہونے کی خوشخبری سنائی لیکن میں اندر سے کانپ گئی تھی۔ آنے والے طوفان سے ڈر گئی تھی۔ تم بھی میرا سرد رویہ دیکھ کر دل برداشتہ ہو گئی تھیں۔ تمہیں اس کا حق پہنچتا تھا مگر میں کیا کرتی...... آنے والے لمحوں کا ڈر اور خوف مجھے دہلا گیا تھا...... اور ہوا بھی یہی...... اس سے اگلے روز ہی مقتول پارٹی کی طرف سے یہ پیغام مل گیا تھا کہ اب جلد تمہاری رخصتی کر دی جائے۔'' اس کی والدہ نے روتے ہوئے بتایا۔

''لیکن اماں! یہ سراسر ظلم ہے...... زیادتی ہے۔'' اپنی والدہ کے ساتھ وہ بھی رونے لگی تھی۔

''میں جانتی ہوں مگر میں کچھ نہیں کر سکتی...... یہ سب یہاں کا دستور ہے۔ روایات ہیں اس علاقے کی...... جس میں ہم رہ رہے ہیں اور ان سے روگردانی اس لیے بھی ممکن نہیں کہ یہ برسوں سے ایسے ہی چل رہا ہے اور پھر تم بھی شرعی لحاظ سے پابند کر دی گئی ہو۔ تمہارا نکاح حبیب خاں سے ہو چکا ہے۔'' اس نے روتے ہوئے بتایا۔

''مگر اماں! میں اپنی خواہشوں کے گلے میں خود اپنے ہاتھوں پھانسی کا پھندا نہیں ڈال سکتی۔ میری اپنی خوشیاں ہیں، میرے اپنے جذبات ہیں۔'' ناہید نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''میری بچی...... اس کے سوا چارہ کار بھی تو نہیں۔'' اس کی والدہ نے بتایا۔

اس رات وہ بالکل نہ سو سکی تھی۔ وہ جب بھی اپنی آنکھیں بند کرتی تو اسے یوں لگتا جیسے فرسودہ رسم و رواج کی بھیانک چڑیلیں بے ہنگم ناچ، شور و غل مچا رہی ہوں...... کیا اس معاشرے میں جہاں وہ سانس لے رہی ہے عورت ہونا

واقعی جرم ہے۔ کیا اس کے سارے خواب چکنا چور ہو جائیں گے...... سپنوں کے شیش محل ...... اور وہ سارے خوب صورت لمحے جو ایک عرصے سے اس کے من میں بسے تھے، روایات کے ایک ہی وار سے ختم ہو جائیں گے...... اور وہ حسین یادیں...... کبھی نہ بھولنے والی زندگی کی خوشگوار ساعتیں...... اب ساری زندگی کا روگ بن کر رہ جائیں گی...... سوچوں کے بھنور پھیلتے چلے جا رہے تھے۔

اس کے گھر والوں نے آج تک اس سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی...... اگر اسی طرح...... اسے کسی نہ کسی دن...... ان روایات کے عفریت کے سامنے اسی بے دردی سے پھینک دینا تھا تو اسے شعور کی روشنی کیوں دی گئی تھی...... اسے بھی ان لڑکیوں کی طرح ان پڑھ رہنے دیا ہوتا...... جو اپنی قربانی پر آنکھیں بند کر کے خاموشی کے ساتھ سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے احساس کی کسی بڑی حویلی میں بند کر کے زبردستی سارے دروازوں کو تالا لگا دیا گیا ہو اور ان کی چابیاں...... ان فرسودہ روایات کے ٹھیکیداروں کے حوالے کر دی گئی ہوں......

سوچیں اسے کہاں دم لینے دیتی تھیں...... پھر ان ہی سوچوں کے عقب میں وہ خوب صورت لمحے...... ٹھنڈے میٹھے ہوا کے خوشبو بھرے جھونکے بن کر اس کی زندگی میں کس طرح شامل ہوئے تھے...... وہ نہیں جانتی تھی مگر اسے اس بات کا علم تھا کہ ان لمحوں کو اس کی زندگی تک لانے والا جواد تھا۔

جواد سے اس کی ملاقات کالج کے ایک فنکشن میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ تقریب کی فوٹو گرافی کرنے آیا تھا...... وہ تصاویر اتارتا رہا اور اس دوران دو چار مرتبہ اس کا سامنا بھی ہوا...... تو اس کی ساتھی لڑکیوں نے پوچھا۔

"ہمیں یہ تصاویر کہاں سے ملیں گی؟"

"یہ میرا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ تصاویر یہاں سے آپ لے سکتی ہیں۔" جواد نے مسکراتے ہوئے اپنا وزیٹنگ کارڈ ان سب میں بانٹتے ہوئے کہا۔

پھر اس فنکشن کے تیسرے روز ہی وہ اس پتے پر پہنچ گئیں۔

"آپ......" اس نے ناہید کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ناہید......" اس نے اپنا نام بتایا۔

"آپ کا چہرہ بڑا (فوٹو جینک) فوٹو گرافی کے معیار کے مطابق ہے۔" اس نے تصاویر اسے دیتے ہوئے کہا تو وہ اپنے متعلق اس کے تاثرات سن کر بہت خوش ہوئی۔

"اگر ان میں سے کوئی زیادہ اچھی لگے تو اسے بڑا کروایا جا سکتا ہے۔" اس نے رائے دی۔

"ہوں......!" اس نے سرسری طور پر تصاویر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی تصاویر سب نے پسند کی تھیں۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اس میں سے دو ایک کو بڑا کروا لیا جائے۔ چنانچہ اگلے روز ہی وہ دوبارہ جواد کے پاس پہنچ گئی۔ اس بار وہ اکیلی تھی۔ جواد کے ساتھ یہی ملاقات اس کی اگلی ملاقاتوں کا سبب بن گئی...... ایک روز جواد نے ہنستے ہوئے اس سے کہا۔

"تم بہت خوب صورت بلا ہو......!"

"تب تو میں تمہیں کھا جاؤں گی......"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے لمبے لمبے خوب صورت ناخنوں والے ہاتھوں سے اسے ڈرایا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

خوب صورت لمحے بھی خوابوں کی طرح ہوتے ہیں جو لمحہ بھر کو آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ یہ خوب صورت اور حسین گھڑیاں بھی جلد ہی ختم ہو گئیں۔ امتحانات قریب آئے تو وہ اس میں مشغول ہو گئی۔ اب جواد سے اس کی ملاقاتیں تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ امتحانات سے فارغ ہوئی تو وہ دونوں ایک بار پھر آپس میں ملنے لگے۔

"تم اپنے گھر والوں سے کہو نا کہ وہ مجھے مانگ لیں......!" ایک روز ناہید نے ہنس کر جواد سے کہا۔

"ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" جواد نے اسے حوصلہ دیا۔

انہی دنوں اس کا رزلٹ آ گیا۔ وہ بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تھی۔

"اب تو فوٹو گرافی کے لیے یہ موزوں چہرہ میں اپنے گھر کے فریم میں سجا لینا چاہتا ہوں......!" اس روز جواد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چل جھوٹے...... میں تو کتنے دنوں سے یہ خواب دیکھ رہی ہوں۔" ناہید نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بس...... بہت جلد...... میں وقت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے کوشش تو کر رہا ہوں۔" اس بار جواد بھی سنجیدہ تھا۔

ان دونوں کے درمیان یہ ملاقات جس قدر مختصر تھی، دونوں کو اتنا ہی حوصلہ دے کر ختم ہو گئی...... اس روز جب اس نے اپنی والدہ کو اپنے رزلٹ کے بارے میں بتایا تو جو کچھ اس نے سنا اس نے اس کے سارے حوصلوں کو پست کر

ڈالا تھا۔ تبھی وہ جواد سے ملی...... اس روز...... زیادہ رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

''پہلے یہ کم موٹی ہیں، جو رو رو کر ان کا حجم اور بڑھا رہی ہو...... اور خدا کی پناہ اوپر سے ظلم کہ ان میں سرخ سرخ ڈوروں نے اور بھی قیامت برپا کر ڈالی ہے۔'' جواد نے حسبِ معمول اسے ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میں خودکشی کرلوں گی جواد......!'' اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔

''خدا خیر کرے...... کیا کوئی زیادہ پریشانی کی بات ہے......!'' جواد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

تب اس نے روتے ہوئے آہستہ آہستہ اسے ساری بات بتادی۔

''بس...... یہ کام اب تو مشکل نہیں رہا...... پریشانی انہیں ہے جنہیں راہ نہیں ملتی......'' اس نے حوصلہ دیا۔

''تو میں کیا کروں......؟'' اس نے روہانسی ہو کر پوچھا۔

پھر اس نے جواد کے مشورے پر عمل کر ڈالا۔ اب اسے امید تھی کہ جلد اس کے دکھوں کا مداوا ہو جائے گا۔

جیسے جیسے وقت بیت رہا تھا، مقتول پارٹی کے تقاضے اب بڑھتے جا رہے تھے۔ ہر روز ان کی طرف سے دھمکی آمیز پیغامات مل رہے تھے۔

''اب کیا جواز ہے، انہیں اپنی بیٹی کو روکنے کا......!'' یہ مقتول پارٹی کی طرف سے انہیں پیغام ملا تھا۔

''لگتا ہے ان کی نیت خراب ہو گئی ہے۔'' اڑنے والی دوسری افواہ ان تک پہنچی۔

تبھی اس رات اس کے والدین خاصی دیر تک اس بات پر غور کرتے رہے۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ جب کتنی دیر تک ان کی باتوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو وہ بھی اٹھ کر ان کے قریب آگئی۔ وہ دونوں سر جھکائے باتیں کر رہے تھے۔

''اب ہمارے پاس ناہید کو روکنے کا کوئی بہانہ نہیں رہ جاتا۔'' اس کی والدہ نے کہا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ ان کی اتنی مہربانی کیا کم ہے کہ انہوں نے ہمیں اتنا موقع دیا۔ ورنہ یہ تو ان کا شرعی حق بھی ہے۔ وہ جس وقت چاہیں طاقت سے بھی اپنا حق لے جاسکتے ہیں۔'' اس کے والد نے شرمندگی سے جواب دیا۔

''اور اگر میں اس فیصلے کو ماننے سے انکار کردوں تو......؟'' ناہید نے پہلی بار ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

قدر

بڑی چیز حاصل ہو جانے سے چھوٹی چیز کو کبھی نہ بھولو کیونکہ جہاں سوئی کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں تلوار کام نہیں کرتی۔

☆☆☆

بندھن

قطرہ قطرہ جب آپس میں ملاپ کے بندھن سے بندھ جاتے ہیں تو دریا کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ دانہ دانہ مل کر تسبیح بن جاتی ہے اور جب لوگ آپس میں ایمان و محبت اور بھائی چارے کے جذبے میں بندھ جائیں اور سچائی کو اپنا لیں، ذاتی صفات کو بالائے طاق رکھ کر نیک مفادات کو پانے کی جستجو میں لگ جائیں تو معاشرتی امن قائم ہو جاتا ہے اور وہاں نعمتوں اور رحمتوں کی برسات ہوتی ہے۔

☆☆☆

دھکا

ایک بحری جہاز جا رہا تھا کہ ایک بڑھیا سمندر میں گر گئی۔ اسے نکالنے کے لیے کسی کی بھی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ ایک سردار چھلانگ لگا کر بڑھیا کو بحفاظت نکال لایا۔

کیپٹن نے جان بچانے پر سردار کو انعام دینا چاہا تو وہ غصے سے بولا۔

''پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے سمندر میں دھکا کس نے دیا تھا۔''

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری
چوہنگ سٹی، لاہور

نعمتِ خداوندی

ایک مریض نے ڈاکٹر سے اپنے مرض کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے عجیب وغریب مرض ہے۔ میری بیوی جب بولنا شروع کر دیتی ہے تو مجھے اس کا ایک لفظ بھی سنائی نہیں دیتا۔''

یہ سن کر ڈاکٹر بولا۔ ''جناب! اسے بیماری نہ سمجھیں بلکہ یہ نعمتِ خداوندی ہے جو آپ کو عطا ہوئی ہے۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

"یہ کس طرح ممکن ہے...... اگر تم ایسا کرتی ہو تو اس سے ہماری بدنامی کے علاوہ خود تم بھی ساری عمر طعنوں کی سولی پر لٹکتی رہو گی۔" اس کی والدہ نے سمجھایا۔

"اس طرح بھی تو میں سولی پر لٹک رہی ہوں۔ روز روز مرنے سے بہتر ہے کہ میں ایک بار ہی زہر کا پیالہ پی لوں۔" وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔ "یہ میری زندگی ہے اور اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے بھی ہے۔" روتے روتے ناہید نے کہا۔

"بیٹی...... تمہارے ونی ہونے سے تمہارے باپ کی زندگی کی سانسیں بڑھی ہیں۔ اب تم چاہتی ہو تو انہیں دوبارہ چھین لو......" اس کی والدہ بھی اسی کے ساتھ رونے لگی تھی۔

"مگر اماں...... تم خود سوچو...... میں حبیب خاں سے...... جو عمر میں مجھ سے......!" روتے ہوئے ناہید کی بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ اس کی والدہ دوبارہ بولی۔

"میں مانتی ہوں...... حبیب خاں کی عمر تمہارے والد سے بھی زیادہ ہے اور اس کے بیٹے بیٹیاں عمر میں تم سے بڑے ہیں لیکن یہاں ایسے ہی چلتا ہے...... سب اسی طرح...... یہ رسم ورواج ہیں یہاں کے...... جن سے بچنا بہت مشکل ہے......"

"اس قدر بھی مشکل نہیں...... جس قدر آپ لوگوں نے اسے بنا رکھا ہے......!" ناہید نے روتے ہوئے حوصلے سے کہا۔

"تو کیا......" اس کے والد نے پوچھا۔

"ہاں...... میری طرف سے انکار کر دیں۔" ناہید نے جرأت سے جواب دیا۔

تب اگلے روز ان کا انکار مقتول پارٹی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اک قیامت تھی جو برپا ہو چکی تھی۔ اک طوفان تھا...... جس نے نئے سرے سے سر اٹھا لیا تھا۔ اب ہر طرف یہی باتیں ہو رہی تھیں۔

"رشید خاں کی بیٹی نے ونی ہونے سے انکار کر دیا ہے۔"

اب تو یہ آوازیں ہر وقت اس کا پیچھا کرنے لگی تھیں...... اس روز بھی جب وہ بازار سے گزر رہی تھی تو مقتول پارٹی کا ایک لڑکا جواد کے ساتھ جاتے ہوئے اسے ملا۔ وہ جن مشکلات کا سامنا کر رہی تھی، ایسے میں جواد کا اس کے ساتھ ہونا ایک بہت بڑا سہارا تھا۔

وہ تیزی کے ساتھ جواد کی طرف بڑھی...... اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر جواد بھی ذرا دیر کو رکا...... تبھی اس کا ساتھی لڑکا ناہید کو دیکھ کر تیزی سے بولا۔

"تم قاتل کی بیٹی ہو...... تمہارا خاندان خونی ہے......!"

"تمہیں ایسی باتیں کرتے حیا نہیں آتی۔" اس نے بڑی جرأت سے جواب دیا۔

"تمہارے باپ نے ہمارا گھر تباہ کیا ہے۔ تم ہمارے دشمن کی بیٹی ہو۔ ہم تمہیں جلا جلا کر ماریں گے......"

وہ چاہتی تھی کہ جواد اس کے طعنوں کا جواب دے مگر وہ حیرانی سے انہیں دیکھے اور ان کی گفتگو سنے جا رہا تھا۔

پھر اس لڑکے نے جواد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو وہ موم کے پتلے کی طرح اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس لڑکے نے جاتے جاتے ناہید کو دوبارہ دھمکی دی۔

"تم ہمارے دشمن کی اولاد ہو۔ ہم تم سے بدلہ لیں گے......"

اس رات ایک بار پھر اس کے والدین سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔

"انہوں نے چٹ پوشوں کا کٹھ بلایا ہے......!" اس کے والد نے روہانسی آواز میں کہا۔

"کب......؟" اس کی والدہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ابھی تاریخ طے نہیں ہوئی۔" اس کے والد نے اداسی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

ان کی گفتگو نے اسے اور بھی خوفزدہ کر دیا تھا...... اسے لگنے لگا تھا کہ وہ بھرے پرے معاشرے میں بالکل اکیلی رہ گئی ہو۔ اس نے جواد کے کہنے پر جو قدم اٹھایا تھا، ابھی تک اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا۔

تب اسے اپنی ایک سہیلی کا مشورہ یاد آیا...... سائیں ننگے شاہ کے مزار پر مانگی دعائیں بہت جلد قبول ہوتی ہیں۔ اسے پہلی بار یوں لگ رہا تھا جیسے اگر وہ وہاں نہ گئی تو اس کی کامیابی کے سارے راستے مسدود ہو جائیں گے۔ ناچار اس روز وہ سائیں ننگے شاہ کے مزار پر منت ماننے کو چلی آئی۔ وہاں لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو اپنے اپنے مسائل کا حل نکلنے اور منتیں ماننے یہاں آتا تھا۔ ان میں حالات کی ستائی عورتیں بھی تھیں جو اپنی طرف کھلنے والی کھڑکی کی جالی سے لگی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ کچھ جالی کے ساتھ اپنے دوپٹوں کی کترنیں...... پراندوں کے دھاگے بھی باندھ رہی تھیں۔

یہاں آ کر وہ بھول ہی گئی تھی کہ وہ کونسی دعا یہاں مانگنے آئی تھی...... اس کا ذہن نفرت کی آگ میں پک رہا تھا...... کھڑکی نے اسے دعا کا یا دوپٹے کی کترن باندھنے کا

مشورہ دیا۔

اس نے مشورہ مانتے ہوئے اپنے دوپٹے کی کترن وہاں باندھی اور پھر بڑی کوششوں سے اپنے گم شدہ لفظوں کو اکٹھا کر کے دعا بھی مانگ ڈالی...... اسی شام اسے گھر آ کر پتا چلا کہ چٹ پوشوں نے کٹھ کی تاریخ رکھ لی ہے۔ آج سے دو دن بعد شام کو ایک مخصوص جگہ ان کا کٹھ ہو رہا ہے۔

یہ سن کر اسے لگا جیسے کسی نے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو...... جواد بھی اب اس سے ملنے سے کترا رہا تھا۔ اس نے اسے کئی جگہوں پر خود بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کے موبائل پر پیغام بھی دینے کی کوشش کی مگر وہ بھی بند پڑا تھا۔ اب اسے پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ وہ اندھیروں میں بھٹک رہی ہے اور اس کے اردگرد طعنوں کے تیز نکیلے نیزے سنبھالے رسم و رواج کی چڑیلیں وحشیانہ رقص کرتی ہوئی اس پر کسی وقت بھی بھرپور حملہ کر سکتی ہیں۔

جیسے جیسے وقت بیت رہا تھا...... اس کی سوچیں اور وہ خود ٹوٹتی جا رہی تھی۔

اور پھر وہ دن بھی آ پہنچا...... جب چٹ پوشوں کا کٹھ ہونے والا تھا۔ وہ نڈھال سی اپنے بستر پر پڑی تھی۔ اس کی حالت اب سزائے موت کے اس قیدی کی طرح تھی جس کو کسی وقت بھی موت کے گھاٹ تک لے جایا جانے والا تھا۔

چٹ پوشوں نے اس کے والد کو بھی کٹھ میں بلا لیا تھا۔

کٹھ میں وہ لوگ اپنی دلیلیں دے رہے تھے۔ جب ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کٹھ کے بڑے کے کان میں کچھ کہا۔ وہ پریشانی میں اٹھ کر چلا گیا...... کٹھ دوبارہ شروع ہوا پھر اچانک...... ایک کھلبلی مچ گئی۔ بتانے والے نے اسے بتایا کہ پولیس کٹھ کرنے والوں اور اس کے والد کو پولیس اسٹیشن لے گئی ہے۔ لحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک لوٹ آئی تو کیا...... اس نے جو کیا تھا اس کا نتیجہ عین وقت پر نکل آیا تھا......؟ وہ تو مایوس ہو چکی تھی، اس نے سوچا۔

تھوڑی دیر بعد اسے بھی پولیس اسٹیشن طلب کیا گیا۔

”میں قطرہ قطرہ ساری زندگی نہیں مر سکتی۔ مجھے مارنا ہے تو ایک ہی بار مار دیا جائے۔“ ناہید نے روتے ہوئے کہا۔

”یہ جو آپ کے قریب بیٹھا ہے...... حبیب خان...... اس کے بچے بھی مجھ سے بڑے ہیں اور جب مجھے شعور نہیں تھا تو میرا اس کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ محض اس لیے کہ میرے والد سے اتفاقاً ایک قتل ہو گیا تھا...... اور صلاب (صلاح) کے عوض ہم سے انہوں نے بدلے لڑکی یا رہ شرم و نی کے طور پر لیں۔ جن میں سے سبات آج بھی ان کے خاندان میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہی ہیں۔ وہ وہاں ہر روز جیتی اور ہر روز مرتی ہیں۔ اس وقت ہم نابالغ تھیں۔ اس لیے ہمارے نکاح تو کر دیے گئے مگر ہمیں بالغ ہونے تک دوبارہ والدین کے پاس بھیج دیا گیا۔ میں اب بالغ ہوں مگر میرے اندر کا خوف مجھے بے موت مارے دے رہا ہے۔ میں حالات کی کڑی دھوپ پہنے پھر رہی ہوں اور اس کی سختی کو اپنے بدن پر برداشت کر رہی ہوں۔ یہ لوگ مجھے دوبارہ اپنے پاس لے جانے کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں جو مجھے منظور نہیں۔ اگر آج میں ہار گئی تو رسم و رواج کی بھیانک اور گہرے غار سے مجھ ایسی ہزاروں ناتواں کرنے والیاں کبھی نکل نہ پائیں گی؟“

ناہید اپنا بیان ریکارڈ کرا کے باہر نکلی تو علاقے کے لوگ اس کے اس فیصلے سے بے حد مشتعل دکھائی دے رہے تھے...... تھانے کے باہر جم غفیر جمع تھا لیکن حکومتی آرڈر کے سامنے وہ بے بس تھے۔ لوگ چٹ پوشوں کے بڑے کے خلاف بھی نعرے لگا رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اسے پہلے سے پولیس کی کارروائی کا علم تھا۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے ان سے بچتے بچاتے گھر کی طرف آنے لگی تو اچانک وہ اس کے سامنے آ گیا۔

اس کی سفید خشخشی داڑھی متواتر رونے سے بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بڑی سی چادر میں چھپا رکھا تھا...... وہ ڈر گئی۔ اس سے پہلے کہ اس کی چیخ نکلتی...... اس نے اپنا چہرہ عیاں کر دیا۔ وہ حیرانی سے رک گئی...... اس نے اپنے ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

”بیٹی...... میں ہمیشہ ان چٹ پوشوں کا بڑا رہا ہوں۔ جس روز یہ کٹھ ہوا، میں بھی وہاں موجود تھا کہ کسی نے آ کر مجھے بتایا کہ میرے بڑے بیٹے کا جھگڑا ہو گیا ہے اور مخالف شدید زخمی ہو کر اسپتال جا چکا ہے۔ میں فوراً وہاں سے اٹھ آیا...... پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ میں بھاگتا ہوا اسپتال پہنچا...... تو وہ زخمی مر چکا تھا...... میں نہیں جانتا...... اب آگے کیا ہو گا مگر میرے اندر ایک خوف بیٹھ گیا ہے۔ تم بڑی بہادر لڑکی ہو...... مجھے بھی کوئی راستہ دکھاؤ۔“

وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہے جا رہے تھے۔

”یہ راہ تم ہی مجھے دکھا سکتی ہو۔ میری بیٹیاں ابھی بہت چھوٹی ہیں۔“

عکس

منظر امام

اکثر ماضی کا تسلسل کئی زندگیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور یہاں بھی یہی ہوا۔۔۔ جو عکس کل کسی کا حال تھا آج وہ ماضی بن کر کسی کا مستقبل سنوارنے کی جستجو میں مبتلا ہے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ جذبوں کا احترام ہمیشہ رشتوں کو مضبوط کرتا ہے۔

ایک بھولے بسرے چہرے میں اپنائیت کا پرتو دیکھنے والی دوشیزہ کا ماجرا

وہ ایک ادھیڑ عمر انسان تھا۔ فیاض کے برابر یا اس سے کچھ چھوٹا لیکن حالات نے اسے بہت کمزور کردیا تھا۔

ویسے فیاض تو خود بھی بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اس کے قویٰ مضبوط تھے جبکہ نظر آنے والا اجنبی بہت کمزور تھا۔ اس سے چلا بھی نہیں جارہا تھا۔ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا۔

جانے کیوں فیاض کو اس سے کچھ ہمدردی سی ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ چلنے والے ملازمین سے کہا۔

”ذرا معلوم تو کرو کون ہے یہ؟“



اس دوران میں وہ اجنبی تھک کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ چکا تھا۔ فیاض دور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اس علاقے کا ایک بڑا زمیندار تھا۔ دور دور تک اس کی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ہر صبح سیر کے لیے نکلتا تو کئی ملازمین اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ راستے میں ملنے والے کسانوں کو ڈانٹتا پھٹکارتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا۔

اس علاقے کے کسان اس کی صورت دیکھ کر کانپ اٹھتے تھے۔ بے رحمی اس کے مزاج میں شامل تھی۔ وہ کہا کرتا ...... میں نے جس دن ان پر رحم کیا، اسی دن یہ میرے سروں پر سوار ہو جائیں گے۔ اس کے ملازمین اس اجنبی کی خبر لے کر واپس آ چکے تھے۔

''سرکار...! وہ اس علاقے میں پہلی بار آیا ہے۔'' ملازمین نے بتایا۔ ''وہ مدنا پور جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے بس پر حملہ کر دیا۔ وہ موقع پا کر کسی طرح بھاگ نکلا۔''

''ہاں سنا تو میں نے بھی ہے کہ آج کسی بس پر حملہ ہوا ہے۔'' فیاض نے کہا۔ ''تو اب یہ کہاں جا رہا ہے؟''

''اس کو خود بھی کچھ نہیں معلوم سرکار کہ یہ جگہ کون سی ہے اور وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بھوکا بھی ہے۔''

''اس کو حویلی لے چلو۔'' فیاض نے کہا۔ ''اس سے وہیں بات کریں گے۔''

وہ ملازم پھر اس بوڑھے کے پاس دوڑے چلے گئے۔ انہوں نے اس اجنبی کو سہارا دے کر اٹھایا اور فیاض کے پاس لے کر آ گئے۔ فیاض بہت غور سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ ''ہاں تو ..... کیا نام ہے تمہارا؟''

''جناب! میرا نام ناظم علی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں مدنا پور جا رہا تھا کہ راستے میں ایک حادثہ ہو گیا۔''

''اور کہاں سے جا رہے تھے؟''

''شہر سے جا رہا تھا جناب۔ مدنا پور میں میرا ایک شاگرد ہے۔ اس کو اسکول کے زمانے میں پڑھا چکا ہوں لیکن وہ مجھے بھولا نہیں ہے۔ اس نے مجھے اپنی شادی میں بلایا تھا۔ بس وہیں جا رہا تھا کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ اب تو میں بہت تھک چکا ہوں۔ عمر بھی ایسی نہیں رہی۔''

''شادی کب ہے؟'' فیاض نے پوچھا۔

''ابھی تو ایک ہفتہ ہے۔ اس نے پہلے بلایا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ہمارے یہاں آ کر آرام کریں۔'' ناظم نے کہا۔

''ابھی تو بہت وقت ہے۔ تم ہماری حویلی چلو۔ ہمارے آدمی تمہیں مدنا پور پہنچا دیں گے۔'' فیاض نے کہا۔

''بڑی مہربانی جناب۔''

فیاض کے ملازمین کے لیے بھی یہ ایک نئی بات تھی کہ فیاض کسی پر اتنا مہربان ہو رہا تھا کہ اپنی حویلی میں لے جانے کی بات کر رہا تھا۔ ورنہ وہ تو کسی کو ایک ہی منٹ میں بھگا دیتا تھا۔

اس اجنبی ناظم کو حویلی میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے لیے ایک کمرا مخصوص کر دیا گیا اور ایک اچھا سا بستر لگا دیا گیا۔

فیاض کے منیجر نے اس سے سوال کیا۔ ''سرکار! میری سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ نے اس شخص کو اتنی عزت کیوں بخشی ہے؟''

فیاض مسکرا دیا۔ وہ منیجر اس کا منہ چڑھا تھا۔ وہ کبھی کبھی فیاض سے ایسی باتیں بھی کر جاتا جو اس کو ناگوار گزر جاتیں۔ لیکن وہ صرف اس لیے برداشت کر لیتا تھا کہ منیجر ایک ہوشیار انسان تھا۔ اس نے فیاض کے سارے معاملات بہت خوبی سے سنبھال رکھے تھے۔

''یہ تم نہیں سمجھو گے۔ فی الحال اتنا سمجھ لو کہ وہ ایک استاد ہے اور مجھے اس کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ جب میں نے اسے دیکھا تو اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ رہے گا۔''

''جو مرضی ہو سرکار...... ویسے میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔''

''اتنا کافی ہے کہ میری نیلماں کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔'' فیاض نے کہا۔

نیلماں فیاض کی نواسی تھی۔ اس کی بیٹی راشدہ کی نشانی۔ فیاض کو اس سے بہت محبت تھی۔ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک حادثے نے دونوں کی جان لے لی تھی۔ نیلماں اس وقت پندرہ سولہ برس کی تھی۔ فیاض نے اپنی نواسی کو اپنے گھر ہی میں رکھ لیا تھا۔

وہ پرائیویٹ تعلیم حاصل کر رہی تھی لیکن اسے اس بستی میں پڑھانے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ ایک دو تھے بھی تو وہ جوان تھے اور فیاض اس سلسلے میں اتنا محتاط تھا کہ اس نے کسی بھی نوجوان سے نیلماں کو تعلیم دلوانے کے بجائے یہی بہتر سمجھا تھا کہ وہ خود سے امتحانات کی تیاری کرتی رہے۔

اور اب اس اجنبی ناظم کی صورت میں ایک استاد ہاتھ آ گیا تھا۔ منیجر کی سمجھ میں اس کی یہ بات آ گئی تھی۔

دوسری صبح فیاض خود ناظم کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ناظم اس وقت ناشتے سے فارغ ہو کر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے فیاض کا استقبال

کیا۔ ''جناب! آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے میرا اتنا خیال رکھا۔ اب میں جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہوں۔ جو کمزوری تھی، وہ اب دور ہو گئی ہے۔''

''لیکن میں تو تمہیں جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔'' فیاض نے کہا۔

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا؟''

''میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اب کہیں نہیں جاؤ۔'' فیاض نے کہا۔ ''اس حویلی میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''کیوں مذاق کر رہے ہیں جناب...... میں تو ایک مسافر ہوں۔ میرا گھر ہے، میرے معاملات ہیں۔ میں یہاں کیسے رہ سکتا ہوں؟''

''تم اپنے گھر والوں کو بھی یہیں بلا لو۔''

''گھر والے۔'' ناظم کے چہرے پر دکھ کے سائے لہرا گئے۔ ''نہیں جناب! میرے کوئی گھر والے نہیں ہیں۔ میں ایک اکیلا انسان ہوں۔''

''پھر تو یہ اور بھی اچھا ہے۔'' فیاض نے کہا۔ ''جو وہاں کے معاملات ہیں، وہ ایسے تو نہیں ہوں گے کہ تم واپس نہ جاؤ تو سب تباہ ہو جائیں۔ زیادہ سے زیادہ تھوڑی بہت ذمے داریاں ہوں گی، وہ ادا کر دی جائیں گی۔''

''جناب! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ آپ کیوں ایسا چاہتے ہیں؟''

''تم ایک استاد ہو نا..... تو میں تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے نیلماں کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس سے بہت پیار ہے۔ اس کی ضد ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرے۔ اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی بھروسے کا آدمی اس کو پڑھا دیا کرے۔''

''جناب! وہ اگر آپ کی نواسی ہے تو مجھے بھی اسے تعلیم دینے میں خوشی محسوس ہوگی۔'' ناظم نے کہا۔ ''لیکن......''

''اب.... لیکن ویکن کچھ نہیں۔ یہاں سب کچھ ہے۔ تمہیں ساری سہولیات ملیں گی۔ اس کے علاوہ جو تنخواہ چاہو گے، وہ ملے گی۔''

''جناب! بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے سامنے پیسوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ پڑھنا پڑھانا میرا شوق ہے۔ اسی لیے میں ضرور پڑھاؤں گا لیکن مجھے شادی میں شریک ہونا ہے۔ اس کے بعد ہی آسکوں گا۔''

''ہاں ہاں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میری گاڑی تمہیں مدنا پور پہنچا دے گی اور واپس بھی لے آئے گی۔''

☆☆☆

ناظم کچھ دنوں کے بعد واپس آ گیا تھا۔

فیاض کی نواسی نیلماں نے شور سا مچا دیا تھا۔ ''تمہیں نانو! میں اس آدمی سے نہیں پڑھوں گی۔''

''بیٹا! وہ بہت قابل آدمی ہے۔'' فیاض نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''نانو! اسے آپ نے زبردستی رکھ لیا ہے تو اس کا دل کیا لگے گا۔'' نیلماں نے کہا۔ ''وہ تو مجبوری میں پڑھائے گا۔''

''بیٹا! تم دیکھ لینا۔'' فیاض نے کہا۔ ''ورنہ دو چار دنوں کے بعد روانہ کر دیں گے اس کو......''

لیکن جب وہ نیلماں کو پڑھانے بیٹھا تو نیلماں کو مزہ آنے لگا۔ ناظم نے پہلے ہی دن اسے حیران کر دیا تھا۔ اس نے مشکل ترین سبجیکٹ کو بھی آسان بنا دیا تھا۔ اس کے سمجھانے کا انداز اتنا اچھا تھا کہ نیلماں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایک عام سا انسان اتنا قابل بھی ہو سکتا ہے۔

اس پڑھائی کے لیے فیاض نے جو کمرا مخصوص کیا تھا، وہ کسی زمانے میں نیلماں کی ماں، فیاض کی بیٹی راشدہ کا تھا۔ وہ بھی وہیں بیٹھ کر پڑھا کرتی تھی۔ نیلماں اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ بہت غور سے ناظم کو دیکھے جا رہی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹا...... اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟''

''پتا نہیں کیوں، یقین نہیں آتا کہ آپ جیسا آدمی کسی کو پڑھا بھی سکتا ہے۔'' نیلماں نے کہا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ کی آواز اور لہجے میں بہت نرمی اور مٹھاس ہے۔ میں نے تو بستی کے استادوں کو دیکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جلاد سر پر آکر کھڑا ہو گیا ہو۔''

''کیا تم کسی اور سے بھی پڑھ چکی ہو؟''

''نہیں۔'' نیلماں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں سنتی ہوں۔ اس بستی میں میری دو چار دوست ہیں۔ وہ بتاتی ہیں۔''

''ہر استاد ایسا نہیں ہوتا بیٹا۔ ہر ایک کا طریقہ الگ ہوتا ہے اور تم پر تو میں سختی کر بھی نہیں سکتا۔''

''وہ کیوں؟''

''وہ...... وہ اس لیے کہ تم بہت اچھی ہو۔'' ناظم نے

بات بتائی۔

نیلماں کے لیے اس کی بات حیران کن تھی۔ اسی دن نیلماں کے پاس کاغذ ختم ہو گئے۔ ناظم نوٹس لکھوا رہا تھا۔

''سر!'' نیلماں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کاغذ ختم ہو گئے ہیں۔ میں کسی سے منگواتی ہوں۔ دس منٹ میں آجائیں گے۔''

''تم ایسا کرو، وہ سامنے والی کیبنٹ کھول لو۔ اس کی نچلی دراز میں کاغذ پڑے ہوں گے۔''

''آپ کو کیسے معلوم سر؟''

''بس...... بس یوں ہی۔ میرا اندازہ ہے۔'' ناظم نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے مل ہی جائیں۔''

نیلماں نے سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں کیبنٹ کھولی۔ بے شمار الٹی سیدھی چیزیں بھری ہوئی تھیں اور کاغذات کا ایک بڑا پلندا بھی تھا۔ نیلماں حیران رہ گئی تھی۔ ''سر! یہ صرف آپ کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔'' اس نے کہا۔ ''بات کچھ اور ہے، بتائیں آپ کیسے جانتے ہیں؟''

''تمہارا کام ہو گیا نا۔ بس اب لکھنا شروع کرو۔''

''نہیں سر! مجھے بتائیں... میں اس طرح نہیں لکھوں گی۔ جب تک آپ مجھے مطمئن نہیں کر دیں گے۔'' نیلماں نے ضد شروع کر دی تھی۔

''خدا کی قسم...... بالکل اپنی ماں کی طرح ضدی ہو۔'' ناظم نے کہا۔

''اب تو آپ کو بتانا ہی پڑے گا سر۔'' وہ اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی تھی۔ ''آپ کیسے جانتے ہیں امی کو؟''

''بیٹا! میرا خیال یہ ہے کہ پوری دنیا میں تمہاری امی کے علاوہ میں کسی اور کو نہیں جانتا۔'' ناظم نے ایک گہری سانس لی۔

''کیا......'' نیلماں حیران رہ گئی تھی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کا امی سے کیا تعلق ہے اور ایک بات بتاؤں...... امی کو جاننے کا دعویٰ کرنے والا دنیا میں ایک ہی شخص ہے اور اس کا نام ہے سہیل...... سہیل فاروقی......''

''بیٹا! اب اگر میں تم سے کچھ کہوں تو کیا تم اس راز کو راز رکھ سکو گی۔ ورنہ میری زندگی کو خطرہ ہو جائے گا۔ میں مار دیا جاؤں گا۔''

''خدایا آپ کتنی بھیانک باتیں کر رہے ہیں سر۔ کون مارے گا آپ کو؟''

''پہلے یہ وعدہ کرو کہ تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

''بیٹا! وہ سہیل فاروقی میں ہی ہوں۔'' ناظم نے بتایا۔

''کیا؟''

''ہاں بیٹا! اب میں نے اپنا راز تمہارے حوالے کر دیا ہے۔ اب تم اس کی حفاظت کرنا۔''

''یہ سب کیا ہے؟ میں تو آپ کا نام اپنے بچپن سے سنتی چلی آرہی ہوں۔'' نیلماں نے بتایا۔

''کون لیتا تھا میرا نام؟''

''میری امی...... انہوں نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ بلکہ ایک دن میں نے ان کی ڈائری پڑھ لی تھی۔ وہ آپ کے تذکروں سے بھری ہوئی تھی۔ امی میری دوست بھی تھیں۔ میں نے جب انہیں کریدا تو انہوں نے مجھے آپ کے بارے میں بتا دیا۔ وہ ابو سے کبھی خوش نہیں رہیں۔ نہ جانے کیوں نانا نے ان کی شادی ابو جیسے سخت اور بے رحم انسان سے کر دی تھی۔ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسی لیے امی کہا کرتی تھیں کہ مجھے سمجھنے والا صرف ایک ہی شخص ہے اور وہ ہے سہیل......''

ناظم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نیلماں بھی رو رہی تھی۔ اپنی ماں کو یاد کر کے۔

''بیٹا! یہ بتاؤ تمہارے نانا تمہارے ساتھ کیسے ہیں...... میرا مطلب ہے کہ ان کا کیا رویہ ہے؟''

''بہت اچھا۔ بہت مہربان۔ امی کی موت کے بعد جیسے وہ بالکل بدل کر رہ گئے ہیں۔ اب ان کے مزاج میں پہلے والی سختی بھی نہیں رہی۔ اس کی مثال خود آپ ہیں۔ نانا آپ کو یہاں لے کر آئے، اپنی حویلی میں رکھا اور مجھے تعلیم دینے کی ذمے داری دے دی۔ اگر پہلے والی بات ہوتی تو پھر نہ جانے کیا ہوتا۔''

''بیٹا! میں اور راشدہ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ہو جائیں گے کیونکہ تمہاری نانی بھی ہمارے حق میں تھیں لیکن تمہارے نانا دیوار بن گئے۔ انہوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا، اب اس کا ذکر بے کار ہے۔ اس ملک اور اس معاشرے میں ایسی نہ جانے کتنی کہانیاں ہوں گی جہاں غریبوں کو محبت کا بھی حق نہیں ہے۔ میرے دل میں نفرتیں پروان چڑھتی چلی گئیں۔ میں نے سوچ لیا کہ تمہارے نانا سے اس..... کا بدلہ ضرور لوں گا۔ پھر وقت گزرتا چلا گیا۔ پتا چلا کہ راشدہ کی شادی ہو گئی ہے۔

وہ خوش نہیں ہے۔ اس کے بعد پتا چلا کہ اس کی ایک بیٹی بھی ہو گئی ہے جس کا نام نیلماں رکھا گیا ہے۔ پھر اس کی اور تمہارے باپ کی موت کی خبر بھی ملی۔ میں اور زیادہ جنونی ہوتا چلا گیا۔ پھر میں ایک فیصلہ کر کے اس طرف آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں تم کو تمہارے نانا کے خلاف بھڑکاؤں گا کیونکہ میں ان کے مزاج سے واقف تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ جس طرح وہ راشدہ کے لیے سخت تھے، اسی طرح تمہارے لیے بھی ہوں گے لیکن پتا چلا کہ وہ تم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔"

"تو کیا آپ کا انتقام صرف اتنا ہی ہوتا کہ آپ مجھے نانا کے خلاف بھڑکا کر چلے جاتے؟"

"ظاہر ہے۔ میں اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو پہلے بھی بے بس اور کمزور تھا اور آج بھی ہوں۔" ناظم نے کہا۔ "لیکن اب مجھے کچھ نہیں کرنا کیونکہ تمہیں نانا کی پوری محبت مل رہی ہے۔"

"جی ہاں۔ نانو کو مجھ سے بہت محبت ہے۔ ان کو اس بات کا پچھتاوا بھی ہے کہ انہوں نے میری امی یعنی اپنی بیٹی کے ارمانوں کا خون کر کے بہت برا کیا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔" ناظم نے ایک گہری سانس لی۔ "بیٹا! اب میرا یہاں کا کام ختم ہو گیا۔ اب میں چلا جاؤں گا۔"

"میں سمجھی نہیں۔ کہاں جائیں گے اور کس کام کی طرف آپ کا اشارہ تھا؟" نیلماں نے پوچھا۔

"بیٹا! تمہاری ماں سے جدا ہونے کے بعد مجھ پر جو گزری، وہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔" ناظم نے کہا۔ "میں سہیل فاروقی سے ناظم بن گیا۔ صرف تمہارے نانا کے خوف سے...... کیونکہ انہوں نے میرے پیچھے غنڈے لگا دیے تھے۔ جو ہر حال میں مجھے مارنا چاہتے تھے۔"

"میرے خدا! یہ سب تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔" نیلماں نے کہا۔

"ظاہر ہے، یہ سب تمہیں کون بتاتا۔"

"بتائیں تو پھر کیا ہوا؟"

"اس کے بعد کیا ہوتا تھا۔ میرے دل میں تمہارے نانا کے خلاف نفرت پروان چڑھتی چلی گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہر حال میں اپنا اور اپنی محبت کا بدلہ لے کر رہوں گا۔ اسی لیے میں نے اپنی شناخت بدل لی۔ سہیل سے ناظم ہو گیا اور کسی طرح سے یہاں آ گیا اور اب جا رہا ہوں۔"

"ایک بات بتائیں۔ کیا آپ کو میری ماں سے محبت تھی؟"

"بیٹا! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"

"فرض کریں...... امی سے آپ کی شادی ہو جاتی تو میں آپ کی کون ہوتی؟"

"ظاہر ہے، تم میری بیٹی ہوتیں۔"

"تو کیا آپ اپنی بیٹی کو چھوڑ کر چلے جائیں گے؟"

ناظم اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ بہت دنوں کے بعد ایک نئی زنجیر اس کے قدموں سے لپٹ رہی تھی۔ بہت پہلے راشدہ نے بھی یہی کہا تھا۔ کیا آپ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے؟

"اب میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔" نیلماں نے کہا۔

"ہاں بتاؤ۔"

"آپ کیا سمجھتے ہیں کہ نانا بے وقوف ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"تو پھر سن لیں کہ نانا کو معلوم ہے کہ آپ کون ہیں۔" نیلماں نے بتایا۔

"کیا......؟"

"ہاں، انہوں نے آپ کو پہچان لیا تھا۔ اسی لیے انہوں نے آپ کو آفر دی کہ آپ مجھے پڑھائیں۔"

"کیوں...... اتنی مہربانی کیوں؟"

"صرف اس لیے کہ میری زندگی کا وہ خلا پورا ہو سکے جو باپ کے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔" نیلماں نے کہا۔ "کیا آپ مجھے یہاں رہ کر ایک باپ کی شفقت نہیں دے سکتے؟"

"بیٹا! وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں رہوں گا تو تمہاری ماں یاد آتی رہے گی۔"

"ماں تو مجھے بھی یاد آتی ہے نا...... لیکن میں تو یہیں رہ رہی ہوں۔ یادوں کے تعاقب میں دور تک نہیں چلے جاتے۔ وہیں رہ کر زندگی گزارتے ہیں اور اب تو میں جان چکی ہوں کہ آپ کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ آپ یوں ہی ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اب تو میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔"

ناظم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی راشدہ اب ایک دوسرے روپ میں سامنے آ گئی تھی۔ پہلے محبت کی ذمے داری تھی اور اب ایک بیٹی کی ذمے داری اس کے سامنے تھی۔

ازدواجی زندگی کی باریکیاں سمجھاتی اور محبت [illegible] رشتے کو سلجھاتی ایک [illegible] اور [illegible] داستان

چھپر چھائوں

محمد زبیر سلیمانی

کائنات بنانے کے بعد اللّٰہ تعالیٰ نے اس کا حسن بڑھانے کے لیے اس میں بسنے والے جوڑے بنائے... نہ صرف انسان بلکہ جانوروں کے بھی... تاکہ زندگی کو سہل کرکے جیا جاسکے۔ ورنہ تنہائی کا زہر شاید ہر جاندار کو مار دیتا لیکن... افسوس عہد حاضر میں یہ جوڑ بن جانے کے بعد انسان جانے کس جوڑ توڑ میں لگ جاتا ہے کہ زندگی کا سارا حسن ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور جب توازن کا بگاڑ پیروں تلے سے زمین کھسکا دیتا ہے تو یہی نادان انسان اس وقت قدم جمانے کے لیے ادھر ادھر سہارے تلاش کرتا ہے مگر... یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک کو سہارا میسر بھی آجائے۔ البتہ جسے مل جائے وہ واقعی خوش نصیب ہوتا ہے۔ اسے بھی دنیا کی دھکم پیل میں جب جگہ نہ ملی تو ماضی کے در پکڑنے پر مجبور ہو گئی تاکہ زندگی کی ڈور ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے... لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ جب زندگی رنگین تتلی کے مانند اس کے گرد طواف کر رہی تھی تو وہ اس وقت اس کی قدر کرتی... شاید زندگی کا حسن اسے حسن سلوک کی پوشاک میں چھپائے ہمیشہ کے لیے معتبر کر دیتا اور وہ ذلت اور نفرت کی دلدل میں گرنے سے بچ جاتی، جس میں اس کے گھمنڈ نے دھکیل دیا تھا... جبکہ سچ بھی یہی ہے کہ شادی شدہ زندگی کی گاڑی توازن مانگتی ہے ورنہ کوئی نہ کوئی گڑھا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔





جمال نے موبائل کی اسکرین پر ٹائم دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے اپنی گاڑی ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی کی اور خود اندر داخل ہوگیا۔ پھر وہ واش بیسن کی طرف آیا، آئینے میں اپنا حلیہ دیکھا۔ بڑھی ہوئی شیو، آنکھوں میں رت جگا اور ذہنی تناؤ صاف نظر آرہا تھا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد وہ ٹیبل پر آیا۔ اگلے ہی لمحے ویٹر اس کے سامنے آکر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''ناشتے میں کیا ہے؟'' جمال نے جماہی لیتے ہوئے سوال کیا۔

''انڈا فرائی، پائے، چھولے، حلوا پوری۔'' ویٹر مشینی انداز میں بولا۔

''ایک پراٹھا اور انڈا فرائی، ساتھ چائے، چینی کم پتی زیادہ۔'' یہ کہہ کر جمال میز پر رکھے ہوئے اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ہیڈلائنز کو دیکھنے کے بعد اس نے اخبار کے صفحات پلٹے اور سرسری طور پر دیکھنے لگا مگر اخبار پر دھیان دینے کے باوجود اس کے ذہن کی سوئی حنا پر اٹکی ہوئی تھی۔ حنا اس کی بیوی تھی۔ ان کی شادی کو تین سال مکمل ہو چکے تھے مگر ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی بات تلخی کا باعث بن جاتی تھی۔ جمال کو اس کی انا پرستی اور بے پروا طبیعت سے شکایت تھی۔ وہ خود ایک کم گو اور سیدھا سادہ انسان تھا۔ آج صبح ہونے والی تلخی کے باعث نہ تو حنا نے ناشتا بنایا، نہ اس نے طلب کیا اور اب آفس جاتے ہوئے وہ اس چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھا اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔ ناشتا کر کے وہ آفس روانہ ہوگیا۔

شام پانچ بجے جب وہ اپنے گھر آیا تو کافی تھکا ہوا تھا۔ گھر آتے ہی وہ بیڈروم میں جا گھسا اور جوتوں سمیت بستر پر اوندھے منہ دراز ہوگیا۔ حنا دوسرے کمرے میں... ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جمال کا خیال تھا کہ صبح ہونے والی تلخی اب ختم ہو چکی ہوگی۔ ابھی حنا کمرے میں داخل ہوگی اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر پوچھے گی...... چائے بناؤں آپ کے لیے۔ مگر ایک گھنٹا پڑے رہنے کے باوجود ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ لحہ بہ لحہ اس کی ذہنی تھکن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بستر سے اٹھا اور حنا کے کمرے میں جا گھسا۔ حنا نے ایک نظر دیکھا پھر ڈراما دیکھنے میں مشغول ہوگئی۔ جمال کا دل چاہا کہ وہ اینٹ کی ایک ضرب سے ٹی وی کی اسکرین توڑ دے مگر وہ ایسا نہ کرسکا، اندر ہی اندر تلملاتا رہا مگر خود کو نارمل ظاہر کرنے کے لیے ایک گانے کی دھن پر سیٹی بجا رہا تھا۔ یہ وہ گانا تھا جس میں محبوب اپنی محبوبہ سے کہتا ہے کہ تمہاری بے نیازی سے مجھے کیا لینا، میں تو ہر حال میں خوش رہتا ہوں۔

کمرے میں بے مقصد آنے کے بعد وہ باہر نکل گیا اور کچن میں چائے بنانے لگا۔

☆☆☆

وال کلاک رات کے تین بجا رہا تھا۔ جمال کا ہاتھ بار بار ریموٹ کی جانب جاتا، چینل تبدیل کرتا پھر ریموٹ رکھ دیتا۔ اگلے ہی لمحے ریموٹ سے کوئی اور پروگرام لگا دیتا تھا۔ پچھلے پانچ گھنٹوں میں وہ تیس چینل آزما چکا تھا پھر اس نے قریب لیٹی ہوئی حنا کو دیکھا جو آڑی ترچھی لیٹی ہوئی انتہائی سکون کی نیند سو رہی تھی۔ بوریت، غصہ، جھنجلاہٹ، اور اداسی کے باعث اس کا ذہن مختلف کیفیتوں میں گھرا ہوا تھا۔ جمال نے پاس رکھی، سگریٹ کی ڈبیا کو کھولا، اس میں کوئی سگریٹ نہیں تھا۔ پھر اس نے سلیپر میں پاؤں ڈالے اور سگریٹ لینے کے ارادے سے باہر نکل گیا۔ باہر آکر اس نے کھلے آسمان کو دیکھا۔ ادھورے چاند کی تاریکی میں لپٹی ہوئی چاندنی ماحول کو اور بھی اداس بنا رہی تھی۔ سارا شہر سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے جیب کو ٹٹولا۔ بٹوا تو وہ کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ کمرے میں آکر اس نے سگریٹ کا ایک ٹوٹا ایش ٹرے سے نکالا۔ اس کے تین چار کش لگ سکتے تھے۔ ماچس سے اس کو سلگایا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ پہلے سے استعمال شدہ سگریٹ کا کش لگاتے ہی اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ حنا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی پھر کروٹ بدل کر دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

''جاگ رہی ہو تو ایک کپ چائے بنا دو۔'' جمال نے گویا صلح نامے پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔

حنا نے وال کلاک دیکھا پھر سوگئی۔

''یہ کون سا ٹائم ہے چائے کا۔ سوجاؤ۔'' جمال نے زیرلب پہلے اپنے نصیب کو پھر حنا کو کوسا اور بٹوا اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ باہر آکر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ انجن کی آواز سے گیٹ پر بیٹھا ہوا چوکیدار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے غیرارادی طور پر ساتھ رکھی ہوئی کلاشنکوف کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر جمال کو دیکھتے ہی نارمل ہوگیا۔ اس نے ایک طویل جماہی لی اور گیٹ کھول دیا۔ گیٹ کے قریب آکر جمال نے گاڑی روکی اور چوکیدار سے مخاطب ہوا۔

''تم سو رہے تھے کیا؟''

''نہیں جی تھوڑی دیر پہلے آنکھ لگی تھی مگر میری نیند

ایسی ہوتی ہے کہ ایک کھٹکے سے آنکھ کھل جاتی ہے۔'' پھر اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں ٹائم دیکھا پھر حیرت سے سوال کیا۔''صاحب جی! رات کے ساڑھے تین بجے آپ کہاں جارہے ہیں؟''

''بس نیند نہیں آرہی، سگریٹ بھی ختم ہو گئے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر سگریٹ مل جائے گی؟''

''آپ گھر میں رہیں، میں سگریٹ لے آتا ہوں صاحب۔ شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔'' چوکیدار گاڑی کے قریب آتے ہوئے بولا۔

جمال مسکرا دیا۔''تم بھی تو میری طرح انسان ہو، شہر کے حالات تو تمہارے لیے بھی ٹھیک نہیں ہیں حاکم علی۔''

''صاحب جی! میں ایک عام سا آدمی ہوں۔ کوئی گولی لگ بھی گئی تو کوئی خاص نقصان نہیں ہوگا، آپ کو دوسرا چوکیدار مل جائے گا مگر آپ تو صاحب لوگ ہیں۔''

چوکیدار کی بات سن کر جمال نے ایک اور سوال کیا۔''حاکم علی! فرض کرو میں تمہیں بھیج دوں اور تم خدانخواستہ کسی حادثے کا شکار ہو جاؤ تو تمہاری بیوی کتنی اداس ہوگی؟''

''صاحب جی! اداس کیا ہوگی، وہ تو میرے بغیر دو دن بھی زندہ نہیں رہے گی۔''

''پھر تو تم مجھ سے زیادہ قیمتی آدمی ہو۔ تم آرام کرو، مجھے جانے دو۔ میں ذرا ٹینشن میں ہوں۔ کچھ ڈرائیونگ کروں گا، چائے شائے پیوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے حاکم علی کو خالی نظروں سے دیکھا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ اب وہ خالی سڑک پہ گاڑی دوڑا رہا تھا۔ چوکیدار کی باتوں نے اسے اور بھی غمگین کر دیا تھا۔ تین چار کلومیٹر کے بعد اس کو ریلوے اسٹیشن کے باہر دو تین ریسٹورنٹ کھلے ہوئے نظر آئے۔ اس نے اپنی گاڑی روکی اور باہر رکھی ہوئی کرسی پر جا بیٹھا۔ ویٹر نے فوراً وہاں پانی کا جگ رکھا اور مؤدب انداز میں کھڑا ہو گیا۔

''اسٹرانگ سی چائے لاؤ۔'' جمال نے آرڈر دیا۔

ویٹر سر ہلا کر واپس چلا گیا۔ دو تین منٹ بعد بھاپ اڑاتی چائے اس کے سامنے تھی۔

''کچھ کھانے کو ہے تو لے آؤ۔'' جمال چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔ تھوڑی دیر بعد درمیانے سائز کا ایک کیک اس کے آگے رکھ دیا گیا۔ جمال نے کیک کھانے کے دوران ویٹر کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

''جی!'' وہ سامنے آکر بولا۔ جمال نے سو کا ایک نوٹ اس کے آگے کر دیا۔''ایک ڈبی مارون کی لے آؤ۔''

ویٹر نے پیسے لیے اور کچھ دیر بعد سگریٹ لے آیا۔ جمال نے بقایا جات میں سے بیس روپے اس کو دیے پھر چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد سگریٹ سلگا کر اس کے مرغولے فضا میں چھوڑنے لگا۔

اندر کی تنہائی باہر کے ہجوم سے نہیں بہل رہی تھی۔ سگریٹ ختم ہو جانے کے بعد اس نے بل ادا کیا اور بوجھل قدموں سے اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ ونڈ اسکرین سے اس نے فٹ پاتھ پر سونے والوں کو دیکھا۔ حیرت ہے اتنی مفلسی اور اتنی گہری نیند۔ شاید ان کے پاس حنا جیسی بیوی نہیں ورنہ یہ خودکشی کر چکے ہوتے۔ یہ سوچ کر اس نے انجن بیدار کیا اور گاڑی گھر جانے والے راستے پر ڈال دی۔

جب وہ گھر میں داخل ہو رہا تھا تو صبح کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں آیا۔ حنا ابھی تک سکون کی نیند سو رہی تھی۔ اس نے زخمی نگاہوں سے آڑی ترچھی لیٹی ہوئی حنا کو دیکھا اور پھر اس کے قریب ہی ڈھیر ہو گیا۔ صبح سات بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔

''ساری رات آپ کہاں رہے؟'' آنکھ کھلتے ہی ایک تلخ اور زہر میں بجھا ہوا سوال اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ اس نے سر اٹھا کر ادھ کھلی آنکھوں سے حنا کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر ابھی تک لپ اسٹک کی تہ لگی ہوئی تھی۔

جمال نے کچھ دیر سوچا پھر جواب دیے بغیر دوبارہ لیٹ گیا۔

''جمال! اب آپ کنوارے نہیں رہے۔ ایک شادی شدہ اور ذمے دار انسان ہیں۔ یوں آدھی رات کو آوارہ گردی کرنا اور صبح واپس آنا تمہارے کنوارے وقتوں کا مشغلہ ضرور رہا ہوگا مگر اب ایسا نہیں ہونا چاہیے۔'' حنا کی آواز میں بدستور تلخی گھلی ہوئی تھی۔

''تم نے چین کی نیند کرلی نا۔'' جمال نے سوال کیا۔

''آپ گئے کہاں تھے؟'' پھر سوال ہوا۔

''سگریٹ ختم ہو گئے تھے، وہ لینے گیا تھا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''ساتھ کوئی سکون والی گولی بھی لے آتے۔'' حنا نے اس کو دیکھے بغیر کہا۔

''ٹھیک کہا تم نے۔ تم جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے سکون آور گولی کی واقعی ضرورت ہوتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے تکیے سے منہ ڈھانپ لیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا میں نے تمہیں بے سکون کیا ہوا ہے؟'' حنا گویا لڑنے کے موڈ میں تھی۔ جمال نے تکیہ ایک طرف رکھا اور حنا کے آگے ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔

"یار خدا کے لیے مجھے ایک گھنٹا آرام کرنے دو۔ نو بجے میں نے دفتر بھی جانا ہے۔"

"جمال! تم مجھ سے کس بات کا بدلہ لے رہے ہو۔ تم خود تو نفسیاتی مریض ہو، مجھے کیوں نفسیاتی مریضہ بنانے پر تلے ہوئے ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھ سے شادی کر کے پشیمان ہو اور اب تمہیں میرا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔"

جمال نے خود پر ضبط کیا پھر نرم لہجے میں بولا۔

"حنا! میں شادی سے پہلے ایک خوش مزاج انسان تھا۔ میں واقعی اب ایک نفسیاتی مریض بنتا جا رہا ہوں اور مجھے تم نفسیاتی مریض بنا رہی ہو۔ تمہاری بے نیازی گھر سے عدم دلچسپی، میری ذات سے لاتعلقی یہ سب مل کر مجھے ذہنی مریض بنا رہے ہیں۔ تم نے اگر شادی نہیں کرنی تھی تو انکار کر دیا ہوتا، میری زندگی میں زہر گھولنے کا اختیار تم نے کیوں اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ تم اگر چاہتی ہو کہ میں راتوں کو باہر نہ رہوں تو خود کو بدلو۔ بیوی بن کر رہو، الھڑ دوشیزہ یا محبوبہ بننے کی کوشش مت کرو اور اگر تمہیں میرے اس طرح کے رویے پر گلہ ہے تو اس کا سبب بھی پوچھ لیا کرو۔ تم اگر خود کو نہیں بدلو گی تو میرا رویہ اور زیادہ خراب ہوتا جائے گا۔ رات جب میں جا رہا تھا تو تم جاگ رہی تھیں، اگر مجھے روک لیتیں تو میں کبھی نہ جاتا۔ کبھی مجھ سے پوچھ لیا کرو کہ ساری ساری رات کروٹیں کیوں بدلتا رہتا ہوں، سگریٹ پہ سگریٹ کیوں پھونکتا رہتا ہوں۔"

وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ حنا کے چہرے پر اپنی باتوں کا ردعمل تلاش کیا مگر وہاں سکون اور طمانیت کا راج تھا۔ حنا کی زبان ضرور شعلے اگل رہی تھی مگر ان شعلوں کی تپش اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ اس بات سے جمال کا دل مزید کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بات بگڑنے کا سوچ کر خاموش ہو گیا۔ گھر میں برپا ہونے والا یہ پہلا ہنگامہ نہیں تھا۔ تین سالہ ازدواجی زندگی میں کئی بار اس قسم کا تصادم ہو چکا تھا۔ حنا نے سر پر پٹی باندھی اور بستر پر دراز ہو گئی۔ جمال بھی کروٹ بدل کر سو گیا۔

صبح آٹھ بجے وہ بستر سے اٹھا اور باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ نہانے سے فارغ ہو کر وہ ناشتے کی میز پر آیا مگر ناشتے کے آثار نظر نہ آئے۔ کچن سے بھی ایسی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ ناشتا تیار ہو رہا ہے۔ کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد وہ خود کچن میں گیا۔ چائے بنائی، انڈا فرائی کیا اور فریج سے ڈبل روٹی اٹھا کر ٹیبل پر آ گیا۔ ناشتے کے بعد وہ کمرے میں گیا۔ کمرے میں حنا اپنی وارڈ روب میں سے کپڑے نکال کر بیگ میں رکھ رہی تھی۔ جمال نے کھنکھار کے اپنے وجود کا احساس دلایا مگر وہ اپنے کام میں مگن رہی۔

"میں نے اپنا ناشتا خود بنایا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ میرے ناشتے کا ٹائم ہے۔" مگر وہ خاموش رہی۔ جمال نے کچھ سوچا پھر اس کے قریب آ گیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" اس نے سوال کیا۔

"جب تمہیں پتا ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں تو پھر اس سوال کی کیا ضرورت ہے۔" حنا بے پروائی سے بولی۔

"ناشتا کیوں نہیں بنایا؟" وہ پیار سے بولا۔

"یہ کام بیویاں کرتی ہیں۔ جب تم مجھے بیوی سمجھنے لگو گے تو ناشتا بھی بنا دوں گی۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" اس نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

"امی کے پاس جا رہی ہوں۔ تم میری وجہ سے نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہو پھر میرا یہاں کیا کام...... جب میری ضرورت محسوس کرو تو آ کر لے جانا۔"

"ابھی وہ دن پہلے پورے تین دن گزار کے آئی ہو۔ پلیز مت جاؤ۔ تمہارے بنا یہ گھر مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔" وہ منانے والے انداز میں بولا۔ "اچھا جانے بھی دو۔ آئندہ رات کو گھر سے باہر نہیں جاؤں گا، وعدہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"امی نے بلایا ہے، مجھے جانے دو۔" وہ بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے بولی۔

"تمہاری امی تمہارا گھر اجاڑ کے رہیں گی۔ تم میرے روکنے کے باوجود جانے پر بضد ہو تو شوق سے جاؤ مگر یاد رکھو کہ میں تمہیں لینے نہیں آؤں گا کیونکہ تم میری مرضی سے نہیں جا رہی ہو۔" جمال آواز بلند کرتے ہوئے بولا۔

"میں اپنی مرضی سے نہیں جا رہی بلکہ تم وہ حالات پیدا کر دیتے ہو جس سے میرا دل اس گھر سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔"

"حنا! دراصل شادی کے پہلے ہفتے سے ہی تمہارا دل اس گھر میں نہیں لگا۔ جسم یہاں ہوتا ہے تو تمہاری روح میکے میں ہوتی ہے۔ گھر میں چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں مگر یہ مناسب نہیں کہ ہر تیسرے دن معمولی باتوں کو جواز بنا کر تم اماں کے پہلو میں جا بیٹھو۔ کوئی بات نہ ہو تو معمولی باتوں کو جواز بنا کر شاندار قسم کا فساد برپا کر کے چلی جاتی ہو، یہی تمہارا وہ لائف اسٹائل ہے جس سے میرا خون

کھولتا ہے۔ آخری بار کہہ رہا ہوں، مت جاؤ ورنہ یہ چھوٹی موٹی جدائیاں کسی لمبی جدائی کا پیش خیمہ بن جائیں گی۔ میں صبح جاتا ہوں شام کو واپس آتا ہوں، رات کو تم آرام کی نیند سوتی ہو۔ یہی چند گھنٹے ہماری رفاقت کے ہوتے ہیں۔ تم اگر کوشش کرو تو یہ چند گھنٹے بہت خوشگوار بھی ہوسکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر جمال خاموش ہوگیا مگر حنا کے ارادے میں تبدیلی نہ آئی۔ اس نے بیگ اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

''سنو......'' وہ پکارا۔

''کیا ہے؟'' وہ چلتے چلتے رک گئی۔

''کافی سوٹ لے کر جارہی ہو، لگتا ہے اس بار لمبا پروگرام ہے تمہارا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''بہت مسکرا رہے ہو۔ لگتا ہے میرے جانے کی دل ہی دل میں خوشی منا رہے ہو۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

''میرا کھانا اور ناشتا کون بنائے گا؟ کپڑے کون استری کرے گا؟'' اس نے سوال کیا۔

''اپنی اماں کو لے آنا، ان کے سینے میں بھی ٹھنڈک پڑ جائے گی۔ وہ تمہارا کھانا بھی بنا دیں گی اور کپڑے بھی استری کردیں گی۔ ان کے آنے سے پھر نئے نئے پروگرام بنانا۔ وہ ویسے بھی مجھے طلاق دلوانا چاہتی ہیں...... لے آنا ان کی مرضی کی بہو۔'' جمال اس کے قریب آگیا اور بولا۔

''ان کو حمیدہ جیسی فرشتہ سیرت بھولی ہوئی ہے جو دو دو ماہ تک میکے نہیں جاتی۔ تمہاری ہی خواہش پر میں نے اپنی جنت چھوڑ کر تمہیں الگ گھر میں رکھا ہوا ہے...... اور ہاں کان کھول کر سن لو، مجھے اپنے باپ جیسا مت سمجھنا جس نے ساری عمر بیوی کی غلامی میں گزار دی۔ ہماری سرشت میں بیوی کا غلام بننا نہیں ہے۔ تم لاکھ کوشش کرو مگر ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ زن مریدی والا چکر تمہارے میکے میں ہوتا ہے، یہاں کبھی نہیں ہوگا۔''

حنا نے شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور گویا ہوئی۔

''خبردار جو آئندہ میرے ماں باپ کے خلاف کوئی بکواس کی ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

یہ بات سن کر جمال کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ ''یہ تھپڑ تمہیں کافی عرصے تک یہ بات یاد دلاتا رہے گا کہ زبان دراز عورت کا یہی علاج ہے۔''

حنا نے خونخوار نظروں سے اس کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے بھی بادل ناخواستہ اپنا

چارپائی اور کلچر

چارپائی ایک ایسی خود کفیل تہذیب کی آخری نشانی ہے جو نئے تقاضوں اور ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نت نئی چیزیں ایجاد کرنے کی قائل نہ تھی۔ بلکہ ایسے نازک مواقع پر پرانی چیزوں میں نئی خوبیاں دریافت کرکے مسکرا دیتی تھی۔ اس عہد کی رنگا رنگ مجلسی زندگی کا تصور چارپائی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کا خیال آتے ہی ذہن کے افق پر بہت سے سہانے منظر ابھر آتے ہیں...... اجلی اجلی ٹھنڈی چادریں، خس کے پنکھے، کچی مٹی کی ٹن ٹن کرتی کوری صراحیاں، چھڑکاؤ سے بھیگی زمین کی سوندھی سوندھی لپٹ اور آم کے لدے پھندے درخت جن میں آموں کے بجائے لڑکے لٹکے رہتے ہیں...... اور ان کی چھاؤں میں جوان جسم کی طرح کسی کسائی ایک چارپائی جس پر دن بھر شطرنج کی بساط یاری کی پھڑ جمی اور جو شام کو دسترخوان بچھا کر کھانے کی میز بنالی گئی۔ ذرا غور سے دیکھیے تو یہ وہی چارپائی ہے جس کی سیڑھی بنا کر سگھڑ بیویاں مکڑی کے جالے اور چلبلے لڑکے چڑیوں کے گھونسلے اتارتے ہیں۔ اسی چارپائی کو وقت ضرورت پٹیوں سے بانس باندھ کر اسٹریچر بنا لیتے ہیں اور بجوگ پڑ جاتے تو انہی بانسوں سے ایک دوسرے کو اسٹریچر کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح مریض جب کھاٹ سے لگ جائے تو تیمار دار موخرالذکر کے وسط میں بڑا سا سوراخ کرکے اول الذکر کی مشکل آسان کردیتے ہیں اور جب ساون میں اودی اودی گھٹائیں اٹھتی ہیں تو ادوان کھول کر لڑکیاں دروازے کی چوکھٹ اور والدین چارپائیوں میں جھولتے ہیں۔ اسی پر بیٹھ کر مولوی صاحب قمچی کے ذریعے اخلاقیات کے بنیادی اصول ذہن نشین کراتے ہیں۔ اسی پر نومولود بچے غاؤں غاؤں کرتے، چندھیائی ہوئی آنکھیں کھول کر اپنے والدین کو دیکھتے ہیں اور روتے ہیں اور اسی پر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پیاروں کی آنکھیں بند ہوجاتی ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب چراغ تلے سے اقتباس

مرسلہ: امتیاز احمد، کراچی

بریف کیس اٹھایا اور دفتر کی راہ لی۔
دن ڈھلے جب وہ واپس گھر پہنچا تو گھر پر ویرانی کا راج تھا۔ وہ تمام کمروں سے ہوتا ہوا کچن میں آیا۔ اس کو ایک خفیف سی امید تھی کہ شاید اس کی غیر موجودگی میں حنا واپس آگئی ہو مگر وہاں بھی خاموشی تھی۔ وہ تمام کمروں سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں آکر صوفے پر ڈھیر ہو گیا نہ جانے کب تک یونہی بیٹھا رہا۔ شام کی اذان کانوں میں پڑی تو وہ وضو کرنے کے لیے باتھ روم میں جا گھسا۔
نماز سے فراغت کے بعد اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور صوفے پر بیٹھ کر پینے لگا۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا کہ حنا کے جانے کے بعد وہ شدت کے ساتھ اس کی کمی محسوس کرتا تھا اسی لیے حنا کے جانے میں جمال کی رضامندی شامل نہیں ہوتی تھی۔ آج تو تین سال میں پہلی بار جمال نے اس پر ہاتھ بھی اٹھا لیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ شوہر پر حکمرانی کرنے اور اپنی بیٹی کو حاکم بنانے والی اس کی ساس اس تھپڑ کو کبھی نہیں بھولے گی۔ اس بار حنا کافی مدت کے لیے میکے میں رہے گی۔ وہ اس آس پر حنا کو بٹھائیں گے کہ جمال آکر اپنے رویے کی معافی مانگے گا مگر جمال کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے بھی دل پر پتھر رکھ کر حنا کی جدائی کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
رات کا کھانا کھانے کے لیے اس نے اپنی بائیک نکالی اور کسی اچھے سے ریسٹورنٹ کی طرف چل دیا۔ بازار میں آتے ہی اس کا دل بہل گیا۔ کافی رونق اور چہل پہل تھی۔ وہ بلا مقصد ادھر ادھر گھومتا رہا پھر ایک معقول سے ریسٹورنٹ کے سامنے بائیک روکی اور ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔
کھانا یا تو واقعی لذیذ تھا یا پھر اس کو زیادہ بھوک لگی تھی۔ کھانا کھا کر اس نے چائے منگوائی اور سگریٹ سلگا کر کبھی سگریٹ کا دھواں اڑانے لگا اور کبھی چائے کے گھونٹ لینے لگا۔
جب وہ ریسٹورنٹ سے نکلا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ اس نے اپنے ایک جگری یار کو فون کر کے گھر پر بلا لیا کیونکہ گھر کی تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔
ابھی وہ گھر پہنچا ہی تھا کہ رضوان آن دھمکا۔ آتے ہی اس نے چائے کی فرمائش کر دی۔
''وہ سامنے کچن ہے جہاں چائے کے تمام لوازمات موجود ہیں۔'' جمال نے اس کو کچن کا دروازہ دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ایک کپ اپنے لیے اور آدھا کپ میرے لیے بنانا۔'' یہ کہہ کر جمال بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ جب بھی حنا میکے جاتی تھی تو جمال اپنے کسی نہ کسی دوست کو اپنے پاس ٹھہرا لیتا تھا۔
''یار! یہ بھابی کی اور تیری آنکھ مچولی کب تک جاری رہے گی؟ مسئلہ کیا ہے تم دونوں کے ساتھ؟'' رضوان صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ چائے کا کپ اس نے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔
''سب سے بڑا مسئلہ اس کی ماں ہے۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے شوہر جیسا داماد چاہتی ہے جو کہ میں نہیں بن سکتا اور دوسرے یہ کہ سارا سارا دن ماں بیٹی موبائل فون پر ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ میرے لیے تو اس کے پاس دس منٹ نہیں ہوتے۔ یار! یہ ماں بیٹیاں اگر ایک دوسرے کی سہیلیوں کی طرح رہیں تو شوہر کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر جمال چائے پینے لگا۔
''تو یہ بات ہے۔'' رضوان نے جواب دیا۔ ''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تو گھر والی کو گھر تک رکھ اپنے لیے باہر والی ڈھونڈ یار۔ یہ جو بیویاں ہوتی ہیں نا ان کے ساتھ جتنا اچھا سلوک کرو یہ اتنا ہی سر کو کھاتی ہیں۔ میں نے دو رکھی ہوئی ہیں، مطلب باہر کی دو۔ گھر میں کوئی چخ چخ نہیں ہوتی۔ تو کہے تو ایک تجھے بھی دے دیتا ہوں، زبردست چیز ہے۔'' رضوان ایک آنکھ بند کرتے ہوئے بولا۔
جمال نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شادی سے پہلے وہ کافی دوستیاں کر چکا تھا مگر شادی کے بعد اس نے اپنی فون بک سے نہ صرف تمام نمبر صاف کر دیے بلکہ سم بھی تبدیل کر لی۔ اس کو اپنی کسی گرل فرینڈ کا فون نمبر یاد نہیں تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر اس کو یاد آیا کہ اپنی خاص دوست کا نمبر اس نے ڈکشنری کے اندرونی صفحات میں لکھ رکھا تھا تاکہ ''بوقتِ ضرورت'' کام آسکے اور آج اس نمبر کی اس کو شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ نمبر ماورا کا تھا۔ ماورا اس سے کسی زمانے میں بہت محبت کرتی تھی۔ پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اور یوں رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ اسی شہر میں رہتی تھی۔ جمال نے ڈکشنری نکالی اور ایک ایک کر کے اس کے ورق الٹنے لگا۔
''یہ رات گئے تمہیں ڈکشنری پڑھنے کا خیال کیسے آگیا؟'' رضوان بوریت محسوس کرتے ہوئے بولا۔
جمال نے کوئی جواب نہیں دیا، بس ورق گردانی کرتا رہا۔ تقریباً آدھی ڈکشنری کے اوراق دیکھ لینے کے بعد اس کو نمبر مل گیا۔ اس نے نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیا اور اپنی شناخت کے ساتھ ایک ٹیکسٹ سینڈ کر دیا۔
دونوں دوستوں کی محفل رات تین بجے تک جاری

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایڈ فری لنکس

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-



رہی پھر دونوں سو گئے۔ آٹھ بجے ناشتے کے بعد رضوان نے اپنے گھر کی راہ لی اور جمال اپنے آفس روانہ ہو گیا۔ آفس میں وہ ماورا کے جوابی ٹیکسٹ کا انتظار کرتا رہا اور تقریباً گیارہ بجے اس کا جواب آ گیا۔

☆☆☆

حنا اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ آج اس کو اپنا گھر چھوڑے تیسرا دن تھا۔ وہ آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی کہ پیچھے سے اس کی چھوٹی بہن نادیہ کی آواز سنائی دی۔

''ہائے یہ انتظار بھی کیا چیز ہے۔ اگر اتنی ہی شدت سے اس کا انتظار ہے تو پھر ذرا حوصلے سے کام لیا کریں باجی۔ اب دیکھیں نا جمال بھائی کی اور آپ کی انا محبت کے درمیان دیوار بن کے کھڑی ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' حنا اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے، میں ایسے تو نہیں چلی جاؤں گی۔ آج ہاتھ اٹھایا ہے، کل تشدد کرے گا۔ امی کہاں ہیں؟''

''امی تو بازار گئی ہیں۔'' نادیہ نے جواب دیا۔ ''ویسے ایک الجھن سی میرے ذہن میں موجود ہے باجی۔ یہ بتائیں کہ جمال بھائی جیسے ٹھنڈے مزاج کے آدمی نے آپ کو تھپڑ کیوں مارا؟ آپ نے یقیناً کچھ نہ کچھ کیا ہوگا یا کوئی نامناسب بات کی ہوگی۔''

حنا نے آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا تم ہر وقت جمال کی سائڈ لیتی رہتی ہو۔ میری بہن ہو میرا ساتھ دو اور خبردار کبھی اس کے سامنے ایسی بات نہ کرنا ورنہ وہ اور بھی شیر ہو جائے گا۔''

''میں نے تو یونہی آپ کے سامنے ایک بات کی ہے باجی ورنہ میں ان کے سامنے ایسی بات کیوں کروں گی۔ آپ کا گھر ہے آپ جانیں اور جمال بھائی جانیں مگر ایک سبق میں نے ضرور سیکھا ہے۔''

''وہ کیا؟'' حنا نے سوال کیا۔

''وہ یہ کہ گھر کو جنت یا جہنم بنانا عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ شوہر کو اگر بیوی کا میکے میں بار بار جانا پسند نہیں تو بیوی کو نہیں جانا چاہیے۔'' نادیہ بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''جب تمہاری شادی ہوگی تو پتا چل جائے گا۔'' یہ کہہ کر حنا وہاں سے چلی گئی۔

شام کو کھانے کی ٹیبل پر حنا کے باپ نے جمال کا ذکر چھیڑ دیا۔ ساتھ ہی اس نے حنا کو دبے دبے الفاظ میں گھر جانے کا مشورہ بھی دے دیا۔

''ہماری بیٹی ہم پر بوجھ نہیں ہے۔'' حنا کی ماں ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''جب تک وہ ہمارے گھر آ کر اپنے کیے کی معافی نہیں مانگے گا حنا یہاں سے نہیں جائے گی...... سن لیا آپ نے۔''

حنا کا باپ خاموش ہو کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

''آج ہم پورے پانچ سال بعد مل رہے ہیں۔'' ماورا ریسٹورنٹ کی کونے والی ٹیبل کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ جمال بھی اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

''کافی موٹی ہو گئی ہو اور خوب صورت بھی۔'' جمال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اپنی یہ گندی نظریں ہٹاؤ اور گندے مردوں کی طرح کھا جانے والی نظروں سے مت دیکھو۔''

''بے فکر رہو، یہ میرا گھر نہیں ہے ریسٹورنٹ ہے۔ یہاں تم بالکل 'محفوظ' ہو۔ کیا حال ہے تمہارے امریکن شوہر کا؟'' جمال نے سوال کیا۔

''وہ تو شادی کے دو ماہ بعد ہی امریکا واپس چلا گیا تھا۔ سال میں ایک مرتبہ آتا ہے۔ دو ہفتے بھی نہیں رہتا اور امریکا امریکا کی رٹ لگانا شروع کر دیتا ہے۔ میں تو بس تنہا ہی زندگی گزار رہی ہوں۔ تمہارے حالات مجھے معلوم ہوتے رہتے ہیں۔'' وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکا کر بولی۔

''وہ کیسے؟'' جمال نے حیرت سے سوال کیا۔

''جناب! حنا کے پڑوس میں میری خالہ زاد کا گھر ہے۔ میرا مطلب ہے حنا کی ماں کے گھر کے ساتھ۔ وہ لوگ کافی عجیب سے ہیں۔ تمہاری ساس بہت تیز عورت ہے۔ تمہاری بیوی بھی اس پر گئی ہے۔ تمہاری ساس نے بھی شوہر کو نوکر بنا کے رکھا تھا، حنا بھی تمہیں ویسا ہی دیکھنا چاہتی ہے جیسا اس کا باپ ہے۔''

''تو پھر اب کیا ہو سکتا ہے؟'' جمال نے سوال کیا۔

''ہتھیار ڈال دو۔ ہفتے میں دو بار واشنگ مشین پر کپڑے دھو لیا کرو، کبھی کبھی برتن بھی مانجھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ساس کی خدمتِ اقدس میں بھی ہر دوسرے تیسرے دن حاضری دے دیا کرو۔ حنا پھر تمہارے ساتھ بہت خوش رہے گی۔'' یہ کہہ کر ماورا مسکرا دی۔

''تمہاری مسکراہٹ آج بھی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔'' جمال اس کی طرف بھرپور نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہٹاؤ یہ آنکھیں...... مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔'' وہ اس کے چہرے کو دوسری طرف کرتے ہوئے

بولی۔ ''مجھے اپنی مسکراہٹ کا تو پتا نہیں مگر تمہاری آنکھوں کی چمک کافی ماند پڑ گئی ہے۔ یار ایک کام کرو۔''

''کیا؟'' جمال نے سوال کیا۔

''وہ بھی کوئی عورت ہے جو شوہر کی معمولی بات بھی نہ مان سکے۔ کام یہ کرو کہ ایک اور شادی کر کے ایک عدد سوکن اس کے سر پر بٹھا دو۔ ایمان سے ایسی عورتوں کا یہی علاج ہے۔''

''ابھی نہیں، ابھی میں کچھ اور انتظار کروں گا۔ یہ بتاؤ کہ کیا پیو گی، کیا کھاؤ گی؟''

''بس ایک کپ چائے اور دو عدد سموسے پھر میں نے جانا ہے ورنہ میری ساس تو میرا اگلا دبا دے گی۔''

جمال نے مطلوبہ آرڈر دے دیا۔

''تم خود کو خوش رکھا کرو۔ کیوں ایک ایسی بیوی کے لیے خود کو اداس رکھتے ہو جو نہ تمہارے گھر میں رہنا چاہتی ہے اور نہ تمہیں ٹائم دیتی ہے۔ اتنی خوب صورت بھی نہیں ہے، پتا نہیں کون سا جادو کیا ہے اس نے تم پر۔''

''وہی جادو جو تم نے کیا تھا۔'' جمال نے جواب دیا۔

''ویسے اگر تم میری زندگی میں ہوتیں تو شاید میں زیادہ خوشحال ہوتا۔'' جمال نے جواب دیا۔

''اس وقت تو تم نے مجھے ٹائم پاس کرنے کے لیے رکھا ہوا تھا تمہارے مزاج آسمانوں پر ہوتے تھے غرور کا سر نیچا۔'' یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''مجھے کچھ اچھا سا مشورہ دو، میں کیا کروں؟ سوکن اتنی جلدی تو نہیں لاسکتا اس پر۔'' جمال بے تابی سے بولا۔

''یار! یہ تم دیسی مردوں کو پتا نہیں کیوں شادی کے بعد سوائے بیوی کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ میرے شوہر کو دیکھو، وہاں اس نے ایک شادی کر رکھی ہے۔ کئی گرل فرینڈز بھی ہیں، زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کر رہا ہے۔ ایک تم ہو کہ اپنی زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے تم نے۔ حنا تو خیر کیا تمہارے ساتھ دشمنی کرے گی، تم نے خود اپنے آپ کو اپنا دشمن بنا رکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم ان مردوں میں سے ہو جو اپنی بیوی میں بھی ممتا کو تلاش کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے تمہیں ماں کی محبت نہیں مل سکی، میرا مطلب ہے بچپن میں۔ اب بھی وہ اپنے بڑے بیٹے کے پاس رہتی ہیں۔ کچھ بتاؤ نا اپنے بچپن کے بارے میں۔''

جمال میز پر بازو ٹکائے ماورا کی جانب دیکھ رہا تھا مگر ذہن کی اسکرین پر سارا بچپن کسی ڈرامے کے مانند نشر ہو رہا تھا۔

''میری ماں نے بیوہ ہو جانے کے بعد میرے باپ سے شادی کی تھی۔ پہلے شوہر سے اس کے تین بیٹے تھے پھر میرے باپ سے شادی کے بعد میں اور میری بہن پیدا ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ میری ماں کی زیادہ توجہ اپنے پہلے شوہر کی اولاد پر ہوتی تھی۔ میرے لیے اور میری بہن کے لیے بہت بچا کھچا پیار حصے میں آتا تھا جیسے اپنا بچا ہوا کھانا کوئی کسی بھوکے کے آگے ڈال دے۔ شاید بچپن کی یہی محرومی ہے جو آج مزاج کا حصہ بن کر میرے شب و روز کو جہنم بنائے ہوئے ہے۔ تمہاری بات ٹھیک ہے۔ جن بچوں کو ماں کا یا باپ کا بھرپور پیار ملتا ہے، ان کی ازدواجی زندگی بہت بھرپور گزرتی ہے لیکن ماورا! میں کب کہتا ہوں کہ وہ میرے پاس بیٹھی رہے اور میں اس کے گھٹنے پر سر رکھ کر سو یا رہوں۔ میری تو چھوٹی سی تمنا ہے کہ وہ گھر میں ٹک کے رہے، میرے ساتھ خوش مزاجی سے پیش آئے۔'' یہ کہہ کر جمال خاموش ہو کر ماورا کو دیکھنے لگا۔

ماورا گویا ہوئی۔

''جمال! تمہاری بیوی میں شوہر پرستی والی بات سرے سے موجود ہی نہیں یار۔ وہ کبھی بھی شوہر پرست بیوی نہیں بنے گی، وہ ایک ضدی محبوبہ بن کر رہنا چاہتی ہے۔ تمہیں یا تو سمجھوتا کرنا ہوگا یا دوسری شادی...... اور اب میں بھی چلتی ہوں، کافی دیر ہو گئی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ جمال نے بل ادا کیا اور دونوں باہر گاڑی میں جا بیٹھے۔

''بس مجھے اگلے اسٹاپ پر اتار دینا۔ میں نے وہاں سے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔''

''اوکے جی لیکن پھر کب ملو گی؟'' جمال نے سوال کیا۔

''فون پر بتا دوں گی لیکن زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں۔ بس ہفتے میں ایک دن ملا کریں گے اس ریسٹورنٹ میں۔''

''میرے گھر میں کیوں نہیں؟'' جمال نے شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ سوچنا بھی مت کہ میں تمہیں تمہارے گھر میں ملنے آؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ شیشے کے پار دیکھنے لگی۔

جمال نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔

اگلی صبح جمال دیر تک اپنے بستر پر لیٹا رہا کیونکہ آج آفس کی چھٹی تھی۔ تقریباً نو بجے ابھی وہ بستر چھوڑنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ جمال نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ سامنے اس کی والدہ کھڑی تھیں۔

''ارے اماں جی! آپ اور وہ بھی بنا بتائے۔ کم از کم ایک فون ہی کر دیا ہوتا، میں خود آپ کو لینے آجاتا......

آ گئیں۔'' وہ ماں کو راستہ دیتے ہوئے بولا۔
'' یہ کیا حال بنا رکھا ہے تو نے گھر کا۔ لگتا ہے جیسے کئی ماہ سے اس کی صفائی نہ ہوئی ہو اور کبھی خود کو بھی آئینے میں دیکھ لیا کر۔'' اس کی ماں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
'' ارے اماں آپ بیٹھو، میں تمہارے لیے ناشتا بناتا ہوں۔''
'' میں فجر کے بعد ہی ناشتا کر لیتی ہوں۔ تو بیٹھ میں تیرے لیے بناتی ہوں۔'' تھوڑی دیر بعد وہ ٹرے میں چائے اور دو سلائس لے کر آ گئیں۔
'' رات مجھے حنا نے فون کیا تھا۔ تیری شکایت کر رہی تھی کہ تو نے اس کو مارا ہے۔ بری بات ہے بیٹا، بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔''
'' بس چھوڑیں امی جان! اس بات کو جانے دیں۔ میں کچھ کہوں گا تو آپ یقین نہیں کریں گی۔''
'' بات کیا ہوئی ہے؟'' والدہ نے پوچھا۔
'' کیا آپ کو نہیں معلوم، چھ مہینے تو ہم آپ کے ساتھ رہے ہیں۔ آپ سوچ کر بتائیں کہ وہ ان چھ ماہ میں کتنا عرصہ میرے ساتھ رہی اور کتنا عرصہ میکے میں۔ تمہیں یاد تو ہے نا۔ وہ آج بھی اسی ٹائم ٹیبل پر عمل پیرا ہے۔ یعنی دو دن میرے پاس دو دن میکے میں اور جو دو دن میرے پاس ہوتی ہے، وہ بھی اکثر فون پر اپنی امی اور بہنوں کے ساتھ ہی گزارتی ہے۔ تنگ آ گیا ہوں میں اس سب سے اور اب تو زبان بھی چلانے لگی ہے۔ تھپڑ بھی میں نے اس کی زبان درازی پر ہی مارا ہے۔''
ماں کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے۔
جمال ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا پھر جب اس نے ماں کے گھٹنوں پر سر رکھا تو وہ پانچ سالہ جمال تھا۔ جس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے پھر اس نے سر اٹھا کر ماں کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ '' مجھے یاد ہے اماں! ایک بار میرے بابا نے آپ کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا پھر انہوں نے آپ کے ہاتھ میں برقع پکڑ کر گھر سے نکلنے کو کہا تھا۔ تم نے کتنے وقار کے ساتھ برقع رکھتے ہوئے کہا تھا کہ یہ میرا گھر ہے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ آپ کے اس صبر اور اس جواب کے بعد مجھے یاد ہے، ابا تو جیسے آپ کے غلام بن گئے تھے وہ عورت کہاں ہے اماں جو صبر اور قناعت سے اپنے شوہر کے دل پر حکمرانی کرتی تھی۔''
'' آج بھی اچھی بیویاں موجود ہیں۔'' ماں نے جواب دیا۔ '' اور تو ذرا صبر سے کام لے، ہو سکتا ہے سب ٹھیک ہو جائے۔ تیرا خیال تو رکھتی ہے نا وہ؟''
'' ہاں کپڑے استری کر دیتی ہے، کھانا بھی مل جاتا ہے۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ تمہاری صحت تو ٹھیک ہے نا۔'' جمال ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔
'' صحت بالکل ٹھیک ہے بس تیری طرف سے فکرمند رہتی ہوں۔ تو میری ایک بات مان۔'' ماں اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
'' جی اماں کیا بات ہے۔'' جمال نے جواب دیا۔
'' میں آج حنا کو لے آتی ہوں۔ تو ذرا صبر سے کام لے، میں بھی اس کو سمجھا دوں گی۔ ماں باپ کی لاڈلی ہے۔ تو اس کے میکے جانے پر اعتراض نہ کیا کر۔ کب تک جائے گی۔ جیسے ہی بھائی کی شادی ہوئی اس کا جانا کم ہو جائے گا۔ باقی تجھے اس سے جو شکایتیں ہیں تو اس کا اظہار نہ کیا کر بس، صبر سے اس کے اچھے ہونے کا انتظار کر۔''
'' اماں! بعض دکھ ایسے بھی ملتے ہیں جو کسی کو بتائے نہیں جا سکتے۔ کوئی ایسا لفظ نہیں ہوتا جس سے دوسرے کو اپنے درد کی وضاحت کی جا سکے۔ اس کا میکے جانا بھی میں برداشت کر لوں گا مگر میری ذات سے اس کی لاتعلقی میری برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ تم ابھی مت جاؤ...... اس کو کچھ دن گزار لینے دو، میں ابھی ذرا ذہنی سکون میں ہوں۔''
'' یہ ذہنی سکون نہیں ہے۔ ذہنی سکون جیون ساتھی کی موجودگی سے ہوتا ہے نادان۔'' ماں نے تسبیح کے دانوں کو گراتے ہوئے کہا۔
'' جیسے تمہاری مرضی اماں لیکن اس میں تھوڑی بہت تبدیلی لازمی ہے ورنہ میری اور اس کی آنکھ مچولی یونہی چلتی رہے گی۔'' پھر اماں نے جمال سے حنا کا موبائل نمبر لیا۔
ماں نے دو تین منٹ بات کی پھر اطمینان سے بولی۔
'' بڑی فرماں بردار بچی ہے۔ کہنے لگی کہ آپ کا فون پر بلا لینا ہی کافی ہے، میں خود شام تک آ جاؤں گی۔ حنا اتنی بری نہیں ہے بس اس کی ماں نے اس کو سر پر چڑھا لیا ہے۔ تو حوصلے سے کام لے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
'' آپ تو کچھ دن میرے پاس رہیں گی نا؟'' جمال نے سوال کیا۔
'' میں دوپہر کا کھانا کھا کر چلی جاؤں گی۔ جائے نماز کدھر ہے، میں ذرا دو نفل پڑھ لوں۔''
جمال نے ماں کو جائے نماز بچھا کر دی اور خود سوچوں میں گم ہو گیا۔ حنا کے آنے کی بھی خوشی اپنی جگہ مگر ذہنی ہم آہنگی کا فقدان اس کی تشویش کا سبب تھا۔
شام کو حنا آ گئی۔ جمال کی ماں دن کا کھانا کھا کر

جا چکی تھی۔ جمال اپنے گھر پر ہی تھا جب حنا اپنی ماں کے ساتھ آئی۔ جمال نے محض رسمی سلام دعا کی اور دونوں ماں بیٹیاں کمرے میں گھس گئیں۔

جمال ایک گھنٹے تک حنا کی راہ دیکھتا رہا پھر کسی بہانے سے ان کے پاس چلا گیا۔ دونوں ماں بیٹیاں دبی دبی زبان میں باتیں کر رہی تھیں۔ جمال کو دیکھتے ہی خاموش ہو گئیں۔

''لگتا ہے کوئی ایسی بات ہو رہی تھی جو میرے سننے کے لائق نہیں تھی۔'' جمال نے مسکراتے ہوئے طنز کیا۔

حنا نے ناگواری سے جمال کو دیکھا مگر خاموش رہی۔

جمال واپس چلا گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کی ساس بھی روانہ ہو گئی پھر حنا کچن میں آ گئی۔ کھانا تیار کیا اور ٹیبل پر رکھ کر خود منہ لپیٹ کر سو گئی۔

''تم نے امی کو کھانا کھلائے بغیر کیوں بھیجا؟'' جمال حنا کے قریب آ کر بولا۔

''آپ کے طنزیہ جملوں کے بعد بھی وہ آپ کا کھانا کھاتیں...... کمال ہے۔'' حنا نے دیکھے بغیر جواب دیا۔

''یار! دو بندے کھسر پھسر کر رہے ہوں اور تیسرے بندے کی آمد پر خاموش ہو جائیں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ گویا اس بندے کے خلاف ہی کوئی بات ہو رہی ہے۔ میں نے تو بس یونہی بات کی تھی، تم تو خفا ہو گئیں۔''

''میں بہت تھکی ہوئی ہوں، مجھے سونے دیں۔ آپ کا کھانا میز پر رکھا ہے، کھا لیں۔''

جمال محض ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ پھر وہ دن شام میں ڈھل گیا۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ جب حنا اپنی جگہ سے اٹھی اور کچن میں داخل ہو گئی۔ جمال کہیں گیا ہوا تھا۔ حنا نے اپنے لیے کھانا تیار کیا اور وہیں کچن میں بیٹھ کر کھانے لگی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ واپس اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد جمال آ گیا۔

''تم ابھی تک سو رہی ہو، کھانا نہیں کھاؤ گی کیا؟'' جمال اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' اس نے آنکھیں کھول کر جمال کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

''ٹھیک ہے جب بھوک لگے، کھا لینا۔ مجھے اپنے ہاتھ کی چائے تو پلا دو۔'' وہ رومانٹک لہجے میں بولا تو حنا فوراً چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتری اور چائے بنانے چل دی۔

وہ رات کافی خوشگوار انداز میں گزر گئی۔

اگلی صبح حنا کا موڈ بہت اچھا تھا۔ ناشتے میں کیا لیں

چھت

مسجد کے امام صاحب نے ایک چھوٹے سے بچے کو مسجد کے صحن میں روتے دیکھا تو اس سے رونے کا سبب پوچھا۔ بچے نے اوپر کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرے ابا مجھے اکیلا چھوڑ کر وہاں چلے گئے ہیں۔''

امام صاحب کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور بولے۔

''رنج نہ کرو میرے بچے...... وہ وہاں فرشتوں اور حوروں کے پاس آرام سے بیٹھے ہیں۔''

''ابا فرشتوں اور حوروں کے پاس نہیں گئے۔'' بچے نے کہا۔ ''وہ تو اوپر مسجد کی چھت دھو رہے ہیں۔''

سوال

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شام ڈھلے میں نے ایک بچے کو دیکھا جو روشن شمع لیے جا رہا تھا۔

میں نے اسے روک کر پوچھا۔ ''بیٹے تم بتا سکتے ہو یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے؟'' لڑکے نے میرا سوال سنتے ہی فوراً پھونک مار کر شمع بجھا دی اور کہا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ روشنی کہاں چلی گئی ہے تو میں بتا دوں گا کہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی۔''

خواجہ بصری کہتے ہیں کہ میں اس لڑکے کا جواب سن کر لاجواب ہو گیا۔

دردِ مشترک

شوہر اور بیوی شاپنگ کے لیے نکلے، بیوی نے کہا۔ ''کتنی عجیب بات ہے میرے پاس پرفیوم کی شیشی ہے لیکن پرفیوم نہیں، ساڑی کا بلاؤز ہے لیکن ساڑی نہیں۔ سیٹ کی انگوٹھی ہے ہار اور بندے نہیں۔''

یہ سن کر شوہر نے کہا۔ ''بیگم! میرا بھی یہی حال ہے...... جیب ہے لیکن پیسے نہیں ہیں۔''

ایک بار پھر...

ایک شخص شادی کے بارے میں مشورہ دینے والے ایک ادارے کے دفتر گیا لیکن دفتر بند تھا۔ اسے وہاں ایک نوٹس لگا دکھائی دیا۔ ''ایک بجے سے تین بجے تک دفتر بند رہتا ہے۔ آپ پھر تسلی سے سوچ لیں، بعد میں ہم ذمے دار نہیں ہوں گے۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

گے آپ؟'' وہ نرم لہجے میں بولی۔
''وہی روٹین والا ناشتا جو تمہاری موجودگی یا عدم موجودگی میں ہوتا ہے۔'' جمال نے جواب دیا۔
وہ ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر لے آئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے بالوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔
''سچ سچ بتاؤ، میری عدم موجودگی میں کتنی گرل فرینڈز کو یہاں لاتے رہے ہو؟'' حنا کے چہرے پر شرارت کھیل رہی تھی۔
''ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ تمہیں پتا ہے میں اپنی تمام غیر نصابی سرگرمیوں سے توبہ کر چکا ہوں لیکن......''
''لیکن کیا؟'' حنا قدرے تشویش ناک انداز میں بولی۔
''اس لیکن کے بعد مجھے کچھ کہنے کی یوں ضرورت نہیں کہ تم سب سمجھ گئی ہو کہ اس لیکن کے بعد کیا ہو سکتا ہے۔'' وہ مسکرا دیا۔
''آج دن میں کیا کھائیں گے آپ؟'' وہ دھیرے سے بولی۔
''تمہارے اس خوشگوار موڈ کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا ہے کہ آج دن میں کچھ نہیں کھائیں گے۔ ویسے بھی میں آفس میں پکوڑے سموسے وغیرہ کھا لیتا ہوں۔ شام پانچ بجے تو واپسی ہو جاتی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ آج رات کا کھانا کسی شاندار ریسٹورنٹ میں کھائیں گے۔''
حنا مسکرا دی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ پھر اس نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور آفس کی راہ لی۔
شام پانچ بجے اس کی واپسی ہوئی۔ گھر میں آتے ہی اس نے حنا کو آواز دی مگر تین چار بار آواز دینے کے باوجود کوئی ردعمل نہ آیا تو اس نے حنا کا نمبر ملایا۔
''کہاں ہو تم...... میں تمہیں سارے گھر میں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔'' وہ تشویش ناک انداز میں بولا۔
''وہ جی امی نے کچھ ضروری شاپنگ کرنا تھی، وہ آ گئی تھیں۔ دراصل میرے بغیر وہ شاپنگ کرنے جاتی نہیں، بس میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔''
''یار پوچھ کر نہ سہی بتا کر جانے میں کیا حرج ہے۔ ایک ایس ایم ایس ہی کر دیا ہوتا۔'' وہ قدرے غصے سے بولا۔ حنا نے جواب دیے بغیر بات ختم کر دی اور جمال دل ہی دل میں تلملا کر رہ گیا۔
شام سات بجے کے قریب حنا آ گئی۔ آتے ہی اس نے خوب صورت سا سوٹ پہنا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ سج دھج کر جمال کے روبرو کھڑی تھی۔
''کیسی لگ رہی ہوں؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
اس کی مسکراہٹ سے جمال کا بگڑا ہوا موڈ کافی حد تک بہتر ہو گیا۔
''اچھی لگ رہی ہو۔'' اس نے بھرپور نظر اس پر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔
''تو پھر چلو، بائیک پہ چلیں گے؟'' وہ اٹھلا کر بولی۔
''بائیک پہ کیوں، گاڑی میں کیوں نہیں؟'' جمال نے سوال کیا۔
''بائیک پر ہم دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا، گاڑی میں ہم کافی فاصلے پر ہوتے ہیں۔ پھر جب بائیک پہ میں تمہیں تھام کے بیٹھتی ہوں تو مجھے صرف یہی احساس ہوتا ہے کہ تم صرف میرے ہو۔''
جمال نے کوئی تبصرہ نہیں کیا یا شاید حنا کی باتیں اس کے دل تک نہیں پہنچ سکی تھیں کیونکہ عملی زندگی میں اس کا طریقہ کار بہت مختلف ہوتا تھا۔
جب وہ گھر سے نکلے تو چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔
''تم چپ کیوں ہو؟'' حنا اپنے اڑتے ہوئے بالوں کو سیٹ کرتے ہوئے بولی۔
''میں چپ ضرور ہوں مگر بہت ساری سوچیں مجھ سے کافی سوالات کر رہی ہیں۔'' جمال نے جواب دیا۔
''مثلاً؟'' حنا بولی۔
''مثلاً یہ کہ ساری ساری رات ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے ہیں۔ تم کئی کئی دن تک میرے بغیر رہ لیتی ہو، اس وقت تمہیں ملن اور جدائی کا خیال نہیں ہوتا۔ بائیک پر چند منٹوں کے ملن کو تم اتنا اہم سمجھ رہی ہو کہ گاڑی میں تمہیں ہم دونوں کے درمیان فاصلہ محسوس ہوتا ہے۔ کیا تمہارے قول اور فعل میں تضاد نہیں ہے؟''
''کتنے ہوٹل گزر گئے ہیں بائیک کہاں روکو گے؟'' حنا نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔
''آج دریا کنارے والے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں گے۔ میں آج دریا کے اندر چودھویں کے چاند کا عکس دیکھوں گا۔ کافی عرصہ ہو گیا، یہ منظر نہیں دیکھا۔'' پھر اس نے سر گھما کر مسکراتی ہوئی حنا کو دیکھا اور دریا کی طرف جانے والی سڑک پر ہو لیا۔
جب وہ دریا کنارے والے ریسٹورنٹ میں پہنچے تو چاند عین دریا کے اوپر جھلملا رہا تھا۔ بہتے پانی میں اس کا عکس بہت دلفریب لگ رہا تھا۔ جمال بیٹھتے ہی محویت سے

چاند اور اس کے عکس کو دیکھنے لگا۔
''تیز تو ہے، اتنی محویت سے دیکھ رہے ہو کیا پہلے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا؟'' حنا نے سوال کیا۔
''شادی کے بعد آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں اور بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔'' جمال نے جواب دیا پھر اس نے ویٹر کو کھانے کا آرڈر دیا۔
''لگتا ہے کوئی بہت پرانی یاد وابستہ ہے اس چاند سے۔'' حنا شرارتی لہجے میں بولی۔
''حنا! چودھویں کے چاند کو دیکھ کر معلوم نہیں کیوں اداسی میں لپٹی ہوئی ایک طمانیت سی میرے ذہن و دل میں پھیل جاتی ہے پھر کوئی کمی سی، کوئی خلش سی جاگ جاتی ہے۔''
حنا نے کوئی تبصرہ نہ کیا، بس اس کی طرف دیکھنے لگی۔
''حنا!'' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں سوچتا ہوں کہ صدیوں پرانا یہ چاند بات کیوں نہیں کرتا۔ اپنے راز شیئر کیوں نہیں کرتا۔ مسکراتا کیوں نہیں۔ روتا کیوں نہیں۔ یہ کب سے ہے۔ جب یہ یہاں نہیں تھا تو پھر کہاں تھا۔''
''بس بس اتنا کافی ہے۔ کالج میں ریاضی کا پیریڈ اتنا مشکل نہیں لگتا تھا جتنی مشکل باتیں تم کرنے لگے ہو۔ ہمیں کیا کہ یہ کب سے ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ میں زیادہ خوب صورت ہوں یا چاند؟'' حنا رومانٹک لہجے میں بولی۔
''چاند اگر ایک گھنٹا میک اپ کرے تو تم سے زیادہ حسین ہوسکتا ہے۔'' جمال اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک سوال کروں؟''
''ہاں کرو۔'' حنا بولی۔
''کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' جمال نے یہ سوال پہلی بار کیا تھا۔ دراصل یہ اس کا سوال نہیں تھا، بہت پرانا وسوسہ تھا۔
''یہ سوال تم اپنے دل سے کرو اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوگی تو مجھے بھی لازمی ہوگی۔'' حنا نے جواب دیا۔
''میں جو سوال کر رہا ہوں، اس کا سیدھا سا ایک جواب ہے، ہاں یا نہیں۔ مجھے وہ جواب چاہیے۔'' جمال پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے بولا۔
''تمہیں آنکھیں پڑھنا نہیں آتیں؟ کیا ضروری ہے کہ ہر جذبے کو ہر بات کو الفاظ میں ڈھالا جائے۔'' حنا نے جواب دیا۔
''ہاں، یہ بہت ضروری ہے۔ دل کے اندیشوں کو الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں خود جب محبت اور نفرت کا اظہار الفاظ سے کرتا ہوں تو میری بھی خواہش ہے کہ میرے لیے بھی الفاظ ہوں۔''
''اگر میں تم سے محبت نہ کرتی تو ایک دن بھی تمہارے ساتھ نہ رہتی۔''
''تو پھر تم اپنی محبت کا اظہار کیوں نہیں کرتی ہو۔ گھر میں تو اس طرح رہتی ہو جیسے ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بیٹھی ہو۔ آج تمہیں گھر سے باہر لایا تو تمہارا ایک اور ہی روپ میرے سامنے ہے۔''
حنا نے ہتھیلی پر اپنا چہرہ ٹکایا اور آنکھیں گھماتے ہوئے بولی۔
''اف جمال! تم اتنے الفاظ کہاں سے لے آتے ہو؟''
''ہاں، یہی الفاظ جو میں تمہارے لیے ڈھونڈ کے لاتا ہوں اسی قسم کے چند الفاظ تم بھی بول لیا کرو، کیا جائے گا تمہارا۔'' جمال نے برجستہ کہا۔
''مثلاً کون سے الفاظ؟'' وہ چائے کا خالی کپ میز پر گھماتے ہوئے بولی۔
''مثلاً کیا حال ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے، چائے بنا دوں، دفتر میں دیر کیوں ہوگئی...... بس۔'' جمال مسکراتے ہوئے بولا۔
''اس سے کیا ہوگا؟'' وہ بحث کرنے والے انداز میں بولی۔
''اس سے میں جی اٹھوں گا۔ راتوں کو جاگنا ختم ہوجائے گا۔'' وہ رومانٹک لہجے میں بولا۔
''میرے خیال میں تمہیں وقت پر کھانا مل جاتا ہے۔ وارڈ روب میں تمہارے مہینے بھر کے سوٹ موجود رہتے ہیں، ایک مرد کو اور کیا چاہیے۔'' وہ یہ کہہ کر مسکرا دی۔ جمال نے ٹھنڈی سانس بھری۔
''میرے خیال میں چلنا چاہیے۔ تم یا تو سمجھنا نہیں چاہتی ہو یا پھر مجھے ذہنی اذیت دے کر دل میں کچھ تسکین سی محسوس کرتی ہو۔ حنا! اگر تمہیں شادی کا شوق نہیں تھا تو تمہیں انکار کر دینا چاہیے تھا۔ یوں کسی مرد کی زندگی میں زہر گھولنے کا تمہیں کوئی حق نہیں تھا۔''
''آپ مجھے گھمانے کے لیے لائے ہیں یا لڑنے کے لیے؟'' وہ قدرے خفگی سے بولی۔
''چلو اٹھو چلتے ہیں۔'' وہ سرد لہجے میں بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ حنا بھی بنا کچھ کہے کھڑی ہوگئی۔ بائیک پر وہ اس طرح بیٹھی جیسے جمال کو چھونے سے گریزاں ہو۔ ان کے درمیان مزید کوئی بات نہیں ہوئی اور یوں آدھے گھنٹے کا یہ راستہ دونوں جانب سے سرد مہری میں گزر گیا۔ گھر آکر

دونوں جب بیڈ پر لیٹے تو یہاں بھی کافی فاصلہ رہا۔ دونوں کے چہرے مخالف سمتوں میں رہے اور یوں رات گزر گئی۔

اگلی صبح جب وہ بیدار ہوا تو حنا کچن میں مصروف تھی۔ کام کے دوران وہ سوچتی رہی کہ ابھی جمال کچن میں داخل ہو کر اس کو پیچھے سے بازوؤں میں لے کر منائے گا مگر ایسا کچھ نہ ہوا اور وہ ناشتے کو ٹیبل پر رکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جمال باتھ روم سے نکلا تو ناشتا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے بے دلی سے معدے میں انڈیلا اور بریف کیس اٹھا کر کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ حنا ابھی آئے گی اور رات والے واقعے پر معذرت کرلے گی۔ یوں اس کا دل صاف ہو جائے گا پھر وہ اس کو دروازے تک چھوڑنے آئے گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ کچھ کہے بنا آفس نہیں جانا چاہتا تھا۔ پھر خود ہی اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''میں آج ذرا دیر سے آؤں گا۔'' اس نے یونہی کہہ دیا۔

''اچھا!'' حنا نے دیکھے بغیر جواب دیا۔

''حنا! اگر ہمارے درمیان بحث و تکرار کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو ایک دیوار سی ہم دونوں کے درمیان آجائے گی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔''

''یہ بات مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ مگر آپ کو شاید معلوم نہیں۔'' وہ پھر دیکھے بنا بولی۔

''تم ہر بات پر بحث کیوں کرتی ہو...... تسلیم و رضا والی عادت کیوں نہیں ہے تم میں؟'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''آپ کو ایک گونگی لڑکی کی ضرورت تھی جو آپ کی ہر بات پر خاموش رہتی اور یوں آپ کی انا کو تسکین مل جاتی۔ میں ایک روشن خیال گھر کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ہوں اور اس بات سے باخبر ہوں کہ میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں جو آگے پیچھے نہیں بلکہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔''

جمال کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے آفس جانے میں ہی عافیت سمجھی اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ اس رات کے بعد ان کے گھر کی زندگی ایک بار پھر رنگوں سے خالی ہو کر بلیک اینڈ وائٹ سی ہو گئی۔ اگلے چھ سات دن تک ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ پانچ بجے گھر پہنچتا۔ کچھ دیر آرام کر کے باہر چلا جاتا۔ رات گئے واپس آتا تو فریج میں سے کھانا نکال کے خود گرم کرتا اور صوفے پر ہی سو جاتا۔

آٹھویں دن اس نے کچھ روز اپنی ماں کے گھر میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اتوار کا دن تھا جب دس بجے کے قریب وہ نہا دھو کر کپڑے پہن کر تیار ہوا اور سوئی ہوئی حنا کو آواز دی۔

''میں کچھ دنوں کے لیے امی کے گھر جا رہا ہوں۔ تمہاری مرضی ہے چاہے یہاں رہو چاہے اپنی ماں کے گھر۔ جب واپس آؤں گا تو تمہیں بتا دوں گا۔'' حنا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں نے ابھی کچھ بکواس کی ہے، کیا تم نے سن لی یا نہیں؟'' وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''میں نے سن لیا ہے۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

جمال کو اس سے اسی قسم کی بے پروائی کی توقع تھی مگر اس نے اس امید پر اپنی بات دہرائی تھی کہ شاید حنا اس کو جانے سے روک لے۔ وہ بھی تو میکے جاتی ہوئی حنا کو کئی بار پیار سے روک چکا تھا۔ اس کے دل پر چوٹ سی لگی اور وہ بیگ اٹھا کر چل دیا۔ اس کو پتا نہ چلا کہ گھر سے لاری اڈے تک وہ کس طرح پہنچا۔ ماں کا گھر کوئی چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

جب وہ ماں کے ہاں پہنچا تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ماں تو بہت خوش تھی، دونوں بھتیجے بھی چچا کی آمد پر نہال تھے۔ بھابی حمیدہ بھی کافی مسرور نظر آرہی تھیں۔

''حنا کو ساتھ نہیں لائے؟'' بھابی نے سوال کیا۔

''کوئی اور بات کریں بھابی...... میں اس عورت کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ گھر اب میرے لیے جہنم بن چکا ہے۔ میں جہنم سے فرار ہو کر کچھ دنوں کے لیے یہاں آیا ہوں تاکہ تھوڑا ریلیکس ہو سکوں۔'' جمال چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''تو کیا وہ لڑکی ویسی کی ویسی ہے جیسے یہاں اس نے چھ ماہ گزارے۔'' بھابی نے تشویش ناک انداز میں پوچھا۔

''جی بھابی! شادی کے پہلے ہفتے سے آج تک ویسی کی ویسی۔''

''تم اس کو سمجھاؤ۔'' بھائی کمال نے کہا۔

''آپ بھی بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ بھابی حمیدہ سے آپ اتنے خوش ہیں، کیا آپ نے انہیں بھی سمجھایا جو یہ اتنی اچھی ہیں۔ یہ تو ہر عورت کی اپنی عادت ہوتی ہے جو فطرت سی بن جاتی ہے۔'' جمال نے جواب دیا۔

''اس طرح تو زندگی نہیں گزرے گی جمال۔'' ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''گزر ہی رہی ہے اماں۔ حنا کے کئی روپ ہیں۔

اپنے میکے میں وہ اور طرح سے ہوتی ہے۔ آپ کے سامنے فرماں بردار بیوی نظر آنے کی کوشش کرتی ہے۔ گھر میں وہ یوں رہتی ہے جیسے قیدی جیل میں۔ گھمانے پھرانے لے جاؤں اور ہوٹلوں کے کھانے کھلاؤں تو اس وقت اس کا روپ انتہائی شاندار ہوتا ہے۔ ہر صبح اس سوچ کے ساتھ بیدار ہوتا ہوں کہ آج اس کے ساتھ اس طرح رہوں کہ یہ خود کو میرے مطابق ڈھال لے مگر نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ تین سال میں نے پلاننگ کرتے ہوئے گزار دیے۔ آخر کب تک میں اس طرح زندگی گزاروں گا۔ اماں پلیز، اب مجھ پر رحم کریں اور مجھے مزید صبر کی تلقین نہ کریں۔''

ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے چہرے کی لاتعداد شکنوں میں دو تین اور شکنوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔

''اچھا اب کچھ دن آرام سے یہاں رہ۔ اس کا خیال ذہن سے نکال دے۔'' ماں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

جواب میں جمال کچھ اس طرح مسکرایا کہ اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ وہ تین چار دن وہاں رہا۔ اس کی خوب آؤ بھگت کی گئی مگر دل و دماغ کی بے چینی اپنی جگہ موجود رہی۔ تیسرے دن وہ وہاں سے جانے کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ ماں نے سمجھایا۔

''کیا واپس اپنے گھر جاؤ گے؟ وہ تو وہاں نہیں ہوگی۔ اکیلے کس طرح رہو گے؟ تمہارے کھانے پینے کا مسئلہ ہوگا۔'' ماں نے شفیق لہجے میں کہا۔

''ارے اماں ہوٹل ہے نا اور ویسے بھی میں خود کافی اچھا کھانا بنا لیتا ہوں، بس مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔'' جمال ماں کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے بولا۔

''میری دعائیں سائے کی طرح تیرے ساتھ ہوتی ہیں۔ انشاء اللہ تجھے گھر کا سکون ضرور ملے گا۔'' ماں نے جواب دیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ وہاں سے چل دیا۔ گھر آکر اس نے چائے بنائی اور آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں غور کرنے لگا۔ جوں جوں وہ سوچتا جاتا، اس کا ذہن مزید الجھتا جارہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ حنا ہر وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتی تھی۔ بظاہر خود کو مطمئن سمجھنے والا جمال اپنی بیوی کے بغیر خود کو بہت ادھورا سمجھتا تھا۔ وہ ابھی تک یہ بھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ حنا سے وہ نفرت کرتا ہے یا محبت۔ موبائل پر بجنے والی ہر گھنٹی پر وہ اس امید پر متوجہ ہوتا کہ شاید وہ حنا کا فون ہو۔

پھر اگلے روز اس نے خود حنا سے فون پر بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ کافی دیر دوسری طرف بیل بجتی رہی۔ پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

''مجھے حنا سے بات کرنی ہے۔'' اس کو معلوم نہ ہوا کہ حنا کا فون اٹھانے والا اس کا باپ ہے یا بھائی ہے۔

''جی کیا بات کرنی ہے، جو بات ہے آپ مجھ سے کہیں...... میں اس کا بھائی بول رہا ہوں۔''

جمال کا پارہ چڑھ گیا مگر اس نے خود کو سنبھال کر شائستہ لہجے میں کہا۔

''دیکھیے وہ میری بیوی ہے...... پلیز میری اس سے بات کرادیں۔''

''وہ میری بہن بھی ہے۔ آپ نے جو بات کرنی ہے یہاں آکر کریں، او کے۔'' فون بند ہوگیا۔

حنا نے میرا فون خود کیوں نہیں سنا؟ موبائل بھائی کو کیوں تھما دیا؟ کیا اس کو میری کال کا انتظار نہیں تھا؟ یہ سوچ کر اس کے ذہنی سکون میں مزید کمی سی آگئی۔ اس نے فون رکھ دیا۔

وہ رات سگریٹ پھونکتے ہوئے اور کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گئی۔

اگلی صبح وہ شیو کیے بغیر آفس روانہ ہوگیا۔ آفس میں ہی اس نے ناشتا منگوایا اور بے دلی سے تھوڑا سا کھا کر باقی ایک سائڈ پر رکھ دیا۔

اس کے سامنے تین راستے تھے جو بار بار اس کے ذہن میں ہلچل سی مچا دیتے تھے۔ پہلا راستہ یہ تھا کہ وہ اطمینان سے دوسری شادی کرلے۔ دوسرا یہ کہ حنا کو طلاق دے کر قصہ ہی ختم کردے اور تیسرا راستہ یہ تھا کہ وہ حنا کو واپس لے آئے اور شہر کے ستر فیصد مردوں کی طرح ہتھیار پھینک دے۔ اس طرح زندگی بڑے آرام سے گزر جائے گی۔ بیوی کی بے اعتنائی پر جلنے اور کڑھنے کے بجائے حالات سے سمجھوتا کرلے۔ سارا دن دفتر میں وہ خود سے جنگ کرتا رہا پھر بالآخر اس نے تیسرے راستے پر چلنے کا فیصلہ کرلیا۔

چھٹی کے بعد وہ اپنے گھر جانے کے بجائے سسرال چلا گیا۔

سسر اور سالے نے اس کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود باہر چلے گئے۔ جمال حنا کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ جوں جوں ٹائم گزرتا جارہا تھا، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی۔ ہر لمحے اس کو یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ تھوڑی دیر تک نہ آئی تو اس کی سانس بند ہوجائے گی۔ اس

لیے اس پر انکشاف ہوا کہ وہ حنا سے شدید محبت کرتا ہے۔
تقریباً بیس منٹ کے بعد حنا اپنے باپ اور بھائی کے ہمراہ اندر داخل ہوئی اور سلام کر کے اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میں پچھلے تمام واقعات بھلا کر تمہیں لینے آیا ہوں۔'' وہ دھڑکتے دل کے ساتھ بولا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بات سنتے ہی حنا کے چہرے پر خوشی کی لہر سی آجائے گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

''تم نے سنا نہیں۔'' جمال خود پر ضبط کر کے بولا۔
مگر حنا کے بجائے اس کا باپ بول پڑا۔

''بیٹا یہ تمہاری بیوی ہے۔ تمہارا حق ہے اس کو لے جانے کا۔ چلو بیٹا تمہارا شوہر تمہیں لینے آگیا ہے۔ بس یہ کافی ہے۔''

''ایسے کیسے بھیج دوں میں اپنی بیٹی کو۔'' جمال کی ساس اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''ذرا اس کی صحت تو دیکھیں، کیا شادی سے پہلے یہ ایسی ہوتی تھی۔'' وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولی۔

''آنٹی صحت تو میری بھی ایسی نہیں تھی جیسی اب ہے۔ گھر میں چھوٹے موٹے اختلافات تو ہوتے رہتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اس کو ہر دوسرے تیسرے دن بلا کر یہاں بٹھا لیا کریں۔'' پھر وہ حنا سے مخاطب ہوا۔ ''حنا تم کیوں خاموش ہو؟ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں دل کو صاف کر کے تمہیں لینے آیا ہوں؟''

''میں کیا کہوں۔'' وہ جمال کو دیکھے بنا بولی۔'' جو میرے گھر والے چاہیں گے میں وہی کروں گی۔''

''دیکھو جمال! ہمیں تم پر بھروسا یوں نہیں ہے کہ تم اب اس پر روزانہ تشدد کرتے ہو اور.....''

''روزانہ؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''تین سال کے عرصے میں ایک بار اس کو تھپڑ مارا اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں روزانہ تشدد کرتا ہوں۔ حنا تم خاموش کیوں ہو۔ بتاؤ نا ان کو کہ میں نے کب تم پر روزانہ تشدد کیا ہے۔'' وہ اونچی آواز میں بولا۔ مگر حنا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''جمال بیٹا!'' ساس اس سے قدرے مختلف انداز میں مخاطب ہوئی۔ ''یہ اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ ہم لوگ بھی نہیں چاہتے کہ تم دونوں کے درمیان اختلافات اتنے شدت اختیار کر جائیں کہ خدانخواستہ علیحدگی کی نوبت آجائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنا گھر کرائے پر دے کر یہاں شفٹ ہو جاؤ۔ اوپر والا پورشن خالی پڑا ہے۔ تم بھی ندیم کی طرح ہمارے بیٹے ہو۔ یہاں رہو گے تو تم دونوں کے درمیان کوئی ناچاقی نہیں ہوا کرے گی۔ یہ بھی تو تمہارا گھر ہے۔''

جمال اس بات کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آپس کی پوری مشاورت کے بعد یہ فیصلہ سنایا جائے گا۔ حنا کے رویے سے بھی لگ رہا تھا کہ وہ بھی یہی چاہتی ہے۔ جمال نے اپنی ساس کو بغور دیکھا پھر سسر سے مخاطب ہوا۔

''انکل! انسان کو شریف ضرور ہونا چاہیے مگر اتنی شرافت بھی نہیں ہونی چاہیے جو کمزوری بن جائے۔ مجھے حیرت ہے کہ گھر کے بڑے آپ ہیں اور بات کوئی اور کر رہا ہے۔'' پھر اس نے روئے سخن بیوی کی طرف کیا۔ ''جی حنا صاحبہ! ویسے تو اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ آپ کی ماں کی اس خواہش میں آپ کی رضامندی مکمل طور پر شامل ہے پھر بھی میں آپ کی رائے لینا پسند کروں گا کہ آپ چاہیں گی کہ آپ کا غیرت مند شوہر گھر جمائی بن جائے۔ گھر جنوائی...... جس کے بارے میں ایک مشہور مقولہ بھی ہے کہ بہن کے گھر میں بھائی کتا اور سسرال میں جنوائی کتا۔ کیا کہیں گی آپ؟''

''دیکھو جمال۔'' وہ اپنا روئے سخن جمال کی طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ سب گئے دنوں کی باتیں ہیں۔ میرے خیال میں یہاں رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ کوئی مفت میں تو نہیں رہیں گے، ماشاء اللہ اچھی خاصی انکم ہے آپ کی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہاں رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اوپر تین چار کمرے ہیں۔ اٹالین کچن ہے اور سب سے بڑی بات کہ آپ کا آفس یہاں سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ساس سسر بھی ماں باپ کی طرح ہوتے ہیں۔ مجھے تو یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

جمال اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''او کے میں سوچ کر بتاؤں گا۔ چلتا ہوں۔''

''بیٹھو بیٹے، کھانا کھا کر جاؤ۔'' ساس شفیق لہجے میں بولی، جس کی شفقت میں مکاری کا عنصر بھی شامل تھا۔

''تھینکس آنٹی، پھر کبھی سہی۔ میں ایک ہفتے کے اندر آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے دل کی حالت کافی ابتر تھی۔ رہ رہ کے اسے حنا کے اجنبی سے رویے پر دکھ ہو رہا تھا۔ اب اس کے ذہن میں یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ حنا کے سرد رویے کی کیا وجہ تھی۔ وہ کافی عرصے سے اپنی ماں کے گھر میں رہنے کے خواب دیکھ رہی تھی مگر اس کو

یہ بات کہنے کی جرأت کبھی نہ ہوسکی تھی آج اس کی ماں نے یہ بات کہہ کر حنا کے عزائم سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ ذہنی صدمے کے باعث وہ تین بار ایکسیڈنٹ سے بچا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ گھر داماد بن کر رہنے کا فیصلہ اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ بیوی کے ساتھ معاملات سیٹ ہوں اور رہائش کا مسئلہ ہو تو اور بات ہے مگر وہ شوہر کی کمزوری بھانپ کر اس کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھالنے پر مجبور کرے تو غیرت مند شوہر کافی مشکل کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر آ کر وہ بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ کافی تھکا ہوا تھا اس لیے سو گیا۔ رات کے آخری پہر بھوک کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ڈبل روٹی کے چند سلائس کھائے اور چائے بنانے کے لیے کچن کا رخ کیا۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ چائے پی کر اس نے اپنا موبائل دیکھا۔ ماورا کے تین چار میسیج آئے ہوئے تھے۔ اس نے اس کے نمبر پر ایک مسڈ کال کی۔ تھوڑی دیر بعد ماورا نے اس کو کال کر دی۔

''جاگ رہی تھیں کیا؟'' جمال نے سوال کیا۔

''ہاں طبیعت ناساز تھی۔ سرشام سو گئی تھی ایک گھنٹا پہلے آنکھ کھلی۔ تمہیں میسیج کیے مگر تم سو رہے تھے۔ یہ رات کے تین بجے تم کیوں جاگ رہے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''کل پھر اسی ریسٹورنٹ میں ملو، تم سے ایک ضروری مشورہ لینا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آ جاؤں گی...... کس وقت؟''

''پانچ بجے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

''کیسی ہو؟'' وہ ریسٹورنٹ کی کونے والی میز کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا جہاں پر ماورا پہلے سے موجود تھی۔

''بہت بُرے ہو تم جمال۔ پورے آدھا گھنٹا لیٹ ہو گئے ہو۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''بس ذرا آفس سے دیر ہو گئی۔ آج تو بہت شاندار لگ رہی ہو۔'' جمال اس کے سراپا کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ محض مسکرا دی۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

''ماورا! میں زندگی کے عجیب دوراہے پر آ گیا ہوں۔ ٹوٹتے ہوئے گھر کو بچاتے بچاتے میں خود ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ اب ایک سنجیدہ معاملے پر تم سے مشورہ درکار ہے۔ تم سن رہی ہو نا؟'' وہ اس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم بات جاری رکھو، میں سن رہی ہوں۔'' ماورا ٹیبل پر رکھے ہوئے گلاس کو گھماتے ہوئے بولی۔

اس اثنا میں ویٹر ان کے سامنے دو کولڈ ڈرنک رکھ کر چلا گیا۔

''میری ازدواجی زندگی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہے۔ حنا کی سرکشی کے باوجود میں نے کئی بار کمپرومائز کیا مگر کل اس نے اور اس کی ماں نے ایک عجیب و غریب شرط رکھ دی جو مجھ جیسے آدمی کے لیے قابل قبول نہیں۔''

''کیسی شرط؟'' ماورا کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

''حنا کئی دن سے میکے میں ہے۔ کل میں خود اس کو لینے چلا گیا۔ ان لوگوں سے بات ہوئی۔ میں حنا کو واپس لانا چاہتا تھا مگر اس کی ماں نے کہا کہ یہ یہاں سے نہیں جائے گی۔ اگر اس کے ساتھ رہنا ہے تو تمہیں ہمارے گھر میں رہنا ہوگا۔''

''یعنی گھر داماد بن کر؟'' ماورا نے سوال کیا۔

''جی گھر داماد بن کر۔'' جمال نے جواب دیا۔

''اس بارے میں حنا کا کیا خیال ہے؟'' ماورا نے پوچھا۔

''وہ تو مکمل اپنی ماں کی ہمنوا لگ رہی تھی۔ مجھے تو ایک پل کے لیے بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ میری بیوی ہے۔'' جمال نے جواب دیا۔

''تو تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے ان سے سوچنے کا وقت مانگا ہے۔ ماورا! میں بچپن میں ٹوٹے ہوئے گھر کا عذاب سہہ چکا ہوں اس لیے اپنا گھر نہیں توڑنا چاہتا لیکن میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ حالات مجھے اس مقام پر لا کھڑا کریں گے جہاں مجھے گھر بچانے کے لیے اپنی خودداری کو قربان کرنا پڑے گا۔ اب تم بتاؤ میں کیا کروں؟ ایک خیال آتا ہے کہ طلاق دے کر جان چھڑا لوں مگر یہ میرے بس میں نہیں۔ مجھے پلیز گائیڈ کرو اور بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

ماورا نے بالوں کو سیٹ کیا اور آرام سے بولی۔ ''بن جاؤ گھر داماد۔ سالی پہ بھی آنکھ رکھو، کچھ عرصے بعد ان کے بیٹے کی شادی ہو جائے گی۔ اس کی بیوی کو بھی پٹاؤ تا کہ تمہاری زوجہ محترمہ کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔''

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' جمال بولا۔

''ہاں تو میں بھی سیریس ہوں۔ جمال! گھر داماد بن کر رہنے میں کوئی زیادہ قباحت نہیں ہے مگر تم جیسے خوددار انسانوں کے لیے واقعی مشکل کام ہے۔ یار! یہ تمہاری بیوی میری سمجھ سے تو باہر ہے اور میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آرہا کہ اس موقعے پر تمہیں کیا مشورہ دوں۔ اپنی ماں اور بھائی سے

بات کر دو وہ کیا کہتے ہیں۔"

"مجھے پتا ہے یہ بات سن کر بھائی کیا مشورہ دے گا۔ وہ فوراً کہے گا کہ اس بیوی کو دفع کرو اور دوسری شادی کرو۔" جمال نے جواب دیا۔

"یہ تو کافی معقول مشورہ ہے۔ تمہاری بیوی فسادی ذہن رکھنے والی عورت ہے۔ ایسی عورت کا علاج صرف دوسری شادی ہے۔ مجھے تو قسم سے تمہاری بے بسی پر رحم آرہا ہے اور تمہاری بیوی پر شدید غصہ آرہا ہے۔ پہلے تم سے تمہاری ماں کا گھر چھڑوایا، اب تم سے تمہارا گھر چھڑوانا چاہتی ہے۔ یار عجیب لڑکی ہے۔ یہ آئیڈیل لائف ہے۔ ساس نندوں کے جھگڑوں سے دور خوب صورت گھر ملا ہوا ہے مگر اس کو وہاں چین ہی نہیں آتا۔ یہ عورت تمہیں اپنی ماں کے گھر میں بھی سکون سے جینے نہیں دے گی۔ اپنے کسی قابل دوست سے مشورہ کرو، میں تو تمہیں کوئی مشورہ نہیں دے سکتی۔"

"پھر بھی کچھ تو کہو۔" جمال بے تابی سے بولا۔

نادرا نے آنکھوں کی پتلیوں کو سکیڑا اور بولی۔

"بن جاؤ گھر داماد۔ یہ کرکے بھی دیکھ لو۔"

"ہوں۔" جمال لمبی سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ تمہارا مشورہ ہے؟"

"نہیں، ایک بات ہے۔ اس کو مشورہ بھی سمجھ سکتے ہو۔ اب تم مجھ سے ہر حال میں مشورہ لینا ہی چاہتے ہو تو میں تمہیں یہی کہوں گی کہ ان کی یہ بات بھی مان کے دیکھ لو۔"

"ٹھیک ہے، میں اس بارے میں مزید سوچوں گا۔ کیا خیال ہے چلیں؟"

"چلو۔"

پھر دونوں وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اگلے روز جمال نے دفتر سے ایک ہفتے کی چھٹی لی۔ وہ اس ماحول سے کچھ دنوں کے لیے دور جانا چاہتا تھا۔ ڈیرہ غازی خان میں اس کا ایک پرانا دوست رہتا تھا، رشید نام تھا اس کا۔ اپنے علاقے کا معقول زمیندار تھا اور جمال کا بے تکلف دوست بھی۔ جمال کچھ دنوں کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا۔ رشید کئی بار فون پر اس کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے چکا تھا۔ رشید کے گھر وہ پہلے بھی دو تین بار جا چکا تھا۔ وہاں اس کو سب اپنے گھر کا فرد ہی سمجھتے تھے۔ اس نے بیگ میں دو تین جوڑے ڈالے، کچھ اور ضروری سامان رکھا اور ڈیرہ غازی خان جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔

چند گھنٹے بعد وہ ڈیرہ غازی خان کے اڈے پر تھا جہاں پر رشید اس کے انتظار میں موجود تھا۔ دونوں دوست بغل گیر ہو گئے۔

"کافی کمزور لگ رہے ہو، لگتا ہے ہماری بھابی تمہاری خوراک کا خیال نہیں رکھتیں۔" رشید بغل گیر ہونے کے بعد بولا۔

"بس ذرا آفس کے کاموں کا کافی بوجھ ہوتا ہے۔ تو بتا امی اور بھابی کیسی ہیں؟" جمال نے سوال کیا۔

"تم خود ان کو دیکھ لینا، آؤ بیٹھو۔" رشید گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا اور جمال اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ان کی گاڑی شہر سے نکل کر مضافات میں داخل ہوئی۔ دس منٹ کی مزید ڈرائیو کے بعد رشید کا گھر آ گیا۔ دو کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا وہ گھر کافی خوب صورت بنا ہوا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سب نے بھرپور استقبال کیا۔ آخری بار وہ شادی سے ایک سال پہلے آیا تھا۔ رشید اس کے گھریلو حالات سے کافی باخبر تھا۔ دونوں مہینے میں دو چار بار فون پر لمبی گفتگو کیا کرتے تھے۔ رشید اس کو کمرے میں لے آیا۔ تھوڑی دیر بعد رشید کی بہن اور بیوی کمرے میں آ گئیں۔

"بھابی کو بھی ساتھ لے آتے۔" رشید کی بیوی نرگس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"حنا کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس لیے اس کو نہ لا سکا پھر کبھی لے آؤں گا۔ آپ سنائیں آپ کیسی ہیں؟" وہ دونوں سے مخاطب ہوا۔

"بس جی ٹھیک ٹھاک ہیں۔" نرگس سادگی سے بولی۔ "بھائی! آپ نہا لیں تاکہ فریش ہو جائیں۔ میں آپ کے کپڑے استری کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر نرگس نے بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ رشید کی بہن بھی اس کے ہمراہ تھی۔ جمال باتھ روم میں گھس گیا۔ جب دس منٹ بعد نہا کر باہر نکلا تو سلیقے سے استری کیا ہوا سوٹ بیڈ پر پڑا تھا اور اس کے جوتے بھی پالش سے چمک رہے تھے۔

"یہ جوتے کس نے پالش کیے؟" اس نے رشید سے سوال کیا۔

"تمہاری بھابی نے اور کس نے۔" رشید نے جواب دیا۔ جمال رشید کی ازدواجی زندگی سے بہت متاثر تھا۔ اس کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے۔ رشید کی بیوی ایک خاموش طبع عورت تھی اور وہ رشید کا اس طرح خیال رکھتی جیسے وہ کوئی چھوٹا بچہ ہو۔ رشید کی ہر بات اس کے لیے حرف آخر ہوتی تھی۔ اس دس سالہ ازدواجی رفاقت میں ان کے درمیان کوئی سنگین جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ اس گھر میں جمال

جب بھی آتا تھا تو نرگس اپنے سگے بھائیوں کی طرح اس کی خدمت کرتی تھی۔

جمال کو وہاں رہتے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ وہ دونوں آدھی آدھی رات تک گئے دنوں کی باتیں کرتے تھے اور نرگس ہر گھنٹے بعد ان کے لیے چائے بنا کے لاتی تھی۔ کیا مجال جو اس کے ماتھے پر جمال نے کبھی کوئی شکن دیکھی ہو۔

ایک دن رشید نے اس کو اپنے ساتھ شکار پور لے جانے کا پروگرام بنایا۔ رشید کے پاس روسی ساختہ دو نال والی رائفل تھی جو کافی پرانی تھی۔ اس روز بھی رشید وہ بندوق اٹھا لایا اور اس کو تیل دینا شروع کر دیا۔

''تم اپنا شکار والا مشغلہ بھولے نہیں ہو۔'' جمال اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

''اونہیں یار! شکار کا شوق جس کو لگ جائے وہ عمر بھر ساتھ رہتا ہے۔ اپنا ٹینٹ ساتھ لے جائیں گے۔ رات وہیں گزاریں گے۔ تم کسی زمانے میں وائلن بجایا کرتے تھے، کیا اب بھی بجاتے ہو؟'' رشید نے سوال کیا۔

''اتنی فرصت کہاں رہی یار۔'' جمال انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ اس اثنا میں نرگس کھانا لے کر آگئی اور فرشی نشست پر کھانا رکھ کر چلی گئی۔ دونوں نے کھانا کھایا پھر چائے سگریٹ سے فارغ ہو کر باہر آگئے۔

''سگریٹ میں نے خرید لیے ہیں۔ جہاں ہم جائیں گے وہاں تمہارے برانڈ والے سگریٹ نہیں ملتے، وہاں تو بس جنگل ہی جنگل ہے۔'' رشید گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ڈکی میں چھوٹا سا ٹینٹ بھی پڑا ہے اور بقیہ ضروری سامان بھی۔ بس آج کی رات وہاں بسر کریں گے کل واپسی ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ان کی گاڑی گھر سے نکل کر پکی سڑک پر آگئی۔ دس بارہ کلو میٹر کے بعد پکی سڑک ختم ہوگئی۔ اب کچا راستہ شروع ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک آس پاس کے کھیت دکھائی دیتے رہے پھر جنگل شروع ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ گاڑی سے نکلے اور رشید نے ایک مناسب جگہ پر اپنا ٹینٹ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رشید کا ایک مزارع بھی موجود تھا۔

''یہ جگہ ٹھیک رہے گی نا بخشو؟'' رشید نے پیچھے مڑ کر اپنے پچاس سالہ مزارع بخشو کو دیکھا۔

''جی جناب! بس یہی جگہ ٹینٹ لگانے کے لیے مناسب ہے۔'' بخشو نے آس پاس دیکھتے ہوئے جواب دیا اور جمال اور رشید گاڑی سے باہر نکل آئے۔ رشید نے اپنی رائفل کو کندھے سے لٹکایا اور کارتوس کا ڈبا سنبھال کر جمال سے بولا۔

''چل میرے یار! اب ہم پیدل گھومیں گے۔ یہاں تیتر کافی تعداد میں مل جاتے ہیں۔'' اور جمال خاموشی سے اس کے ہمراہ چل دیا۔

وہ کافی دیر تک شکار کرتے رہے۔ رشید پانچ تیتروں کا شکار کر چکا تھا۔ جب سورج ڈھلنے کے قریب ہوا تو دونوں نے واپسی کی راہ لی۔

''تھک تو نہیں گئے؟'' رشید نے جمال سے سوال کیا۔

''ارے نہیں یار! میں تو پہلے سے زیادہ تازہ دم ہو گیا ہوں۔'' جمال نے جواب دیا۔

''اپنا بخشو کافی اچھا شیف ہے۔ تم اس کے ہاتھ کا پکا ہوا تیتر کھا کے دیکھنا، مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی ایسا لذیذ کھانا تمہیں نہیں ملے گا۔''

جب وہ اپنی گاڑی کے پاس پہنچے تو ٹینٹ نصب ہو چکا تھا اور سورج مغرب کی آغوش میں چھپنے جا رہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو یار؟'' رشید نے جمال سے سوال کیا۔

''میں فطرت کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' جمال نے ٹینٹ کے اندر داخل ہو کر کہا جہاں پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں اور تکیے بھی موجود تھے۔

''کیا مطلب؟'' رشید نے سوال کیا۔

اس اثنا میں بخشو خیمے میں داخل ہوا۔ رشید نے شکار کیے ہوئے تمام تیتر اس کے حوالے کر دیے۔

''ابھی پکاؤں یا تھوڑی دیر بعد؟'' بخشو نے مودبانہ انداز میں سوال کیا۔

''ابے او کھامڑ! یہ جمال شہری بابو ہے۔ دیر سے کھانا کھاتا ہے۔ پہلے تو ہمیں گرما گرم چائے پلا، کھانا رات آٹھ بجے بنانا۔ اب تم جاؤ۔''

بخشو جی اچھا کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ رشید نے سوالیہ انداز میں جمال کو دیکھا جیسے اس کو بات جاری رکھنے کا کہہ رہا ہو۔

''یار رشید! ہم شہری لوگوں نے خود کو فطرت سے دور کر کے خود پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اب دیکھو یہ پرندے، یہ جانور جس طرح آج سے ہزاروں سال پہلے تھے آج بھی ویسی ہی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تنکوں سے گھر بناتے ہیں۔ کوئی لالچ کوئی حرص، کوئی طمع نہیں ہوتا ان کو۔ آج کھایا اس کے بعد بے فکر ہو گئے۔ ذرا بڑے شہروں کے لوگوں کی زندگی دیکھو۔ اب میں لاہور میں رہتا ہوں جہاں سڑکوں پر ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہے۔ ٹریفک جام، شاندار رہائشی مکان اور پھر دوسرا مکان بنانے کا لالچ پھر تیسرا مکان۔ شادی ہالوں میں

ہزاروں لاکھوں روپے برباد کرنا، امراء کی بیگمات کی بے تحاشا شاپنگ، ایک میراتھن ریس ہے شہروں میں جو کئی سالوں سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے اور ظلم یہ ہے کہ آگے سے آگے بڑھنے کی اس میراتھن ریس میں وہ بھی شامل ہونے پر مجبور ہے جس میں دو قدم چلنے کی بھی سکت نہیں۔ اب دیکھو اس جنگل میں کتنا سکون ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح نشے میں مبتلا ہو کر انسان اس نشے سے جان نہیں چھڑا سکتا، اسی طرح آج کا ترقی یافتہ انسان آگے سے آگے بڑھنے کے نشے میں مبتلا ہے۔ شاندار گاڑی میں بیٹھا ہے مگر چہرے پر بے سکونی چھائی ہے۔ شاندار کھانے میز پر موجود ہیں مگر یا تو بھوک نہیں یا پھر ڈاکٹر نے منع کیا ہوا ہے۔ بس یار! میرا تو دل چاہتا ہے کہ اسی طرح کے کسی جنگل میں ایک خیمہ لگا کے بقیہ زندگی گزار دوں۔''

رشید نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

''یار جمال! یہ آج تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ اتنی مایوسی کیوں ہے تیرے اندر اور میں دو تین دن سے دیکھ رہا ہوں کہ تو کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ پھر میں نے تجھے گھر والوں کو فون کرتے بھی نہیں دیکھا۔ نہ ہی بھابی کا فون آتا ہے۔ خیریت تو ہے نا۔''

جمال نے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر گویا ہوا۔

''رشید! تجھے معلوم تو ہے کہ تیری بھابی سے میری ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو سکی۔ وہ ایک انتہائی انا پرست عورت ہے۔'' پھر اس نے رشید کو تمام حال کہہ سنایا۔

''تو پھر تو نے کیا سوچا، سسرال میں رہنے کے بارے میں؟'' رشید بولا۔

''میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ اگر تو میری جگہ ہوتا تو کیا کرتا؟'' جمال نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''تیری جگہ میں ہوتا تو شادی کے دو ماہ کے اندر اس قسم کی بیوی کو طلاق دے کر فارغ کر چکا ہوتا۔ سسرال میں رہنا تو دور کی بات ہے۔'' رشید نے جواب دیا۔

بخشو چائے کے دو کپ لے کر اندر داخل ہوا۔

''ادھر رکھ دو اور کچھ ہی دیر میں کھانا تیار کر دو۔'' رشید اس سے بولا۔

دونوں دوست چائے پینے میں مشغول ہو گئے، چائے پی کر دونوں خیمے سے باہر نکلے۔ آسمان پر بادلوں کی اوٹ سے نکلتا اور اوٹ میں چھپتا ادھورا چاند ماحول پر ایک عجیب سا سحر طاری کیے ہوئے تھا۔ دونوں چلتے ہوئے کچھ دور نکل گئے اور چلتے چلتے رک گئے۔ رشید نے جمال کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرم لہجے میں بولا۔

''جو انسان تمہیں ذہنی تکلیف پہنچائے، اس سے دور رہو اپنا تو یہی اصول ہے۔ تیری بیوی کو تیری اچھائی اور تیری محبت کی ضرورت نہیں ہے تو، تو کیوں خود کو خوار کر رہا ہے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے اور نوجوانی تو سردیوں کی دھوپ کی طرح ہوتی ہے۔ ابھی تھی، ابھی غائب۔ یا تو مکمل طور پر ہتھیار ڈال دے جیسے عام مرد ہوتے ہیں، بیوی سے صرف جسمانی تعلق۔ اس نے جو پکایا کھا لیا۔ وہ جو بھی کر رہی ہے اس کو نہیں روکنا۔ اس طرح مرد کافی سیٹ رہتا ہے لیکن اگر تو اس سے کچھ جائز خواہشات رکھتا ہے جو کہ وہ پوری کر سکتی ہے اور نہیں کر رہی تو پھر ایسی عورت سے جان چھڑانا بہتر ہے۔ خود کو ہلکان کرنے سے کیا فائدہ۔ تو خود کو اندر ہی اندر سے دیمک کی طرح کھا رہا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں خوش بیٹھی ہے۔ تجھ جیسے بے ضرر انسان کو اس حال میں دیکھ کر دکھ ہو رہا ہے۔ آؤ واپس چلتے ہیں اور موضوع بھی بدلتے ہیں۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔

''یار اس جنگل میں درندے تو نہیں ہوتے نا؟'' جمال نے سوال کیا۔

''اب وہ جنگل کہاں رہے یار..... ہر دو تین کلومیٹر کے بعد کوئی نہ کوئی گھر یا چھوٹا موٹا گاؤں موجود ہے۔ کچھ سال پہلے تک یہاں دو تین بھیڑیے دیکھے گئے تھے۔ جو شکاریوں نے مار دیے بس صرف گیدڑ موجود ہیں۔''

''کتنی دیر باقی ہے کھانا پکنے میں؟'' رشید نے بخشو سے پوچھا جو سالن پکانے میں مصروف تھا۔ چولہے میں جنگل کی خشک لکڑیاں جل رہی تھیں۔

''بس جی پانچ، دس منٹ اور باقی ہیں، اس کے بعد روٹیاں بناؤں گا۔'' بخشو دور سے بولا اور اس کی بات سن کر دونوں اپنے خیمے کے اندر چلے گئے۔ سالن کی مہک ان کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی جس سے دونوں کی بھوک بھی چمک اٹھی۔ خیمے میں آ کر دونوں گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لگا دیا گیا۔ تینوں نے مل کر خوب سیر ہو کر کھایا اور پھر بخشو قہوہ بنانے چلا گیا۔ ان کی یہ محفل رات دو بجے تک جمی رہی۔ صبح جب جمال جاگا تو سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ بخشو ناشتا لے کر آ گیا۔ ناشتے کے بعد واپس جانے کی تیاری شروع ہو گئی۔ جب وہ گھر پہنچے تو دن کے بارہ بج رہے تھے۔

جمال وہاں پر مزید تین دن رہا اور چھ دن گزارنے کے بعد واپس اپنے شہر آ گیا لیکن اپنے شہر میں داخل ہونے

سے پہلے وہ مکمل طور پر ایک فیصلہ کر چکا تھا۔
اگلے دن وہ اپنے آفس سے چھٹی کے بعد سسرال چلا گیا۔ حنا نے خلافِ توقع اس کی خوب آؤ بھگت کی۔
''اوپر والا پورشن دکھاؤ۔'' جمال بولا۔
حنا اس کو بالائی منزل پر لے گئی، ایک ایک کونا دکھایا۔ تمام پورشن دیکھ لینے کے بعد جمال کمرے میں آیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
''میں نے تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق یہاں رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ آج چودھویں کا چاند ہوگا۔ تم تیاری کرو، اسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہیں اور نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ میں تمہارے حق میں دعا کروں گا کہ اللہ تمہیں یہاں خوش رکھے اور تم میرے حق میں دعا کرنا کہ میں بھی یہاں خوش رہ سکوں۔ چائے پلاؤ۔''
حنا فوراً کچن میں جا گھسی اور چائے بنا کے لے آئی۔
جمال خاموشی سے چائے پینے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران حنا ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی جن کا جواب جمال ہوں ہاں میں دیتا رہا اور خالی کپ ایک سائڈ پر رکھتے ہوئے بولا۔
''میں ذرا کام سے باہر جا رہا ہوں، رات آٹھ بجے تک آجاؤں گا۔ تم تیار رہنا۔''
حنا نے مسکرا کر اس کو الوداع کہا اور جمال سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے چلا گیا۔ رات نو بجے وہ اسی ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے۔ ایک خالی ٹیبل سنبھالنے کے بعد جمال نے مچھلی کا آرڈر دیا اور خاموشی سے حنا کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔
''کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ شوخی سے بولی۔
''کل سے تمہیں بہت خوش دیکھ رہا ہوں۔'' جمال نے جواب دیا۔
''تو کیا مجھے خوش نہیں ہونا چاہیے؟'' حنا نے سوال کیا۔
''ضرور ہونا چاہیے۔'' جمال بولا۔ ''ہر انسان کو خوش رہنے کا حق ہے، حیرت اس لیے ہوئی کہ میں نے اپنے گھر میں تمہیں کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا۔ کل بالائی منزل والا پورشن دکھاتے ہوئے تم چہک رہی تھیں کیونکہ تین سال بعد تم نے اپنا مقصد حاصل کرلیا۔ میں نے مرد ہو کر اپنے بھائی اور ماں کو چھوڑ دیا کیونکہ میں نے اپنی ہر خوشی تم سے وابستہ کرلی تھی۔ تم نے عورت ہو کر شادی کے بعد بھی ہزار جتن کیے کہ تمہیں تمہارے میکے میں رہنے کی جگہ مل جائے جبکہ عورت تو بچپن ہی سے ذہنی طور پر اپنے ماں باپ کے گھر میں خود کو مہمان سمجھتی ہے۔''

اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دریا کی لہروں سے ٹکرا کر آنے والی ہوا میں کافی خنکی تھی۔ اوپر آسمان پر اکیلا اور خاموش چاند جیسے دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔
اس نے اپنی بات جاری رکھی۔
''کل اپنی امی کے ساتھ میرے گھر چلی جانا اور اپنا سامان اٹھوا لینا۔''
''ہاں میرے جہیز کا سامان تو وہیں پر رکھا ہے۔ کل اٹھوا لوں گی اور تم شام سے کھوئے کھوئے سے ہو۔ بس اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔
''اب مجھے بھی تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
''میرا دوست رضوان کہتا ہے کہ بیویاں موسموں کی طرح ہوتی ہیں۔ کچھ بیویاں گرمی کے موسم کی طرح ہوتی ہیں، کچھ سردی کے موسم جیسی ہوتی ہیں۔ مرد کو چاہیے کہ جس طرح موسم کے مطابق زندگی گزارتا ہے، وہ بھی اپنی بیوی کے مطابق زندگی گزار دے مگر میں کہتا ہوں کہ بیوی کو سردیوں کے موسم میں دھوپ جیسا اور گرمیوں کی دوپہر میں درخت کی ٹھنڈی چھاؤں جیسا ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے تمہیں میرے خیال سے اتفاق نہ ہو کیونکہ تم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی ہو۔ تمہارا اپنا نقطۂ نظر ہوسکتا ہے مگر میں اپنے اس خیال سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکا۔ تم نے کبھی وائلن کی تاروں میں سے نکلتی ہوئی جھنکار سنی ہے؟'' جمال نے سوال کیا۔
''میں سازوں کے بارے میں کم جانتی ہوں۔'' حنا نے جواب دیا۔
''حنا! میں نے وائلن کی کپکپاتی تاروں میں سے ہمیشہ محبت کو آنسو بہاتے ہوئے محسوس کیا ہے۔ جب وائلن بجتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے محبت اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی ہو۔''
''یہ تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو جمال...... دیکھو کتنا سہانا موسم ہے۔ کوئی رومانٹک بات کرو نا۔ اگر میری جگہ ماورا ہوتی تو تم کتنا چہک رہے ہوتے۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔
''تم تو خوش ہو نا۔'' جمال نے سوال کیا۔
''ہاں، میں بہت خوش ہوں۔'' وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔
تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا اور دونوں کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانے کے بعد کولڈ ڈرنک آ گئی۔

''میں آج کیسی لگ رہی ہوں؟'' حنا شوخ لہجے میں بولی۔
''تمہارا چہرہ بہت خوب صورت ہے۔'' جمال نے مختصر تبصرہ کیا۔
''وہ تو ہے، مطلب آج اس وقت اس بلیک سوٹ میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' اس نے پھر سوال کیا۔
''چھوڑو ان فضول باتوں کو یہ بتاؤ کھانا کیسا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کی فرائی مچھلی بہت لاجواب ہوتی ہے۔'' جمال ٹشو سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولا۔
''تم کافی بدلے بدلے سے لگ رہے ہو۔ لگتا ہے امی کے گھر میں رہنے کا فیصلہ تمہیں پسند نہیں آیا۔''
''بات پسند ناپسند کی نہیں، درمیانی راستے کی ہے۔ اپنے گھر میں بھی تو میں ہر وقت سولی پہ لٹکا ہوتا تھا۔ اگر میں کہہ بھی دوں کہ نہیں جی میں تو سسرال میں نہیں رہتا، تمہیں میرے ساتھ وہیں پہ رہنا ہوگا، تو اس سے کیا ہوگا؟ پھر تمہاری بے پروائی اور میری بے سکونی شروع ہو جائے گی۔ جینے کا درمیانی راستہ تو مل گیا نا، بس ایک دکھ یہی ہے کہ کاش تم نے مجھے سسرال میں رہنے پر مجبور نہ کیا ہوتا۔''
''اب آپ ان باتوں کو چھوڑ کر نئی زندگی کا آغاز نہیں کر سکتے۔'' حنا اکتا کر بولی۔
''میری ہر بات پر تم جلدی اکتا جاتی ہو۔ بس وعدہ آج کے بعد اس موضوع پر پھر کبھی بات نہیں ہوگی..... چلیں؟''
''ہاں چلو۔''

☆☆☆

اگلے دو دنوں میں شفٹنگ کا کام مکمل ہوگیا۔ حنا تو اپنے جہیز کا سارا فرنیچر اور دیگر سامان اپنی ماں کے گھر میں شفٹ کر چکی تھی۔ جمال نے صرف اپنے کپڑے وہاں سے اٹھائے، باقی سامان رہنے دیا۔ حنا کو اس نے یہ کہا کہ جیسے ہی کوئی اچھے سے کرائے دار مل گئے، میں اپنا بقیہ سامان اٹھا لوں گا۔

حنا نے تمام سامان اپنے نئے ٹھکانے پر شفٹ کر دیا۔ جمال دفتر سے آکر تھوڑا سا آرام کرتا پھر باہر چلا جاتا پھر رات گئے آتا اور کھانا کھاتے ہی سو جاتا۔ حنا خود بھی جلدی سو جانے کی عادی تھی اس لیے وہ اس کی اس تبدیلی پر معترض نہیں تھی۔ جمال حنا کے ماں باپ سے بس واجبی سا تعلق رکھے ہوئے تھا چونکہ اس کو ان کے پورشن سے ہو کر آنا پڑتا تھا اس لیے سلام دعا تو لازمی تھی۔

تقریباً ایک ہفتے تک جمال کی یہی روٹین رہی۔ ایک دن حنا نے آخر وہ بات کہہ دی جو اس کی ماں کئی دن پہلے اس کے کان میں ڈال چکی تھی۔
''جمال! آپ میرے والدین سے کچھ کچھے کچھے سے رہتے ہیں، کبھی ان کے ساتھ نہیں بیٹھتے۔ کبھی کوئی اسپیشل ٹائم نہیں دیا بس گزرتے ہوئے سلام دعا کرنا تو کافی نہیں ہوتا نا۔''
''تو آپ کی امی صاحبہ نے ایک نیا محاذ کھڑا کر دیا۔'' جمال نے جواب دیا۔ ''کیا ضرورت تھی ان کو یہ بات کہنے کی، یہاں رہتے ہوئے یہ میرے فرائض میں تو شامل نہیں ہے تاکہ میں ان کی محفلوں میں بھی شرکت کروں۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان ہوں۔''
''آپ سے تو کوئی بات کرنا ہی گناہ ہے۔'' یہ کہہ کر حنا پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ رفتہ رفتہ ان دونوں کے درمیان پھر ایک ان دیکھی سی دیوار بن گئی۔ اب ہوتا یوں تھا کہ جمال جب بھی دفتر سے گھر آتا تو اوپر جا کر اس کو بہت دیر تک حنا کا انتظار کرنا پڑتا۔ بعض دفعہ تو اس کو آواز دے کر بلانا پڑتا تھا۔
ایک دن اس نے اپنی جھنجلاہٹ ظاہر کر دی۔
''حنا! کم سے کم اتنا تو کیا کرو کہ جب میں یہاں آؤں تو تم اپنے ہی پورشن میں ملو۔ اب تو میں جب بھی آؤں جہاں سے بھی آؤں تم نیچے موجود ہوتی ہو۔''
''ہاں تو میں آتی تو پھر تمہارے پاس ہوں نا۔ اس میں اتنا شور کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' حنا بے پروائی سے بولی۔
''ضرورت ہے۔'' وہ چلّایا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ جب میں آفس سے تھکا ہوا یہاں آؤں تو تم مجھے اپنی منتظر ملو۔ اگر میری یہ خواہش ناجائز ہے تو پھر تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے اوپر رہنے کی۔ جاؤ نیچے جا کر رہو۔''
حنا نے غصے بھری نظروں سے ایک نظر اس کو دیکھا پھر نیچے چلی گئی۔ جمال رات دس بجے تک اس کا منتظر رہا۔ وہ ساڑھے دس بجے آئی اور جمال سے کوئی بات کیے بنا چپ کر کے سو گئی۔ اگلی صبح دونوں کے بیچ تناؤ کی کیفیت موجود تھی۔ حنا نے ناشتا میز پر رکھا اور جانے ہی والی تھی کہ جمال کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
''سنو۔'' وہ دھیرے سے بولا۔
''جی۔'' اس نے بے اعتنائی سے کہا۔
''حنا! میں اب اس ٹینشن زدہ ماحول میں مزید نہیں رہ سکتا۔ تمہیں تمہاری ماں کی اور بہن بھائی کی رفاقت درکار تھی سو مل گئی۔ میری ضرورت نہ تمہیں پہلے کبھی تھی اور نہ آج

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ہے۔ میں صرف اپنے کپڑے لے کر آیا تھا، باقی سامان بھی لانا تھا مگر لگتا ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔''
جمال اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر حنا مزید کوئی بات سنے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جمال کا خیال تھا کہ حنا کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ وہ سوری کر کے بات ختم کر دے گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا، جمال نے کچھ دیر تک اس کا انتظار کیا پھر آفس روانہ ہو گیا۔ آفس میں سارا دن اس کے ذہن میں آندھیاں چلتی رہیں۔ اپنی خودداری کی قربانی بھی اس کے کام نہ آئی تھی۔ اس نے فارغ اوقات میں اپنے ہر اقدام کا جائزہ لیا۔ ہو سکتا ہے حنا اتنی قصوروار نہ ہو، وہ خود حالات بگاڑنے کا ذمے دار ہو مگر اپنا جائزہ لینے کے بعد اس نے خود کو بری الذمہ پایا پھر اس نے حنا سے جدا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ آفس سے چھٹی ہوتے ہی وہ گھر پہنچا۔ حنا کہیں بھی نہیں تھی۔ جمال نے کچھ دیر اس کا انتظار کیا مگر وہ نہ آئی پھر اس نے بیگ میں اپنے کپڑے ڈالے اور نیچے اتر گیا۔ نیچے والے پورشن میں کسی سے اس کا ٹکراؤ نہ ہوا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔ اب اس نے حنا کے ساتھ نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہاں سے وہ سیدھا اپنی والدہ کے گھر روانہ ہو گیا۔

شام ڈھلے وہ والدہ کے گھر پہنچا۔ اس کی اڑی ہوئی رنگت اور ہاتھوں میں تھامے ہوئے بیگ نے اس کی ماں کو ساری کہانی بیان کر دی۔

''بس اماں اب اور میری قوتِ برداشت سے باہر ہے میں نے گھر کو بچانے کے لیے ہر قدم اٹھایا، اپنی خودداری کو کچلا مگر یہ عورت شاید میرے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اب پلیز مجھے یہ مت کہیے گا کہ صبر کر، وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ ٹھیک نہیں ہو سکے گی کیونکہ وہ خود کو غلط سمجھتی ہی نہیں۔''

بھابی نے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ بھائی نے دل جوئی کی۔ تب کہیں جا کر اس کی طبیعت کو تھوڑا سا قرار آیا۔

''میرا کمرا سیٹ کر دیں۔ میں یہاں رہوں گا اور ہاں اب میں حنا کو طلاق دوں یا دوسری شادی کروں، آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ تمام آداب ملحوظ رکھتے ہوئے بولا۔

''تم اپنی خوشی کے لیے جو چاہو کرو، میں درمیان میں نہیں بولوں گی۔'' ماں نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نارمل ہو گیا اب وہ گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چل دیا۔

اب جمال روزانہ چالیس کلومیٹر کا سفر کر کے آفس جاتا اور واپس اپنی ماں والے گھر میں چلا جاتا۔ اس کا کمرا اس کی جائے پناہ بن گیا تھا۔ ماورا اور رشید کو وہ تمام داستان سنا چکا تھا۔ دونوں نے اس کو یہی کہا کہ جو بھی فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے ماں کو باقاعدہ لڑکی دیکھنے کا کہہ دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ بے شک کوئی بیوہ ہو مگر بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہونی چاہیے، بس زیادہ سے زیادہ گریجویٹ ہو اور اس کی ماں نے بھی اس کی دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ البتہ حنا کو طلاق دینے کی مخالفت کی تھی مگر جمال دوسری شادی کے ساتھ ساتھ طلاق پر بھی غور کر رہا تھا۔

☆☆☆

آج جمال کو حنا سے جدا ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ اس ایک ماہ کے دوران حنا نے ایک بار اس کو فون کیا تھا مگر نمبر بند مل رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے پورشن میں بیٹھی نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی کہ اس کی ماں اندر داخل ہوئی۔

''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے؟'' حنا کی ماں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''جمال کے لیے پریشان ہو تو بے فکر رہو، آ جائے گا۔ تمہارے بنا وہ نہیں رہ سکتا۔''

''امی! ان کا نمبر بند مل رہا ہے۔ لگتا ہے انہوں نے نمبر تبدیل کر لیا ہے۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا ہوگا؟'' وہ فکرمند لہجے میں بولی۔

''ہوگی کوئی وجہ۔ ہو سکتا ہے نیٹ ورک خراب ہو۔ حنا! وہ تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چند دن اور صبر کر۔ اگر اسی طرح تو نے بے صبری دکھائی تو وہ اپنی من مانیاں شروع کر دے گا۔ مکان تو اس نے کرائے پر دے دیا ہے پھر لے جائے گا وہ تجھ کو شہر سے دور اپنی اماں کے گھر میں۔ مرد کو قابو کرنا بہت آسان کام ہے لیکن یہ بے قابو ہو جائے تو پھر عورت کی ایک نہیں چلتی۔''

حنا خاموش رہی۔ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''تیرے بھائی کے سسرال والے شادی پر اصرار کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم نے حج پر جانا ہے جب تک بیٹی کا فرض نہیں نبھائیں گے حج پر نہیں جائیں گے۔ آج وہاں جانا ہے، شادی کی تاریخ طے کرنی ہے۔ تو بھی اچھے سے کپڑے پہن لینا اور اپنا حلیہ بھی ٹھیک کر...... میں ذرا کچن تک جاتی ہوں، سالن جل نہ جائے۔'' یہ کہہ کر ماں کمرے سے نکل گئی۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ گھنٹے دنوں میں اور دن مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ جمال کو گئے ہوئے تین ماہ گزر گئے تھے۔ اس کا کوئی میسیج یا کوئی فون نہیں آیا تھا جبکہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ جمال چند دن سے زیادہ اس کے بغیر رہ پایا ہو۔ حنا کی بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔ انجانے خدشات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ ایک دن وہ اپنی ماں کو بتائے بغیر جمال کے آفس چلی گئی۔ ریسیپشن پر آکر اس نے استقبالیہ کلرک کو بتایا کہ وہ جمال سے ملنا چاہتی ہے۔

''کیا کام ہے جی آپ کو ان سے؟'' کلرک نے روایتی سوال کیا۔

''میں ان کی مسز ہوں۔'' حنا نے جواب دیا۔

کلرک نے فون پر جمال کو آگاہ کیا پھر جمال کی بات سن کر وہ حنا سے مخاطب ہوا۔

''جی وہ بزی ہیں، آپ سے نہیں مل سکتے۔''

''کیا مطلب؟'' حنا غرائی۔ ''میں ان کی بیوی ہوں، ملاقاتی نہیں ہوں۔ مجھے ان کا کمرا دکھائیے۔'' کلرک نے حنا کو سمجھانے کی کوشش کی۔ جب وہ باز نہ آئی تو کلرک نے پھر جمال کو فون کیا۔ جمال نے آنے کی اجازت دے دی۔

''جائیے جی، وہ سامنے والا کمرا ان کا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اگلے ملاقاتی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حنا اپنی جگہ سے اٹھی اور جمال کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ جمال نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں یہاں سے گزر رہی تھی سوچا تمہارا حال پوچھتی جاؤں۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی پھر سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ جمال دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ حنا کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے پہلو بدلنا شروع کر دیا۔ جمال کی طرف سے اس کو اتنی اجنبیت کی توقع نہیں تھی۔ پھر وہ اپنے لہجے کے کھوکھلے پن سمیت دوبارہ بولی۔

''آپ نے نہ کوئی میسیج کیا نہ فون۔ گھر میں چھوٹی موٹی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ وہ میں...... دراصل...... آپ خاموش کیوں ہیں؟''

جمال نے انٹرکام پر اپنے ایک ماتحت کو بلایا۔ اگلے ہی لمحے وہ جمال کے آفس میں تھا۔

''بیٹھیے!'' جمال نے اس کو اشارہ کرتے ہوئے کہا اور آفس سپرنٹنڈنٹ سلیم شکریہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ جمال ایک فائل الٹنے پلٹنے لگا پھر فائل بند کر کے سلیم سے مخاطب ہوا۔

''یہ فائل میں نے دیکھ لی ہے۔ اس میں کچھ ضروری کاغذات نہیں ہیں۔ ان کے بغیر تو یہ پروجیکٹ مکمل نہیں ہو سکتا۔ آپ فوراً صدیقی صاحب کو آگاہ کیجیے اور بتائیے کہ کون کون سے کاغذات مزید لگنے ہیں اور جتنی جلدی ممکن ہو یہ فائل مکمل کر کے میرے حوالے کیجیے۔ چائے کا موڈ ہے تو بیٹھیے ورنہ آپ کو اجازت ہے۔'' جمال نے مسکرا کر سلیم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ سر! میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ سلیم واپس چلا گیا۔

جمال اب حنا سے مخاطب ہوا۔

''تو حنا صاحبہ! آپ یہاں سے گزر رہی تھیں اور آپ نے سوچا کہ پتا کرتی جاؤں کہ جمال زندہ ہے یا مر گیا ہے۔'' جمال تلخی سے مسکرایا۔

''خدا نہ کرے، ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں آپ؟'' حنا نے جواب دیا۔

''کیا امی سے کوئی نیا ٹوٹکا پوچھ کر پھر سے مجھے ذہنی ٹینشن دینے آئی ہیں آپ؟'' وہ طنز کرتے ہوئے بولا۔

''بس جانے دیجیے، آج آفس کے بعد سیدھا گھر آجائیے۔ مجھے آپ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔'' حنا ہارے ہوئے جواری کی طرح بولی۔

''اوہو تو آپ کو بھی میری کمی محسوس ہوئی اور آپ مجھے دوبارہ اسی جہنم زدہ زندگی میں لے جانے کے لیے آگئی ہیں۔'' جمال نے طنز کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے، مجھے واقعی آپ کی کمی محسوس ہوتی ہے۔'' حنا نظریں جھکا کر بولی۔

جمال کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت پیدا ہوئی اور وہ بولا۔

''حنا صاحبہ! آپ کی انا ابھی تک باقی ہے۔ میری کشش تمہیں یہاں کھینچ لائی مگر مجھے کہتی ہو کہ یہاں سے گزر رہی تھی، سوچا تمہیں دیکھتی جاؤں اور پھر تم مجھے واپس اپنی ماں کے گھر لے جانا چاہتی ہو۔ حنا! اگر تم اپنے ماضی پر پشیمان ہو گئیں اور اپنی انا پرست طبیعت کو کچل چکی ہوتیں تو میرا لہجہ یہ نہ ہوتا جواب ہے۔ تم وہی حنا ہو، تم مجھے اپنی انا پرست اور بے پروا طبیعت کی وجہ سے ہمیشہ ذہنی ٹارچر کرتی رہی ہو۔ تم ذرا بھی نہیں بدلی ہو۔ ہاں تنہائی سے اکتا کر وہی چوہے بلی والا کھیل کھیلنے کے لیے پھر سے تازہ دم ہو کر آئی ہو۔ حنا، اب ہم دونوں کبھی ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتے۔ تم سارے شہر کو میری منتیں کرانے کے لیے لے آؤ تب بھی میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اب تم جا سکتی ہو کیونکہ یہ میرا گھر نہیں ہے، آفس ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کام میں مصروف ہو گیا۔

حنا اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کا انداز ایسا تھا

جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو مگر کچھ کہے بنا واپس لوٹ گئی۔ پھر دروازے پر رک کر پلٹ کر جمال کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اپنے آنسو اس نے ہتھیلی سے صاف کیے پھر اس سے مخاطب ہوئی۔

''جمال! تم مجھے کتنا ہی برا بھلا کہو۔ میں ذرا بھی مائنڈ نہیں کروں گی اور ایک بات تمہیں آج بتائے دیتی ہوں جس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے بھیک مانگنے والے انداز میں جمال کو دیکھا اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ جمال اس کے اعتراف محبت سے رتی بھر بھی متاثر نہ ہوا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ چھٹی ہوتے ہی وہ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ تمام راستے حنا سے ہونے والی آج کی ملاقات اور اس کے انوکھے روپ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنی بیوی کے منہ سے اپنے لیے اعتراف محبت کے الفاظ سنے تھے لیکن اس نے یقین نہ کیا۔ وہ اس بات کو حنا کا نیا طریقہ واردات جان کر فراموش کر دینا چاہتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ اب وہ کسی بھی صورت میں حنا کے پاس واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی تین سالہ ازدواجی رفاقت میں جمال نے حنا کو ایک اچھی بیوی بنانے کے لیے تمام حربے استعمال کیے تھے۔ اب وہ مزید کوئی حربہ استعمال کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

گھر جاتے ہی وہ صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اپنی بیوی سے کئی ماہ کی دوری کی وجہ سے وہ گھر کی روز روز کی ٹینشن سے تو ضرور بچ گیا تھا مگر اندر کی تنہائی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ بھائی اور بھابی کو خوش گپیاں کرتے ہوئے دیکھتا تو اس کے دل میں ایک خلش سی محسوس ہوتی۔ کبھی کبھی حنا کی یاد بھی اس کو بے چین کر دیتی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر بعد ماں کو آواز دی۔ اس کی بھتیجی کمرے میں داخل ہوئی۔

''چاچو جی دادی اماں تو ساتھ والوں کے گھر گئی ہیں۔ وہ لوگ حج پر جا رہے ہیں نا تو ان سے ملنے گئی ہیں۔'' ثنا نے ایک ہی سانس میں بتاتے ہوئے کہا۔

''ایک گلاس پانی پلاؤ بیٹا۔'' جمال بوٹ اتارنے کے بعد موزے اتارتے ہوئے بولا۔

ثنا جی اچھا کہتے ہوئے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی کا گلاس تھامے اندر داخل ہوئی۔

''تھینک یو بیٹا۔'' جمال نے گلاس پکڑتے ہوئے کہا اور پانی پینے لگا۔ پانی پی کر اس نے خالی گلاس ثنا کو تھمایا تو وہ واپس چلی گئی۔ وہ صوفے پر ہی لیٹ گیا۔ آج وہ خود کو بہت شکستہ سا محسوس کر رہا تھا۔ دل کی سچی خوشی اس سے کافی دور تھی۔ آفس میں تھوڑا بہت دل لگ جاتا تھا مگر چھٹی کے بعد وہ گویا ایک ان دیکھے قید خانے میں چلا جاتا تھا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے سوچوں میں گم تھا کہ ماں کی آواز نے اس کو چونکا دیا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' ماں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اماں طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے مگر آج کل دل پر ایک عجیب سا بوجھ ہے۔ دل کرتا ہے یہ شہر چھوڑ کر کسی جنگل میں نکل جاؤں یا کسی پہاڑ کے دامن میں ایک درخت کے نیچے چھوٹا سا خیمہ لگا کر..... زندگی گزار دوں۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میں تیرے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہوں۔ تو فکر نہ کر اچھی بیوی ملے گی تو تیرا دل لگ جائے گا۔ ابھی میں ساتھ والوں کے گھر سے آ رہی ہوں۔ میاں بیوی حج پر جا رہے ہیں نا۔ کافی مہمان آئے ہوئے تھے۔ وہاں پہ ایک لڑکی دیکھی ہے۔ غریب لوگ ہیں اس کی ماں کہہ رہی تھی کہ میری پانچ بیٹیاں ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں تیرا ذکر کر دیا تو انہوں نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔'' اس کی ماں تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے اماں۔ آپ ماں ہیں، میرے لیے جو بھی کریں گی اچھا ہی کریں گی۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''کہاں جا رہے ہو، ابھی تو آفس سے آئے ہو؟'' ماں نے پوچھا۔

''میں کچھ دنوں کے لیے شہر سے دور جانا چاہتا ہوں۔ آٹھ دس دنوں کی چھٹی چاہیے اس کے لیے میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوانا ہے۔''

''اب کہاں جاؤ گے؟ گھر سے زیادہ سکون اور کہاں ملے گا تمہیں؟'' ماں نے پوچھا۔

''گھر......'' اس نے زہریلی مسکراہٹ سے زیرلب کہا اور ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''اماں! گھر کے جہنم میں جتنا میں جلا ہوں، شاید آپ کو ابھی تک پتا بھی نہیں۔ میں بس ویسے ہی آؤٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔ ٹریفک کا شور، گاڑیوں کے ہارن، اوٹ پٹانگ قسم کی موسیقی، بیہودہ ٹی وی چینل...... کیا ہے شہر میں سوائے ان فضولیات کے۔ ویسے بھی چند دنوں کے لیے

جا رہا ہوں۔ آخر رہنا تو اسی شہر میں ہے۔ ایک ہفتے بعد آجاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام تک اس نے ضروری کاغذات بنوائے اور ایڈمنسٹریشن آفیسر کے گھر دے دیے۔ ایڈمنسٹریشن آفیسر اس کا دوست بھی تھا اور باس بھی۔ اس نے اس کی ایک ہفتے کی چھٹی منظور کرلی۔ گھر آکر اس نے شولڈر بیگ میں کپڑے اور ضروری سامان رکھنا شروع کردیا۔

''کہاں کی تیاری ہے؟'' اس کا بڑا بھائی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''بھائی جان! ہوسکتا ہے رشید کے پاس چلا جاؤں یا پھر دو تین مزارات پر حاضری دوں۔ کچھ روحانی سکون کی تلاش میں جا رہا ہوں۔'' جمال اپنی دو تین کتابیں بیگ میں ٹھونستے ہوئے بولا۔

''ہاں، اچھی بات ہے۔ ہمارے لیے بھی دعا کرنا۔ ویسے بھی میں دیکھ رہا ہوں کہ تم جب سے یہاں آئے ہو، کافی کھوئے کھوئے سے اور بے چین سے رہتے ہو۔ تم بے فکر ہوکر جاؤ، جیسے ہی واپس آؤ گے ہم تمہاری شادی کردیں گے۔ اپنا خیال رکھنا۔ آج ہی جا رہے ہو کیا؟'' بھائی نے سوال کیا۔

''جی رات دس بجے والی ٹرین سے جا رہا ہوں۔ رشید کو فون کیا تھا وہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں کراچی گیا ہوا ہے۔ میرا ارادہ ملتان جانے کا ہے۔ وہاں پر اولیائے کرام کے بہت سے مزارات ہیں۔ دو دن وہاں رہوں گا پھر وہاں سے بہاولپور جاؤں گا۔ وہاں کے ایک گاؤں میں بہت پہنچے ہوئے بزرگ کا مزار ہے۔ سنا ہے وہاں پر مانگی جانے والی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ ایک دو دن وہاں رہ کر رشید کے پاس جاؤں گا۔ اس نے پچھلی بار مجھے پرندوں کے شکار کی لذت سے اس طرح آشنا کیا کہ دل کرتا ہے وہیں جنگل میں ڈیرا ڈال دیا جائے۔ رشید چار دن بعد کراچی سے واپس آجائے گا۔ آپ نے سنا نہیں سفر وسیلۂ ظفر۔'' جمال ہنستے ہوئے بولا۔

''ہاں ٹھیک کہا تم نے۔ تم کہو تو تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ آتا ہوں۔'' بھائی نے پیشکش کی۔

''ارے نہیں بھائی جان...... ٹیکسی کس لیے ہے۔ آپ آرام کریں۔'' پھر وہ ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

''چلتا ہوں اماں۔''

''کھانا تو کھالیتے۔'' ماں نے کہا۔

''بھوک نہیں ہے۔'' پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور ماں کے گلے میں دونوں بازو ڈالتے ہوئے بولا۔

''اماں! میں ایک گھر توڑ کر نیا گھر بسانے کا فیصلہ کرچکا ہوں۔ مجھے اس جیت سے نفرت ہے جس میں کسی کی شکست شامل ہو۔ حنا کو طلاق دینا میرے لیے بہت مشکل فیصلہ ہوگا۔ اس سے علیحدگی بھی ضروری ہے۔ میں اللہ سے وہ طاقت مانگنے جا رہا ہوں جو مجھے طلاق جیسے مشکل کام کی ہمت دے۔ آپ اس لڑکی کے بارے میں ضرور بات کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں جیسے ہی واپس آؤں، یہ دونوں کام ہوجائیں اور زندگی کا ایک نیا سفر شروع کرسکوں۔''

''جاؤ بیٹا! اللہ تمہارا مددگار ہو اور ہر قدم پر تمہیں سکون کی چھاؤں ملے۔'' ماں دعا دیتے ہوئے بولی۔

''آپ کی یہی دعائیں مجھے ڈوبنے نہیں دیتیں۔ چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر اس نے ٹیکسی کی اور ریلوے اسٹیشن آگیا۔ اس کی مطلوبہ ٹرین اپنے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ وہ اپنی ریزروشدہ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ٹرین نے چلنا شروع کردیا۔ گاڑی جا رہی تھی۔ سردی آرہی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اس کو نیند آگئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو ریل گاڑی اس وقت ملتان کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ رات کی سیاہی ایک پاکیزہ سی سحر میں تبدیل ہوچکی تھی۔ گاڑی اب مضافات سے نکل کر شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ اولیائے کرام کا شہر اس کے سامنے تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ملتان کے خوب صورت اور پُررونق ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوکر آہستہ آہستہ ہوتی بالآخر رک گئی۔

گاڑی کے رکتے ہی وہ دیگر مسافروں کے ہمراہ پلیٹ فارم پر اترا اور ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔ باہر جاکر ایک مناسب سے ریسٹورنٹ میں جاکر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور ناشتے کے لیے بیٹھ گیا۔

ناشتا کرنے کے بعد اس نے ویٹر سے اخبار منگوایا اور وہیں پر پڑھنا شروع کردیا۔ اخبار پڑھ کر اس نے ٹیبل پر رکھا اور باہر دیکھا سورج نکلے کافی دیر ہوچکی تھی۔ اس نے بل ادا کیا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔ اب اس کی منزل حضرت شاہ رکن عالمؒ کا مزار تھا۔ اس نے رکشے والے کو آواز دی اور مطلوبہ جگہ جانے کو کہا۔ رکشے والے نے اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو جمال بیٹھ گیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ وسیع و عریض مزار کے احاطے میں تھا۔ یہاں پر کافی رونق تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مزار کے قریب گیا۔ دعا مانگی اور وہیں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے سر اٹھایا۔ آس پاس کا

جائزہ لیا اور مزار پر ایک نظر ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔

جمال نے وہ سارا دن اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے اور نوافل پڑھتے ہوئے گزار دیا مگر اس کے دل کی بے کلی کم نہ ہوئی۔ ایک عجیب سی بے چینی جو اس کے شہر سے اس کے ساتھ ہی روانہ ہوئی تھی۔ اس بے کلی کا وجود ابھی تک باقی تھا۔ شام کا سورج غروب ہوتے ہی اس نے وہاں سے روانہ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ یونہی بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ رات کا کھانا کھاتے ہی ریلوے اسٹیشن کی راہ لی۔ وہاں جاکر پتا چلا کہ بہاولپور جانے والی ٹرین کچھ دیر پہلے روانہ ہوئی ہے۔ اگلی ٹرین رات کے دو بجے روانہ ہوگی۔ وہ ٹکٹ لے کر ویٹنگ روم میں چلا گیا۔ تھرڈ کلاس قسم کا ویٹنگ ہال تھا۔ بھانت بھانت کے لوگ وہاں موجود تھے۔ تمام نشستیں پُر تھیں۔ اکثر لوگ بیٹھنے والی نشستوں پر لمبی تان کر سو رہے تھے۔ جمال نے آس پاس کا جائزہ لیا اور ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ کافی دیر تک خلاؤں میں گھورتا رہا۔ پھر وہاں پر ہونے والے اضافی شور سے اس کی توجہ بدلی تو اس کی نظر ایک فیملی پر پڑی جو چار افراد اور دو تین بچوں پر مشتمل تھی۔ وہ سب اس کے قریب ہی چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ اس فیملی کی سب سے نمایاں چیز ایک سیاہ فام موٹی سی عورت تھی جو مسلسل گلا پھاڑ پھاڑ کر چلائے جارہی تھی۔

"یہ تم کہاں لے آئے شہباز کے ابا۔ یہاں پر تو بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ اچھے بھلے اے سی والی گاڑی پر جارہے تھے مگر تمہاری بہو کو ٹرین سے جانے کا شوق جاگ اٹھا۔ اب مزے کرو، گاڑی بھی چار گھنٹے بعد آئے گی۔" یہ کہہ کر وہ دو زانو ہوکر بیٹھ گئی۔

"او کوئی بات نہیں فریدہ..... اگر ہماری بہو کو ریل گاڑی کا شوق ہے تو، تو زیادہ خود کو ہلکان مت کر۔" ایک سفید ریش نورانی صورت اور ادھیڑ عمر کے آدمی نے ملائمت سے جواب دیا۔

"میں کیوں خود کو ہلکان کروں گی۔ خود ہی بھگتے گی جب چار گھنٹے یہاں انتظار کرکے گزارے گی۔ دیکھنا اس کے دونوں بچے ہماری ناک میں دم کردیں گے۔ کیا مجال جو دو منٹ بھی آرام سے بیٹھیں۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی۔

اس کی بہو ان باتوں سے بے پروا آس پاس کا جائزہ لے رہی تھی۔ جمال بڑی محویت سے ان کا جائزہ لے رہا تھا جو کسی گاؤں کے کھاتے پیتے لوگ لگتے تھے۔ وہ سفید ریش بزرگ جمال کے قریب ہی آکر بیٹھ گیا۔

"چائے تو لے آؤ۔" وہ موٹی عورت اس بزرگ سے مخاطب ہوئی۔ اس کا لہجہ ہنوز زہر میں بجھا ہوا تھا۔

"ابھی لایا جی۔" وہ بزرگ اٹھتے ہوئے بولا پھر وہ جمال سے مخاطب ہوا۔

"آپ چائے پئیں گے جی؟"

"نہیں شکریہ۔" جمال مسکراتے ہوئے بولا۔

"کیا آپ چائے بالکل نہیں پیتے؟" بزرگ نے سوال کیا۔

"جو چائے میں پیتا ہوں وہ یہاں پر تو ہرگز نہیں ملے گی، رہنے دیں۔" جمال نے جواب دیا۔

وہ بزرگ وہاں سے روانہ ہوگیا۔

جب وہ پندرہ منٹ بعد واپس آیا تو ایک چھوٹی سی ٹرے میں چار کپ..... اٹھا رکھے تھے۔ دو کپ خواتین کو دے کر تیسرا کپ اس نے جمال کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"پی لیں جی۔ یہاں بڑی اچھی چائے ملتی ہے۔ جس کینٹین سے میں چائے لایا ہوں، اس کا باپ میرا بچپن کا دوست تھا۔ وہ تو مرگیا اب اس کا بیٹا یہ کینٹین سنبھالے ہوئے ہے۔ ماشاء اللہ چائے ویسی ہی بناتا ہے جیسی اس کا باپ بناتا تھا۔" بزرگ نے اُن کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

جمال نے کپ لے کر اپنے قریب رکھ دیا۔ "آپ نے تکلیف کی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"او نہیں بیٹا! اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ تیری شکل میرے بڑے بیٹے سرفراز سے ملتی جلتی ہے۔ سرفراز آج کل کینیڈا میں ہوتا ہے۔ وہاں پر ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟" بزرگ نے سوال کیا۔

"جی مجھے جمال کہتے ہیں..... جمال الدین۔"

"ماشاء اللہ بڑا پیارا نام ہے۔ میرا نام کریم داد ہے، میں بہاولپور کے ایک گاؤں میں رہتا ہوں۔ تھوڑی سی زمین اللہ نے دی ہوئی ہے۔ بیج ڈالتا ہوں، مالک بوریوں کے ڈھیر لگا دیتا ہے۔ بہت مہربان ہے میرا رب مجھ پر۔" وہ بزرگ آنکھوں میں تشکر کے جذبات لاتے ہوئے بولا۔

جمال نے پہلی بار اس سفید ریش بزرگ کو بغور دیکھا جس کی باتوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ پھر وہ بزرگ دوبارہ جمال سے مخاطب ہوا۔ "کہاں جارہے ہو؟"

"بہاولپور سے آگے ایک گاؤں ہے، وہاں کسی اللہ والے کا مزار ہے۔ سنا ہے وہاں جو بھی جاتا ہے، من کی مراد پاتا ہے۔" جمال چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا جو واقعی اس کو پسند آئی تھی۔

"کہاں سے آرہے ہو؟" دوبارہ سوال ہوا۔

"لاہور سے۔"

"معاف کرنا بیٹا، تم پڑھے لکھے اور شہری نوجوان ہو۔ جانتا ہوں شہری لوگ خاموشی کے عادی ہوتے ہیں بالخصوص کسی اجنبی سے اس طرح فری نہیں ہوتے۔ میں ذرا پینڈو ہوں اور ٹائم بھی پاس کرنا ہے اس لیے خفا نہ ہونا۔"

جمال نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "چاچا جی! مجھے آپ کی باتیں اچھی لگ رہی ہیں۔ میں کئی دنوں سے کسی سے بولنا چاہ رہا تھا۔ آپ نے میرا کام آسان کر دیا۔ ویسے گھبرائیں مت، میں پیدا تو شہر میں ہوا، تعلیم بھی وہاں حاصل کی، جاب بھی وہیں ہے مگر اندر سے میں بھی پینڈو ہی ہوں اور مجھے اپنے اندر کا پینڈو بہت پسند ہے۔"

کریم داد نے تجسس آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس موٹی عورت کی آواز پھر گونجی جو اپنے پوتوں سے مخاطب تھی۔

"ادئے اب آرام سے بیٹھتے ہو یا لگاؤں دو ہاتھ۔ شہباز کے ابا ان کو تو چپ کراؤ، میرا کان کھا گئے ہیں۔ ان کی ماں تو مزے سے سو رہی ہے۔" وہ کریم داد سے مخاطب ہوئی جو غالباً اس کا شوہر تھا۔

کریم داد نے ہلکی سی ڈانٹ سے ان کو چپ کرایا اور سونے کا اشارہ کیا۔ دونوں بچے دبک کے سو گئے۔

جمال نے بزرگ کا جائزہ لیا جو اپنی نوجوانی میں خاصا ہینڈسم رہا ہوگا۔ پھر اس کی کالی کلوٹی اور بے ہنگم بیوی کو دیکھا جو عمر، ڈیل ڈول اور صورت و شکل میں اس کی ہم پلہ تو کیا اس کا پاسنگ بھی نہیں تھی۔

دونوں چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ وہ موٹی عورت دو تین گھونٹ میں اپنی چائے ختم کر چکی تھی جبکہ اس کی بہو کی چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی کیونکہ وہ نیند کے مزے لے رہی تھی۔

"چائے کافی اچھی تھی۔ عام طور پر ریلوے اسٹیشن پر ایسی چائے نہیں ملتی۔" جمال نے دوبارہ بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، میں جانتا تھا اس لیے تمہارے لیے بھی لے آیا۔ ایک بات پوچھوں؟" بزرگ نے سوال کیا۔

"جی پوچھیے۔" جمال نے جواب دیا۔

"ایسی کونسی دعا مانگنے جا رہے ہو جو گھر میں مانگنے سے قبول نہیں ہو سکی؟"

"میں اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں لیکن خود میں حوصلہ نہیں پاتا۔ اللہ سے اسی حوصلے کے لیے دعا مانگنی ہے پھر ایک نئی زندگی کی شروعات بھی کرنی ہے اس کے لیے بھی دعا مانگنی ہے۔" جمال نے جواب دیا۔

"کیا تمہاری بیوی بدکار عورت ہے جو اس کو طلاق دینا چاہتے ہو؟" بزرگ نے سوال کیا۔

"نہیں، وہ مضبوط کردار کی مالک ہے۔" جمال بولا۔

"اچھا تو پھر وہ تمہارے مال کی دشمن ہوگی یعنی تمہاری کمائی کو فضول میں اڑاتی ہوگی اور ساتھ ساتھ تمہارے والدین سے برا سلوک بھی کرتی ہوگی۔" بزرگ نے کہا۔

"نہیں چاچا! ایسی بھی کوئی بات نہیں، دراصل وہ میری چھوٹی چھوٹی سی خواہشوں کا احترام بھی نہیں کرتی۔ بہت بے پروا اور انا پرست عورت ہے۔ میں دفتر سے آؤں تو اس کو پروا نہیں ہوتی۔ میں سر درد سے تڑپتا رہوں۔ اس کو کوئی فکر نہیں ہوتی۔ میرے گھر سے زیادہ اپنے باپ کے گھر رہتی ہے۔ بتائیں میں اس کو طلاق نہ دوں تو کیا کروں۔ میری کسی بات، کسی احتجاج کا اس پر کوئی اثر تک نہیں ہوتا۔" یہ کہہ کر جمال خاموش ہو گیا۔

کریم داد نے اس کی طرف دیکھا پھر ایک سوال کیا۔

"کیا وہ خود بھی تم سے طلاق کی خواہش مند ہے؟"

"نہیں۔ وہ طلاق نہیں چاہتی، نہ ہی اس نے کبھی مطالبہ کیا ہے۔" جمال نے جواب دیا۔

دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔

پھر اس خاموشی کو بزرگ نے توڑا۔ "دوبارہ چائے کا موڈ ہے تو وہیں کینٹین پر چلتے ہیں۔ کینٹین کیا ہے بس پلیٹ فارم پر چھوٹا سا کاؤنٹر ہے۔"

"چلیے۔"

اور وہ دونوں چائے پینے چل دیے۔ چائے پی کر واپس آئے تو کریم داد کی بیوی لمبی تان کر سو رہی تھی۔ اس کے خراٹے کافی بلند آواز میں گونج رہے تھے۔ اس لمحے جمال کو وہ پرانے اسٹیم ریلوے انجن کی طرح محسوس ہوئی۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ کریم داد جیسے خوبرو مرد نے ایک بدصورت اور زبان دراز عورت کے ساتھ زندگی کیسے بسر کر لی۔

"ٹائم کیا ہوا ہے؟" کریم داد نے جمال سے سوال کیا۔

جمال نے موبائل نکال کر ٹائم دیکھا۔ "گیارہ بجنے والے ہیں۔" کچھ دیر توقف کرنے کے بعد جمال نے پوچھا۔ "آپ کی کتنی زمین ہے؟"

''میری کہاں جی اللہ کی زمین ہے بس آج کل میرے حصے میں ہے۔ اس سے پہلے میرے باپ کے پاس تھی۔ باپ سے پہلے دادا کے پاس اور میرے بعد میرے بیٹے وہیں پر اپنی ملکیت جتائیں گے پھر اس کے بیٹے۔ اصل میں تو یہ زمین ہے کسی کی بھی نہیں۔ ہم بس یونہی ساری عمر ملکیت کے خواب دیکھتے دیکھتے صرف چھ فٹ کی زمین میں جا کر سو جاتے ہیں، کبھی نہ جاگنے کے لیے۔''

''مجھے گاؤں کی لائف بہت پسند ہے۔'' جمال بولا۔

''گاؤں میں ابھی فطرت کے مطابق زندگی گزاری جاسکتی ہے۔''

اس کی بات سن کر کریم داد نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا اور انتہائی خلوص و انکساری سے بولا۔

''تو پھر تم دو دن ہمارے مہمان بن کے رہو، تیسرے دن میں خود تمہیں اسی بزرگ کے مزار پر چھوڑ آؤں گا۔ تم سے مجھے اپنے بیٹے سرفراز کی خوشبو آتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ دو دن مزید تمہارے ساتھ گزریں۔''

''ٹھیک ہے جی! اگر اماں جی کو...... مطلب ہے کہ آپ کی بیوی کو اعتراض نہ ہو تو...... مجھے تو یہ بہت غصے والی لگتی ہیں۔ ورنہ تو دو دن آپ لوگوں کے ہمراہ بسر کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ مجھے خوشی ہوگی۔''

''غصے کی تیز ہے۔ دل اس کا شیشے کی طرح ہے۔'' کریم داد محبت بھری نظر اپنی بیوی پر ڈالتے ہوئے بولا۔

جمال نے آنکھیں بند کرلیں اور ستون سے ٹیک لگالی۔

رات کے دو بج کر بیس منٹ پر ٹرین پہنچ گئی۔ کریم داد جاگ رہا تھا۔ اس نے سب کو جگایا اور سب گاڑی کی طرف روانہ ہوگئے۔ گاڑی میں زیادہ رش نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد گاڑی چل پڑی۔ جمال آنکھیں موند کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر کریم داد اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔

''میں نے کہا سرفراز کی ماں سو گئی ہو کیا؟''

''جاگ رہی ہوں، کیوں شور مچا رہے ہو؟'' وہ نیم وا آنکھوں سے بولی۔

''ذرا اس منڈے کو دیکھ۔'' وہ سوئے ہوئے جمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ بالکل اپنے سرفراز جیسا ہے نا۔ وہی ناک نقشہ، بولتا بھی سرفراز کی طرح ہے۔ یہ بھی بہاولپور جا رہا ہے۔ گھر تو اس کا لاہور میں ہے۔ میں نے اس کو اپنے گھر میں دو تین دن رہنے کا کہا ہے۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''تمہیں تو بہت شوق ہے مہمان پالنے کا۔ اب کیا ضرورت تھی کسی غیر آدمی کو اپنے گھر دعوت دینے کی۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''مجھے تو ذرا بھی غیر نہیں لگا۔ اپنا اپنا سا لگا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑکی کے پار دیکھنے لگا جہاں پر آس پاس کی عمارتوں کی روشنیاں پیچھے کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ دو گھنٹے بعد وہ بہاولپور پہنچ گئے۔

☆☆☆

کریم داد کا گھر بہت خوب صورت تھا۔

یہاں اس کو سب نے یوں خوش آمدید کیا جیسے وہ اسی گھر کا فرد ہو۔ کریم داد نے اس کو اپنے ہی کمرے میں جگہ دے دی۔ جب وہ نیند سے جاگا تو اسے کریم داد جائے نماز پر نظر آیا جو اشراق کی نماز پڑھ رہا تھا۔ جمال اس کو بغور دیکھنے لگا۔ کریم داد بہت خشوع و خضوع سے نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ کافی دیر تک دعا مانگنے کے بعد وہ جمال کی طرف متوجہ ہوا۔

''جمال بیٹا نہا لو پھر ناشتا کرتے ہیں۔'' جمال اٹھ کر باتھ روم چلا گیا نہانے کے بعد ناشتا کیا اور سگریٹ سلگا کر اس کا دھواں فضا میں چھوڑنے لگا۔

''کافی بڑا گھر ہے۔'' جمال نے کریم داد کی طرف دیکھا۔

''ہاں چار کنال رقبے پر بنا ہوا ہے۔ میرا چھوٹا بیٹا شہباز تو کہتا ہے کہ شہر میں رہتے ہیں مگر جو مزہ دیہات میں ہے وہ شہر میں کہاں۔ ویسے بھی ہمارے آباؤ اجداد کی قبریں یہاں پر ہیں۔ میرا اپنا بچپن اسی حویلی میں گزرا ہے۔ میں نے تو کہہ دیا ہے کہ شادیاں کرلو پھر جہاں دل چاہے رہو۔''

''کتنے بیٹے ہیں آپ کے؟'' جمال نے سوال کیا۔

''تین بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔ دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ بڑا بیٹا سرفراز ہے جو کینیڈا میں رہتا ہے۔ وہاں پر ڈاکٹر ہے۔ اس سے چھوٹا جہانگیر ہے، اس نے پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے۔ بہاولپور کے ایک کالج میں لیکچرار ہے۔ اس کی چھٹیاں تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ گزرتی ہیں۔ تم اس کو دیکھو گے تو وہ تمہیں بالکل قرون وسطیٰ کے مسلمانوں جیسا لگے گا۔ سادہ لباس، سادہ غذا...... آج کل وہ اپنے کسی ضروری کام کے سلسلے میں کراچی گیا ہوا ہے۔ سب سے چھوٹا شہباز ہے، میرے ساتھ ہی زمینداری کرتا ہے۔ بہت لائق بچے ہیں میرے۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔

''آپ مجھے خود بھی کافی تعلیم یافتہ لگتے ہیں۔'' جمال نے سوال کیا۔

''میں نے ہسٹری میں ماسٹرز ڈگری لی ہوئی ہے۔ بس

جمال بیٹا! تعلیم ڈگریوں میں تو ہے نہیں، تعلیم کا تعلق تو اپنے اندر کی روشنی سے ہے۔ اندر روشنی ہے تو سمجھو تمہارے ذہن و دل پڑھے لکھے ہیں۔ من میں اندھیرا ہے تو بڑی بڑی ڈگریاں بیکار ہیں۔ آؤ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔''

جمال اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ سادہ انداز میں بنا ہوا یہ گھر اپنے مکینوں کی تعداد کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ صحن بہت کشادہ تھا۔ ایک سائیڈ پر لمبا سا برآمدہ تھا جہاں پر چھ سات بھینسیں اور گائیں کھڑی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے دو تین نوکر بھی موجود تھے۔ ایک چھپر کے نیچے ٹریکٹر اور تھریشر مشین موجود تھی۔ صحن میں ہر طرف بلند و بالا درخت لگے ہوئے تھے۔

''آپ نے درخت بہت زیادہ لگا رکھے ہیں۔'' جمال نے سوال کیا۔

''ہاں جمال بیٹا! میں نے واقعی بہت زیادہ درخت لگائے ہیں۔ میری زمینوں پر بھی تمہیں بے تحاشا درخت نظر آئیں گے۔'' کریم داد ایک جگہ پر رکتے ہوئے بولا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ درخت بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ سورج کی تپش کو اپنے اوپر لے کر زمین کو کیسی ٹھنڈی چھاؤں فراہم کرتے ہیں، کیا مجال جو جون کی دوپہر میں بھی ان کے سائے کی ٹھنڈک کم ہوتی ہو۔ گرمی کے مارے ہوئے پرندے ان کی شاخوں پر جب سستانے کے لیے بیٹھتے ہیں تو ان کی چھوٹی شاخیں کس طرح خوشی سے جھومنے لگتی ہیں۔ ان کی چھاؤں سب کے لیے ایک جیسی ہوتی ہے۔ جتنا ظرف درخت میں ہوتا ہے اگر اتنا ظرف کسی انسان میں آجائے تو اس کی زندگی سنور جائے مگر انسان بڑا کم ظرف ہوتا ہے۔ ذرا سی تکلیف سے بلبلا اٹھتا ہے۔ ذرا سی خوشی ملنے پر اپنے آپ میں نہیں رہتا۔'' پھر کریم داد خاموش ہو گیا۔

چلتے چلتے وہ ایک بھینس کے قریب آیا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سہلانے لگا۔ پھر وہ باری باری سب بھینسوں اور گایوں کے قریب گیا اور سب کا حال دریافت کیا۔

''کیا یہ آپ کی زبان سمجھ لیتی ہیں؟'' جمال نے سوال کیا۔

''جمال بیٹا پیار کی زبان تو پتھر بھی سمجھتے ہیں یہ تو پھر جانور ہے۔ پیار کی ضرورت ہر جاندار کو ہر وقت ہوتی ہے۔ پیار کیا ہے؟ بس دو میٹھے بول، ذرا مسکرا کر دیکھنا کوئی خرچہ نہیں آتا اس میں مگر ہم انسان مسکراہٹ اور دو میٹھے بولوں کا صدقہ بھی نہیں دیتے۔''

''ایک بات پوچھوں؟'' جمال نے سوال کیا۔

''ہاں بیٹا پوچھو۔'' کریم داد نے جواب دیا۔

''کیا آپ اپنی بیوی سے خوش ہیں؟ میرا مطلب ہے وہ پڑھی لکھی بھی نہیں لگتیں۔ ظاہری شخصیت بھی ایسی نہیں کہ کسی مرد کو متاثر کر سکے۔ کیا آپ کی شادی زبردستی ہوئی تھی؟''

جمال کی اس بات پر کریم داد نے قہقہہ لگایا۔

''او بیٹا! شادی کا فیصلہ آسمانوں پر ہوتا ہے۔ جوڑے تو میرا پروردگار بناتا ہے۔ اس نے بھی میرا جوڑا اس کے ساتھ بنایا پھر میں اس کے فیصلے پر رونے پیٹنے والا اور اس کو مسترد کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ اسی کا نام تسلیم و رضا ہے کہ اپنے رب کے ہر فیصلے کو من و عن تسلیم کر لیا جائے۔ میرے دل نے بھی اس کو مسترد کر دیا تھا لیکن اپنے سلوک اور اپنے الفاظ سے کبھی میں نے یہ احساس نہیں دلایا کہ تو مجھے پسند نہیں ہے۔ بس گزار دی زندگی۔'' پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنے ایک نوکر کو آواز دی۔

''جی صاحب جی۔'' نوکر قریب آ کر بولا۔

''شہباز کہاں ہے؟'' کریم داد نے سوال کیا۔

''وہ تو اپنے ایک دوست کے ساتھ بہاولنگر گئے ہیں، کہہ رہے تھے شام تک واپس آجاؤں گا۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ اب تو جا۔'' نوکر واپس چلا گیا۔

''بڑا عجیب موسم ہے۔ دھوپ میں گرمی لگتی ہے اور چھاؤں میں سردی۔ تو تھک تو نہیں گیا میری تقریروں سے؟'' کریم داد جمال کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ارے نہیں چاچا! میں کیوں تھکنے لگا۔ میں کوئی ہل تو نہیں چلا رہا۔''

کریم داد کھلکھلا کر ہنس دیا پھر جمال سے مخاطب ہوا۔ ''ایک بات کروں، اگر تو مان جائے تو؟''

''ماننے والی ہوگی تو ضرور مانوں گا، بولیں کیا بات ہے؟'' جمال نے جواب دیا۔

''بیٹھ!'' وہ ایک چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا جو کیکر کے درخت کے نیچے بچھی ہوئی تھی۔ جمال بیٹھ گیا۔

''اس موسم میں کیکر کے نیچے بیٹھا جا سکتا ہے۔ یہ بڑا مفلس اور غریب درخت ہے۔ اس کی شاخوں کا رنگ بھی کالا ہوتا ہے، اس پر پھل بھی نہیں آتا، اس کا سایہ بھی گھنا نہیں ہوتا۔ پرندوں کو بھی اس سے زیادہ لگاؤ نہیں ہوتا۔ کڑوی پھلیاں اور کانٹے اس کا مقدر ہیں۔'' پھر اس نے

طویل سانس لی اور جمال کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"جمال بیٹا! تو ایک کام کر۔ تو اپنی بیوی کو ایک موقع اور دے۔ میرا خیال ہے اس کو کافی سزا مل چکی ہے۔ اس میں کوئی ایسا بڑا عیب نہیں ہے۔ تو بس اس کے لیے پھل دار اور گھنا درخت بن جا۔ پھر دیکھ تیرے آنگن میں اللہ تعالیٰ کیسی کیسی نعمتیں اتارتا ہے۔ ضروری نہیں کہ نعمت صرف پیسے اور جائداد کی شکل میں ہو۔ دل اور دماغ کا سچا اطمینان سب سے بڑی نعمت ہے۔ میں نے ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی کے پینتیس سال گزار دیے جو بیوی تو کیا نوکرانی بننے کے لائق بھی نہیں تھی۔ دیکھ میرے آنگن میں کیسی کیسی بہاریں اتری ہیں۔ ایسے ایسے کرم میرے رب نے کیے ہیں جو بتانے بیٹھوں تو شام ہو جائے۔ تو تو مجھے غیر مطمئن اور بے سکون لگتا ہے۔ میرے خیال میں اس نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا کہ اس کو طلاق دے دی جائے۔ تیری یہ بے اطمینانی بتاتی ہے کہ اس کو طلاق دینے کے لیے تیرا دل آمادہ نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہ انا پرست ہوگی مگر تیری یہ خودداری بھی تو انا میں لپٹی ہوئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کو چھوڑ کر تو ہمیشہ ناخوش رہے گا، چاہے ایک کیا چار بیویاں کیوں نہ لے آئے۔"

جمال نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"چاچا! تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں اس کو چھوڑ کر خوش نہیں رہوں گا؟"

"ہاہاہا۔" کریم داد ہنسا۔ "بات یہ ہے کہ جس تعلق کو توڑنے کے لیے تو اللہ سے ہمت مانگنے اتنا لمبا سفر کر کے یہاں تک آیا ہے اس کا مطلب ہے کہ تیرا ضمیر ابھی جاگ رہا ہے اور صاحب ضمیر انسان اتنی سی بات پر گھر توڑنے کا فیصلہ کر لے اور اس پر عمل بھی کر لے تو ساری عمر اس کا ضمیر اس کو لعن طعن کرتا رہے گا۔ دراصل تو بھی دل میں یہ بات جانتا ہے کہ اس کی اتنی بڑی خطا نہیں جتنی اس کے لیے سزا تجویز کی گئی ہے۔ جمال بیٹا! طلاق کی اجازت ضرور دی ہے میرے رب نے مگر اس کا حکم نہیں دیا۔ طلاق وہ مکروہ فعل ہے جس سے عرش کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے باوجود عدالتیں طلاقوں کے کیسوں سے بھری پڑی ہیں۔ معمولی باتوں پر بیوی خلع کے لیے عدالت پہنچ جاتی ہے اور گھر میں شوہر اپنا یہ اختیار استعمال کر کے اتنے قیمتی رشتے کو دھاگے کی طرح توڑ دیتا ہے۔ طلاق کے خواہش مند لوگ اگر اپنے معصوم بچوں کے جذبات سمجھ لیں تو کبھی طلاق کا سوچیں بھی نہیں۔"

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا، آس پاس کا جائزہ لیا اور پھر بات شروع کر دی۔

"جمال بیٹا! آج میرے اس آنگن میں تجھے اللہ کی رحمتیں دکھائی دے رہی ہوں گی۔ میری دونوں بیٹیاں اپنے گھروں میں خوشحال زندگی بسر کر رہی ہیں۔ تینوں بیٹے خوشحال ہیں اور میرے فرماں بردار بھی۔ اگر میں بیوی کو طلاق دے چکا ہوتا تو یہ سارے بچے آج نفسیاتی مریض ہوتے۔ میرے گھر میں میری پسند کی بیوی بھی آجاتی مگر میرے دل کو وہ راحت و سکون نہ ملتا جو آج میسر ہے۔ میں صرف اللہ کی رضا کی خاطر اپنے دل کی خواہش کو رد کر کے بس اس گھنے درخت کے مانند اس آنگن میں چھاؤں بچھائے بیٹھا ہوں۔"

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ جمال نے بھی کوئی بات نہیں کی۔

"آؤ چلتے ہیں بیٹا۔ میری تقریریں تو ختم ہوں گی نہیں۔" کریم داد اٹھتے ہوئے بولا۔

اور جمال اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے میں آکر جمال بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ چاچا کریم داد نے آج اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا تھا وہ سوچوں میں گم نہ جانے کتنی دیر تک جاگتا رہا پھر اس کو نیند آگئی۔

اس کی آنکھ کسی کی پکار پر کھلی تھی۔ اس کے سامنے نوکر ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔ جمال اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ دھونے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ جب باہر نکلا تو نوکر جا چکا تھا اور کھانے کی ٹرے بیڈ پر رکھی تھی۔ دیسی گھی کی اشتہا انگیز خوشبو آرہی تھی۔ جمال کی بھوک چمک اٹھی۔

شام سے ذرا پہلے کریم داد اسے اپنی جیپ میں بٹھا کر اپنی زمینوں پر لے گیا۔ کہیں پر گندم کی فصل تھی تو کہیں پر کوئی اور فصل سر اٹھائے کھڑی تھی۔ ہر طرف لہلہاتے کھیت تھے۔ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے وہ واپس لوٹ آئے۔ رات کو بھی کافی دیر تک دونوں گپ شپ لگاتے رہے۔ اس دوران کریم داد نے اس کی نجی زندگی پر کوئی بات نہیں کی، بس اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتا رہا۔

پھر جمال نے ایک سوال کر دیا۔

"چاچا! آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی۔ اس میں بھی تو کوئی حرج نہیں تھا۔"

"حرج تو تھا۔" کریم داد بولا۔ "طلاق کی طرح اس کی بھی اجازت ہے، حکم نہیں ہے اور دوسری بات یہ کہ دوسری شادی انسان خود اپنی خواہش سے نہیں کر سکتا۔ یہ تو لازم ہو جاتی ہے۔ ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ آپ کو

دوسری شادی کرنی پڑ جاتی ہے۔ میرے دل میں بھی خواہش تھی کہ دوسری شادی کرلوں مگر اللہ... کو جب منظور ہی نہیں تھا تو میں کیسے کرتا۔''

''آپ کی باتیں بہت عجیب ہیں۔'' جمال بولا۔

''میں نے اپنی پیسٹھ سالہ زندگی میں جو دیکھا، جو محسوس کیا۔ وہ سب تجھے بیان کردیا۔ اچھا اب تو آرام کر، وہ سامنے ٹی وی رکھا ہے۔ ریموٹ بھی اس کے قریب ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بلاجھجک فون کردینا۔ صبح کی نماز کے لیے تجھے جگانے آجاؤں نا؟'' کریم داد نے سوال کیا۔

جمال نے مسکرا کر اثبات میں سرہلا دیا۔ کریم داد بھی سلام کرکے رخصت ہوگیا۔

بستر پر ڈھیر ہوتے ہی اس کے ذہن کی اسکرین پر حنا نمودار ہوگئی۔ اس نے حنا کی یاد کو ہٹانا چاہا مگر وہ اور بھی شدت کے ساتھ براجمان ہوگئی۔ جمال نے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کردیا۔ مختلف چینل گھماتے گھماتے اس نے اسپورٹس چینل پر نظریں جمادیں۔ فٹ بال کا میچ لگا ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر میچ دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے رات کے کس پہر اسے نیند آگئی۔

صبح کی اذان کے ساتھ ہی وہ خود ہی بیدار ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے کریم داد کھڑا تھا۔

''مسجد چلو گے یا یہیں نماز پڑھو گے؟'' کریم داد نے مشفقانہ انداز میں سوال کیا۔

''آپ اگر مسجد جارہے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔'' جمال نے جواب دیا۔ یہ کہہ کر دونوں گھر سے نکل کر مسجد کی طرف روانہ ہوگئے۔ باہر ہلکی ہلکی سردی تھی، درختوں پر پرندوں کی چہچہاہٹ ماحول کو پاکیزہ بنا رہی تھی۔ ہوا کی تھپکیوں سے درختوں کے پتے یوں سرسرا رہے تھے جیسے خوشی سے جھوم رہے ہوں۔ مسجد بہت سادہ سی تھی۔ نمازیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔ دونوں نے نماز ادا کی۔ نماز پڑھنے کے بعد دو تین لوگوں نے کریم داد سے ہاتھ ملایا، حال احوال پوچھا پھر ایک سفید ریش جو کہ کریم داد سے زیادہ عمر کا تھا، کریم داد سے مخاطب ہوا۔

''بھائی کرمو آج پنچایت بلوائی ہے ہم لوگوں نے۔ اس میں تمہاری شرکت بہت ضروری ہے۔ آخری فیصلہ ہم تم پہ چھوڑیں گے۔''

''پنچایت کس لیے بلوائی ہے خیر تو ہے نا؟'' کریم داد نے تشویش ناک انداز میں سوال کیا۔

''وہ اپنا رحمت ہے نا رحمت آرائیں۔ تجھے معلوم تو ہے کہ وہ سعادت بلوچ کی بیٹی کو بھگا کر لے گیا تھا۔ سعادت بلوچ تو بہت بڑا زمین دار ہے، اس نے پنچایت بلوائی ہے۔ رحمت آرائیں نے اس کی بیٹی سے کورٹ میرج کرلی تھی۔ آج کل وہ اسی گاؤں میں رہتے ہیں۔ سعادت بلوچ کہتا ہے کہ اس نے میری غیرت کو للکارا ہے، مجھے انصاف دیا جائے ورنہ میں رحمت آرائیں کو قتل کرادوں گا۔ اسی سلسلے میں گاؤں کے بڑے آج میری جگہ پر بیٹھ کر فیصلہ کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ سفید ریش بزرگ اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر دوسرا آدمی بولا۔

''گاؤں کی عزت تو سب کی سانجھی ہوتی ہے۔ ہم سب بہو بیٹیوں والے ہیں۔ اس رحمت آرائیں کو کچھ تو سزا ملنی چاہیے تاکہ آئندہ کوئی شخص کسی کی بیٹی کو اس طرح نہ ورغلا سکے۔'' باقی لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ تقریباً تمام نمازی اب ان کے آس پاس جمع تھے اور جتنے منہ اتنی باتیں کے مصداق سب کچھ نہ کچھ رائے زنی کررہے تھے۔ جمال بھی کریم داد کے قریب کھڑا تمام ماجرا دیکھ رہا تھا۔ پھر کریم داد گویا ہوا۔

''ٹھیک ہے فضل دین میں آج پہنچ جاؤں گا۔ کتنے بجے آنا ہے؟''

''عصر کی نماز کے بعد۔'' فضل دین نے جواب دیا۔

کریم داد آنے کا کہہ کر جمال کے ہمراہ مسجد سے نکل گیا۔

☆☆☆

چار بجتے ہی فضل دین کے ڈیرے پر گاؤں کے لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے۔ رحمت آرائیں کا بوڑھا باپ بھی کانپتے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا آیا اور صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ باقی تمام لوگ بھی دیگر چارپائیوں پر براجمان ہوگئے۔ اکا دکا لوگوں کی آمد ابھی جاری تھی۔ تھوڑی دیر بعد سعادت بلوچ مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا آیا اور فضل دین کے قریب بیٹھ گیا۔ کریم داد جب جمال کے ہمراہ وہاں پہنچا تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔ وہ اور جمال فضل دین کے قریب رکھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ گاؤں کے چھ سات بزرگوں کا رخ دیگر حاضرین کی طرف تھا۔ جب تمام لوگ جمع ہوگئے تو فضل دین اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور اس نے پنچایت کی غرض وغایت پر روشنی ڈالنے کے بعد رحمت آرائیں کے خلاف باقاعدہ چارج شیٹ پیش کی اور سعادت بلوچ کے مطالبات بیان کرتے ہوئے کہا۔

''بھائیو ہم سب بہو بیٹیوں والے ہیں اور کسی کی بہن

بیٹی پر غلط نگاہ ڈالنا جرم سمجھتے ہیں کیونکہ شریعت بھی یہی کچھ کہتی ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اس گاؤں کے ایک نمک حرام رحمت آرائیں ولد شوکت آرائیں اپنے ہی گاؤں کے ایک معزز انسان کی بیٹی کو ورغلا کر لے گیا اور عدالت میں جا کر شادی کر لی اور آج اسی گاؤں میں رہنے کے لیے آ گیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ مکمل انصاف ہو۔ اس سلسلے میں انصاف کا مستحق چودھری سعادت بلوچ ہے اور اس نے اس سلسلے میں اپنے دو مطالبات پیش کیے ہیں۔ ان میں سے ایک مطالبہ لازمی پورا کرنا پڑے گا۔ دوسری صورت میں یہ ذاتی طور پر رحمت آرائیں سے بدلہ لینے کا مجاز ہو گا۔ دونوں مطالبات یہ ہیں۔ رحمت آرائیں ولد شوکت آرائیں پر لازم ہے کہ وہ ہرجانے کے طور پر مبلغ بیس لاکھ روپے سعادت بلوچ کو ادا کریں۔ اگر یہ بھی نہیں مانتے تو دوسری صورت میں شوکت آرائیں اپنی بیٹی چودھری سعادت بلوچ کے نکاح میں دے گا۔'' پھر فضل دین روئے سخن چودھری سعادت بلوچ کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''کیوں سعادت بلوچ! تیرے یہی مطالبات ہیں نا؟'' چودھری نے جواب میں ہاتھ اٹھا کر اس کی تائید کی۔

حاضرین میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ شوکت آرائیں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ فضل دین کریم داد سے مخاطب ہوا۔

''بھائی کریم داد! تم گاؤں کے معززین میں شمار ہوتے ہو، پہلے بھی کئی فیصلے تم کر چکے ہو۔ ہم چودھری سعادت بلوچ کے ان مطالبات کو تمہارے سامنے رکھتے ہیں پھر جو تمہارا فیصلہ ہو گا ہمیں قبول ہو گا۔''

کریم داد اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اس لمحے اس کی آنکھوں میں گاؤں کی کسی بھی مسجد جیسا تقدس موجود تھا۔ اس نے کھنکھار کے گلا صاف کیا اور حاضرین کی طرف متوجہ ہوا۔ تمام حاضرین پر سکوت طاری ہو گیا، صرف چڑیوں کی چہچہاہٹ سنائی دے رہی تھی جو صحن میں موجود درختوں پر بیٹھی ہوئی اس تمام کارروائی سے بے خبر اپنے ہی کاموں میں مصروف تھیں۔ کریم داد سلام کر کے گویا ہوا۔

''میرے بھائیو دوستو اور بزرگو! میں چودھری سعادت بلوچ کی بلوائی گئی اس پنچایت میں فضل دین اور دیگر بزرگوں کے کہنے پر شامل ہوا ہوں۔ انہوں نے سارا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال دیا ہے۔ میں جو فیصلہ کروں گا وہ سب کو قبول ہو گا نا؟'' تمام لوگوں نے یک زبان ہو کر ہاں میں جواب دیا۔ اس نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔

''چادر اور چار دیواری کا تقدس ہم سب کو عزیز ہے۔ چودھری سعادت بلوچ کی بیٹی میری بیٹی ہے، سارے گاؤں کی بیٹی ہے۔ اس نے گھر کی چار دیواری کو پھلانگا اور رحمت آرائیں نے اس سے عدالت میں جا کر شادی کر لی۔ یہ سب اچھا نہیں ہوا۔ اب میں ایک سوال آپ سب لوگوں کی موجودگی میں چودھری سعادت بلوچ سے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مجھے جواب دے کہ اس کے بزرگوں نے اپنے مزارعین کی کتنی ہی بیٹیوں کی آبرو کو پامال کیا۔ اس مکروہ کھیل میں اس کے دادا پردادا بھی شامل تھے۔ یہ جس مزارع کی بیٹی کو اپنے ڈیرے پر کام کاج کے بہانے بلاتے تھے، اس کے ساتھ ان کی حویلیوں میں کیا کچھ ہوتا تھا اس کے گواہ آج بھی وہی در و دیوار ہیں۔ گاؤں کے مزارعین کی مسکین بیٹیاں کئی کئی ہفتوں تک پامال ہوتی رہتی تھیں۔ اس وقت تو کوئی پنچایت بلانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ آج ایک زمیندار کی عزت پر حرف آیا تو فردِ جرم بھی عائد ہو گئی اور غیر شرعی مطالبات بھی رکھ دیے گئے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جو ہوا برا ہوا، یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سعادت بلوچ تمہاری تو جوانی کیسی گزری، اس کے گواہ آج بھی سفید ڈاڑھی کے ساتھ یہاں موجود ہوں گے۔ قدرت کے کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ یعنی جو تم دوسروں کے ساتھ کرو گے وہی تمہارے ساتھ بھی ہو گا۔ دونوں بچوں سے غلطی ہوئی مگر نکاح کے بعد انہوں نے کافی حد تک اپنی غلطی کا ازالہ کر لیا۔ رحمت آرائیں اور اس کا باپ معمولی زمیندار ہیں۔ وہ اتنی بڑی قیمت ادا نہیں کر سکتے اور اس سارے معاملے میں شوکت آرائیں کی معصوم بیٹی کا کیا قصور جو بدلے میں ایک ساٹھ سالہ آدمی سے بیاہ دی جائے۔ میں شوکت آرائیں سے کہتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹے کو بلائے اور وہ سب کے سامنے اپنی غلطی پر معافی مانگے گا۔ اس کے بعد اس کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ نہ تو ہرجانے میں بیس لاکھ دیے جائیں گے اور نہ ہی لڑکی کا نکاح چودھری سعادت بلوچ سے ہو گا۔ رحمت آرائیں کی معافی کے بعد بھی اگر چودھری سعادت بلوچ نے اس کو نقصان پہنچایا تو میں کریم داد ولد فضل داد بذاتِ خود تھانے میں جا کر اس کی ایف آئی آر کٹاؤں گا۔ بس یہی میرا فیصلہ ہے، آؤ جمال چلتے ہیں۔''

یہ کہہ کر کریم داد حاضرین کو سلام کر کے واپس لوٹ گیا۔

تمام لوگ ملے جلے تبصروں کے ساتھ اس کو جاتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ شوکت آرائیں کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں اور چودھری سعادت بلوچ پر گویا سکتہ طاری تھا۔

کریم داد اور جمال واپسی پر بالکل خاموش رہے۔ جمال اس دلیرانہ فیصلے پر دل ہی دل میں بے حد حیران تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی دونوں کمرے میں آ گئے۔ کریم داد ہنوز خاموش تھا پھر جمال دل کی بات زبان پر لے ہی آیا۔
''چاچا! آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر کے چوہدری سعادت بلوچ سے دشمنی مول نہیں لی کیا؟ وہ آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔''
کریم داد ہنس پڑا۔ ''پتر جمال...... سعادت بلوچ کو میں بچپن سے جانتا ہوں، اس کا کردار کبھی صاف نہیں رہا۔ جن بچوں کے ماں باپ ہی اچھے کردار کے نہ ہوں تو ان بچوں کو بھٹکنے سے کون روک سکتا ہے۔ وہ غیرت مند ہوتا تو اس کا کردار صاف ہوتا اور غیرت سے عاری انسان فطرتاً بزدل ہوتا ہے۔ یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہاں اگر قدرت کی طرف سے کوئی نقصان لکھا ہے تو اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔''
جمال کی آنکھوں میں عقیدت کا دریا اُمڈ آیا تھا۔ اس مرد قلندر کی کسی بات کو رد کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔
''چاچا! آج میرا واپسی کا ارادہ ہے۔ یقین کریں دل تو نہیں کرتا کہ یہاں سے جاؤں مگر ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے واپسی کے لیے دل بے قرار سا ہے۔''
''اس بزرگ کے مزار پر نہیں جاؤ گے کیا جس کے لیے اتنا سفر کر کے آئے ہو؟'' کریم داد نے سوال کیا۔
''اب وہاں جانے کی ضرورت نہیں رہی۔'' جمال اس کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے ساتھ گزرے ہوئے چار دن مجھے بہت کچھ سکھا گئے ہیں۔ آپ کے قول اور فعل کی یکسانیت مجھے اپنے بہت سے فیصلوں پر عمل درآمد کرنے میں مدد دے گی۔''
''آج مت جاؤ کل سویرے نکل جانا۔'' کریم داد نے کہا تو جمال مسکرا دیا۔
اگلی صبح ناشتے کے بعد جمال نے اپنا بیگ سنبھالا اور فون کر کے کریم داد کو اپنے جانے کی اطلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے کمرے میں آ گیا۔ ''بس روانگی ہے؟'' کریم داد نے اس کے بیگ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''ہاں چاچا بس اب چلنا ہے۔ میں گاہے بگاہے آتا رہوں گا اور آپ کو لاہور آنے کی اسپیشل دعوت بھی دے رہا ہوں۔ یہ لیں میرا کارڈ...... اس پر میرے گھر کا ایڈریس بھی ہے اور دفتر کا بھی۔ مجھے آپ کی میزبانی پر واقعی دلی خوشی ہوگی۔''
کریم داد نے کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ''میں تجھے اڈے تک چھوڑ آتا ہوں۔'' کریم داد اس کا بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔
''نہیں، چاچا! آپ یہیں بیٹھیں۔ میں چلا جاؤں گا۔ ہر بات آپ کی مانتا آیا ہوں، آپ میری بات مان لیں۔''
کریم داد مسکرا کر رہ گیا پھر وہ اس کو دروازے تک چھوڑنے آیا۔ دروازے پر جمال نے اس سے بغل گیر ہونے کے بعد نم آلود آنکھوں سے اس کو دیکھا اور گویا ہوا۔
''میں آپ کا منتظر رہوں گا۔''
''میں ضرور آؤں گا اور میرے گھر کے دروازے بھی تم پر ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ کسی نیک ماں کے بیٹے لگتے ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اگلی بار اپنی بیوی کے ساتھ آؤ جس کو چھوڑنے کی ہمت تم میں آج بھی نہیں ہے...... اور ہاں آخری بات سن لو۔ قدرت کے فیصلوں کا انتظار خاموشی سے کرو گے تو ہر فیصلہ تمہارے حق میں آئے گا۔ اپنی ذات کو اس چھپر کی طرح بنا لو جو اپنے اوپر دھوپ کی شدت برداشت کر کے اوروں کو چھاؤں فراہم کرتا ہے، پھر دیکھ لینا کہ تمہارے نصیب میں کیسی کیسی راحتیں آتی ہیں۔''
جمال نے کریم داد سے ہاتھ ملایا اور پکی سڑک کی طرف چلنے لگا جس کے بارے میں کریم داد اس کو بتا چکا تھا۔ تارکول سے بنی یہ تنگ سی سڑک مختلف دیہاتوں کو آپس میں ملانے کے بعد بڑی سڑک سے منسلک ہو جاتی تھی جو ملتان کی طرف جاتی تھی۔ وہ دس بجے کے قریب ملتان پہنچ گیا پھر وہاں سے لاری پر بیٹھ کر لاہور روانہ ہو گیا جو اس کی منزل تھی۔
☆☆☆
حنا کو جمال سے جدا ہوئے تین ماہ بیت چکے تھے۔ اس دوران دل کی شدید خواہش کے باوجود اس نے حنا سے کوئی رابطہ نہ کیا۔ موبائل فون کی ہر گھنٹی پر دعا کرتا تھا کہ کاش یہ حنا کا فون ہو اور وہ اس طویل جدائی سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی ہو مگر ایک بار بھی حنا نے رابطہ نہ کیا اور نہ ہی جمال نے کوئی پیغام بھیجا جبکہ اس کی دلی شدت سے خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح حنا سے رابطہ ہو جائے۔ وہ اپنے سینے پر صبر کی بھاری اینٹ رکھ کر اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر چکا تھا۔ ماں سے اس نے پھر اپنے رشتے کی بات نہیں کی۔ وہ اگر بات چھیڑ دیتی تو یہ کہہ کر خاموش کرا دیتا کہ ابھی میں دوسری شادی کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اپنا شہر والا گھر اس نے کرائے پر دے دیا تھا۔ اب وہ مستقل طور پر ماں

کے پاس مقیم تھا۔ دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر۔ گھر آتے ہی وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ ماں کے سامنے وہ خود کو خوش باش ثابت کرنے کے لیے خوش گپیاں کرتا رہتا تھا مگر جانتا تھا کہ آنکھوں اور الفاظ کی آپس میں کوئی کمٹمنٹ نہیں ہے۔ ماں بھی اس کے الفاظ کا کھوکھلا پن محسوس کرتی تھی جس کا جمال کو بخوبی اندازہ تھا مگر اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کو ٹھیک کرنا اس کے بس میں نہیں تھا اس کی سوچوں کے تمام راستے حنا پر جا کر ختم ہو جاتے تھے۔ ٹی وی کے ہر چینل پر حنا کا وجود لہراتا تھا۔ سرد راتوں میں ہوا کے جھونکے سے کھڑکی کے کواڑ بجتے تو اس کو یوں محسوس ہوتا جیسے حنا پائل پہنے کہیں آس پاس موجود ہے۔

☆☆☆

حنا کے بھائی کی شادی ہو گئی۔ نئی نویلی بھابی نے گھر میں قدم رکھا تو گھر کی رونق میں اضافہ ہو گیا۔ حنا نے بھی کسی پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی تھی۔ وہ صبح کو جاتی اور دوپہر کو واپس آکر گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ ایک دن وہ کچن میں برتن دھو رہی تھی کہ اس کی بھابی کے جہیز کا کوئی برتن اس کے ہاتھ سے گر کے ٹوٹ گیا۔ بھابی نے جونہی ٹوٹنے کی آواز سنی وہ فوراً کچن کی طرف بھاگی۔ اس کے سامنے چائے کا کپ کرچی کرچی پڑا تھا جسے حنا سمیٹ رہی تھی۔ بھابی فوراً اس کے سر پر پہنچ گئی۔

”حنا! تم بچی تو نہیں ہو جو تم سے میرے ٹی سیٹ کا قیمتی کپ ٹوٹ گیا۔“ عنبرین اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”بھابی! میں نے جان بوجھ کے تو نہیں توڑا۔“ حنا نے صفائی پیش کی۔

”صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ آئندہ میرے جہیز کی کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا، سن لیا تم نے۔“ عنبرین نے یہ بات زیادہ زور سے نہیں کی مگر قریب سے گزرتی ہوئی حنا کی ماں نے یہ بات سن لی۔

”کیا ہوا؟“ ماں نے حنا سے سوال کیا۔

”امی ان کا ایک معمولی سا کپ میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا ہے جس پر یہ خفا ہو گئی ہیں۔“ یہ کہہ کر حنا رو پڑی۔

”بہو! بھول چوک میں تو بڑے بڑے نقصان ہو جاتے ہیں، دل بڑا رکھنا چاہیے انسان کو۔“ ماں کی طنز میں ڈوبی ہوئی بات عنبرین کو پسند نہیں آئی اور وہ کچن سے نکل کر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ قریب میں ندیم اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس نے دو تین بار اخبار ہٹا کر عنبرین کو دیکھا پھر وہ اس کے قریب آیا۔

”خیر تو ہے، کیوں منہ پھولا ہوا ہے تمہارا؟“

”اپنی ماں اور بہن سے جا کے پوچھو جنہوں نے ایک تو میرا قیمتی کپ توڑ دیا اوپر سے مجھے ہی برا بھلا کہنے لگیں۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ ندیم فوراً کمرے سے نکلا اور ماں کے سر پر پہنچ گیا۔

”امی! عنبرین رو رہی ہے آپ کو کچھ احساس کرنا چاہیے۔ وہ نئی نویلی دلہن ہے، کیا سوچے گی کہ کیسے لوگوں سے پالا پڑ گیا ہے۔“

ماں نے حیرت سے بدلے بدلے لہجے والے ندیم کو دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”واہ جی واہ ابھی سے بیوی کی پوجا پاٹ شروع ہو گئی۔ اپنی بیوی سے بھی پوچھو کہ وہ حنا سے کیوں بدتمیزی کر رہی تھی۔ معمولی کپ تھا ٹوٹ گیا۔“

”ایک کام کریں امی جان! آپ پلیز حنا کو اپنے گھر

المیہ

”ارے کچھ سنا تم نے؟“
”کیوں، کیا ہوا؟“
”اسلم مر گیا!“
”کون اسلم؟“
”ارے وہی جو لنڈے بازار میں کندھے پر کوٹ ڈال کر بیچا کرتا تھا۔“
”ارے کیسے مرا؟“
”رات سردی سے!“

بات تو سچ ہے

ایک بنگلے کی اونچی چھت پر بیٹھی ایک چڑیا نے دوسری چڑیا سے کہا۔ ”انسان کتنا فضول خرچ ہے۔ اتنی رقم خرچ کر کے چھت اور عمارتیں بناتا ہے اور چلتا فرش پر ہے۔“

”بلاوا“

میاں بیوی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔
”میں جا کر دیکھتا ہوں۔“ خاوند باہر کی طرف لپکا اور دروازے کے اندر سے پوچھا۔ ”کون؟“
دروازے کے دوسری طرف سے آواز آئی۔
”موت کا فرشتہ!“
خاوند الٹے قدموں واپس آگیا۔ ”بیگم تمہیں بلا رہے ہیں۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

بھتیجیں، شادی شدہ بہن ملنے آئے تو ٹھیک ہے یوں میکے میں جم کر بیٹھ جانا اور اوپر سے سینہ زوری کرنا کہاں کا انصاف ہے۔"

حنا اندر داخل ہوئی۔

"ندیم! اس کل کی چھوکری نے تم پر ایسا جادو کر دیا کہ آج تم اپنی ماں سے بدتمیزی کر رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ بہن کا وجود بھی تمہیں کھٹکنے لگا ہے۔"

"رہنے دو حنا۔" ندیم نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "تم اگر اتنی اچھی ہوتیں تو اپنا گھر آباد کر لیا ہوتا۔"

حنا اس کی بات سن کر سناٹے میں آ گئی۔ ندیم خاموشی سے واپس چلا گیا۔

اس دن کے بعد اس گھر میں دو گروپ بن گئے۔ بہن بھائی کی بول چال بند ہو گئی۔ ندیم اپنی ماں سے بھی کم بولتا تھا، زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ہی رہتا جہاں سے ان کے خوشگوار قہقہے ماں کو اپنی بیٹی کی بربادی کا گویا احساس سا دلاتے رہتے تھے۔

آہستہ آہستہ عنبرین کے اخلاق اور خوش مزاجی کے رنگ پھیکے پڑتے گئے اور دو تین ماہ بعد اس نے باقاعدہ ندیم پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ اس گھر میں خوش نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ دونوں ماں بیٹیاں اس پر تعویذ گنڈے کرتی ہیں تاکہ میرے اور آپ کے درمیان اختلافات پیدا ہو جائیں۔ ایک دن کھانے کی ٹیبل پر ندیم نے عنبرین کے دل کی بات کر دی۔

"امی! ایک بات کہوں آپ سے؟"

"ہاں کہو۔" ماں نے جواب دیا۔

"حنا کب تک یہاں رہے گی؟ آج چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ نہ تو خدانخواستہ یہ بیوہ ہے، نہ اس کو طلاق ہوئی ہے۔ پھر اس کا یہاں رہنا کچھ عجیب سا نہیں ہے؟"

حنا کے ہاتھ رک گئے۔ ماں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اب تم اس سوال کا جواب دو مگر وہ مزے سے کھانے میں مصروف تھا۔

"سنا آپ نے؟" وہ بول پڑی۔ "آج اس کو ایک بہن کا وجود کھٹک رہا ہے کیونکہ اس کی بیگم حنا کو پسند نہیں کرتی۔" مگر حنا کے باپ نے سنی ان سنی کر دی۔ حنا نے کھا جانے والی نظروں سے بھابی کی طرف دیکھا پھر اطمینان سے بولی۔

"میں اپنے باپ کے گھر میں رہتی ہوں کسی میں ہمت نہیں ہے جو مجھے یہاں سے نکالے۔ جس کو میرا چہرہ پسند نہیں ہے، وہ کہیں اور جا کے رہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عنبرین نے بھی اپنے ہاتھ روک لیے اور توڑا ہوا نوالہ واپس رکھ کر پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ ندیم نے بھی کھانا ادھورا چھوڑا اور وہاں سے چلا گیا۔ ایک کپ کے ٹوٹنے سے دل ٹوٹنے کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا تھا اور پھر انہی تلخیوں کے بیچ ندیم کی شادی کو دس ماہ ہو گئے۔ اب اس نے باقاعدہ علیحدگی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عنبرین کے باپ کا ایک چھوٹا سا گھر جو عنبرین کے نام تھا انہوں نے اسی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس کا اعلان کرنا ندیم کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ حنا کا باپ جیسے اس تمام معاملے سے الگ تھلگ تھا، ماں کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ان کو اپنے گروپ میں شامل کر لیا جائے۔ ایک دن ندیم کی ماں نے اپنے خاوند سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

ندیم کے ابو ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا ایک جنرل اسٹور چلا رہے تھے۔ ایک رات وہ اسٹور سے واپس آئے تو ان کی بیوی چائے کا کپ لے کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے کپ سائڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

حنا کے ابو نے بیوی کو حیرت سے دیکھا پھر چائے کے کپ پر نظر ڈالی۔

"خیریت تو ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" انہوں نے سوال کیا۔

"کیا مطلب ہے..... میں آپ کو چائے نہیں پلا سکتی؟" بیوی نے جواب دیا۔

"آج کئی سالوں کے بعد کیسے خیال آ گیا؟ کیا کوئی فرمائش کرنی ہے یا..... اچھا۔" انہوں نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ "اپنے گروپ میں شامل کرنا چاہتی ہو۔"

"طنز مت کریں، میں پہلے ہی بہت افسردہ ہوں۔" بیوی نے جواب دیا۔

"افسردہ ہوں تمہارے دشمن، یہ بتاؤ چاہتی کیا ہو؟" انہوں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ندیم کے تیور بالکل بدلے بدلے سے ہیں، شادی کے بعد تو وہ بالکل بدل گیا ہے۔ میری طرف دیکھتا تک نہیں، بس بیوی کے اشاروں پہ چلتا ہے۔ مجھے تو شک سا ہو رہا ہے کہ وہ کہیں ہمیں چھوڑ کر چلا نہ جائے۔" یہ کہہ کر وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

"ہاں بھئی یہ تو تم پر بڑا ظلم ہوگا اگر اس کی بیوی اسے

لے کر اپنے میکے چلی جائے چچ چچ چچ۔'' یہ کہہ کر وہ چائے پینے لگے۔

''آپ کو تو ذرا بھی افسوس نہیں ہے، اس وقت بھی آپ کے چہرے پر طمانیت ہے۔ میرے اندر جھانک کر دیکھیں میرا دل کرچی کرچی ہو رہا ہے۔''

''بیگم کوئی مسئلہ نہیں، تم نے اپنی شادی شدہ بیٹی کو اپنے گھر بٹھا رکھا ہے۔ ہماری بہو کی ماں بھی یہی کرنے جا رہی ہے۔ اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟''

''آپ کیا چاہتے ہیں، کیا میں اپنی بیٹی کو واپس بھیج دوں؟'' بیوی نے سوال کیا۔

''ہاں، اس طرح ہو سکتا ہے کہ تمہارے گناہ کی تلافی ہو جائے۔ اپنی بیٹی کی ازدواجی زندگی میں تمہاری بار بار کی مداخلت کے باعث آج وہ اجڑ کے رہ گئی ہے۔ جس طرح تم حنا کی زندگی میں بربادی لے کر آئی ہو، اسی طرح روزانہ کی ٹیلی فون کالز جو کہ عنبرین کی ماں کرتی ہے اس کی زندگی میں تباہی لے کر آنے والی ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ بہو اگر حنا کو برداشت نہیں کر رہی تو حنا کو اپنے گھر واپس بھیج دو اور اسے پرانی عورتوں کی طرح نصیحت کرو کہ اب اس گھر سے تمہارا جنازہ ہی اٹھے گا۔ کمال ہے یار! ہماری دادی نانی نے اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی تھی مگر کس طرح اپنے اپنے گھروں کو آباد کرتی تھیں۔ آج کی تم جیسی پڑھی لکھی ماؤں نے روزانہ موبائل فون پر بیٹی سے بات کر کر کے اپنی بیٹی کو نہ میکے کا رہنے دیا، نہ سسرال کا۔'' یہ کہہ کر وہ چائے پینے میں مشغول ہو گئے...... وہ کچھ دیر سوچوں میں گم رہی پھر کمرے سے نکل گئی لیکن اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ بیٹے کو ہاتھ سے نکلنے سے بچانے کے لیے حنا کو واپس بھیجنا ضروری ہے۔

☆☆☆

ایک اور دسمبر جمال کے آنگن میں دستک دے رہا تھا۔

حنا کو گھر چھوڑے پورا سال ہو چکا تھا۔ اس دوران ان دونوں کا کسی قسم کا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ماورا سے بھی جمال کا رابطہ نہیں تھا ورنہ وہ اس کو حنا کے بارے میں ضرور بتا دیتی کہ وہ کس حال میں ہے۔

وہ ایک اداس شام تھی۔ جمال اپنے کمرے میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔

''آیئے بیٹھیے ماں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''جیتے رہو...... اماں سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''میں تم سے کچھ کہنے آئی ہوں بلکہ یوں سمجھو کہ اپنی دلی خواہش کا اظہار کرنے آئی ہوں اور مجھے امید ہے کہ میرا فرماں بردار بیٹا انکار نہیں کرے گا۔''

''جی فرمایئے اماں۔'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''مجھ سے تمہارا دکھ اب برداشت نہیں ہوتا۔ میں تمہارے لیے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈوں گی۔ سانسوں کا کیا اعتبار۔ بوڑھی ہوں، بیمار بھی ہوں، کوئی بھی لمحہ مجھے......''

''بس بس اماں! آگے کچھ مت کہیے اور جہاں تک آپ کی خواہش کی بات ہے تو آپ اپنی خواہش پوری کیجیے۔ آپ میرے لیے جو بھی لڑکی پسند کریں گی، میں انکار نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک مردہ سی مسکراہٹ اپنے چہرے پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔

''اللہ تمہیں خوش رکھے بس میں تمہارے منہ سے یہی سننا چاہتی تھی۔'' ابھی وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی کہ ان کی بڑی بہو حمیدہ کمرے میں داخل ہوئی۔

''امی بات سنیے۔'' وہ ہاتھ کے اشارے سے بولی۔

''کیا بات ہے؟'' ماں اٹھتے ہوئے بولی۔

''آیئے میرے ساتھ۔'' یہ کہہ کر وہ اسے لے کر کمرے سے نکل گئی۔

''حمیدہ! کیا بات ہے، خیر تو ہے نا۔'' اس نے سوال کیا۔

''جی سب خیریت ہے۔ کوئی خاص مہمان اپنے بوریے بستر سمیت آیا ہے بلکہ آئی ہے، آپ کے کمرے میں ہے۔''

یہ سنتے ہی جمال کی ماں اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ سامنے بیڈ پر حنا بیٹھی تھی، قریب ہی اس کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ ماں کو دیکھتے ہی حنا اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور آگے بڑھ کر پہلے ان کے پاؤں چھوئے پھر سینے سے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

''کیا لینے آئی ہو؟'' ماں نے تیکھے تیکھے لہجے میں کہا۔

''کیا کوئی کسر باقی رہ گئی ہے؟''

''بس آپ مجھے معاف کر دیں۔'' حنا نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں تجھے اس وقت تک معاف نہیں کر سکتی جب تک جمال تجھے معاف نہیں کرے گا۔'' ماں نے جواب دیا۔

''وہ آپ کا فرماں بردار بیٹا ہے آپ سفارش کریں گی تو وہ معاف کر دے گا۔''

''میں بیچ میں نہیں پڑتی۔ وہ سامنے اس کا کمرا ہے، خود اس سے بات کر لے...... جا۔'' ماں نے بے رخی سے کہا۔

''مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔'' حنا نے بے قراری سے بولی۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

"نہ بابا نہ..... ابھی میں اس کو دوسری شادی کے لیے راضی کر کے آئی اور اب تجھے لے کر پہنچ جاؤں..... اگر اس کی نظر میں تیرا قصور قابلِ معافی ہوا تو وہ معاف کر دے گا ورنہ تیرے لیے تیری ماں کا گھر پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔"

"اب وہاں میری جگہ نہیں رہی امی جان۔" حنا رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تو نے اس کے صبر کو بہت آزمایا ہے حنا..... تو خود جا اور اس سے بات کر۔" یہ کہہ کر ماں اپنے بستر پر دراز ہو گئی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

حنا لڑکھڑاتے قدموں سے جمال کے کمرے کی طرف بڑھی، اندر داخل ہو کر اس نے کھنکھار کے اپنی آمد کا احساس دلایا۔ جمال نے چونک کر اس کو دیکھا۔ محبت اور نفرت کی ملی جلی کیفیت اس کے دل میں بیدار ہوئی پھر اس نے حنا کو نظرانداز کر دیا اور ٹی وی اسکرین پر نظریں جما دیں۔

"جمال! میں ہر چودھویں رات کو چھت پر چاند دیکھنے جاتی تھی۔ اس امید پر کہ شاید تمہاری نظریں بھی اس سے چاند پر ہوں گی..... میں نے ہر پل، ہر لمحہ تمہاری یادوں میں بسر کیا ہے۔ میں نے ایک سال تک تم سے رابطہ نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے تمہیں یاد نہیں کیا۔ بالکل اس طرح جیسے ایک سال تک تم مجھے یاد کرتے رہے مگر ایک ٹیکسٹ میسج تک نہیں کیا۔ میری طرف دیکھو جمال۔ میں نے اپنے اندر کی انا پرست عورت کو کچل دیا ہے۔" پھر وہ اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ جمال نے پہلی بار اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے اندر کی شکستگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے پڑ گئے تھے۔ اس وقت وہ سراپا انکسار بن کے کھڑی تھی۔

"بیٹھو۔" جمال نے اس کو اپنے قریب بیٹھنے کو کہا تو حنا تیزی سے بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی جھلک صاف طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔

جمال نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور گویا ہوا۔

"میرے مرشد نے کہا تھا کہ قدرت کی ہر ستم ظریفی پر خاموشی کی مہر لگا دو۔ کسی سے اپنے دکھ کا اظہار مت کرو پھر دیکھنا کہ قدرت کس طرح سارے فیصلے تمہارے حق میں کرتی ہے۔ کتنا بڑا سچ کہا تھا اس نے۔ تمہارے لہجے کی سچائی بتا رہی ہے کہ تم واقعی بدل گئی ہو۔"

"یہ مرشد کب سے رکھنے شروع کر دیے تم نے؟" حنا ہنستے ہوئے بولی۔

"مرشد رکھے نہیں جاتے، تفویض کیے جاتے ہیں۔"

"تو کیا تم نے مجھے معاف کر دیا؟" حنا نے سوال کیا۔

"میری بات چھوڑو، میں تو ہر رات تمہارے انتظار میں گزارتا تھا۔ اگر اماں تمہیں معاف کر دیں تو ٹھیک ہے ورنہ میرے گھر میں تمہاری کوئی جگہ نہیں۔"

"میں انہیں منا لوں گی۔"

"اسی گھر میں رہنا ہوگا۔"

"رہوں گی۔"

"میری ماں کو کوئی دکھ یا تکلیف نہیں پہنچاؤ گی کیونکہ وہ پہلے ہی میرے حوالے سے صدمات جھیل چکی ہیں۔"

"میں بیٹی سے بڑھ کر ان کی خدمت کروں گی انشاء اللہ ان کے سارے گلے شکوے دور ہو جائیں گے۔" حنا نے جواب دیا۔

"میں نے شہر والا گھر کرائے پر اٹھا دیا ہے۔ اب تم کو اسی گھر میں رہنا پڑے گا۔ رہ لو گی؟"

"ہاں۔" اس نے مختصر مگر دل کی گہرائیوں سے جواب دیا۔

"اماں کو منا لو، انہوں نے میری زندگی پر کڑھتے کڑھتے بہت سی بیماریوں کو سینے سے لگا لیا ہے۔ وہ مان جائیں تو ایک کپ چائے بنا کر لے آنا۔" یہ کہہ کر جمال نے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالا ہی تھا کہ حنا نے سگریٹ اور ڈبیا چھین کر ڈسٹ بن میں پھینک دی۔

"آج سے سگریٹ ختم بس۔ میں تم پر یہ پابندی تو ضرور لگا سکتی ہوں نا....؟ تمہیں اس ڈبیا پر کینسر زدہ سگریٹ نوش کی تصویر سے ڈر بھی نہیں لگتا۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں امی کو مناتی ہوں۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ ایک منٹ میں مان جائیں گی۔"

"سنو۔" جمال نے اس کو پکارا۔

"جی۔" اس نے مڑ کر جواب دیا۔

"تمہارے روٹھ کر جانے سے ایک دن پہلے میں پرپل کلر کی لپ اسٹک لایا تھا۔ تمہیں دے نہ سکا۔ وہ سامنے الماری کے اوپر والے خانے میں رکھی ہے، لگا لینا..... تمہیں تو شاید اب بھی یہ کہنے میں مشکل ہے کہ..... آئی لو یو۔"

"جمال....." وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی اور پلٹ کر جمال کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ اس لمحے اس کی نم آلود آنکھوں میں دھنک کے سارے رنگ آن بسے تھے۔